
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اگست 2016
نگران اعلیٰ
معراج رسول
رفعت سراج کا نیا سلسلے وار ناول
نیلوفر عباسی کی زندگی کا احوال.....
رضوانہ پرنس کے مخصوص انداز بیان میں
Monthly PAKEEZA AUG - 2016 PRICE RS. 60/=
REGD. NO. MC-12

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ● مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ● مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

دنیا میں طرح، طرح کے لوگ ہیں اور ان کی طرح، طرح کی عادتیں......کوئی آگے بڑھنا چاہتا ہے اور مقابلہ کر کے خوش ہوتا ہے اور بعض افراد کو زندگی میں ایسی صورتِ حال بہت اچھی محسوس ہوتی ہے جہاں کوئی مسابقت موجود نہ ہو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر مقابلے کا کوئی مرحلہ کسی بھی حوالے سے آ جائے تو بہت سے افراد اس سے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظاہر ہے اس کے نفسیاتی اسباب ہوتے ہیں کہ ایسے کم ہمت بلکہ ڈرپوک سے لوگ فیصلہ کن ذہن نہیں رکھتے......اور اسی وجہ سے وہ خود کو کسی امتحان میں ڈالنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ دنیا جدوجہد سے عبارت ہے اور مسابقت یا مقابلہ جدوجہد کا اصل محرک ہے اس لیے اس سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے ناگزیر طور پر مسابقت کے عمل سے گزرنا پڑے گا۔ اور یہ تلخ ترین حقیقت جتنی جلدی ان کی سمجھ میں آ جائے اتنی ہی ان کے لیے بہتر ہے۔

ہم نے ایسے بھی بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ آرٹ، لٹریچر اور فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ خود یہ حقیقت تسلیم نہیں کریں گے، تب تک وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار بھی نہیں لا سکتے یہ خود آگاہی بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے......ہمیں خود کو یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ ہم کسی کام کے اہل ہیں تب ہی قدم بڑھایا جاتا ہے اور جب قدم بڑھ جائیں تو وہ رکا نہیں کرتے......! ہمیں اپنے لیے، اپنے گھر کے لیے اور اپنے ملک کے لیے بہت کچھ کرنا ہے اور ہم کاہل ہرگز نہیں ہیں......اور آج ہمیں یہی آپ سے کہنا ہے کہ مسابقت سے ہمیں گھبراہٹ نہیں بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے ملک کے لیے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ (انشاء اللہ) آپ سب کو یومِ آزادی مبارک ہو......

مدیرہ

انجم انصار

دین کی باتیں

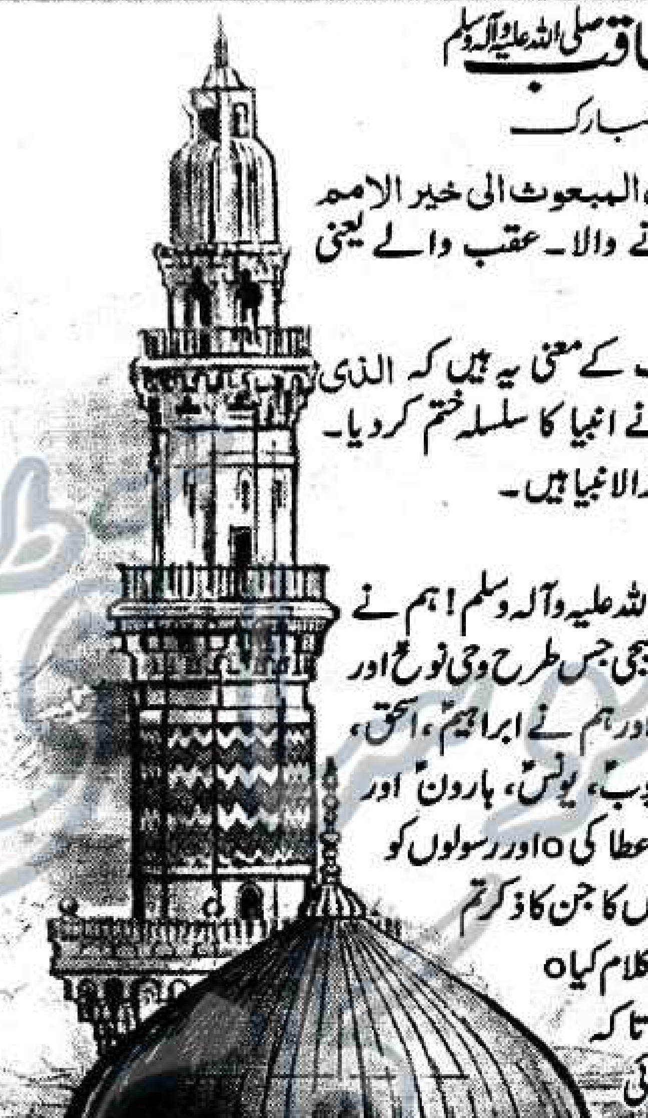
اور وہی ہے جو رات کو تمہیں وفات (یعنی خواب) دیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے اسے جانتا ہے پھر تمہیں دن میں پیدا کرتا ہے تاکہ (زندگی) ایک معین مدت ختم کی جائے پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے تھے اس (کے نتیجہ) سے تمہیں آگاہ کردے گا (۶۰) اور وہ اپنے (تمام) بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر نگہبانی کرنے والے (فرشتے مقرر کر کے) بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اسے ہمارے فرشتے قبض کرلیتے ہیں اور وہ (ذرا بھی) تقصیر نہیں کرتے (۶۱) پھر وہ اپنے سچے کارساز (یعنی) اللہ کی طرف واپس کیے جائیں گے آگاہ رہو اسی کا حکم (سب پر غالب) ہے اور وہ تمام حساب کرنے والوں سے تیز (حساب کرنے والا) ہے (۶۲) (ان سے) پوچھو کہ تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ تم اسے چھپ (چھپ) کر (گریہ وزاری سے) پکارتے ہو کہ اگر ہمیں اس (بلا) سے نجات دے دے گا (تو) بے شک ہم شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے (۶۳) کہو کہ ان سے تمہیں اللہ ہی نجات دیتا ہے اور ہر مصیبت سے (وہی نجات دیتا ہے) پھر (افسوس کہ) تم شرک کرتے ہو (۶۴) کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے اور تمہارے پیروں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا تمہیں گروہ (کرکے) جمع کرے اور تم میں سے بعض کو بعض کی جنگ (سے موت کا مزہ) چکھا دے (اے نبی ﷺ) اور دیکھو ہم کس کس طرح (اپنی) آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں (۶۵)



(سورۃ انعام آیت نمبر ۶۰ تا ۶۵)

سیدنا عاقب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صفاتی اسم مبارک



اللھم صل علی سیدنا محمدن المبعوث الی خیر الامم

1 : مفہوم: سب سے پیچھے آنے والا۔ عقب والے یعنی آخری پیغمبر۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عاقب کے معنی یہ ہیں کہ الذی ختم اللہ بہ الانبیاء جس پر اللہ نے انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا۔

سفیان فرماتے ہیں کہ عاقب کے معنی آخر الانبیا ہیں۔

1: القرآن:

ترجمہ: بے شک اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف وحی بھیجی جس طرح وحی نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی اور ہم نے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کو وحی کی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی ۝ اور رسولوں کو جن کا ذکر ہم تم سے فرما چکے اور ان رسولوں کا جن کا ذکر تم سے نہ فرمایا اور اللہ نے موسیٰؑ سے حقیقتاً کلام کیا ۝ رسول خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے تاکہ رسولوں کے بعد اللہ کے یہاں لوگوں کو کوئی عذر نہ رہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۝ لیکن اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ اس کا گواہ ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا وہ اس نے اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے گواہ ہیں اور اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ (۱۶۶) النساء

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اقتباس





گم شدہ محبت

قسط 7

انجم انصار

انسان نہ کچھ ہنس کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
اداؔ سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر......



''السلام علیکم! میں شہلا بول رہی ہوں۔'' اس نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
''اور میں ریحان۔''
''اوہ...... اچھا...... اچھا۔''
ریحان کے موبائل کا اسپیکر آن تھا۔ اس کی اچھا، اچھا سن کر حارث کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔
''آپ سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے بھئی؟''
''پرسوں تو میں آ رہی ہوں۔''
''کہاں آ رہی ہیں......؟'' ریحان نے بوکھلا کر پوچھا اور حارث کو دیکھ کر کاندھے اچکائے۔
''آپ کے گھر...... اور کہاں......؟'' اس نے جمائی لی۔
''مگر میں تو آپ کو اپنے آفس بلانا چاہتا ہوں...... کیا آپ وہاں نہیں آ سکتیں؟''
''ریحان ماموں کب سے جانے لگے آپ آفس...... پرسوں فائزہ کی بسم اللہ میں ہم لوگ آ رہے ہیں ناں......'' وہ کچھ خجل لہجے میں بولی۔ ''گہری نیند سو رہی تھی...... لے کر جگا دیا آپ نے...... اب آپ کر رہے ہیں اپنے اوندھے سیدھے مذاق...... آفس کب سے جانے لگے۔''
''میں آپ کا ماموں نہیں...... ریحان بول رہا ہوں، ریحان شیخ۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔
''کون ہیں آپ؟'' اس نے کھڑ تل پن سے پوچھا۔ ''کہاں سے لیا ہے آپ نے میرا نمبر......؟'' لہجہ تفتیش بھرا سا تھا۔
''آپ کا دوست ہوں، آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''
''دیکھ اب اگر کیا ناں اس نمبر پر فون...... تو اچھا نہیں ہوگا۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں پولیس والے کی بہن ہوں اگر تیرا نمبر دے دیا ناں تو یوں ہوگا دو منٹ میں اندر...... آیا سمجھ......'' لہجہ آگ اگل رہا تھا۔
''سوری شہلا...... آپ تو برا مان گئیں، میں تو آپ کا فین اس وقت سے ہوں جب آپ اسکول میں جاب کیا کرتی تھیں۔''
''میں دو منٹ میں ٹھکائی لگا سکتی ہوں۔ جانتا نہیں ہے تو مجھے، میں بلیک بیلٹ بھی ہوں۔''
''اوکے مس...... سوری۔'' ریحان نے فون بند کرتے ہوئے حارث کو دیکھا اور بولا۔ ''اب کیا کہتے ہو تم؟''
''یہی کہ لڑکی بڑی شریف ہے۔'' حارث نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔
''مگر وہ عاشق صرف تمہاری ہی ہے۔'' ریحان نے ہنس کر کہا۔
''عاشق مت کہو......'' حارث نے منہ بنایا۔
''پاگل کہوں......؟'' ریحان نے شوخی سے پوچھا۔
''بے وقوف کہہ سکتے ہو۔'' حارث نے گہری سانس لے کر کہا۔
''اوکے، بے وقوف ہی سہی۔ اب تم اسے فون کرنا بلکہ آج ہی کرنا۔''
''کوشش کروں گا......'' حارث نے کہا۔
''تمہارا موبائل بہت اچھا ہے، کریڈٹ بھی ہے...... آسانی سے کال مل جائے گی اس لیے یہ کوشش تم لازمی کر لینا۔'' ریحان نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔
حارث چپ ہی رہا۔
''یار... ابھی بتا دے کہ آج تم فون کرو گے یا نہیں؟''

''کہہ تو دیا کرلوں گا، تم میری جان کو کیوں آ رہے ہو۔''

''وہ اس لیے آ رہا ہوں کہ اس وقت تمہاری زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ ساجد ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ سارا کھڑاگ جلدی سے حل ہو جائے۔''

''او کے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

ندیم خان اپنے موبائل کی تلاش میں کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا، جھنجلا کر اس نے سائڈ دراز سے لفافہ اٹھا کر پھینکا تو کئی تصویریں نیچے گر گئیں اور جب اس نے تصویریں اٹھائیں تو ہر تصویر میں صبا رحیم اپنی فطری معصومیت کے ساتھ موجود تھی۔

''اوہ...... تم پہلے ہی آ چکی ہو اور میں ناواقف رہا اور تم جان بوجھ کر مجھ سے ایسا سلوک کرتی رہیں جیسے میرے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھیں۔''

''میری بات یاد رکھنا...... جو لڑکیاں اپنے آپ کو سیدھی سادی پوز کیا کرتی ہیں وہ حقیقت میں بے حد چالاک اور اچھی خاصی مکار بھی ہوا کرتی ہیں۔'' سبین آپا کے جملوں کی بازگشت اسے سنائی دے رہی تھی۔

''واقعی یہ لڑکی صبا ہے تو خاصی تیز و طرار سی...... جب ہی تو آفس کی ساری لڑکیاں اس سے خار کھاتی ہیں۔ اگر میں نے اسے دیر سے آنے پر ڈانٹ دیا تھا تو کیسے اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مجھے خود ہی معذرت تک کرنی پڑ گئی۔'' جوں، جوں وہ سوچ رہا تھا توں، توں اس کے غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''یہ صبا رحیم مجھے واقعی بے وقوف بنا رہی ہے...... کیسے ہنس، ہنس کر مجھ سے باتیں کرتی ہے، ایک فون کر دوں کہ آؤ کھانا ساتھ کھاتے ہیں تو فوراً آ جاتی ہے، آفس کے ساتھی اس کا مذاق اڑائیں تو ان کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیتی ہے۔ اچھا ہوا آپا نے اسے پہچان لیا...... ورنہ اگر اماں دوبارہ ان کے گھر چلی جاتیں تو میری وجہ سے ان کی کتنی ہتک ہوتی۔ شاید یہ لڑکی دوسروں کو گرا کر خوش ہوا کرتی ہے۔'' ندیم خان کے ذہن میں اس وقت یہی بات آئی تھی۔

''اور آج ان کے آفس جانے کا موڈ اس لیے ختم ہو گیا تھا کہ وہ جس لڑکی کو پسند کر بیٹھے تھے یہ وہی تھی جس نے ان کا رشتہ پہلے بھی منع کر دیا تھا...... ماں اور خالہ کی پسندیدگی کے باوجود بھی اس کی جانب سے واضح انکار تھا۔

ان کے یوں اچانک آفس نہ جانے پر آفس سے فون آ رہے تھے مگر وہ کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ اور بے وجہ کا غصہ ان کے طیش میں اضافہ کر رہا تھا۔

اور پھر اس دشمنِ جان کا فون بھی آ گیا۔

''سر آج آپ آفس کیوں نہیں آئے؟'' اس کے لہجے کی معصومیت بھی انہیں شاطرانہ سی لگی جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ تم میرے لیے ہو ہی کیا......؟

''میری مرضی، میں آفس آؤں یا نہیں آؤں......'' وہ نروٹھے پن سے بولے۔

''سر، آپ کو آج اس لیے آنا چاہیے تھا کہ آج آپ کو ٹی وی کے ایک ٹاک شو میں جانا تھا۔''

''تم میری جگہ حیدر کو بھیج دو۔''

''وہ وہاں جا کر سوائے مسکرانے کے پوز کے کچھ نہیں بول پائے گا۔''

''میری بلا سے......'' اس کی اختلافی بات بھی انہیں زہر لگ رہی تھی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......'' اس کو اس لہجے پر پریشانی تھی۔

''مجھے کیا ہونا تھا...... بالکل ٹھیک ہوں میں......''

''اللہ کرے آپ ہمیشہ ٹھیک ہی رہیں۔'' اس کا دعائیہ لہجہ بھی اسے تمسخرانہ سا لگ رہا تھا۔

''مس صبا اس وقت میں آرام کر رہا ہوں، آپ آفس میں بھی سب کو کہہ دیں کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے......'' اس کا لہجہ اتنا تناؤ بھرا تھا کہ کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے فون ہی منقطع کر دیا۔

''ہونہہ...... یہ لڑکی کس قدر چالاک سی ہے، اپنے آپ کو ایسا معصوم بنا کر رکھتی ہے جیسے اسے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہو۔ حالانکہ سب سے بڑی گھنّی تو یہ خود ہے۔''

اور ندیم خان جب اگلے دن آفس آیا تو اس نے صبا رحیم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی صرف گردن کے اشارے سے دیا۔ گو بات کچھ بھی نہیں تھی مگر وہ اندر ہی اندر اس سے سخت ناراض سا تھا۔

وہ پانچواں دن تھا، جب صبا رحیم نے اس سے پوچھا۔ ''سر کریلے قیمہ کھائیں گے آپ؟''

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

''اوکے سر، ویسے بھی آج وہ زیادہ اچھے نہیں بنے...... میں نے پہلی مرتبہ بنائے تھے ناں، امی کے ہاتھوں کا مزہ ان میں ہے ہی نہیں، جب مجھ کو ہی اچھے نہیں لگے تو آپ کو کیسے اچھے لگ سکتے ہیں۔'' وہ بلاتکان بولے چلی جا رہی تھی...... اور ندیم خان کو صرف اتنا یاد تھا کہ آج وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی تھی اور اس نے منع کر دیا تھا۔

''میں نے کیوں منع کر دیا......؟'' اس کے دل نے اس سے پوچھا۔

''تم نے اس لیے منع کیا...... کہ تم اپنی زندگی عزت کے ساتھ جینا چاہتے ہو، محبت کے بغیر زندگی بسر کی جا سکتی ہے مگر عزت کے بغیر نہیں۔ تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ تمہاری اتنی بے تکلفی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔''

اس کی وہ میٹنگ جس میں صبا کی بریفنگ اس کے لیے اہم ہو سکتی تھی اس نے فرزانہ کو اس کی جگہ بلا لیا...... اور فرزانہ کے لیے ایک عمدہ موقع تھا...... جس میں وہ صبا رحیم کو ڈی گریڈ کر سکتی تھی۔

''سر اب ویکلی میگزین کا معیار وہ نہیں رہا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔''

''میں سمجھا نہیں......'' وہ اس کا لب ولہجہ سمجھنے کے باوجود حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''سر میرا مطلب یہ ہے کہ اب صبا رحیم اتنی محنت نہیں کرتی ہیں جتنی کہ انہیں کرنی چاہیے۔''

''اچھا'' وہ لفظ چبا کر بولا۔

''سر آپ ہر ویک اتنا خوب صورت کالم ساحر کے نام سے لکھتے ہیں مگر انہوں نے میگزین کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی نیا سلسلہ شروع نہیں کیا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' پہلی مرتبہ صبا کے خلاف کچھ بولتے ہوئے اسے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔

''سر اگر آپ اجازت دیں تو میں معروف خواتین کے انٹرویو کا سلسلہ شروع کر دوں؟''

''کر دیجیے......'' وہ غیر ارادی طور پر بولا۔

''اور اگر صبا رحیم نے کوئی اعتراض کیا تو؟'' فرزانہ جملہ چھوڑ کر ندیم خان کو دیکھنے لگی جو کسی سوچ میں گم تھا۔

''وہ کیوں مداخلت کریں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''سر ان کو لیڈرانہ انداز میں رہنے کی عادت ہے۔''

''اوہ...... یہ بات ہے۔'' فرزانہ کی منفی باتیں سنتے ہوئے اس نے حیرت سے کہا۔

''سر اس کی وجہ آپ ہیں...... آپ نے ان کو خواہ مخواہ چڑھا دیا ہے اور جب سے وہ ٹی وی کے ٹاک شو میں شرکت کر کے آئی ہیں اپنے آپ کو طرم خان ہی سمجھنے لگی ہیں۔''

''آئندہ اب آپ شرکت کر لیجیے گا۔''

''ریئلی سر......''

''جی ہاں، یہ مواقع سب کو ملنے چاہئیں۔''

''تھینک یو سر......'' فرزانہ شاداں و فرحاں سی آفس سے باہر نکل آئی۔ ندیم خان کی شہہ پا کر تو اس کے انداز ہی بدل گئے تھے۔ صبا نے اسے کسی کام سے پکارا تو جواب دینے کے بجائے ان سنی کرتے ہوئے وہ اپنے کیبن میں چلی گئی۔

آفس میں سیاستیں ہوا کرتی ہیں مگر اس آفس میں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ فرزانہ اب اپنے ساتھیوں کو اپنے دل کی باتیں ندیم خان کے کندھے پر رکھ کر سنا رہی تھی۔ ایسے انداز میں تو وہ ہمیشہ کی ماہر بھی تھی۔

''ندیم سر کہہ رہے تھے، خواتین کے انٹرویوز کا تو بیڑا غرق ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر انٹرویو میں ایک جیسے سوالات پڑھ کر مزہ ہی نہیں آرہا۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ اب انٹرویو کرنے والے کو یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ آپ کی تعلیم، آپ کی کوششیں، آپ کی محنت، آپ کے کارنامے کیا تھے اور کیوں تھے؟'' ناعمہ نے اس کی لن ترانی سن کر ہنس کر کہا کہ وہ بھی کسی کی دل سے دوست نہیں تھی۔

''ضرور پوچھنے چاہئیں مگر انداز جدا ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے ہاں تو ہر ہفتے دال چاول ایک ہی طرح سے پکائے جا رہے ہیں تو کب تک کوئی کھائے گا، ابکائی تو آئے گی ہی ناں......'' فرزانہ اب اترا، اترا کر بول رہی تھی۔ آخر اسے صبا کو گرانا تو تھا۔

''ٹھیک ہے، اب کوئی دوسرا فرد اپنے طریقے سے دال چاول بنا لے......رہیں گے تو وہی دال، چاول بریانی کا ذائقہ تو آنے سے رہا۔'' ناعمہ نے ہنس کر کہا مگر دل میں اس کے بھی یہ جلن تھی کہ انٹرویو کا یہ سلسلہ فرزانہ کو کیوں دے دیا گیا جب کہ وہ اس سے جونیئر بھی تھی۔

☆☆☆

ندیم خان آفس میں بے حد مصروف تھے......ان کے پاس کسی سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی......اس کا مجھے احساس تھا اور ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوا کرتا ہے کہ وہ کسی کو کیا اپنے آپ کو بھی وقت نہیں دے پاتا۔ اس لیے ان کی ناراضی کا مجھے احساس تک نہیں ہوا تھا۔ کام کرتے ہوئے میں بھی ایسی ہی ہو جاتی تھی اس لیے مجھے ندیم خان کی مصروفیت پر کوئی تعجب بھی نہیں تھا۔ بلکہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ آفس کی جانب سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر...... انہیں پریشان نہ کیا جائے۔

اور جب فرزانہ نے کہا......اب خواتین کے انٹرویوز وہ خود کرنا چاہتی ہے اور اس کے لیے ندیم خان نے اسے اجازت بھی دے دی ہے تو میرے دل میں ندیم خان کے لیے تشکر کا احساس ابھر آیا کہ انہیں واقعی اب احساس ہو گیا تھا کہ میں آؤٹ ڈورز کی وجہ سے بے حد تھک جاتی ہوں اور جب میں نے انہیں تھینکس کا میسج بھیجا تو فوراً ہی جواب آیا۔

''کس چیز کا شکریہ ادا کر رہی ہیں آپ؟''

''آپ نے فرزانہ کو انٹرویوز کے لیے جو سلیکٹ کر لیا ہے اور مجھے یہ اچھا لگا۔''

''مگر میں نے آفس کے اچھے کے لیے کیا ہے۔'' ندیم خان نے لکھا۔

''جی میں جانتی ہوں۔'' میں نے رپلائی دیا۔

اور ندیم خان کھول کر رہ گیا۔

''ہاں، یہ سب کچھ تو یہ محترمہ ہی جانتی ہیں۔ لاعلم تو میں تھا اور وہ جان بوجھ کر مجھ سے کھیلتی رہی۔'' وہ سوچ رہا

تھا اور اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا...... کہ کس قدر چالاک تھی یہ لڑکی...... اور وہ اسے معصوم سمجھتا رہا تھا۔

اور ایک دن جب وہ آسمانی سوٹ پر نیلا شیفون کا اسکارف لیے اس کے آفس میں داخل ہوئی تو یکبارگی ندیم خان اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کیسا نور سا پھیلا ہوا تھا، کشادہ پیشانی اسکارف کے ہالے میں چمکتی سی نظر آ رہی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

''واؤ......'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''یہ اسکارف کتنا اچھا ہے ناں......'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکلا...... حالانکہ وہ کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ تم کتنی اچھی لگ رہی ہو۔

''سوری سر...... اب میں آپ کا یا آپ کے دوست کا شکریہ تو ادا نہیں کر سکتی کہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ یہ سارے اسکارف مجھے میری خالہ نے دیے ہیں۔'' وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

اور پھر ایک دفعہ...... اس کا آفس میں آ کر یہ کہنا۔

''سر، کیا میں ایک گھنٹے لیے گھر جا سکتی ہوں؟ بس یوں گئی اور یوں آئی۔'' اس کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے چٹکی بجا کر کہا۔ جیسے اسے یقین تھا کہ وہ اس کو نہیں روکے گا۔

''خیریت تو ہے ناں......؟'' اس کا قدرے پریشان چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔

''میری فرح خالہ ہیں ناں ان کی کوئی سہیلی ہمارے ہاں ٹپک پڑی ہیں اور خالہ چاہتی ہیں کہ میں ان سے ضرور ملوں...... حالانکہ مجھے ان کی دوست اور ان کی باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔''

''کوئی خاص مہمان آئے ہیں کیا؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر قدرے ذومعنی لہجے میں پوچھا۔

''نو سر...... مہمان تو بس مہمان ہوتے ہیں۔''

''مگر بعض مہمان تو خاص الخاص بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے باور کرایا۔

''مگر میرے لیے تو وہ بے حد عام سے ہیں۔''

''تو پھر جانا کیوں ضروری ہے۔''

''صرف خالہ کی وجہ سے کہ وہ برا مان جائیں گی...... جبکہ مجھے ان کی یہ پگلوسی سہیلی کبھی پسند بھی نہیں رہیں۔ اتنا بولتی ہیں، اتنا بولتی ہیں کہ میرا سر گھوم جاتا ہے اور پھر اتنی تفصیل سے بات کرنے کی عادت ہے توبہ......''

''بری بات...... ایسا نہیں کہتے......'' اس نے سرزنش کی۔

''تو چلی جاؤں میں؟'' اس نے اپنی گاڑی کی چابی انگلی پر گھماتے ہوئے پوچھا۔

''جی، ضرور...... مگر جلدی آیئے گا آج میگزین کی کاپی پریس میں جائے گی۔''

''بس منہ دکھانے جا رہی ہوں، ابھی آئی میں......'' وہ بائیں ہاتھ سے بال برابر کر کے اسکارف کو صحیح کرتی ہوئی سرعت سے نکل گئی۔

اور وہ انجان ہی رہا کہ وہاں سے آ کر وہ کتنی خوش تھی...... شاید وہ اپنے مہمانوں کے منہ توڑ کر خوش ہوا کرتی تھی...... یا اپنے لیے آنے والے رشتوں کو ٹھوکر مارنے میں اسے لطف آیا کرتا تھا...... اس طرح کی حرکتیں کرنے والیوں کی کمی تھوڑی ہے۔

اور پھر...... وہ واقعی بہت جلد ہی آ گئی تھی۔

''ارے، کیا تم دروازہ چھونے کے لیے گھر گئی تھیں......؟'' اس کو اتنا جلدی آتا دیکھ کر وہ بولا تھا۔

''میرا بس چلتا تو اس سے بھی جلدی آ جاتی......'' وہ کھلکھلائی۔

''کیوں.....؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کھلی پڑ رہی تھی۔ اور بڑی بے پروائی سے اسے سنا رہی تھی۔

''خالہ کی دوست سے جب میں نے بات کی.....تو وہ زیادہ دیر کی ہی نہیں.....وہ جو ایک ہفتے سے فون کر کر کے میری الٹی سیدھی تعریفوں میں میرا وقت ضائع کر رہی تھیں.....وہ اچانک ہی میری تعریفیں کرنا بھول گئیں.....اور اپنا بیگ اٹھا کر انہیں اپنے بہت سے کام یاد آگئے۔''

''ارے واہ.....'' وہ اس کے ہنستے، چہرے پر دراز پلکوں کے اٹھنے اور گرنے کو دیکھنے میں ہی محو تھا.....اسے اس کی خالہ یا ان کی باتوں سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔

''اور پھر فرح خالہ کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں صبو اس سے کہیں بہتر تھا کہ تم نہ آتیں.....'' وہ رک کر پھر ہنسنے لگی۔

''ایسا کیوں کہا؟'' وہ قدرے سنبھل کر بولا.....اور سوچنے لگا کہ وہ بولتے ہوئے زیادہ خوب صورت لگتی ہے یا ہنستے ہوئے.....ہونٹوں کے ساتھ اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں کی خوب صورتی کس قدر بڑھ جاتی تھی جس کا کہ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

''سر ہماری فرح خالہ کی پرانی سہیلیاں مجھے تو کچھ، کچھ سائیکی بھی لگا کرتی ہیں.....ایک ہی بات کو دس دفعہ کرنے کی عادی ہیں.....ارے بھئی ایک بات کو بار، بار کرنے سے کوئی بات کی آبرو تو نہیں بڑھ جائے گی ناں اور شاید میں ان کے حساب سے باتیں کرنا بھی نہیں جانتی۔''

''اچھا..... یہ بات تھی.....'' وہ بنا جانے.....اب اس کے اسکارف سے نکلتی ان باغی لٹوں کو دیکھ رہا تھا.....جو اس کی کشادہ پیشانی پر آنے کے لیے بے قرار تھیں۔

''سچی میں سر.....آج مجھے فرح خالہ نے اتنا ڈانٹا.....اتنا ڈانٹا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔''

''کیوں ڈانٹا، کوئی وجہ تو ہوگی.....؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''نو سر، کوئی بات ہی نہیں تھی.....میں نے بھی کہہ دیا کہ میں آفس سے آجاؤں تو آپ دل بھر کر اپنا غصہ نکال لیجیے گا۔''

''عجیب بات ہے، کوئی ایسے بھی کیا کرتا ہے۔''

''آپ فرح خالہ سے ملے نہیں ہیں ناں.....ایک دفعہ مل لیں ان سے آپ.....تو پھر آپ کو بھی پتا چل جائے گا.....''

''حیرت ہے۔'' اب وہ مسکراتے ہوئے اسے بولتے ہوئے سن رہا تھا۔

''ہمارے ہاں بے بات کا غصہ ہوتا ہے، حالانکہ کسی ٹی وی ہوسٹ کی فیملی سے بھی تعلق دور، دور نہیں ہے۔''

''اچھا.....'' وہ لفظ کو چبا کر بول رہا تھا۔

''کوئی نیا آنے والا تو واقعی حیران تو کیا پریشان ہو جائے۔ جیسے ہمارے ہاں بے بات کی ناراضی ہوا کرتی ہے۔'' اب وہ خاموش تھا.....اور وہ اپنے پرس کی زپ کو کھول کر اندر کچھ ڈھونڈتے ہوئے بولے چلی جا رہی تھی۔

''جیسے کہتے ہیں ناں کہ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے.....بس اسی ٹائپ کی ہمارے ہاں صورتِ حال ہوا کرتی ہے۔''

اب اس کی باتیں سوچتے ہوئے وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ اگر میں صبا رحیم سے ناراض ہوں تو بے بات نہیں ہوں۔

''اور یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتی ہے مگر کہاں جانتی ہے؟'' اس کے دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔

''وہ تو شاید مجھے جان ہی نہیں سکی......'' دل میں ملال کا گراف پھر اوپر جانے لگا اور نہ ہی اسے اس بات کا اندازہ ہوا...... کہ وہ اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی۔

''ہونہہ...... اگر وہ مجھے نہیں جانتی تو وہ جان جائے گی بلکہ اسے جان جانا چاہیے کہ میں اس سے کبھی متاثر ہوا ہی نہیں......'' اس نے جیسے اپنے آپ کو بھی اس کے خلاف اکسانے کی سعی کی۔

''آخر...... وہ ہے کیا چیز......؟ اس قدر اتراتا ناکہ اپنے آگے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی اور مجھ جیسا ذہین و فطین شخص ایسا بے وقوف ثابت ہوا کہ جس نے مجھے ریجکٹ کیا...... میں اس کی ہمراہی کے خواب تک دیکھنے لگا۔ میری لاتعلقی کی بھی یہ حد تھی...... مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ میرے گھر والے میری شادی کے لیے کہاں، کہاں گھوم رہے ہیں...... اور کن الٹی سیدھی لڑکیوں کو پسند کررہے ہیں......'' وہ واقعی ان چکروں میں کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

''ہاں، اب مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی ہے کہ اس لڑکی نے اپنے گھر بلانے کے بعد میری ماں اور بہن کو واپس کیا تھا...... اور مجھے پہچان کر بھی یوں انجان بنی رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ جس طرح وہ اپنی خالہ کی سہیلیوں کے لائے گئے پروپوزل منع کرتے ہوئے ہنستی ہے...... ویسا ہی سلوک اس نے میری ماں اور بہن کے ساتھ کیا تھا...... مگر...... یہ بات میں کبھی اسے بتاؤں گا نہیں...... کہ تم مجھے اچھی لگی تھیں۔ اگر کبھی بتادی تو...... پھر کیا ہوگا......'' پھر اس کے دل نے اس سے پوچھا۔

''اب وہ اتنی اچھی بھی نہیں ہے کہ اسے ہر، ہر بات بتادی جائے۔'' اس کے دماغ نے تاویل دی۔

''مگر وہ اچھی ہے...... بلکہ بہت اچھی ہے۔'' دل اپنی ہٹ پر قائم تھا اور دماغ بے بس......

''نہیں ہے اچھی وہ...... بے حد بری ہے، بہت بری۔'' اس نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

''ہاں بالکل...... دل کی جگہ سینے میں ہوتی ہے کہ وہیں قید رہے...... اب دل کو میں اپنے سر پر تو بٹھانے سے رہا......'' اس کا دماغ اسے نت نئی تاویلیں دے رہا تھا۔ اور وہ بے بسی سے سر بھی ہلائے جارہا تھا۔ اور جب اس کا دل اس کے دماغ پر حاوی ہوگیا تو وہ یہ سوچ رہا تھا۔ ایک نظم...... ''شاید کسی نے یہ میرے لیے ہی لکھی تھی۔''

ترکِ تعلق کے بعد بھی
ہر لمحہ میرے ساتھ ہو
خواب میں، میری آنکھ میں
جاگتے، خیال میں
ہر موڑ پر، ہر گام پر
نشانِ سنگ میل پر
ہر جگہ میرے ساتھ ہو
ہنسی کی مدھم لے میں
آنکھوں میں آئے اشک میں
بوندوں کے اس حباب میں
قوسِ قزح کے رنگ میں
انوکھے سے اک احساس میں
ترکِ تعلق کے بعد بھی

☆☆☆

ہر کام شاید ہر ایک کے لیے نہیں ہوتا یا...... وہ اس کام کو کرنے کا اپنے آپ کو اہل ہی نہیں پا رہا تھا۔ آج تین دن ہو گئے تھے اور وہ شہلا کو فون نہیں کر سکا تھا۔ گو وہ ریحان سے وعدہ کر کے آیا تھا...... کہ وہ اسے فون کر کے... یہ آسانی اپنا ہمنوا بنا سکتا ہے۔ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام نہیں کر پا رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے اس کے دوست کا فون پھر آیا تھا اور وہ بڑی شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں بتایا نہیں تم نے...... کہ اس بے وقوف نے کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں''۔

''کیوں۔ مارے خوشی کے گونگی ہو گئی کیا وہ......؟''

''خوشی میں کیا گونگے بھی ہو سکتے ہیں......'' الجھ کر اس نے پوچھا۔

''ہاں سنا تو یہی ہے کہ مارے خوشی کے سکتہ سا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے تمہاری بے وقوف کو بھی ایسا ہی کوئی عارضہ ہو گیا ہو۔''

''نہیں بھئی، ابھی میں نے اسے فون ہی نہیں کیا۔''

''تو کیا اس کو ڈیٹ پر لے جا کر بات کرو گے......'' ریحان ہنسا۔

''پاگل ہوں ناں...... جو اس کو ڈیٹ پر لے کر جاؤں گا۔''

''تو بات کب کرو گے؟''

''کر لوں گا...... یار......'' اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

''ٹھیک ہے سال، چھ ماہ کے بعد جب بات ہو جائے تو بتا دینا......'' یہ کہہ کر ریحان نے فون ہی منقطع کر دیا تھا۔

اور اب پھر اس کے ذہن میں ریحان کی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

''دیکھو...... ساجد سے اصل وجہ معلوم ہو گئی تو بات کی تہ تک پہنچ جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں چٹکی بجاتے میں تمہاری پریشانی رفع کر دوں گا۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہے کہ ہمیں اس کی اس کمزوری کا پتا چل گیا کہ اس کے پروڈکشن ہاؤس میں جتنی بھی لڑکیاں کام کرتی ہیں وہ سب براؤن آنکھوں اور بالوں والیاں ہیں۔''

''مگر یہ ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ایسے حسین اتفاق میرے ساتھ تو کبھی نہیں ہوئے۔'' ریحان نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

''ہو سکتا ہے براؤن کلر اس کا پسندیدہ ہو...... اور وہ یہ رنگ ہر طرف اپنے آس پاس دیکھنا چاہتا ہو...... اور ہر وقت دیکھنا چاہتا ہو۔'' حارث نے بے پروائی سے کہا۔

''سنو، بلیو کلر میرا پسندیدہ ہے...... میرے پاس صرف دو نیلی قمیصیں ہیں اور میرے بیڈ روم کے پردے بھی وائٹ کلر کے ہیں کہ گرمیوں میں مجھ سے گہرے رنگ برداشت ہی نہیں ہوتے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ وہ سو فی صد پاگل شخص ہے۔ اور کسی پاگل کو راہ راست پر لانے کے لیے پاگل بننا ضروری نہیں ہے۔''

''تم سے کون پاگل بننے کو کہہ رہا ہے۔'' ریحان بھی چڑھ کر آیا تھا۔

''مگر میں اس ذلیل شخص سے سچ اگلوانے کے لیے بطور چارہ کسی بھی لڑکی کو استعمال نہیں کر سکتا۔ کل کلاں کو کسی لڑکی کو میری وجہ سے نقصان پہنچ جائے اور میں خود اپنے آپ سے بھی آنکھیں ملانے کے قابل نہ رہوں۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے ہم کسی لڑکی کو بطور چارہ استعمال کریں گے؟''
''مگر تمہاری بات کا مطلب یہی ہے۔''
''حارث اگر تم سنجیدگی سے سوچو تو شہلا اگر ساجد کے ہاں عارضی طور پر جاب کرلے تو وہ ہمیں اس کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کرسکتی ہے۔''
''مگر یار...... وہ کیوں کرے گی وہاں جاب......؟ وہ اسکول میں جاب کرنے والی ایک سیدھی سادی، بے وقوف سی لڑکی ہے، وہ کیوں کسی پروڈکشن ہاؤس میں جاب کرنے کی خواہاں ہوگی۔''
''اگر میں شہلا کو اپنی کمپنی میں جاب دے دوں تو پھر تو وہ یہ کام کرے گی ناں......'' ریحان نے کچھ سوچ کر کہا۔
''مگر تم اسے کیوں جاب دوگے؟ تمہارے ہاں کیا ہُن برس رہا ہے۔''
''یار...... دوستی کی خاطر...... اسے بیس سے پچیس ہزار تک کی جاب دے ہی سکتا ہوں۔''
''مگر وہ کیوں کرے گی جاب...... اس کا تم سے تعلق ہی کیا ہے؟ اس نے تو تم سے فون پر بات نہیں کی، تمہاری جاب کیوں قبول کرے گی۔''
''ہاں...... یہ بات تو تمہاری سوفی صد درست ہے کہ وہ میرے ہاں کیوں جاب کرے گی۔''
''اس پر یہ دعویٰ ہے کہ آپ بہت عقل مند ہیں۔'' حارث نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''اپنی رائے بعد میں دینا...... ابھی میری بات مکمل ہونے دو......''
''چلو جلدی بکو......'' وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔
''میرے ہاں جاب کرنے کے لیے تم شہلا کو آمادہ کروگے...... تم سے فون کرنے کو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم اسے اپنی باتوں سے میرے ہاں جاب کرنے کے لیے تیار کرو۔'' ریحان نے اسے سمجھایا۔
''میں اسے آمادہ کروں......؟''
''ہاں...... تم......''
''میں جو اسے بے شمار مرتبہ ڈانٹ چکا ہوں، میں اسے کیسے آمادہ کرسکتا ہوں؟''
''اب تم اس سے محبت کروگے...... ایسی ہی محبت جیسی وہ تم سے کرتی ہے۔''
''ایک لڑکی جو مجھے کسی بھی لحاظ سے پسند نہیں ہے، میں اس سے محبت کیسے کرسکتا ہوں؟''
''میں نے کہا ہے ناں...... تم اس سے محبت بلکہ شدید محبت کروگے......'' ریحان اپنی بات پر قائم تھا اور انداز ایسا تھا جیسے آج اسے سمجھا کر ہی دم لے گا۔
''چلو مان لیا کہ میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس سے جھوٹی محبت کا اگر ناٹک بھی رچالوں تو وہ لڑکی تو اسے سچ ہی سمجھ رہی ہوگی۔''
''ہاں، اسے سچ ہی سمجھنا چاہیے...... جب ہی تو ہماری دال گلے گی۔''
''مگر...... پھر تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے اصرار کرے گی...... اور اگر میں منع کروں گا تو وہ ناراض ہوجائے گی۔''
شادی تو تم بھی کروگے ہی ناں...... تو اچھا ہے اسی سے کرلینا بقول تمہارے وہ خوب صورت ترین لڑکی ہے۔''
''میں اب شہلا سے شادی کروں گا......؟'' وہ پھر مجھے سے اکھڑا۔
''ہاں یار کرلینا...... لوگ یہی کہتے ہیں کہ شادی اسی سے کرنی چاہیے...... جو ہم سے محبت کرتا ہو...... ایک پنتھ

دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔''

''اُف...... ایسی بے وقوف لڑکی سے شادی کرنا تو کیا...... میں شادی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی...... زندگی میں بہت سے نقصانات ہوا کرتے ہیں تو تم بھی اس اپنے نقصان کو بھول جاؤ...... دنیا میں برے لوگ نقصان ہی پہنچایا کرتے ہیں۔'' اور یہ اس کا اپنا پن تھا کہ اس کے باوجود بھی وہ روزانہ فون کر کے اسے آمادہ کر رہا تھا کہ اسے شہلا کو فون ضرور کرنا چاہیے۔

اور آج تین دن ہو گئے تھے...... اس نے اپنے اندر یہ ہمت نہیں پائی تھی کہ اس سے کوئی بات کرے۔

اس وقت بھی...... وہ بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

''ہونہہ...... یہ وقت قطعی مناسب نہیں ہے، کسی لڑکی کو فون کیا جائے۔''

اس کے موبائل پر بپ ہوئی تو غیر ارادی طور پر نمبر دیکھے بغیر اس نے اٹھایا اور عادتاً سلام کیا۔

''اللہ کا شکر...... آج آپ نے اپنا موبائل تو اٹھایا۔'' دوسری جانب شہلا تھی۔

''کیا اس سے قبل بھی آپ نے مجھے فون کیا تھا......؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ آپ کو چھٹی مرتبہ کال ملا رہی تھی...... میں تو آپ کو روز فون کر رہی تھی...... مگر آپ پتا نہیں میری کال ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔''

''دراصل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی...... اور میں نے اپنے موبائل کا کال رجسٹر بھی چیک نہیں کیا۔'' اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''ہائے اللہ...... آپ کی طبیعت خراب ہے اور میں آپ کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کرتی رہی......'' اس کے لہجے میں جیسے پریشانی بھری تھی۔

''اب ٹھیک ہوں میں......'' اس کی پریشانی جان کر اسے عجیب سا لگا۔

''میری بہن راحیلہ نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا...... مگر وہ آپ کی بہت تعریف کر رہی تھی۔''

''کیوں تعریف کر رہی تھی......؟'' اسے ایسے جملے بھی پسند نہیں تھے...... تو وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''وہ اس لیے تعریف کر رہی تھی کہ اسے میری تعریف کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے کہا آپا...... آپ نے کیا شاندار ہیرو چوز کیا ہے کیا پرسنالٹی ہے...... کیسی مخمور آواز ہے اور آپ جتنا لمبا لڑکا تو ہمارے پورے خاندان میں نہیں ہے۔ کریم جو راحیلہ کا شوہر ہے جو اپنے آپ کو ہیرو بھی بہت سمجھتا ہے جس کا رشتہ منع کرنے پر وہ میرا ابھی تک دشمن بھی بنا ہوا ہے...... وہ بھی آپ کے آگے کچھ نہیں...... بلکہ کچھ بھی نہیں......'' شہلا ایک ہی سانس میں رکے بغیر بولتی چلی گئی۔ وہ جو تہذیب و شائستگی کا مرقع تھا جو بے تکلفی کو بھی بدتمیزی کے زمرے میں لاتا تھا...... وہ شہلا کی یہ سب کتھا سن کر چپ سا ہو گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے، اس نے اس کی بھی رائے مانگ لی۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''حارث، یہ میری شدید خواہش ہے کہ کسی دن آپ ہمارے گھر آئیں...... تا کہ میں اپنی امی کو آپ سے ملواؤں......''

''اگر میں آپ کے گھر آیا تو کیا کہہ کر اپنا تعارف کرواؤں گا؟'' وہ واقعی پریشان لہجے میں بول رہا تھا۔

''ارے، آپ کو اپنا تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''وہ کیوں بھئی......؟''

''اس لیے کہ ہماری امی آپ سے واقف ہیں...... بلکہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ صرف آپ کی محبت کی وجہ سے میں نے کریم کے رشتے سے انکار کیا تھا۔''

''پھر تو مجھے اتنی جلدی نہیں آنا چاہیے...... خواہ مخواہ وہ مجھے دیکھ کر ناراض بھی ہو سکتی ہیں۔''

''نہیں ہوں گی ناراض، تو کون سی وہ میری سگی ماں ہیں...... بے شک میری شادی ساری زندگی نہ ہو انہیں کیا پروا......؟ سوتیلی ماں تو سوتیلی ماں ہی ہوتی ہے مگر میری سوتیلی بہن، میرے لیے سگی بہن سے زیادہ ہے اور وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔''

''ابھی پہلا فون کیا ہے اس لڑکی نے اور یہ لڑکی محبت سے پہلے شادی کی باتیں کر رہی ہے۔'' حارث دل میں پریشان سا ہو گیا۔

''شہلا...... اب کل فون پر بات کریں گے، اس وقت میرے دوست کی کال آ رہی ہے...... شاید وہ میرے پاس آنا چاہ رہا ہے۔'' حارث نے بات بنائی۔

''آپ کی تو طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، اتنی رات کو کوئی دوست آ جائے گا تو خواہ مخواہ آپ تھکیں گے۔ کریں کہ اسے ٹال دیں... کہ کل دن میں آنا۔''

''یہ ٹالنے کا فن مجھے نہیں آتا...... اس لیے اب آج تو میں اس کی باتیں لازمی سنوں گا۔''

''ٹھیک ہے، اب کل بات ہو گی...... مگر پلیز اپنا بہت خیال رکھیے گا...... ابھی میں چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر آپ کی پیشانی پر دم کر دوں گی تو دیکھیے گا آپ کی طبیعت کتنی جلدی ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ میرا آزمایا ہوا......''

''اچھا شہلا اللہ حافظ......'' اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے جملہ ادا کرتے ہی فون نہ صرف منقطع کر دیا بلکہ اسے سوئچ آف بھی کر دیا کہ کہیں وہ دوبارہ اس سے محبت جتانے کے لیے کچھ اور کہانیاں نہ سنانا شروع کر دے۔

''اُف یہ لڑکی کتنا بولتی ہے اور وہ بھی انٹ شنٹ...... جو منہ میں آیا بغیر سوچے سمجھے بولی چلی گئی۔ اُف کیسی ہے یہ لڑکی۔'' اب وہ یہ سوال اپنے آپ سے کر رہا تھا۔

اور خود سے کچھ جواب نہ پا کر...... اب وہ چپ چاپ بیٹھا تھا...... اس سے اسے ایسا کچھ لگ رہا تھا جیسے یہ سب...... بہت غلط ہو رہا ہو، بے حد غلط......

☆☆☆

ہاں سر ندیم جیسا عزت دینے والا باس آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لہجہ اتنا نرم، جیسے مکھن میں گھلا ہو اور شیرے سے اٹھا ہو مگر کچھ دنوں سے کام کی زیادتی کے سبب ان کی تھکن ان کے لہجے پر بھی آ گئی تھی۔ اب وہ اس انداز میں بات نہیں کر رہے تھے...... جیسے پہلے بولا کرتے تھے۔

بگ باس نے بتایا تھا...... میرے کالم کی وجہ سے اخبار کے آفس میں دھمکی آمیز فونز بھی آ رہے تھے...... سر ندیم کے کہنے پر میں جن لوگوں پر قلم اٹھا رہی تھی...... وہ اس کو ختم یا بند کروانے کے لیے شرمناک حرکتیں کر رہے تھے۔

''سر آپ کہیں تو میں قلم کو ہولا رکھوں......'' میں نہیں چاہتی تھی کہ سر ندیم یا بگ باس پر کوئی آنچ آئے کہ لوگ ساحر کی شناخت میں سر ندیم کی شخصیت کو پہچان رہے تھے۔

''اخبار والے کبھی ڈر کر کام نہیں کرتے۔'' سر ندیم نے قدرے غصے سے کہا۔

''مگر ہمارا اخبار جمعہ، جمعہ آٹھ دن کا ہے...... اس کی بساط ہی کیا ہے۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''مس صبا...... آج تو آپ نے یہ بات کہہ دی ہے مگر آئندہ یہ نہیں سنوں گا۔'' سر ندیم کو اچھا خاصا غصہ آ گیا۔
''او کے سر۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔
''اب آپ جا سکتی ہیں......'' وہ بولے۔
''جی......!'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا...... اس انداز میں تو انہوں نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی مگر وہ بے حد مضطرب سے تھے...... نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
''شاید، سر واقعی بہت پریشان ہیں، پیون بتا رہا تھا ہمارے اخبار کو تھریٹ بھی دی جا رہی ہے، اس کی گپّوں کی سچائی مجھے اس لمحے نظر آئی یقیناً کوئی ایسی بات ضرور ہے جس سے سر ندیم خان بہت پریشان ہیں۔''

☆☆☆

پورے دس دن ہو گئے تھے...... آفس کے ضروری امور کی باتوں کے سوا ندیم خان نے صبا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا اندازہ سب سے زیادہ فرزانہ کو ہو رہا تھا۔
''صبا تمہارا اس اخبار میں دل نہیں لگ رہا تھا ناں......؟'' ایک دن فرزانہ نے پوچھا۔
''ہاں، پہلے تو واقعی نہیں لگ رہا تھا۔''
''تو اب کیا ایسی تبدیلی آ گئی ہے۔ وہی اخبار ہے وہی ورکرز ہیں...... تھوڑی بہت اشاعت بڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک بری چیز اچھی لگنے لگے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم کسی اچھے سے پروڈکشن ہاؤس میں چلی جاؤ۔''
''اب مجھے یہ اخبار واقعی برا نہیں لگ رہا......'' میں نے سچائی سے کہا۔
''اس کی کوئی تو وجہ ہوگی ناں......؟''
''وجہ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی...... مگر اب میں واقعی یہاں سے نہیں جانا چاہتی......'' میرا لہجہ وثوق بھرا تھا۔
''یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کس کے لیے تم یہاں ٹھہرنا چاہتی ہو؟'' اب فرزانہ کا جملہ کسی کوڑے کی طرح میری کمر پر پڑا تھا۔
''اپنے لیے اور کس کے لیے......؟ یہ جاب میں نے اپنے لیے کی ہے، مجھے اچھا لگ رہا ہے تو میں یہاں کام کروں گی اور اچھا نہیں لگے گا تو کام نہیں کروں گی۔''
''اچھا، میں تو سمجھ رہی تھی کہ تمہیں ندیم خان سے عشق ہو گیا ہے...... ان کی وجہ سے یہاں رہنا چاہتی ہو۔''
''اسٹاپ اٹ...... آئندہ ایسے جملے اپنے ذہن میں بھی مت لانا......'' میں نے بپھر کر کہا۔
''کیوں، کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''
''سر کو پتا چلے گا...... تو انہیں کس قدر افسوس ہوگا کہ یہاں ہم کام کرنے آئے ہیں یا عشق بگھارنے......''
''یہ کام ساتھ، ساتھ بھی تو کیے جاتے ہیں......'' وہ ہنسی فرزانہ خاصی منہ پھٹ تھی جیسا محسوس کرتی تھی اسے کہہ دینے میں دیر نہیں لگایا کرتی تھی۔
''مگر میں یہاں صرف کام کرنے آئی ہوں صرف کام......''
''تو تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' فرزانہ نے تمسخر سے کہا۔
''تم تو ہمیشہ کی ہو۔ آج کیا اکثر باتوں پر جھوٹ کا بگھار لگایا کرتی ہو۔'' میں نے خاصا کلس کر کہا تھا۔
جسے سن کر فرزانہ منہ بناتی ہوئی ساجد کے کیبن میں چلی گئی تھی کہ اس بیچارے نے تو اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی ہی۔

☆☆☆

شہلا سے فون پر بات کیے اسے آج چار روز ہو گئے تھے مگر وعدے کے باوجود اس نے اسے کال نہیں کی تھی۔
ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔
اگر اس نے شہلا سے باتیں کرنی شروع کر دیں تو پتا نہیں کیا ہو جائے۔
ایک بے وقوف سی لڑکی...... کو جھوٹے خواب دکھانا...... کوئی اچھی بات تھی کیا؟ اور ریحان یہ چاہتا تھا کہ وہ اسے باتوں ہی باتوں میں ...... ریحان کی کمپنی میں جاب کے لیے تیار کرے...... تب ایک دن اس نے ریحان سے کہا۔
''یار...... میں نے جب فراڈ نہیں کیا تھا تو خواہ مخواہ پھنس گیا اور جب میں فراڈی باتوں سے کسی لڑکی سے غلط کام لوں گا تو میرا کیا حشر ہو گا۔''
''کچھ نہیں ہو گا تمہارے ساتھ، وقت پر تو لوگ نہ جانے کس، کس کو بھی اپنا باپ بنا لیا کرتے ہیں۔'' ریحان اب اس سے ہنستے ہوئے نہ جانے اور کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔
اس قسم کے محاروں کا بے جا استعمال کرنا شاید اسے خوب آتا تھا...... اور اب وہ گدھوں کی اہمیت پر بلا تکان بولے چلا جا رہا تھا۔
''یار...... اگر یہ سب باتیں کرنے کے بعد میں اسے یہ بھی بتا دوں کہ میں تم سے اس لیے جھوٹ بول رہا ہوں کہ ہم ایک اصلی مجرم کو پکڑنا چاہ رہے ہیں...... ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے...... اور یہ سب ہم صرف اسی لیے......''
''ابے گھامڑ...... اگر تم نے ایسا کچھ اس لڑکی کو بتا دیا تو وہ ہرگز تمہاری بات نہیں مانے گی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔
''وہ صرف بے وقوف ہے، بے وقوف ترین نہیں ہے۔'' ریحان کا لہجہ اب پریشان کن تھا۔
''تو پھر میں اسے یہ سب سچی باتیں بھلا کب بتاؤں گا۔'' وہ کسی معصوم بچے کی طرح اس سے پوچھ رہا تھا۔
''جب تمہارا کام ہو جائے تو تم بے شک الف سے یے تک پوری داستانِ امیر حمزہ اسے سنا دینا...... کہ یہ مسئلہ آ گیا تھا تو اس لیے ایسا کرنا پڑا۔''
''تو کیا وہ یہ سب سن کر ناراض نہیں ہو گی ہم؟''
''ناراض کیوں ہو گی۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ محبت کرنے والے بنا کسی غرض کے محبت کرتے ہیں وہ تو خوش ہو گی کہ اس کی وجہ سے اس کے محبوب کے چہرے پر لگا دھبا صاف ہو گیا۔''
''اچھا ایسا ہو گا؟''
''ہاں، یار...... بالکل ایسا......''
''اور وہ...... جو پہلے ہی فون پر اپنی شادی کی...... باتیں کر رہی تھی تو اس بارے میں اسے کیونکر روکوں گا؟''
''تم کہہ دینا میری امی آج کی بہوؤں سے بہت خوف زدہ ہیں، اس لیے وہ میری شادی نہیں کریں گی۔''
''یار بکواس مت کر۔''
''اچھا تو پھر یہ کہہ دینا۔ مجھے خوب صورت لڑکیاں پسند نہیں ہیں...... کوئی معمولی شکل صورت کی لڑکی جب بھی ملی تب شادی کر لوں گا...... اور تم تو بہت خوب صورت ہو...... اس لیے میرے دل میں جگہ نہیں بنا سکتیں۔'' اور یہ کہہ کر ریحان نے فون بند کر دیا۔ اور حارث اس کی بکواس کو سن کر...... اب پہلی بار انجوائے کر رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
اور اب اس کی انگلیاں از خود شہلا کا نمبر پریس کر رہی تھیں۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ وقت مٹی ڈال دیا کرتا ہے۔ یادوں پر...... ماضی پر، آرزو پر...... غلطیوں پر...... چاہتوں پر...... یہاں تک کہ رشتوں پر بھی...... مگر عامر کی نہ یادوں پر مٹی چڑھی تھی اور نہ ماضی پر...... وہ اولین دن کی طرح اس کے دل میں بسی تھی۔ وقت نے اسے اس سے دور کر دیا تھا...... مگر وہ اسے بھول ہی نہیں پایا تھا۔

''پتا نہیں لوگ نا امید کیسے ہو جاتے ہیں...... '' وہ اکثر سوچتا جیسے، جیسے وقت گزر رہا تھا...... اس کی محبت اس کے دل میں توانا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا یقین ایسا واثق تھا کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے ضرور ملے گی۔

اس کے دوست اور احباب اُسے سمجھاتے اور اس کی ماں اسے یہ یقین دلاتی کہ...... ''صبا سے بہت اچھی لڑکیاں اس دنیا میں موجود ہیں۔ اگر وہ تمہارے نصیب میں ہوتی تو کبھی غائب نہ ہوتی اور اب تک تو اس کی شادی کہیں ہو چکی ہوگی، تم کیوں اپنے ساتھ اپنی ماں کو بھی خوار کر رہے ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو میرے دل میں محبت کا جو تناور شجر قائم ہے، وہ کب کا خزاں رسیدہ ہو چکا ہوتا۔'' وہ ایک شاندار پرسنالٹی کا مالک تھا...... جو اسے دیکھتا متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اور پھر اس کا اخلاق بھی ہمیشہ سے اچھا تھا...... جس سے بھی بات کرتا انتہائی ملائم لہجے میں کیا کرتا...... خود زیادہ باتیں بنانے کے بجائے وہ ایک اچھا سامع تھا...... یہی وجہ تھی کہ ان دنوں وہ جس آفس میں کام کر رہا تھا وہاں خاصا مقبول تھا...... اس کی دوستی کی خواہاں اگر لڑکیاں تھیں تو وہ لڑکوں میں بھی ہر دل عزیز تھا کہ ایک عجز اور انکساری کے رویّے نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کسی کے ساتھ اتنا کلوز ہونے کی بالکل کوشش نہ کرتا کہ جہاں سے...... بے تکلفی کی سرحد شروع ہو جائے۔

آس پاس تو کیا...... اس کی اپنی فیملی میں کئی لڑکیاں ایسی تھیں کہ جو اس کی ہمراہی کے خواب دیکھا کرتی تھیں اس کی ماں رقیہ بیگم کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی لاڈلی بھتیجی کو اپنی بہو بنائیں انہیں اپنی یہ بھتیجی اس وجہ سے بھی بہت پسند تھی کہ ان کا بھائی ہمیشہ ان کی ہر بات مانا کرتا تھا۔ اور اس نے بارہا اپنی اس خواہش کا اظہار بھی اپنی بہن سے کیا تھا کہ عامر سے اچھا داماد انہیں کبھی مل ہی نہیں سکتا اور انہوں نے یہ بات اپنی بیٹی کو دیکھ کر ہی کہی تھی...... جو عامر سے یک طرفہ محبت کیا کرتی تھی اور اس نے کتنے ہی رشتے صرف اس وجہ سے منع کر دیے تھے کہ اس کے دل میں ایک آس تھی کہ عامر اس سے ضرور شادی کرے گا۔

اور ایک عامر تھا...... جس نے اپنی اس کزن کو کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

عامر کو دیکھ کر...... صرف یہی کہا جا سکتا تھا۔ کچھ دکھ، انسان کے اندر یوں ٹھہر جاتے ہیں کہ جیسے اس کے اندر انہوں نے اپنا مسکن ہی بنا لیا ہو اور وہ وہاں اس انداز میں رہ رہے ہوں جیسے انہوں نے کہیں جانا ہی نہیں ہو۔

عامر اپنے دکھوں کے ساتھ رہتے ہوئے خاموش سے خاموش تر ہوتا جا رہا تھا۔ ماں اس کے دکھ کو جانتی ضرور تھی مگر وہ بھی اس کے دکھ کی نہیں شدت سمجھ سکتی تھی اور نہ ہی اس کی تمازت محسوس کر سکتی تھی۔ ایسے حالات میں جب اس سے اپنا پن روٹھ گیا ہو تو وہ اپنے من کے اکیلے پن سے ایک سمجھوتا سا کر بیٹھا تھا تب عامر دوسروں کو وہ نہیں دکھائی دیتا تھا جو وہ اصل ہوا کرتا تھا۔

پہلے جو خوب بولنے والا، ہنسنے ہنسانے والا تھا...... بے حد کم سخن نظر آیا کرتا تھا۔

اس کے آفس کی لڑکیوں کا تو خیال تھا کہ وہ بحالتِ مجبوری کسی کی بات کا جواب دیا کرتا تھا۔

اس کی شرارتیں جو کبھی ختم نہ ہونے کا نام نہیں لیا کرتی تھیں اب وہ بے حد سوبر سا نظر آتا تھا۔

جس کو کسی کے جوک سن کر بھی ہنسی نہیں آیا کرتی تھی بلکہ وہ ان لوگوں کے فلک شگاف قہقہوں کو حیرت سے سنا کرتا تھا۔ اب وہ ہنسنا تو کیا مسکرانا بھی بھول گیا تھا۔

درودِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل

1۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنے والے پر اللہ تعالیٰ دس بار درود بھیجتا ہے۔
2۔ درود پڑھنے والے کے لیے رب تعالیٰ کے فرشتے رحمت اور بخشش کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔
3۔ درود گناہوں کا کفارہ ہے۔
4۔ درودِ پاک سے عمل پاک ہوتے ہیں۔
5۔ درودِ پاک خود اپنے پڑھنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے۔
6۔ درود پڑھنے سے درجات بلند ہوتے ہیں۔
7۔ درودِ پاک پڑھنے والے کے لیے ایک قیراط ثواب لکھا جاتا ہے جو کہ احد پہاڑ جتنا ہے۔
8۔ درودِ پاک پڑھنے والے کو پیمانے بھر بھر کر ثواب ملتا ہے۔
9۔ جو شخص درودِ پاک کو ہی وظیفہ بنا لے اس کے دنیا اور آخرت کے سارے کے سارے کام اللہ تعالیٰ اپنے ذمے لے لیتا ہے۔
10۔ درودِ پاک پڑھنے کا ثواب غلام آزاد کرنے سے بھی افضل ہے۔

از: ریحانہ حسن، کراچی

''اس زمانے میں ایسی محبت کرنے والے نظر کہاں آتے ہیں آج کل سچی محبتیں اپنا وجود کھو بیٹھی ہیں۔'' یہ جملہ اس نے بارہا اپنی ماں کی زبان سے سنا تھا۔

''امی دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں...... اگر میں اس طرح کا ہوں تو میرے جیسے مزید لوگ بھی ایسے ضرور ہوں گے۔ یہ حقیقت آپ مان کیوں نہیں لیتیں'' کتنی مرتبہ اس نے یہ بات باور کرائی تھی۔

''بیٹا...... ایسے لوگوں کو یہ دنیا والے پاگل کہتے ہیں۔''

''پاگل ہی سہی...... مگر ہر پاگل پتھر مارنے والا تو نہیں ہوتا۔ اور کیا پاگل افراد...... ہماری اس دنیا کا حصہ نہیں ہیں؟''

''اچھا...... اب تم اس بات پر بھی خوش ہو کہ لوگ تمہیں پاگل بھی کہہ دیں۔'' ماں کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔

''امی...... خوشی سے تو میرا کوئی سروکار ہی نہیں ہے...... اس لیے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کون کیا کہتا ہے یا مجھے کون کیا سمجھتا ہے۔'' تب رقیہ بیگم اپنا دل مسوس کر رہ گئی تھیں کہ اس موضوع پر ہمیشہ اس نے صرف اپنی ہی چلائی تھی اور بارہا سمجھانے کے باوجود وہ صبا کو بھول ہی نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

مارے خوشی کے شہلا نے بہن کو فون ملایا۔ وہ اسے بتائے کہ آج حارث نے اسے خود فون کیا ہے۔ پہلی ہی بیل پر فون او کے ہو گیا۔

''راحیلہ آج میں بہت خوش ہوں...... بے حد خوش۔''

''خوشی کی وجہ بھی بتا دیں تو زیادہ خوشی ہو گی۔'' کریم کی ہنسی سے مزین آواز اسے سنائی دی۔

''میں نے اپنی بہن کو فون کیا ہے، آپ اسے دیں۔'' اپنے لہجے کے تناؤ پر قدرے قابو پاتے ہوئے وہ بولی۔
''بہنوئی سے بات کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہوتا۔''
''ٹھیک ہے، نہ دیں آپ...... میں فون بند کر رہی ہوں۔''
''ارے بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا...... کیا اتنا سا بھی حق نہیں ہے میرا...... لو اپنی بہن سے بات کرو۔'' اس نے راحیلہ کو فون تھماتے ہوئے کہا۔
''آپا...... خیریت تو ہے ناں......؟'' راحیلہ نے یک دم گھبرا کر پوچھا۔
''ہاں...... اور یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج حارث کا فون میرے پاس آ گیا۔''
''سچی میں آپا......'' راحیلہ جیسے کھل سی گئی۔
''ہاں، اس نے دس منٹ اور چودہ سیکنڈ بات کی مجھ سے......''
''کیا کہہ رہا تھا وہ......؟''
''یہی کہ وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔''
''صرف دوستی......؟'' راحیلہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔
''پگلی، محبت کی پہلی سیڑھی دوستی ہی ہوا کرتی ہے۔''
''میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ آپ سے یہ پوچھے گا کہ میں اپنی اماں کو کب تک بھیجوں......؟''
''یہ سب بھی وہ ضرور پوچھے گا...... اور بہت جلد پوچھے گا۔''
''اچھا تو پھر ان دس منٹ اور چودہ سیکنڈ میں وہ کیا کہتا رہا؟''
''یہ کہ میں بہت اچھی ہوں اور اسے بہت اچھی لگتی ہوں۔''
''آغاز تو اچھا ہے۔'' راحیلہ ہنسی۔
''ہاں...... میں آج اتنی خوش ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔ اس کا فون ختم ہو گیا ہے مگر اس کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں ہی گونج رہی ہے۔''
''ٹھیک ہے پھر بعد میں بات کروں گی......'' کریم کو کن سوئے لیتے دیکھ کر راحیلہ نے فون آف کر دیا۔
''کس بات پر اتنی خوش ہو رہی تھیں تمہاری بہنا......؟'' اس نے لہجے میں دلچسپی سمیٹ کر پوچھا۔
''ان کا رزلٹ آیا ہے، وہ پاس ہو گئی ہیں۔ یہی بتا رہی تھیں وہ۔''
''اچھا...... حارث ان کا امتحان تھا کیا؟'' اب وہ تمسخر سے پوچھ رہا تھا۔
''ہاں، وہی امتحان تھا...... اور وہ اپنی سابقہ بدتمیزیوں کی معافی بھی مانگ چکے ہیں۔''
''ظاہر ہے جب آج کل کے لڑکوں کو ساتھ گھومنے، مستی، موجیں کرنے کے لیے کسی ساتھی لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔''
''مگر حارث بھائی ایسے ہرگز نہیں ہیں، وہ بے حد نیک اور شریف انسان ہیں۔'' راحیلہ نے جز بز ہو کر کہا...... اسے کریم کی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اور نہ ہی وہ اپنی بہن کے حوالے سے اس سے کسی قسم کی کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔
''تم کتنا جانتی ہو حارث کو؟ کبھی ملی ہو اس سے یا تم بھی اپنی بہن کے ساتھ اس کی جھڑکیاں سننے اس کے بینک جایا کرتی تھیں؟'' کریم تحقیر بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔
''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ حارث نے فون کر کے ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی ہے۔''

''کیوں مانگ لی معافی...... آج کل تو بڑے، بڑے لوگ اپنی غلطی کو غلطی تسلیم نہیں کیا کرتے۔''
''جو لوگ اپنی غلطیوں کو مان لیتے ہیں وہ تو پھر اچھے ہوتے ہیں ناں......''
''ایسے لوگوں کو چالباز کہتے ہیں، ایسے لوگوں کو مکار کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ابن الوقت کہتے ہیں۔'' کریم تلخ سے لہجے میں بول رہا تھا۔ انٹ شنٹ جو اس کے منہ میں آرہا تھا وہ بولے چلا جارہا تھا اور راحیلہ چپ چاپ کھڑی اس کا یہ انداز دیکھ کر اپنے دل میں سوچ رہی تھی۔
اس وقت کریم کے دل میں آگ لگ رہی ہے جس کے شعلے اس کی زبان تک آرہے ہیں، اسے یہ بات کسی صورت پسند نہیں آسکتی کہ اس کے علاوہ بھی شہلا کا کوئی چاہنے والا ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

وہ دسواں دن تھا...... شہلا حارث کے ساتھ ایک ہوٹل میں افطاری کررہی تھی۔
''آپ اپنی امی کو بھی اپنے ساتھ لے آتے تو زیادہ مزہ آتا......'' شہلا نے کہا۔
''امی، گھر پر ہی افطار کیا کرتی ہیں...... بلکہ آج میرے گھر نہ پہنچنے پر میری کھنچائی کریں گی وہ۔''
''تو پھر آپ کو مجھے لے کر اپنے گھر لے جانا چاہیے تھا۔''
''تا کہ اُن کی ڈانٹ کھاتا کہ کس کو ساتھ لے کر آگیا میں۔''
''حارث، آپ نے ابھی تک نہیں بتایا انہیں میرے بارے میں؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔
''ابھی تو میں اپنے آپ کو ہی بتا رہا ہوں کہ شہلا سے میری دوستی ہوگئی ہے۔'' وہ من ہی من میں دانت پیس کر اور نظریں جھکا کر بولا۔
''تو آپ اپنے آپ کو کتنے عرصے تک یہ یقین دلاسکیں گے؟'' بظاہر وہ معصوم سے لہجے میں پوچھ رہی تھی مگر وہ چونک سا گیا۔
اتنی سیدھی تو شاید وہ نہیں تھی جتنی کہ وہ پوز کررہی تھی۔
''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم؟'' سچی بات اس کے لبوں سے ادا ہوگئی۔
''مگر میرے دل نے تو مجھے پہلے ہی یہ سب بتا دیا تھا۔''
''کیا بتادیا تھا......؟'' وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
''یہی کہ جن سے ہم سچا پیار کرتے ہیں، وہ ہم سے ضرور ملتے ہیں۔''
''اوہ...... یہ بات ہے۔'' وہ زبردستی مسکرایا۔
''جی ہاں......'' اب وہ خوشی سے سرشار چائے کپوں میں ڈال رہی تھی۔
''لیجیے...... اپنی چائے۔'' اس نے کپ اس کی جانب کرکے اپنا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔
''چینی کیا بغیر پوچھے ڈال دی......؟'' اس نے کہا۔
''مجھے پتا ہے، آپ جیسے لوگ پھیکی چائے پیتے ہیں تو بس چند دانے ہی ڈالے ہیں میں نے۔''
''تھینکس...... ورنہ شیرہ جیسی چائے مجھ سے پی ہی نہیں جاتی۔''
ابھی وہ دونوں چائے پیتے ہوئے عید کی تیاریوں کے حوالے سے باتیں کررہے تھے...... شہلا اپنی پشت پر قصداً کھنکھار سن کر پلٹی تو کریم کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔
شہلا اسے دیکھ کر پہلی مرتبہ خوش دلی سے مسکرائی اور بولی۔
''کریم بھائی، یہ حارث ہیں، آج میں ان کی مہمان ہوں۔''

''اور حارث، یہ میرے بہنوئی کریم ہیں۔'' حارث نے کھڑے ہو کر کریم سے ہاتھ ملایا اور چائے پینے کی آفر دی۔

''میں اپنے دوست کے ساتھ ہوں۔ پھر کبھی آپ سے ملاقات ہوگی۔'' کریم تحقیر بھری نظروں سے شہلا کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔

''شکر خدا کا...... آج کریم نے آپ کو دیکھ لیا۔''

''اس میں شکر ادا کرنے کی کیا بات ہے؟''

''اب کم از کم یہ میری بہن کی زندگی ضیق تو نہیں کرے گا اور اس سے یہ بھی نہیں کہے گا کہ اسے راحیلہ سے زیادہ میں پسند ہوں اور اب بھی وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''اوہ...... کیا یہ اتنا برا شخص ہے۔'' حارث کا لہجہ تاسف لیے ہوئے تھا۔

''اس سے کہیں زیادہ برا......'' شہلا نے نفرت سے کہا اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک ساتھ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے اور دور کھڑا کریم ان دونوں کو انتہائی نفرت اور غصے سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ عید کا چھٹا دن تھا۔ اور وہ شہلا کے گھر میں موجود تھا۔ اپنے ساتھ وہ عید کیک کے ہمراہ خوشنما بوکے بھی لے کر گیا تھا۔ اس سے تو یہ بھی کہا گیا تھا کہ اسے شہلا کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ بھی لے جانا چاہیے۔

''جب میں کسی کی پسند ناپسند کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں...... تو کیسے کچھ لے سکتا ہوں۔ میں تو اس کے پسندیدہ کلر سے بھی آگاہ نہیں ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے پوچھ کر خود ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے وہ شہلا کے لیے کوئی گفٹ نہیں لایا تھا۔

شہلا کو اس نے فون پر سرسری سا بتا دیا تھا کہ اسے اس کے گھر کے قریب کہیں جانا ہے...... اگر موقع ملا تو وہ اس کے گھر آئے گا۔

''ضرور آئیے گا...... میں انتظار کروں گی۔'' وہ سرشار سے لہجے میں بولی تھی۔

''انتظار مت کیجیے گا...... میں وعدہ نہیں کر رہا۔''

''میں تو اب شدت سے منتظر رہوں گی...... جب تک آپ آ نہیں جائیں گے میں تو سو بھی نہیں سکتی۔''

''لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتی ہیں۔'' اس نے خجل سا ہو کر کہا تھا۔

''اچھا...... تو پھر لڑکیاں کس طرح کی باتیں کرتی ہیں۔'' وفورِ شوق سے پوچھا گیا تھا۔

''مجھے کیا پتا......''

''آپ کو کیوں نہیں پتا...... آپ نے تو ان سے باتیں کی ہوں گی جب ہی تو ایسا کہہ رہے ہیں۔''

''خواہ مخواہ میں ہی باتیں کی ہوں گی۔'' وہ ایک دم بولا۔

''میں اس ٹائپ کا لڑکا نہیں ہوں۔'' وہ اپنا غصہ دبا رہا تھا۔

''یہ تو میں جان چکی ہوں کہ آپ کس مزاج کے ہیں۔''

''اچھا......'' وہ صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

''حارث آپ کتنے اچھے ہیں اور کتنا میرا خیال رکھتے ہیں اور آج ہمارے گھر آ کر آپ نے میرا مان بڑھا دیا ہے، میری سوتیلی ماں جو یہ سمجھتی تھیں کہ شاید میں کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں آج انہیں میری چاہت پر یقین آ گیا ہے کہ وہ یک طرفہ نہیں تھی۔''

اور حارث کے ذہن میں اپنے دوست سے کی گئی نوک جھوک گونج رہی تھی۔
''یار، واقعی گھامڑ ہے تو عید آئی تو تم نے اسے کوئی گفٹ تک نہیں دیا۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے...... پھر بھی کوئی اثر نہیں ہوا......''
''ریحان اسے رمضان کے آخری عشرے میں افطاری تو کرادی تھی......اور تمہارے کہنے پر کیفے میں ہی لے گیا تھا۔''
''مگر نہ تم نے اسے عید پر کوئی گفٹ دیا اور نہ عید کے ایام میں اس سے ملنے گئے۔''
''اس کا ایک کزن مجھے دیکھ کر خاصے ڈرٹی لکس دے رہا تھا۔ تو پھر اس کے گھر جا کر میں مزید ایسے مناظر کیوں دیکھتا؟''
''اس کی ماں اور بہن تو تم کو اپنے گھر دیکھنا چاہتی ہیں۔''
''چاہتی ہوں گی مگر میں کسی کو نہیں دیکھنا چاہتا۔'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔
''سمجھ میں نہیں آتا......تم جو سوفٹ اسپوکن ہو مگر شہلا کے معاملے میں کیوں بار، بار ہتھے سے اکھڑ جاتے ہو۔''
''میں نے اپنے مزاج کے خلاف، اس سے بہت باتیں کرلیں...... اور اب جو میں نہیں کر پا رہا تو کیسے کروں......؟''
''یہ دورانیہ بہت زیادہ لمبا نہیں ہوگا......تم کوشش تو کرو......'' ریحان اب اسے دھیمے لہجے میں پھر سمجھا رہا تھا......اور وہ اس کی گفتگو کے اختتام پر پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔
اور آج عید کے چھٹے دن وہ شہلا کے گھر میں تھا۔ ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا سا کمرا جو اُن کا ڈرائنگ روم ہوگا وہاں وہ بیٹھا ہوا تھا......اور شہلا سرشاری اس کے سامنے بیٹھی خوش ہو رہی تھی۔
کچھ دیر بعد راحیلہ کمرے میں آئی اور پیچھے کیے ہوئے ہاتھ یک دم سامنے کیے اور اس کے گلے میں ایک خوب صورت سا پھولوں کا ہار ڈال دیا اور وہ گڑبڑا سا گیا۔
''ارے، رے...... یہ کیا کر رہی ہیں آپ......؟''
''ہمارے ہاں آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں ناں تو آپ کا پھولوں سے استقبال کرنا تھا۔''
''اچھا، اچھا شکریہ۔'' اس نے فوراً ہی ہار اتار کر سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔
''ارے بیٹے، تم اپنے ساتھ اپنی ماں کو لے کر نہیں آئے؟'' ذکیہ بیگم کمرے میں آئیں تو اُن کا پہلا سوال ہی یہ تھا۔
''کیوں، کیا امی کو یہاں آنا تھا......؟'' وہ حیرت سے پوچھ بیٹھا۔
''ہاں بیٹا...... ایسے معاملات تو خواتین ہی حل کیا کرتی ہیں۔ پھر بعد میں تمہارے ابو بھی آجائیں اور سب بڑوں سے مل لیں......تو سب کو ہی اچھا لگے گا۔''
''امی، ابھی تو حارث سے آپ مل لیں...... یہ پہلی مرتبہ آئے ہیں ہمارے گھر...... آنٹی سے آپ بعد میں مل لیجیے گا۔'' شہلا نے حارث کے چہرے پر اکتاہٹ کے رنگ دیکھے تو بات سنبھالتے ہوئے کہا۔
''ہاں، بیٹا مجھے تمہارے آنے کی بہت خوشی ہوئی ہے حالانکہ تمہیں تو ہمارے ہاں چھ ماہ پہلے آجانا چاہیے تھا۔''
''جی......؟'' وہ حیرت سے ذکیہ بیگم کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میرے ساتھ وہ اندوہ ناک واقعہ نہ ہوتا یا ریحان نے میری برین واشنگ نہ کی ہوتی تو میں آج.... یہاں کسی صورت میں نہیں آتا مگر وہ اب مارے باندھے، وہاں بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں راحیلہ نے کھانے پینے کی ڈھیروں ڈھیر چیزیں اس کے سامنے سجا دیں۔
''اتنا سب کچھ......'' اس نے حیرت سے شہلا کو دیکھا۔

''ہر چیز میں نے بنائی ہے، کل رات جب آپ نے فون پر بتایا تھا کہ آئیں گے تو میں اسی وقت کچن میں چلی گئی تھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''فون کر کے تو آپ نے مجھ پر احسان کیا...... میرا وقت کیسے گزرا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''مگر مجھے کسی کو بھی تکلیف دینا پسند نہیں ہے۔''

''میں کسی نہیں ہوں حارث۔'' لہجہ شکوہ آمیز تھا۔

''اوہ...... ہاں۔'' وہ اسے دیکھ کر پھر ہڑبڑایا۔

''پہلی مٹھائی...... میرے ہاتھ سے۔'' راحیلہ نے سرعت سے ایک گلاب جامن اٹھا کر...... تیزی سے حارث کے منہ میں ٹھونس دی۔

اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر راحیلہ کو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''اکلوتی سالی بنوں گی آپ کی...... مذاق کا تو میرا حق بنتا ہے ناں۔'' وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی تھی۔

''سوری...... مجھے مذاق پسند نہیں ہے۔'' وہ پانی سے وہ ڈلی حلق میں اتارتے ہوئے بولا۔

''حارث یہ میری بہت لاڈلی بہن ہے۔'' شہلا نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔ ''اب راحیلہ مذاق نہیں کرے گی تو پھر کون کرے گا۔''

''اوکے......'' وہ پھر زبردستی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔

''کریم، دو گھنٹے کے بعد یہاں آئیں گے۔'' راحیلہ نے اسے بتایا۔

''مگر میں اتنی دیر نہیں رک سکوں گا۔'' وہ گھبرا کر بولا...... اس کا تو ہر پل مشکل سے گزر رہا تھا۔

''تو کیا اتنی جلدی چلے جائیں گے آپ......؟'' شہلا نے پوچھا۔

''ایک گھنٹے سے تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔''

''مگر مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ ابھی آئے ہیں۔''

''اور مجھے لگ رہا ہے کہ میں دو سال سے یہاں ہی بیٹھا ہوں۔'' وہ دھیمے سے بولا۔ مگر شہلا نے اس کی بات سن لی تھی اور وہ شرماتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''ایمان سے......؟ حارث آپ کو واقعی ایسا ہی لگ رہا ہے کہ آپ دو سالوں سے میرے ساتھ ہیں۔''

''ارے بھئی، میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا۔'' وہ پھر بوکھلا سا گیا۔

''میں بھی ایک ہی بات کہہ رہی ہوں۔'' تب بات کو بڑھنے سے روکنے کے لیے وہ کہہ بیٹھا۔

''ہاں...... آپ ٹھیک سمجھ رہی ہیں۔ اب میں چلتا ہوں، آپ کی شاندار میزبانی کا شکریہ......''

تب وہ بے اختیار بولی۔

''حارث میں تو شروع دن سے آپ کو سمجھ پائی تھی کہ آپ میرے ہیں...... اور مجھے مل کر رہیں گے۔ ہاں آپ کو ہی مجھے سمجھنے میں دیر لگی...... مگر اللہ کا شکر ہے کہ آج آپ بھی میری محبت پر ایمان لے آئے اور آج اس کا اقرار بھی کر لیا۔''

اور حارث...... اب شہلا کو راحیلہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ دونوں پاگل ہوں اور اسے ان پاگلوں کے گھر سے فوراً چلا جانا چاہیے ہو۔ اور وہ بھی بھاگ کر......

(باقی آئندہ ماہ پڑھیے)

بدلی ساون کی رُت بدلی

پروین عذرا تشنہ

راقم جب ملازمت کی غرض سے جالندھر سے دہلی کے لیے روانہ ہورہا تھا تو اباجی نے اپنی رشتے کی بہن مہربانو اور امی جی نے اپنی بہن صغراں کا ایڈرس اسے تھماتے ہوئے اُن سے ملتے رہنے کی تاکید کی تاکہ اجنبی شہر میں اچھے برے وقت میں کوئی اپنا خبرگیری کرنے والا بھی ہو۔ صغراں خالہ کی فیملی سے تو وہ بخوبی واقف تھا کہ وہ اکثر جالندھر آتیں تو رہون ضرور آتیں......ان کا گھر ضلع جالندھر کے قصبہ رہون میں تھا



اور خالہ کی سسرال قریبی قصبہ سلو میں تھی لیکن وہ اپنی بہن کے گھر بھی کچھ دن قیام ضرور کرتیں، خالہ کی دو ہی اولادیں تھیں...... ابرار جو اس کا ہم عمر تھا اور کلثوم اس سے پانچ سال چھوٹی تھی...... جبکہ پھپھو مہر بانو کا کبھی کبھار ہی آنا ہوتا اور اتفاق سے اس کی کبھی ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی لیکن ابا جی کا اصرار تھا کہ چھٹی پر وہاں بھی ضرور جایا کرنا، اس کے علاوہ اس کی جاب میں ہر چھ ماہ بعد ایک ہفتے کی چھٹی بھی شامل تھی تو ابا جی نے تاکید کی کہ "ان چھٹیوں میں تم سیدھے گھر آیا کرو گے۔" اسی لیے وہ کسی ویک اینڈ پر خالہ کے اور کسی پر پھپھو کے گھر جایا کرتا...... پہلی مرتبہ تو وہ پھپھو مہر کے گھر بہت ڈرتے، ڈرتے گیا تھا کہ جانے کیسے لوگ ہوں اور کس طرح ملیں لیکن پھپھو مہر کی شفقت، حسیب بھائی، محب بھائی اور صہیب کے خلوص اور شازیہ کے اخلاق سے پُر رویوں نے اسے اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ رفتہ، رفتہ خالہ کے گھر سے زیادہ وہ پھپھو کے گھر جانے لگا۔ کیونکہ خالہ کے گھر ان کی سسرال سے کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا۔ جن کی عجیب سی نظروں سے اسے کوفت ہوتی پھر اتنی طویل مدت سے یہاں رہنے کے باوجود اُن کے گھر کا ماحول نہیں بدلا تھا۔ پھپھو کا گھر اس کی قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا اور ان کے گھر کا خوشگوار ماحول اسے بہت پسند آیا تھا۔ پھوپا صادق تو فوت ہو چکے تھے تینوں بیٹے گورنمنٹ کے محکموں میں مناسب عہدوں پر فائز تھے۔ نعما کالج اور شازیہ اسکول میں پڑھ رہی تھیں، وہ ویک اینڈ پر وہاں جاتا تو سب ہی گھر پر موجود ہوتے۔ سب کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزرتا۔ رفتہ، رفتہ ہر ہفتہ وہ وہیں جانے لگا اس لیے جب جاتا سب کو اپنا منتظر پاتا، اکثر آؤٹنگ کا پروگرام بھی بن جاتا تو سب خوب انجوائے کرتے، جلد ہی رافع ان سب میں ایسے گھل مل گیا جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتا آیا ہو، اب تو اس کا انداز نشست و برخاست اور گفتگو سب ان کے ہی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اسے ان کا رہن سہن کا طریقہ ایسا بھایا کہ جب گھر جاتا تو امی جی اور زاہدہ کو بھی وہی طور طریقے سکھانے کی کوشش کرتا لیکن جواب میں اُن کے مذاق کا نشانہ بنتا بس فہیم تھا جو اس کا ساتھ دیتا تو امی جی اسے ڈانٹ دیتیں کہ کچھ بڑے تو ہو جاؤ پھر بھائی کی ہاں میں ہاں ملانا۔ حالانکہ اگلے سال وہ بھی کالج جانے والا تھا لیکن امی کی نظروں میں بچہ تھا، ان باتوں سے اسے کافی دکھ ہوتا۔ اسے اپنے گھر کا ماحول پسند نہ تھا جہاں وہ باپ بیٹے کھانا کھا رہے ہوتے تو امی جی یا زاہدہ مسلسل پنکھا جھل رہی ہوتیں اور بعد میں دونوں اکیلے بیٹھی کھانا کھا رہی ہوتیں، اس کا جی چاہتا کہ مہر پھپھو کے گھر کی طرح وہ سب بھی ایک ساتھ بیٹھ کر دلچسپ باتوں کے دوران کھانا کھائیں پھر ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ چائے یا کافی پیئیں یا موسمی پھلوں سے لطف اندوز ہوں لیکن اس کی بات کوئی نہ سنتا اور وہ دلبرداشتہ ہو جاتا، اسے اپنے گھر کے ماحول سے گھٹن ہونے لگی تھی۔ اب تو چھ ماہ بعد کی چھٹی پر بھی اس کا گھر جانے کو جی نہ چاہتا لیکن ابا جی کا حکم ٹالنے کی جرأت بھی نہیں تھی اس لیے مجبوراً اسے وہاں جانا پڑتا اور جب وہ اس گھٹے ماحول سے لوٹتا تو پھپھو کے گھر آکر گویا اسے نئی آکسیجن ملتی جہاں وہ سب مع پھپھو کے ایک محفل جمائے رکھتے، مختلف قسم کے گیم بھی کھیلے جاتے، بحث مباحثے بھی ہوتے، جن میں سب ہی شریک ہوتے آپس میں.... بے تکلفانہ نوک جھوک بھی چلتی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ نعما کب اس کے دل میں آکر بیٹھ گئی، اچانک ہی اسے اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس ہونے لگی، اسے نعما کی آنکھیں بہت خوب صورت لگنے لگی تھیں جن پر سیاہ گھنی پلکوں کی اٹھتی گرتی جھالر میں وہ الجھ کر رہ جاتا تو کبھی گندمی چہرے پر آئی سرخی دیکھ کر وہ کھو سا جاتا کبھی گفتگو کے دوران اپنے ذہن میں آیا جملہ نعما کے لبوں سے سن کر چونک جاتا اور کبھی اپنی کہی کسی بات پر نعما کو حیرانی سے دیکھتا پاتا جیسے یہ بات تو وہ کہنے والی تھی اب بھی اچانک اس کی نظریں نعما سے ملتی تو وہ نظریں چرالیتی تو وہ سوچتا کہ کیا

میری طرح نعما کے اندر بھی یہ تبدیلی آئی ہے؟ اب وہ اکثر تنہائی میں یہ باتیں سوچنے لگتا کہ اس کے علاوہ تو ان کے درمیان کبھی کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی، وہ سب اکٹھے ہی بیٹھتے تھے، ان دونوں نے کبھی ارادتاً ایک دوسرے کی طرف دیکھا تک نہیں تھا، نہ کبھی بات کرنے کے لیے تنہائی کا موقع تلاش کیا تھا، ان کی باتیں سب کے درمیان ایک دوسرے سے کی جانے والی باتیں ہی ہوتی تھیں جن کا کوئی نوٹس بھی نہیں لیتا تھا۔ لیکن اب تنہائی میں اسے یہ باتیں بہت خاص لگنے لگی تھیں جنہیں وہ خود ہی کئی، کئی رنگوں کے خوب صورت لباس پہنا کر دل مندر میں مورتیوں کی طرح سجاتا رہتا، تبدیلی صرف اس کے دل میں اور خیالات میں ہی نہیں آئی تھی بلکہ اتنا وقت وہ دبے پاؤں گزر چکا تھا کہ اس گھر میں بھی کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ حسیب بھائی اور محب بھائی کی شادیاں انہی کی پسند سے ایک ساتھ ہی کردی گئی تھیں اور اب بھی سب ایک ساتھ ہی اس گھر میں رہ رہے تھے اور ننھی ننھی قلقاریوں نے گھر کی رونق میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ گھر کا ماحول اب بھی وہی تھا اور پھپھو تو اب پہلے سے زیادہ خوش تھیں۔

چھ ماہ پیشتر جب وہ گھر گیا تھا تو زاہدہ کی منگنی ہوگئی تھی اور شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ سب لوگوں کو بلاوے بھی دیے جاچکے تھے۔ اب کل وہ شادی کی وجہ سے پندرہ دن کے لیے گھر جارہا تھا۔ اس لیے آج اسے پھپو کے گھر ملنے جانا تھا۔ صبح سے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اسی لیے راستے میں ہی اسے تیز بارش نے آلیا تھا اور جب وہ وہاں پہنچا تو بالکل بھیگ چکا تھا اسی لیے کچھ شرمندہ سا تھا لیکن وہاں کے منظر نے اس کی شرمندگی دور کردی، لان میں سب ہی بارش میں نہا رہے تھے خوب ہلا گلا مچا ہوا تھا۔ ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اچھالے جارہے تھے ایک دوسرے کو پکڑ کر کھڑے پانی میں غوطے دیے جارہے تھے اسے دیکھ کر سب نے زوردار نعرہ لگایا۔ صہیب نے اسے بھی کھینچ کر سب میں شامل کرلیا تھا۔ بہت دیر تک

سب اسی طرح بارش میں خوش فعلیاں کرتے رہے، بارش ہلکی ہوگئی تو میٹھے گلگلوں اور چٹ پٹے پکوڑوں کی طرف دوڑے اور ایک دوسرے سے چھین، چھین کر کھانے لگے، اس کے بعد گرما گرم چائے نے مزہ دوبالا کردیا، اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اتنے پیارے لوگوں کے ساتھ بارش سے اتنے خوب صورت اور بھرپور انداز میں وہ پہلی مرتبہ لطف اندوز ہوا تھا۔ اسے لگا کہ یہ بارش اس کی زندگی کی یادگار بارش ہوگی، وہ اس خوب صورت وقت کے سحر سے نکل نہیں پارہا تھا۔ سب باتوں میں مصروف تھے اور وہ عجب کیفیت سے دوچار کہہ رہا تھا۔

"حسیب بھائی میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ کے خاندان میں شامل ہوجاؤں۔"

"ارے، شامل ہونے کی کیا بات کررہے ہو، اب تو تم ہمارے خاندان کے ایک فرد ہی ہو، کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتے؟" حسیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن بیٹا، اس کے لیے تمہیں اپنے والدین کی اجازت لینی ہوگی۔" پھپو نے بھی یہ بات بظاہر ہنستے ہوئے ہی کہی تھی لیکن وہ اُن کے الفاظ کی گہرائی کو سمجھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، آتے ہوئے میں ان سے تحریری اجازت نامہ لیتا آؤں گا۔" اس نے بھی ان کے ہی انداز میں جواب دیا تھا۔ پھپو نے اسے متذبذب نظروں سے دیکھا تھا لیکن نعما کے علاوہ سب ہی اس کے جواب پر بے اختیار ہنس دیے تھے اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہوگئے۔ تب اس نے پہلی مرتبہ ارادتاً نعما کی طرف دیکھا جو پھپو کے دوسری طرف سر جھکائے خاموشی سے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور پلکوں کی جھالر کے کناروں پر چند موتی ٹکے تھے۔

"کیا پھپو کبھی بن بادل بھی برسات ہوسکتی ہے؟" رافع نے پھپو کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا، جب حبس بہت دیر رہے تو کچھ چھینٹے پڑجاتے ہیں۔" پھپو نے کن انکھیوں سے نعما کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ بارش کب کی تھم چکی تھی اور بادل یوں غائب تھے جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ اس نے چلنے کی اجازت طلب کی تو نعما نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں جانے کیا کچھ تھا کہ اس نے اپنی نظریں جھکالیں۔ سب اپنی بحث سمیٹتے ہوئے اسے الوداع کہنے اٹھ گئے اور اسے گیٹ تک چھوڑنے گئے۔

اسے پتا ہی نہیں چلا اور تمام سفر الفاظ کی ادھیڑبن میں کٹ گیا۔ وہ بار، بار امی جی سے کہنے کے لیے جملے ترتیب دیتا لیکن وہ اتنے فضول لگتے کہ نئے سرے سے الفاظ جوڑنے لگتا جن سے امی جی کے دل پر اثر ہوسکے، اس دفعہ تو وہ سب کے تحائف کے ساتھ، ساتھ امید کی پٹاری میں اپنے ارمان بھی رکھ لایا تھا جسے تنہائی میں امی جی کے سامنے کھولنا چاہتا تھا۔ اسے آئے ہوئے دو دن ہوگئے تھے۔ ابھی وہ موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ امی جی نے دسترخوان پر بڑے پیار سے کھانا رکھتے ہوئے اپنی دلی خواہش بھی اس کے سامنے رکھ دی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ امی جی اپنی بھتیجی رضیہ کو بہت جلد اس کی دلہن بنا کر گھر لانا چاہتی تھیں کہ زاہدہ کی رخصتی کے بعد یہ گھر بہت سونا ہوجائے گا۔ انہوں نے اپنے بھائی سے بات بھی کرلی تھی اور رشتے داروں میں اعلان بھی کردیا تھا۔ ان کے خیال میں ان کے فرمانبردار بیٹے کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ رضیہ کوئی غیر تو نہیں اس کے سگے ماموں کی دیکھی بھالی بیٹی تھی، دونوں کا بچپن ساتھ، ساتھ کھیلتے گزرا تھا اور اب بھی جب رافع گھر آتا تو وہ بھی آجاتی پھر رافع بھی اس سے فرمائش کرکے کچھ نہ کچھ پکواتا رہتا اور وہ خوشی، خوشی اس کی ہر فرمائش پوری کرتی رہتی، وہ خوش تھیں کہ انہوں نے بیٹے کی پسند کی لڑکی ہی اس کے لیے چنی ہے۔

ان کے ہاں پسند پرکھنے کی یہی کسوٹی تو تھی۔ انہوں سوچا بھی نہیں تھا کہ رافع تو اسے بھی زاہدہ کی طرح بہن ہی سمجھتا تھا۔ ابا جی اور امی جی کی ایک ہی رائے تھی، زاہدہ بھی یہ رشتہ طے ہونے پر بہت خوش تھی، صرف فہیم

تھا جو بے تاثر چہرہ لیے بھائی کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کررہا تھا۔ رافع کو چپ لگ گئی تھی وہ تھوڑا سا کھا کر اٹھ گیا اور کمرے میں جا لیٹا، اس کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا اور اب اسے کیا کرنا چاہیے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان کے ہاں ایک دفعہ رشتہ طے کرکے اسے توڑا نہیں جاسکتا تھا۔ زبان دے کر مکرنا یہاں گلا کاٹنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ پھر خاندانی دشمنیاں شروع ہوجاتی تھیں اور یہ تو سگے بہن، بھائی کا معاملہ تھا۔ اسے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ رشتہ طے کرنے سے پہلے اسے بتایا تک نہیں گیا۔ حالانکہ وہ ہر چھ ماہ بعد آتا رہا ہے۔ کاش ایک مرتبہ اس کی بھی رائے لی جاتی، یہ صرف اس کی سوچ تھی ورنہ یہاں تو سب رشتے والدین خود ہی خود طے کرلیتے تھے، بچے تو ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں، اُن سے بھلا اس معاملے میں کیا بات کرنی، یہ تو بڑوں کے فیصلے ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے تجربوں کا نچوڑ استعمال کرتے ہیں اور بچوں کی کیا مجال اُن کے سامنے چوں چرا کرنے کی یہی یہاں کی ریت تھی پھر وہ کیوں اتنا پریشان ہے، اس لیے کہ وہ یہاں سے دور ایک دوسرے ماحول میں رہا ہے، ایک دوسری دنیا میں سانس لیتا رہا ہے جو یہاں سے بہت مختلف ہے اور اس کے حسین رنگ اپنے اندر بساتا رہا ہے وہاں کی روشنی میں بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوگیا ہے، اگر اس کے ساتھ بھی یہی کچھ کرنا تھا تو ایک بالکل الگ ماحول میں کیوں بھیج دیا تھا، ایک نئی دنیا سے کیوں روشناس کرایا تھا، جہاں مائیں اپنے بچوں کے دل کی آواز سن لیتی ہیں، ان کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ لیتی ہیں، جہاں بزرگوں کی تجربہ کار نگاہیں بچوں کی صلاحیتوں کو پہچان کر اجاگر کرتی ہیں اور بخوشی انہیں ان کی منتخب کردہ زندگی کی حسین... شاہراہوں پر چلنے میں ان کا ساتھ دیتی ہیں، یہاں کی طرح ان کی صلاحیتوں کو، خواہشوں کو ان کے وجود کے اندر قتل نہیں کردیا جاتا، انہیں تمام زندگی کے لیے سمجھوتوں اور مصلحتوں کی سولی پر نہیں لٹکا دیا جاتا، انہیں بزرگوں کے تجربوں کے خودرو جنگل میں بھٹکنے کو نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ سوچتے، سوچتے اسے اچانک خیال آیا کہ وہ دو دن سے آیا ہوا ہے اور رضیہ اس سے ملنے نہیں آئی تو اس کی یہی وجہ ہے کہ ان کا رشتہ طے کردیا گیا ہے اور اس کی موجودگی میں وہ یہاں نہیں آسکتی، وہ رضیہ کے تاثرات بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس رشتے پر کتنی خوش ہے، جب وہ ماموں کے ہاں ملنے گیا تو اس کی بہت آؤ بھگت ہوئی لیکن رضیہ ایک پیڑ کے نیچے خاموش کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو رضیہ کی آنکھوں میں کئی سوال تھے جنہیں وہ ہاتھوں سے چھپا کر دوسری طرف دوڑتی چلی گئی شاید وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑی تھی، اس کا دل کٹ کر رہ گیا لیکن وہ جانتا تھا کہ روایت کے مطابق اب کچھ نہیں ہوسکتا وہ اپنے اور رضیہ کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا...... لیکن پھر بھی وہ امی جی اور ابا جی کے سامنے ڈٹ گیا کافی دیر تک اُن سے بحث کرتا رہا، انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا ان سے اپنا حق مانگتا رہا لیکن اس کی تمام کوششیں رائگاں گئیں وہ دونوں اسے وہی باتیں سمجھاتے رہے جن سے وہ واقف تھا، وہ اس بات کے ضرور قائل ہوگئے تھے کہ انہیں رافع سے پوچھ لینا چاہیے تھا لیکن یہ رشتہ تو اچانک باتوں، باتوں میں ہی طے ہوگیا کیونکہ گھر کی بات تھی۔ ابا جی نے روتے، روتے اپنی داڑھی بھگو لی تھی اور امی جی اپنی چادر اس کے پیروں پر رکھنے لگیں تو وہ کانپ گیا اور ان کے آگے سر جھکا دیا جو کتنی دیر سے اسے سمجھا رہے تھے کہ ان کا فیصلہ مان لے اسی میں سب کی بھلائی ہے اور اس نے بھی سب کی بھلائی کے لیے اپنی محبت، اپنی چاہت، اپنے ارمان، جذبات اور زندگی کی ہر خوشی ہر خواہش کی قربانی دے دی وہ سب بوجھ اتار کر بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا اور زاہدہ کی شادی کی مصروفیات میں مصروف ہوگیا۔

وہ ہر وقت کھویا، کھویا سا رہتا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اس کی چھٹیاں ختم ہورہی

تھیں اور اب وہ اس دیس جانا نہیں چاہتا تھا جہاں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا تھا۔ وہ پھپو اور نعما سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا، نہ وہ اپنا ٹوٹا بکھرا وجود اُن کے سامنے لے کر جانا چاہتا تھا، اس لیے بہت غور کیا پھر اس نے آفس میں استعفیٰ کے ساتھ پھپو کو بھی مختصر سا پیغام بھیج دیا۔

''پھپو میں یہاں کی ریت اور رواج کے آگے ہار چکا ہوں آپ سب مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' وہ صرف اتنا ہی لکھ سکا تھا یہ چند الفاظ لکھنے میں ہی وہ کرب کی انتہائی منزلوں سے گزرا تھا۔

اس کی شادی قریب تھی تو اس نے امی، ابا کے اصرار پر جالندھر میں ہی ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ صبح جاتا اور شام کو آجاتا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رضیہ بھی اس کی طرح مجبور تھی اور اب دونوں کی مجبوریاں سمجھوتوں کی کڑی بن کر تمام عمر انہیں ایک زنجیر سے باندھ رکھیں گی اور پھر وہی ہوا رضیہ دلہن بن کر اس کے گھر آگئی اور وہ دونوں خاموشی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر ہر بچے کی آمد فرائض میں اضافہ کرتی گئی جسے وہ خوش اسلوبی سے نبھاتے چلے گئے۔ برسوں پہلے دہلی سے قطع تعلق کر لینے کے باوجود وہاں سے آنے جانے والوں کے ذریعے اسے پھپو کے گھر کے حالات کا علم ہوتا رہتا۔ اسے سب معلوم تھا کہ حسیب بھائی اور محب بھائی کی کتنی اولادیں ہیں، صہیب کی شادی کب ہوئی، شازیہ دلہن بن کر کب اور کہاں رخصت ہوئی اور یہ کہ نعما بی ایڈ کر کے ٹیچر ہو گئی۔ اس نے شادی نہیں کی۔ پھپو اب کافی کمزور ہو گئی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ وہ اپنی مصروفیات میں گم ہوتا چلا گیا۔ ابا اور امی کی وفات کے بعد تو اس کی اور رضیہ کی ذمے داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں کہ اب اسے کہیں کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ ہو گیا جس نے دنیا کے نقشے پر ایک نئے اسلامی ملک پاکستان کا نام جلی حروف سے لکھ دیا۔ بہت سے لوگوں نے اسے کچھ دن کا مذاق سمجھ کر جھٹلانے کی کوشش کی اور بہت سے لوگ قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنی جانوں اور عزتوں کی قربانیاں دیتے ہوئے جوق در جوق پاکستان کی طرف روانہ ہونے لگے، ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم علاقوں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا اور روزانہ کوئی نہ کوئی علاقہ ان کی بربریت کا نشانہ بنتا تھا اور جب اسی قتل و غارت گری کے سیلاب کا ریلا ان کے آس پاس کے علاقوں تک آپہنچا تو یہاں والوں نے بھی اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے یہاں سے روانگی کا ارادہ کیا تو رافع بھی اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ یہاں سے جانے کو تیار تھا۔

سب نے اپنے بھرے پُرے گھر بار چھوڑ دیے اور صرف تن کے کپڑوں میں اپنی عزت و آبرو بچا کر رات کی تاریکی میں بیل گاڑیوں پر قافلے کی صورت اپنے آبائی علاقے پر حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے نئے سفر پر روانہ ہو گئے، وہ بہت خاموشی سے سفر کر رہے تھے، جانے کس علاقے تک پہنچے تھے کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی، اچانک ہی ہتھیاروں سے لیس بلوائیوں نے درختوں سے نکل کر ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، پچھلی بیل گاڑیوں سے چیخ و پکار کی آوازیں سن کر باقی سب اندھیرے میں اپنی جان بچانے کے لیے جس طرف منہ اٹھا دوڑ پڑے اچانک بدحواسی اور افراتفری میں بچوں کے ہاتھ ماں، باپ کے ہاتھوں سے نکل گئے کسی کو بھی کسی کی خبر نہیں تھی کہ کہاں گیا اور سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

پاکستان کی سرحد پر اس کے علاوہ لاہور اور کراچی میں فوج کے انکوائری آفس کھل چکے تھے جہاں بڑی، بڑی فائلوں میں ہجرت کر کے آنے والوں کے نام کا اندراج کیا جاتا تھا۔ رافع نے سرحد پر پہنچتے ہی اپنے بیوی بچوں کا نام تلاش کیا پھر وہ لاہور اور کراچی سب جگہ اُن کے نام تلاش کرتا رہا پھر وہ انہی علاقوں

میں سفر کرتا رہا اور اُن کے نام تلاش کرتا رہتا لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوئی کوئی بھی تو وہاں نہ پہنچا تھا اس کی دنیا اندھیر تھی پھر بھی اندر کہیں امید کا ایک دیا روشن تھا اسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ بے انتہا بڑی داڑھی اور میلے سے چوغے میں وہ پاگلوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتا رہا۔ اس وقت سرحد کے دونوں طرف آمدورفت جاری تھی۔ اس لیے وہ انڈیا جس شہر تک جاسکتا تھا وہاں بھی آتا جاتا رہا آخر ایک دن امرتسر میں اسے اپنے تین چھوٹے بچے مل گئے جو کسی بے اولاد سکھ میاں، بیوی نے اپنوں بچوں کی طرح سکھ حلیے میں ہی رکھ لیے تھے، انہیں رافع کی حالت اور گریہ وزاری پر ترس آگیا تو انہوں نے اُن سب کو چھپا کر خفیہ طور پر اسٹیشن پر اس کے حوالے کردیا۔ تین بچے پا کر اس کی کافی ڈھارس بندھی تھی لیکن ابھی تین بچوں اور رضیہ کے لیے اس کی تلاش جاری تھی اسے اپنے چھ ماہ کے بچے کا خیال آتا تو وہ سوچتا کہ وہ بھی رضیہ کے پاس ہوگا اسے یاد ہی نہیں آیا تھا کہ حملے کے وقت وہ کس کی گود میں تھا۔ رضیہ کی یا اس کی چودہ سالہ بیٹی ساجدہ کی۔ وہ اپنے تینوں بچوں کے لیے سرحد پر لگے خیمے میں رہ رہا تھا۔ اسے اپنے بیوی بچوں کے علاوہ بہن، بھائی کا بھی انتظار تھا لیکن کسی کی بھی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی، یہاں پر اور رشتے داروں سے بھی ملاقات ہوجاتی تھی جو اُسی کی طرح اپنے عزیزوں کی تلاش میں تھے۔ ایک دن باقر بھائی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ انہیں رافع اور بچوں کی حالت پر بہت افسوس ہوا اور وہ زبردستی اسے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں ان کی فیملی تھی ان میں جا کر بچے کچھ بہل گئے تو اسے بھی کچھ اطمینان ہوا لیکن تلاش کا سفر جاری تھا۔ ایک دن اچانک اس کا بڑا بیٹا آٹھ سالہ صائم بھی کسی مہربان کے ساتھ اس تک پہنچ گیا۔ وہ فائل میں اس کا نام اور پتا پڑھ کر یہاں پہنچ گئے تھے، باپ، بیٹا ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت دیر روئے۔ عارفہ، ندیم اور مثال بھی بھائی سے لپٹ کر خوب روئے، اس نے بتایا۔

”میں باجی ساجدہ اور ننھا بھائی ساتھ تھے‘ دو دن ساتھ رہے کہ دو سکھوں نے ہمیں دیکھ لیا، ایک سکھ نے باجی کو پکڑ لیا تھا اچانک کہیں سے ایک بزرگ آگئے جنہوں نے دوسرے سکھ کی کرپان چھین کر باجی کے سینے میں اتار دی۔ انہوں نے میرے سامنے تڑپ کر جان دے دی وہ بزرگ بھی سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے، میں چپکے سے شیر خوار بھائی کو سینے سے لگائے جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ پھر جنگل، جنگل چلنے لگا۔ آخر ایک پیدل قافلے میں شامل ہوگیا۔ ہم دن بھر جنگل میں چھپے رہتے‘ جنگلی پھل اور پتے کھاتے اور بچوں کو چباتے‘ رات ہوتے ہی سفر شروع کردیتے پھر یہ ہوا کہ جب کوئی بچہ بلک کر روتا تو وہاں سے گزرتے بلوائی آجاتے اور کچھ عورتوں اور لڑکیوں کو چھین کر لے جاتے، یہ صورت حال بہت پریشان کُن تھی اس لیے ایک دن قافلے والوں نے ایسا فیصلہ کیا کہ جس سے ان کی روح تک زخمی ہوگئی لیکن یہ قربانی دینا عزت و آبرو بچانے کے لیے ناگزیر ہوگئی تھی۔ سب نے ہی چلنے سے پہلے اپنے معصوم بچوں کو سلا کر زمین پر لٹا دیا تھا پھر زبردستی اس کے بھائی کو بھی چھین کر وہیں لٹا دیا وہ بہت تڑپا بہت رویا تو انہوں نے اسے سمجھایا کہ ہم ماں، باپ ہوتے ہوئے اپنے جگر گوشوں کو یہاں اللہ کے سپرد کررہے ہیں تو تم تو خود بچے ہو اسے کیسے سنبھالو گے اور ایک بچے کی خاطر ہم اپنی اور عزتوں کو کافروں کے حوالے نہیں کرسکتے۔ عزتیں بچانے کے لیے تو ہم نے یہ ملک چھوڑا ہے، اگر ہمارے ساتھ چلنا ہے تو تمہیں بھی یہ قربانی دینی ہوگی پھر ہم دور تک بچوں کو دیکھتے اور روتے چلے آئے، وہ ایسا وقت تھا کہ کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔“ یہ دردبھری داستان ختم کر کے وہ اس طرح تڑپ، تڑپ کر رویا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا، اتنا سا بچہ اور درد کا اتنا بڑا صحرا کس طرح پار کر کے آیا تھا‘ رافع کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ کر اس کی داڑھی کو بھگوئے جارہے تھے باقر بھائی بھیگے لہجے

سے انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔

دن امید اور نا امیدی کی کشمکش میں بیتتے جا رہے تھے، رافع کو بھی کوشش کے بعد ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی لیکن وہ اور بچے اب بھی باقر بھائی کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ بچوں کا بھی تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ باقر بھائی اور ان کی فیملی بہت اچھی تھی وہ سب ان بچوں کا پوری طرح خیال رکھ رہے تھے۔ پھر ایک دن صائم کی طرح فہیم بھی اچانک اُن کے پاس پہنچ گیا تو سب کے زخم پھر ہرے ہو گئے وہ بہت دیر تک ایک دوسرے کے دکھ سنتے رہے جو اُن سب کے مشترکہ دکھ تھے، فہیم نے بتایا۔ ''میں کلکتہ سے ڈھاکا پہنچ گیا تھا، زاہدہ باجی اور رشید بھائی بھی وہیں پہنچ گئے تھے ہمیں جب وہاں آپ کا علم ہوا تو بہت خوشی ہوئی وہ دونوں بھی اب آنے والے ہیں۔'' دھیرے، دھیرے سب کا ہی پتا چل رہا تھا لیکن رضیہ ہنوز لاپتا تھی۔ اب تو بچوں کو بھی ہر گھڑی اپنی ماں کا انتظار رہتا تھا۔ جہاں سے بھی کسی عورت کے متعلق کوئی جھوٹی سچی خبر ملتی وہ وہیں پہنچ جاتے اور مایوس لوٹتے، نہ جانے رضیہ کہاں تھی زندہ بھی تھی یا شہید ہو چکی تھی، وہ تنہائی میں اسی کے متعلق سوچتا رہتا، اب اس کی ایک، ایک بات اس کے ساتھ گزارا ایک، ایک پل یاد آ کر اسے بے چین کر دیتا۔ اس نے اسے جگہ، جگہ ڈھونڈا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔

☆☆☆

پھر ایک دن حسیب بھائی مع اپنی فیملی کے رافع کو مل گئے اور اپنے گھر لے گئے، اسے محسوس ہوا جیسے وہ اُن کے دہلی والے گھر میں ہی آ گیا ہو، وہی ماحول تھا اور گھر اس سے بھی بڑا، اچھا اور سجا سجایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ تو گورنمنٹ ملازم تھے اس لیے گورنمنٹ کی طرف سے چلائی گئی ٹرینوں میں بحفاظت آ گئے تھے۔ یہاں آ کر ان کے گریڈ بھی بڑھ گئے تھے تو اسی مناسبت سے انہیں فرنشڈ سرکاری گھر بھی ملے ہیں۔ انہوں نے رافع کو سب سے ملوایا، سب کو ہی اس کے حالات اور رضیہ کے نہ ملنے پر سخت افسوس ہوا، پھپو بھی انہی کے ساتھ رہتی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھی۔ وہ اسی پُرشفقت رویّے سے اس سے ملیں، نعما نے تو شادی نہیں کی تھی اس لیے وہ بھی انہی کے ساتھ رہتی تھی لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ان سے ملنے کے بعد اور رشتے داروں کے متعلق بھی پتا چلا اور ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، باقر بھائی اور ان کی بیوی رافع کو مسلسل شادی کے لیے اکساتے رہے تھے اور بچوں کے لیے ماں کی اہمیت پر زور دیتے رہتے تھے۔ آخر وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ رافع بھی اب رضیہ کی طرف سے مایوس ہو چلا تھا اور رضیہ کے کھو جانے کے بعد نعما کا مل جانا بھی اسے اللہ کی طرف سے ایک مصلحت لگی۔ نعما جو اس کی پہلی محبت تھی برسوں گزر جانے کے بعد آج بھی اس کے دل میں بسی ہوئی تھی، آج بھی اس کے نام سے دل دھڑک جاتا تھا۔ بیوی، بچوں میں اتنی محبتیں بانٹنے کے باوجود نعما کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی شاید اس کی محبت الگ ہی ایک اکائی تھی جو اپنی جگہ بدستور قائم تھی۔ اور نعما نے شادی نہ کر کے اب تک خود اپنے وجود کو بھی تو ایک اکائی میں ہی ڈھالے رکھا تھا۔

بہت دیر تک خیالوں میں الجھا رہا اور اپنے آپ کو سمجھاتا رہا پھر اس نے شادی کے لیے رضامندی دے دی تو باقر بھائی بہت خوش ہوئے اور اس کا عندیہ لے کر کچھ رشتے داروں کے توسط سے اس کا رشتہ نعما کے لیے دے دیا۔ زندگی میں اب کچھ ٹھہراؤ آنے لگا تھا۔ فہیم کی بھی بہت اچھی جاب لگ چکی تھی وہ اپنی جاب سے مطمئن تھا اس لیے رافع نے فیصلہ کیا کہ اس کی اور فہیم کی شادی ساتھ، ساتھ ہی ہو۔ اس لیے اس کے لیے بھی لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی اب انہوں نے ایک گھر بھی لے لیا تھا اور اس میں شفٹ ہو گئے تھے اور کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لی تھی۔

☆☆☆

پھر ایک دن رافع نے بہت بڑی دعوت کر ڈالی،

بہت لوگ تھے پھپو کی بھی ساری فیملی مدعو تھی۔ زاہدہ بھی اپنے بھائیوں کی خوشی میں چہکتی پھر رہی تھی۔ رافع کی نظروں نے نعما کو تلاش کر لیا جو عارفہ اور شانی سے ہنس، ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اپنے بچوں کے لیے اسی شفقت کو دیکھا جو پھپو کی آنکھوں میں اس کے لیے ہوتی تھی تو اس کے دل میں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔ نعما کو دیکھ کر آج پھر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی اس کا سڈول جسم ساڑی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی پرسنالٹی کتنی پُرکشش ہو گئی تھی وہ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر قدرت کو ان کا ملاپ منظور تھا تو درمیان میں اتنے طویل صحرا کی مسافت کیوں رکھی تھی۔

فہیم کے لیے بھی لڑکی ڈھونڈ لی گئی تھی۔ باقر بھائی کی خوب صورت تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی بیٹی عائشہ اس کے لیے سب کو اچھی لگی، باقر بھائی نے اس کا رشتہ بخوشی منظور کر لیا تھا۔ جس میں عائشہ کی پوری رضامندی تھی۔ نعما نے بھی رافع کا رشتہ منظور کر لیا تھا۔ بچے تو نعما سے ملنے کے بعد اس کا ہی ذکر کرتے رہتے تھے یعنی نعما نے اور بچوں نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا اور اپنے انتخاب پر خوش تھے۔

رافع نے اپنی شادی کی تاریخ چودہ اگست مقرر کی تھی یہ کہ تاریخ دنیا کے نقشے پر ہی نہیں اس کی زندگی میں بھی انقلاب لائی تھی۔

اور فہیم کی شادی چھ ستمبر رکھی تھی کہ اسی تاریخ کو وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ بچوں کو علم تھا کہ نعما ان کی امی بن کر اس گھر میں آ رہی ہیں اور وہ اس بات پر خوش اور مطمئن تھے۔ یہ طے پایا تھا کہ ان کا نکاح سادگی سے ہوگا جس میں گھر والوں کے علاوہ چند قریبی رشتے دار مدعو ہوں گے، نعما نے بھی روایتی دلہن بننے سے انکار کر دیا تھا کہ بچے اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر اس سے جھجک نہ محسوس کریں وہ تو ان کی امی بن کر اس گھر میں جانا چاہ رہی تھی اس لیے رافع اس کے لیے بنارسی ساڑی اور ہلکی سی جیولری لایا تھا۔ آج اس کا نکاح تھا صبح سے ہی بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ نکاح کے بعد زاہدہ اور اس کا میاں بھی فہیم کے ساتھ رافع کے گھر چلے گئے تھے۔

اس کے بعد رافع اور نعما گھر کے لیے روانہ ہوئے اور اس وقت تک بارش تیز ہو چکی تھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ راستے میں وہ نارمل انداز میں کل ہونے والی ولیمے کی شاندار دعوت پر گفتگو کرتے رہے لیکن یہ سب اوپری باتیں تھیں جو ان احساسات اور خیالات کو دبانے کے لیے تھیں جو اُن کے دل میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ اور جنہیں وہ ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہے تھے لیکن خیالات تھے کہ مچل، مچل کر انہیں بے چین کر رہے تھے۔ رافع کو کچھ یاد آیا کہ اس دن بھی ایسی ہی بارش تھی جس میں وہ دیر تک نہاتے ہلا گلا کرتے رہے تھے اور پھر جدا ہو گئے تھے اور وہ بارش نعما کی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ساون کا موسم ہی رہتا تھا اور آج بھی وہی ساون تھا وہی بارش تھی جس نے رافع کو اس سے ملا دیا تھا۔ اس ساون سے اس ساون تک کا طویل سفر کس قدر خشک، پتھریلا اور کٹھن تھا۔ وہ سوچ میں گم تھی جب رافع نے اپنا گرم ہاتھ اس کے نم ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے چونک کر رافع کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں بھی یادوں کا عکس لہرا رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر دروازے تک پہنچتے، پہنچتے بارش میں بالکل بھیگ چکے تھے، اندر قدم رکھتے ہی بچوں نے ان پر پھولوں کی بارش کر دی، سارا گھر پھولوں، پکوڑوں اور گلگلوں کی ملی جلی خوشبو سے مہک رہا تھا، لباس تبدیل کر کے وہ سب گلگلوں اور پکوڑوں پر پل پڑے تھے۔ بچے اور نعما ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔ زاہدہ اور فہیم بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ آج رافع کو اپنے گھر میں وہی بے تکلف دوستانہ خوشگوار ماحول نظر آ رہا تھا جس کی تمنا برسوں پہلے اس کے دل میں جاگی تھی۔ اس کی آنکھیں سجدۂ شکر ادا کر رہی تھیں اور وہ خوشیوں کی برسات میں پور، پور بھیگ چکا تھا۔



ناولٹ

پتھر کا دیس

مدیحہ شاہد

چوتھا حصہ

اس کی آنکھوں میں سورج کی اجلی کرنوں جیسی روشنی تھی۔

”کیسا شاندار نام ہے، ہے ناں؟“ احمر نے مسکرا کر سب سے تعریف چاہی۔

”بالکل۔“ شہرام نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”آخر منگیتر کس کی ہے؟“ احمر نے کالر کھڑے کیے، علیزہ کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ در آئی۔



''اچھا! تو علیزہ صاحبہ کے سب Credits تم ابھی سے لینے لگے ہو۔'' شہرام نے شرارت سے کہا۔

''وہ کیا کہتے ہیں...... کہ ایک جان دو قالب۔'' احمر نے قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں علیزہ کے لیے بہت محبت تھی۔

''شکر ہے کہ آج میرے ہونے والے ساس، سسر گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''امی، ابو، بھابی کے میکے گئے ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ بھابی، آج کل وہیں ہیں۔'' علیزہ نے بتایا۔

رامین، شیرو کو کیک کھلا رہی تھی۔ ساتھ، ساتھ اس کے کپ میں چائے بھی ڈال رہی تھی وہ بھی بڑوں کی طرح چائے پیتا تھا۔

''تم نے تو ابھی سے ہی اپنے سسرال والوں سے بغض پال لیا۔ آگے کیا ہوگا احمر میاں۔'' شہرام نے شرارت سے چائے پیتے ہوئے کہا۔ احمر نے جواباً اسے چپکے سے آنکھ ماری۔

''رامین تمہارے لیے ایک...... سرپرائز ہے...... میں ابھی لاتی ہوں۔'' علیزہ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا اور شیرو کا ہاتھ اور اس کی پلیٹ تھام کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہاں اس نے شیرو کو ٹی وی پر کارٹون لگا دیے۔

''شہرام! مجھے تمہیں کچھ ضرور باتیں بتانی ہیں۔'' احمر نے بہت مدھم آواز میں اس سے کہا۔

''اچھا...... مگر تم نے تو مجھے سب باتیں بتا دی تھیں۔'' شہرام کی آواز آہستہ ہوگئی۔

''ہاں...... مگر کچھ بہت ضروری چیزیں رہ گئی تھیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ راز بھی عیاں ہو جائیں۔''

وہ مبہم لہجے میں بولا۔

شہرام خاموشی سے چائے پینے لگا۔

علیزہ چند لمحوں بعد کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا جیولری بکس تھا۔ اس نے اسے خاموشی سے رامین کو تھما دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ بھی تھا جسے اس نے رامین کی گود میں رکھ دیا۔

رامین نے حیرت سے وہ جیولری بکس کھولا تو اس کی چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔ اس میں اس کی مرحومہ امی کے زیورات تھے۔ وہ حیرت و خوشی سے ایک، ایک زیور ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

''یہ...... یہ کیسے واپس مل گئے؟'' وہ ان زیورات کو عقیدت سے چھوتے ہوئے دم بخود انداز میں پوچھ رہی تھی۔ اس کی مرحومہ ماں کی نشانی، اس کے سونے اور کندن کے خاندانی زیور...... وہ یک دم ایکسائٹڈ ہوگئی۔ یہ زیورات اسے برسوں بعد واپس ملے تھے۔ کھوئی ہوئی چیزیں مل جائیں تو انسان کو ایسی ہی اچانک خوشی دیتی ہیں۔

''تیمور آفندی نے خود اپنے ہاتھ سے دیے ہیں۔'' علیزہ نے پُراعتماد انداز میں بتایا۔ اس کی آنکھیں فتح کی روشنی سے منور تھیں۔ چہرے پر تفاخر کا عکس تھا۔

رامین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہاتھ میں پکڑی زمرد کی جڑاؤ انگوٹھی نیچے گر گئی۔ جسے علیزہ نے سرعت سے اٹھالیا۔ رامین نے جیولری بکس ایک طرف رکھ دیا اور گود میں پڑا سفید لفافہ کھولا۔ اس میں ایک چیک موجود تھا۔ چیک پر لکھی رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ ساری رقم تیمور آفندی سے نکلوائی ہے۔ یہ سب تمہارا پیسہ ہے رامین۔'' علیزہ نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

''اور اب تیمور آفندی کی کیا حالت ہوگی...... تمہیں پتا چلے تو تم مارے خوشی کے کہیں... بے ہوش ہی نہ ہو جاؤ۔'' احمر اعتماد سے مسکرایا۔

رامین نے وہ چیک واپس لفافے میں رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں گہری خاموشی تھی۔

''مگر اس نے رامین کی رقم اور زیورات کیسے

واپس کر دیے؟'' شہرام نے رامین کے چہرے کی اڑی رنگت دیکھ کر آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں، کچھ باتیں رہ گئی تھیں، جن کے بارے میں، میں نے کہا تھا کہ یہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔'' احمر چند لمحے رکا، گہری سانس لی پھر کہنے لگا۔

''ہم نے ایک زبردست سا پلان بنایا۔ اس لیے میں تم سے اس وقت چھپتا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہمیں سب کچھ بہت راز داری سے کرنا تھا۔ سوچا تھا کہ پلان کامیاب ہونے کے بعد تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ اس پلان کو بنانے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں کافی سال لگ گئے۔ میں نے اور گڑیا نے اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد جابز کیں، سیونگ کیں کیونکہ اس پلان پر عمل کرنے کے لیے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ سو ہم نے خود کو اسٹیبلش ...... کر کے کافی رقم جمع کی، تھوڑے خود مختار ہوئے تو اس پلان پر کام شروع کیا جو ظلم تیمور اور اس کے خاندان نے رامین کے ساتھ کیے، انہیں اس کا حساب بھی تو دینا تھا۔ ہم نے جو پلان بنایا وہ کامیاب ہوگیا۔ تیمور اور اس کی ماں کو بے وقوف بنانا زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ ان کی ایک ہی کمزوری ہے۔ دولت، پیسے کی لالچ اور ہوس...''

شہرام سنجیدگی سے سب سن رہا تھا۔ رامین کے چہرے پر ڈھلتی شام کے سائے تھے۔

''میں نے وہ گاڑی تیمور آفندی سے ہی خریدی تھی مگر مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ یہ وہی تیمور آفندی ہے کیونکہ گاڑی تیمور کی ماں کے نام تھی اور میں تو شوروم میں بیسیوں سیکنڈ ہینڈ گاڑیوں کی سیل کرتا ہوں، جب ہم نے تفصیلات اکٹھی کیں تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ گاڑی دراصل رامین کی گاڑی تھی۔'' احمر نے سنجیدگی سے بتایا۔

''اسی دوران جب میں حالات سے لڑ رہی تھی اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی تو میں نے ابو کی گاڑی ایک شاپنگ مال کے باہر دیکھی۔ میں وہاں شیرو کے لیے کچھ چیزیں لینے گئی تھی۔ میں ابو کی گاڑی دیکھ کر جذباتی ہوگئی اور شہرام سے میری واقفیت ہوئی۔ اور یہ واقفیت شناسائی میں بدل گئی۔'' رامین کہتے، کہتے رک گئی، علیزہ نے شوخی سے اس کی بات کاٹی۔

''اور پھر پتا ہی نہیں چلا کہ رامین محترمہ نے کب محبت کے راستے پر قدم رکھ دیے۔'' علیزہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اوہو...... یعنی آگ دونوں طرف برابر لگی ہے۔'' احمر نے ماحول کی گمبھیر سنجیدگی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''اور شہرام صاحب نے وہ گاڑی تحفے کے طور پر رامین کو دے دی۔ واہ، واہ ایسی دریا دلی، بھئی مجنوں اور رانجھے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا تم نے۔'' احمر نے دانستہ ہنستے ہوئے کہا۔

''محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑی، بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔'' علیزہ نے شوخی سے فلسفہ جھاڑا۔

''بالکل، میں نے علیزہ کو کھلے دل کے ساتھ اس پلان پر عمل کرنے کی اجازت دی اور خود بھی ساتھ سارے کام کرتا رہا۔ میں اور علیزہ بچپن کے دوست اور ہمسائے تھے۔ پھر ہم لوگ شفٹ ہو کر دوسرے شہر آگئے مگر محبت فاصلوں کے باوجود قائم رہی۔'' احمر بتا رہا تھا۔

''اصل محبت تو وہ ہی ہوتی ہے جو فاصلوں کے باوجود قائم رہتی ہے، اب تیمور آفندی مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوگا مگر ہم نے بھی سب نشان مٹا ڈالے۔'' علیزہ نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

''مگر تم لوگوں نے پلان کیا، کیا تھا؟''

''تفصیل سے بتائیں گے، یہ ایک لمبی داستان ہے، جس دن تم مجھ سے مری میں ملے تھے، اس وقت میں وہاں رامین اور شیرو کو کچھ چیزیں پہنچانے گیا تھا اور پھر علیزہ کے ابو کی ہدایات پر میں شیرو کے ہاسٹل بھی جایا کرتا تھا۔'' احمر نے کہا۔

''ابھی کچھ دیر آپ لوگ ریسٹ کریں، لمبے سفر سے آئے ہیں پھر ہم تفصیل سے بات کریں گے...... کیوں رامین۔'' علیزہ میز پر سے برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

رامین کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی، شہرام نے

مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

☆☆☆

گئے دنوں کی بات ہے جب سارے موسم اچھے ہوا کرتے تھے۔ رامین اپنے امی، ابو کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی، وہ شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اکلوتی بیٹی تھی، ماں، باپ نے اس کے ہر ممکن ناز اٹھائے...... زمین پر اگر کوئی جگہ جنت ہوتی ہے تو وہ بس ماں، باپ کا ہی گھر ہوتا ہے۔

رامین کے والد کو کاروبار میں نقصان ہوا تو انہوں نے بینک سے قرض لے لیا مگر کاروبار مزید ڈوب گیا، وہ قرض ادا نہ کر سکے۔ پولیس گھر تک آگئی، رامین کے ابو کو اچانک ہارٹ اٹیک آگیا اور وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اچانک ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ وہ ایک سیاہ دن تھا، جب گھر سے ابو کا جنازہ اٹھا، وہ اور امی روتی، چیختی رہ گئیں، مگر جانے والے بھلا کب واپس آتے ہیں۔ ابو کے جانے کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے، امی نے ان سب مسائل سے بچنے کے لیے گھر بیچ دیا اور خود وہ دونوں ماں، بیٹی کرائے کے گھر میں آگئیں، گھر بیچ کر انہوں نے بینک کا قرضہ ادا کیا، جو رقم بچی وہ بینک میں ڈال دی، رامین کے مرحوم ابو نے اس کے نام پر ایک پلاٹ بھی لے رکھا تھا، امی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا، وہ رامین کے مستقبل کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ رامین کے نام کوئی جائداد ضرور رکھیں، وہ پلاٹ اس وقت ایک ویران سے علاقے میں تھا، اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں تھی، اگر وہ پلاٹ بیچ بھی دیتیں تب بھی اتنی رقم نہ ملتی کہ قرض ادا ہو پاتا یا ان پیسوں میں کوئی اچھا گھر مل سکتا۔

ایسے میں امی کے خالہ زاد بھائی مدد کو آئے، وہ کسی زمانے میں رامین کی امی کے منگیتر رہ چکے تھے۔ رامین انہیں واصف ماموں کہتی تھی، کبھی امی اور واصف ماموں میں بہت محبت ہوا کرتی تھی اور محبت کا مقدر تو جدائی ہی ہوتا ہے سو کسی خاندانی تنازعے کی وجہ سے وہ منگنی بڑوں نے ختم کر دی...... بعد میں رامین کی امی، رامین کے ابو کے ساتھ ایڈجسٹ ہو گئیں اور پھر کافی سال امی، واصف ماموں سے نہیں ملیں، جب مشکل وقت آیا اور سب اپنوں نے منہ موڑ لیا تو انہوں نے واصف ماموں کو بلالیا، امی شدید بیمار ہو گئیں۔

اسپتال کے یخ کمرے میں لیٹی وہ خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتیں، رامین ان دنوں انٹر کے امتحان دے کر فارغ تھی، وہ ابھی ناسمجھ تھی، اسے دنیا کی سفاکی کا اندازہ نہیں تھا۔

''امی آپ ٹھیک ہو جائیں گی، یہاں بہت قابل اور اچھے ڈاکٹرز ہیں۔'' اس نے امی کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی۔

''زندگی اور موت ڈاکٹروں کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے بیٹا۔'' نہ جانے کیوں امی اتنی آزردہ رہتی تھیں، وہ کم عمر تھی، ان کی آنکھیں نہیں پڑھ سکتی تھی۔

''اللہ ہمارے ساتھ ہے، آپ کیوں فکر کرتی ہیں، برا وقت بھی جلد گزر جائے گا۔'' وہ دنوں میں بڑی ہو گئی تھی، سمجھدار باتیں کرنے لگی تھی۔ امی اسپتال کے بیڈ پر پڑی خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتیں، اس کے چہرے پر نوعمری کی معصومیت تھی۔

''برا وقت اتنی جلدی نہیں گزرتا، بعض دفعہ یہ صدیوں کا ساتھی بن جاتا ہے۔'' اُن کی آنکھوں میں بے انتہا مایوسی اور دکھ تھا۔

''اگر آپ ایسا ہی سوچتی رہیں گی تو کیسے ٹھیک ہوں گی، میری ٹیچر بتاتی تھیں کہ ہر رات کے بعد ایک صبح ہوتی ہے۔'' اس نے اپنے تئیں بہت سمجھداری دکھائی۔

وہ اپنی ماں کی اداسی اور مایوسی ختم کر دینا چاہتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں ایسا کوئی جادو نہیں تھا، اس کے پاس صرف ایک مسکراہٹ تھی، جس سے وہ اپنی ماں کے دل کا درد دور کر سکتی تھی۔

''واصف آفندی نہیں آئے اب تک؟'' انہوں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

''نہیں آئے تو نہ آئیں...... امی، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ آپ رشتے داروں کو فون کرتی رہتی ہیں اور وہ لوگ نخرے کرتے ہیں...... مصروفیت کا بہانہ بنا کر نہیں آتے۔'' اسے غصہ آگیا، جب تک انسان زندگی کا سیاہ چہرہ نہیں دیکھ لیتا، اس میں بڑی انا ہوتی ہے۔

''وہ ایسے نہیں ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئیں گے...... اور تم اُن کے ساتھ چلی جانا بیٹا۔'' امی کی آواز بھرّا گئی تھی، انہوں نے بہت سے آنسو دل ہی دل میں اتار لیے۔

''میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی، بس آپ کے ساتھ اپنے گھر میں رہوں گی۔'' وہ ضدی انداز میں بولی...... اکلوتی اور لاڈلی بیٹی جو تھی۔ امی آزردگی اور خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں کہہ نہ سکیں کہ اگر نہیں کچھ ہو گیا تب وہ کیا کرے گی، وہ ابھی سے اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں اور شاید وہ اس کی امید بھی نہیں توڑنا چاہتی تھیں۔

اور پھر اگلے ہی دن واصف ماموں آگئے، انہیں دیکھ کر امی کی آنکھوں میں چمک آگئی، وہ تازہ دم انداز میں اٹھ بیٹھیں...... وہ یونہی خوش ہو گئیں جیسے انسان کسی بہت اپنے کی آمد پر خوش ہوتا ہے۔

درمیانے قد اور گہرے بالوں والے باوقار سے واصف ماموں اسے پہلی نظر میں ہی اچھے لگے، وہ اس کے لیے بہت سے تحفے لائے تھے، اس رات امی اور واصف ماموں برسوں پرانی باتیں کرتے رہے، دونوں کا ہی حافظہ اچھا تھا۔ وہ ہتھیلیوں میں چہرہ گرائے کرسی پر بیٹھی ان دونوں کی باتیں سنتی رہی۔

اگلے دن امی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی، وہ امی کے سرہانے بیٹھی روتی رہی، امی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں، کبھی ہوش میں آجاتیں، کبھی بے ہوش ہو جاتیں، اس رات واصف ماموں اسپتال کے کمرے کے باہر بینچ پر بیٹھے روتے رہے۔

امی رات کے آخری پہر آخری بار ہوش میں آئیں، رامین نے ان سے اپنے آنسو چھپا لیے مگر

لاہور سے یارقند......

مستنصر حسین تارڑ

جہاں سے کاریز ظاہر ہوتی تھی اس دہانے کے اوپر ایک چٹان پر فارسی رسم الخط میں کاریز نقش تھا۔

میں نے ذرا جھک کر جوانی کی آسانی سے نہیں بڑھاپے کی ناتوانی سے بہ مشکل جھک کر اس نیم تاریک خلا میں جھانکا جس میں کاریز کے پانی کروٹیں بدلتے سرسراتے ہوئے چلے آرہے تھے۔

صرف یہ جاننے کے لیے کہ کیا ان پانیوں میں کوئی ایک اندھی مچھلی ہے...... نہیں تھی، اگر ہوتی تو وہ میں ہوتا...... ایک ناانصاف، مذہبی تعصب سے آلودہ تنگ نظر اور دل آزار معاشرے میں ایک ایسی اندھی مچھلی جسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا...... وہ زیرزمین اندھیاروں میں بھٹکتی پھرتی ہے، اسے کہیں بھی روشنی نظر نہیں آتی اور وہ سدا سے نابینا نہ تھی، اس کی آنکھیں ہوا کرتی تھیں...... پر ان پر جبر، استبداد اور دہشت کی پٹی کس کے باندھ دی گئی...... اور اس پٹی کے اوپر ایک سیاہ پٹی تھی جو اپنی ایجاد کردہ شریعت کے موت کے پیامبروں نے باندھ دی تھی۔ جن کے نادان بچے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا کر ''کافروں'' کے گلوں پر خنجر پھیر کر انہیں ہولے، ہولے ذبح کرتے تھے۔ ان کے سر کاٹ کر کھمبوں پر لٹکاتے تھے۔ جیسے سلطنت روم کے زوال کے دنوں میں سرکشی کرنے والوں کو صلیبوں پر گاڑ دیا جاتا تھا...... اسکول جانے والی بچیوں کی ویگن جلا کر راکھ کر دیتے تھے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والی درجن بھر بچیوں کے بدن لوتھڑوں میں تبدیل کر دیتے تھے...... اور کوئی بولتا نہ تھا...... اگر بولتا تو بچوں کے قتل کو اپنی شریعت کے مطابق جائز قرار دیتا تھا۔ دکھ تو یہ ہے کہ مذہبی سیاست داں اور کچھ صحافی اور ادیب بھی ان کی مدح سرائی کرتے تھے...... تو کیا یہ میرے حق میں بہتر نہ تھا کہ میں ایک اندھی مچھلی ہوں...... اگر میری آنکھیں ہوتیں تو میں خود انہیں پھوڑ لیتا کہ ایسے منظر مجھ سے دیکھے نہیں جاتے......

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

امی اس کے آنسوؤں سے واقف تھیں۔

''رامین، میری پیاری بیٹی، کچھ ضروری باتیں دھیان سے سن لو، بیٹا...... اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تم اپنے واصف ماموں کے ساتھ چلی جانا، وہ تمہارا خیال رکھیں گے، بیٹا ضد نہیں کرنا اُن کی ہر بات ماننا۔''

وہ اکھڑی سانسوں کے درمیان اسے نصیحت کررہی تھیں۔ رامین کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ فوراً واصف ماموں کو بلا کر لے آئی۔ ان کی آنکھیں رت جگے کے باعث سوجی ہوئی تھیں، امی انہیں دیکھتے ہوئے اداسی سے مسکرائیں۔

وہ امی کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئے۔

''واصف! میری الماری کی چابیاں رامین کے دوپٹے کے کونے میں بندھی ہوئی ہیں، اوپر والے خانے میں...... ایک صندوقچی میں میرے زیورات رکھے ہیں، وہ تم اماناً اپنے پاس رکھ لینا، جب رامین کی شادی کروگے...... تب وہ زیور اس کے حوالے کر دینا...... درمیان والے خانے میں کچھ فائلیں اور بینک کی چیک بکس پڑی ہوئی ہیں، بینک میں کچھ رقم ہے، وہ رامین کی پڑھائی کے لیے کام آجائے گی۔'' امی بہت دقت سے بول رہی تھیں، واصف ماموں کی جھکی آنکھوں میں بہت سا پانی جمع ہوگیا، رامین کا پورا وجود کانپنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ بول ہی نہیں سکی۔

''تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گی مہرالنسا......'' واصف ماموں کے کپکپاتے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ، ٹوٹ کر نکلے۔

''رامین بیٹا! تم بہت سارا پڑھنا، دیکھو! میں اتنی پڑھی لکھی نہیں تھی، اس لیے زندگی میں برے وقت کا مقابلہ نہیں کرپائی...... اور تمہارے واصف ماموں جہاں بھی تمہارا رشتہ طے کریں تم بخوشی راضی ہو جانا...... میں تمہاری خوشیوں اور آسانیوں کی دعا کرتی ہوں۔'' وہ نڈھال آواز میں کہہ رہی تھیں اور... آخری لفظ کہنے کے بعد ان کی آنکھیں بند ہوگئیں، وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئیں۔ رامین بلک، بلک کر روئی، واصف ماموں چھپ، چھپ کر روتے رہے۔

وہ ساری زندگی گم شدہ اور لاحاصل محبت کے غم میں مبتلا رہے تھے۔ محبت کا غم کبھی ہلکا نہیں ہوتا اور جس محبت میں جدائی کا موڑ آجائے، وہ محبت درد کی صورت ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔ واصف ماموں نے امی کے جنازے کے سارے انتظامات کیے۔ رامین کو تو اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔

اور پھر واصف ماموں نے ہی اس کا سامان تیار کیا، اس کی تعلیمی اسناد، الماری کھول کر سب چیزیں احتیاط سے رکھیں، اس کے زیورات، بینک کی چیزیں، دیگر کاغذات...... اور الماری کے نچلے خانے میں پڑے ایک اور ڈبے نے انہیں ساکت و جامد کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں رامین کی امی نے انہیں قطعی نہیں بتایا تھا۔ اس ڈبے میں موجود چیزوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ برسوں بعد ان چیزوں کو دیکھنا انہیں گزرے زمانوں میں لے گیا۔ چھوٹے، چھوٹے رقعے اور خط...... جو انہوں نے کبھی مہرالنسا کو لکھے تھے، جب وہ اُن کی منگیتر تھیں...... بالیاں، کانچ کی چوڑیاں، ایک پازیب، سوکھے پھول، آہ...... یہ سب تحفے تو انہوں نے برسوں پہلے انہیں دیے تھے...... برسوں پہلے یا صدیوں پہلے...... وہ زاروقطار رو دیے تو کیا مہرالنسا بھی ان کی طرح ساری زندگی محبت کے روگ کے ساتھ جیتی رہی تھی...... انہیں دُہرا روگ لگ گیا...... اور جب انسان کو روگ لگ جائے تو وہ کب تک جی پاتا ہے۔

پھپو اور گڑیا اس کے پاس ہی تھیں، پھپو تو اسے ساتھ بھی لے جانا چاہتی تھیں مگر واصف ماموں نے امی کی وصیت کے مطابق اسے ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی، پھپو اور رامین کی امی کی کبھی نہیں بنی تھی۔ دونوں میں روایتی نند، بھاوج والی لڑائی رہتی تھی، پھپو کو اندازہ نہیں تھا کہ امی اتنی شدید بیمار تھیں، ورنہ وہ پہلے ہی آجاتیں، زندگی میں دونوں کے تعلقات سرد تھے مگر امی کی موت نے پھپو کو گہرا صدمہ

دیا تھا۔ وہ اپنے رویّوں اور سرد مہری پر بہت شرمندہ تھیں۔ کاش کہ یہ احساس لوگوں کو وقت پر ہو جایا کرے۔ ہمیں لوگوں کی قدروقیمت کا اندازہ ان کے مرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

اگر امی کو اندازہ ہوتا کہ ان کے مرنے کے بعد پھپو اتنی بدل جائیں گی تو وہ شاید رامین کو ان ہی کے حوالے کر دیتیں..... مگر انسان کے اندازے صحرا کے سراب جیسے ہوتے ہیں۔

اِدھر (واصف ماموں کی بیوی) ممانی کو رامین اور اس کی امی سے شدید نفرت تھی اور یہی نفرت انہوں نے اپنے بچوں تیمور اور سویرا میں منتقل کی تھی..... سویرا تو شادی شدہ تھی، اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ اس کا میکے میں اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ ممانی کی نفرت بہت خطرناک تھی۔ ممانی نے اپنے دونوں بچوں کو بھی باپ کے خلاف کر دیا تھا۔ ممانی دونوں کو بٹھا کر رامین کے خلاف زہر اگلتی رہتیں کہ وہ ایک جادوگرنی کی بیٹی ہے ان کی دشمن کی بیٹی ہے اور ماموں، ممانی کو سمجھاتے رہتے مگر وہ ان سے ہر وقت لڑتی جھگڑتی ہی رہتیں، انہیں طعنے دیتی رہتیں کہ ماموں کے دل پر ساری زندگی اس چڑیل کا قبضہ رہا۔

ماموں نے اسے کالج میں ایڈمیشن دلا دیا۔ ممانی نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مگر ماموں نے پروا نہیں کی۔ وہ اسے کالج چھوڑنے جاتے اور لینے جاتے۔

رامین کو ممانی اور تیمور سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ممانی غصے کی تیز اور تیمور بے حد بدتمیز تھا۔

"تم کیوں ہر وقت اس یتیم بچی کے پیچھے پڑی رہتی ہو؟ وہ بیچاری کیا کہتی ہے تمہیں؟ وہ تو خود دکھی ہے، اتنی سی عمر میں اپنے ماں باپ سے جدا ہو گئی۔" ماموں نے بیچارگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"ارے تم تو اسی کی وکالت کرو گے ناں، ساری زندگی اس کی چڑیل ماں تمہارے دل پر قابض رہی۔ ارے مجھے تو نہ تم نے اہمیت دی اور نہ محبت..... اتنے برس تم اسی منحوس کے خیالوں میں گم رہے، اب اس کی بیٹی آ گئی ہے میرے سینے پر مونگ دلنے..... یہ عجیب تماشا ہے۔" ممانی ہاتھ ہلاتے ہوئے کلس کر بولیں۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، تم کیسی عورت ہو، جو ایک قبر سے حسد کرتی ہے۔" ماموں کی افسردہ آواز میں دبا، دبا سا غصہ تھا۔

"ہائے..... ساری زندگی تمہاری باتیں سنتی رہی ہوں۔ اب اس بڑھاپے میں تو مجھے سکون کی سانس لینے دو..... اوروں سے کیا گلہ کروں، میرے سب سے بڑے دشمن تو تم ہو۔" ممانی نے دہائی دی، کھینچ تان کر آنکھوں سے دو آنسو بھی نکال لیے۔ ماموں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے، تیمور، ممانی کی دلسوز مگر پاٹ دار آواز سن کر دوڑا چلا آیا۔

"امی، آپ کیوں رو رہی ہیں؟" تیمور بگڑے موڈ کے ساتھ اندر آیا، اس نے خشمگیں نظروں سے باپ کو دیکھا، وہ اپنی ماں کے آنسوؤں کے معاملے میں اچھے بیٹوں کی طرح حساس تھا۔

"اس عورت کی بیٹی اس گھر میں آ گئی ہے تو مجھے رونا ہی تو ہے۔ ارے بیٹا اب یہ ہمارا گھر نہیں رہا..... اس چھٹانک بھر کی لڑکی کا گھر ہو گیا ہے۔" وہ بیٹے کو جذباتی طور پر بھڑکاتے ہوئے بولیں، ماموں انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے۔

"ابو، ہمارا گھر کوئی یتیم خانہ نہیں ہے کہ آپ کسی کو بھی اٹھا کر لے آئیں، آپ فوراً اس لڑکی سے کہیں کہ یہاں سے چلی جائے..... ہمارے علاوہ بھی اس کے بہت سے رشتے دار ہوں گے..... ہم نے ہر ایرے غیرے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔" تیمور اکھڑے ہوئے لہجے میں بدتمیزی سے بولا۔ ممانی نے اپنے مگرمچھ کے آنسو صاف کر کے فخریہ انداز میں اپنے جوان بیٹے کو دیکھا۔

"رامین، یہاں سے کہیں نہیں جائے گی، اگر تم لوگ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو بے شک نہ رہو..... تم لوگوں کا جہاں دل کرے چلے جاؤ..... میں تم لوگوں کو جانے سے نہ روکوں گا اور نہ منتیں کروں

گا...... یہ گھر میرا ہے، یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" ماموں غصے میں آگئے تھے، تیمور اور ممانی کو سانپ سونگھ گیا۔

"دیکھ لیا تم نے بیٹا! تمہارا باپ اس لڑکی کے لیے ہمیں اس گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہا ہے، ہائے، کیا یہی دن دیکھنا رہ گیا تھا۔ ارے تمہارے ابا کا تو خون ہی سفید ہو گیا ہے، اپنی اولاد سے زیادہ پرائی اولاد پیاری ہے، ہماری تو اس گھر میں نہ تو کوئی حیثیت ہے اور نہ اوقات...... اب اس عمر میں میری اس سے زیادہ کیا بے عزتی کرو گے۔" ممانی نے غصے بھری رنجیدگی کے ساتھ کہا۔ تیمور کی مٹھیاں بھینچ گئیں، اسے رامین پر بے حد طیش آیا، وہ ہی تو تھی سارے فساد کی جڑ......

"میری بلا سے تم لوگ کسی فٹ پاتھ پر رہو یا جھونپڑی میں، اگر تم لوگ رامین کو قبول نہیں کر سکتے تو مجھے بھی کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔" ماموں نے سختی اور قطعیت سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں رگوں میں خون جما دینے والی سرد مہری تھی۔

ممانی بے رخی اور خفگی سے رخ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ تیمور غصے سے کھڑا ہو گیا۔ اسے شدید اہانت اور...... بے عزتی کا احساس ہوا تھا۔

کمرے کے باہر دروازے کے پاس کھڑی رامین سرتاپا کانپنے لگی...... اس نے ایسے لہجے بھلا کب سنے تھے...... اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی جس پر رکھی چائے کی پیالی ہولے، ہولے لرز رہی تھی۔ وہ پریشان تھی کہ کس جگہ آگئی ہے۔

تیمور سرخ آنکھوں کے ساتھ مٹھیاں بھینچتا باہر نکل گیا۔

دروازے کے ساتھ لگی رامین اسے دیکھ کر مزید سراسیمہ ہو گئی۔ تیمور نے شرر بار نظروں سے اسے گھورا۔ اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی، رامین ان نظروں کی تاب نہ لا سکی اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے تیمور سے بہت ڈر لگتا تھا۔ تیمور دانت پیستا، اسے غصے سے گھورتا تیز، تیز قدموں سے گھر سے ہی باہر چلا گیا۔ رامین کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا...... آخر اس گھر میں اس کا گزارہ کیسے ہوگا، جہاں نفرت ہو، وہاں ایک پل بھی سانس نہیں لی جا سکتی، مستقل رہنا تو دور کی بات تھی۔

چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی، وہ کب سے وہیں کھڑی تھی۔ وہ واپس کچن میں آگئی...... اس کی ہمتیں دم توڑنے لگیں۔ ممانی نے نفرت کے باوجود کچن کے کئی کام اس کے سپرد کر دیے تھے۔ اپنی طرف سے انہوں نے اس کی حیثیت کا تعین کر لیا تھا۔

اگلی صبح جب ماموں اسے کالج چھوڑنے جا رہے تھے تو انہوں نے اس کی افسردگی اور خوف کو محسوس کر لیا۔

"رامین بیٹا! انسان زندگی میں بڑے، بڑے امتحانوں سے گزرتا ہے، اسے بہت سے محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے، تم جانتی ہو کہ انسان کو کون، کون سے ہتھیار چاہیے ہوتے ہیں؟" وہ رسانیت سے گاڑی چلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ رامین ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

سفید یونیفارم میں ملبوس، بالوں کی چٹیا بنائے، وہ بے حد معصوم لگ رہی تھی۔

"حوصلہ، ہمت، صبر اور اللہ کی ذات پر کامل یقین۔" وہ سنجیدگی سے مسکرائے۔

رامین نے ان کی بات سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بیٹا، تم اپنی ممانی کے رویے پر افسردہ نہیں ہونا، زندگی میں تمہیں ایسی فطرت اور تلخ رویوں والے بہت سے لوگ ملیں گے، ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ کوئی اہمیت ہی نہیں دینی چاہیے۔ زندگی میں ہم تب ہی کامیاب ہو سکتے ہیں جب یہ سیکھ لیں کہ کن چیزوں کو اہمیت دینی چاہیے اور کن چیزوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔" انہوں نے اسے بہت نرمی سے سمجھایا۔

"جی ماموں......!" وہ مدھم آواز میں بولی۔

''میری زندگی کا بھی کیا بھروسا...... میرے بعد تمہیں اپنی جنگ خود لڑنی پڑے گی۔'' اُن کی آواز آہستہ ہوگئی تھی۔

رامین کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ ماموں کیا کہنا چاہتے تھے، وہ سمجھ نہیں پائی، کیا وہ یونہی اپنے پیاروں کو ایک، ایک کر کے جاتا دیکھتی رہے گی، وہ کچھ رنجیدہ سی ہوگئی۔

''ماموں! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں، میں ممانی کی باتوں کا بالکل برا نہیں مانتی ہوں۔'' اس نے جیسے ماموں کو تسلی دی۔

''زندگی کا کیا بھروسا، وہ بھی تو ایسے ہی اچانک چلی گئی۔ ورنہ اس کی کوئی جانے کی عمر تھی، برسوں میرے دل کو تسلی رہی کہ وہ دنیا کے کسی کونے میں موجود ہے، اپنی فیملی کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار رہی ہے، اب تو نہ دل میں کوئی تسلی ہے اور نہ امید......'' وہ رنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر حزن اور ملال کے عکس تھے۔ وہ ان کے دکھوں کی بہترین سامع تھی...... وہ اکثر اپنے دکھ اس کے ساتھ شیئر کرلیا کرتے تھے۔

''آپ بہت لمبی زندگی جئیں گے، میرا دل کہتا ہے۔'' اس نے انہیں امید دلانے کی کوشش کی۔

وہ ہولے سے ہنس دیے، کانچ ٹوٹنے جیسی کرچی، کرچی سی ہنسی۔

''اسے ان ہاتھوں سے دفنایا ہے، اس روگ کے ساتھ اب زیادہ نہیں جی سکوں گا...... دل آنسو بن جائے تو زندگی کی آنکھ سے بہہ جاتا ہے۔''

رامین کو اُن کی آواز سے خوف آنے لگا۔

''ماموں پلیز...... ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے ان باتوں سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

ماموں خاموش ہوگئے، ان کی آنکھوں میں صبح کے اجالے میں گھروں کو لوٹتے جگنوؤں کی سی اداسی تھی۔ رامین کو لگا جیسے کچھ برا ہونے والا ہے۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بات بدل کر کہنے لگے۔

''میں نے تمہاری فیس جمع کروادی ہے اور تیمور کی ڈیوٹی بھی لگائی ہے کہ تمہاری گاڑی ہر دوسرے تیسرے دن اسٹارٹ کرلیا کرے، اس طرح اس کی بیٹری ٹھیک رہے گی۔'' وہ نارمل انداز میں بات چیت کرنے لگے۔

رامین کے کالج کے آنے تک انہوں نے دوبارہ اسے کوئی خوفزدہ کرنے والی بات نہیں کہی۔

ماموں بہت اچھے انسان تھے، نہ جانے کیوں ممانی اُن کی اچھائیاں نہیں دیکھ پائیں۔ رامین کو حیرت ہوتی، وہ ممانی کے سامنے کبھی نہیں بولی۔ پھر بھی ممانی اس سے کبھی خوش نہ ہوئیں، سویرا آپا جب بھی اپنی سسرال سے آتیں، اس سے کبھی بات نہ کرتیں، تیمور زیادہ تر گھر سے باہر رہتا، گھر پر ہوتا تو اسے غصے سے گھورتا دبے، دبے الفاظ میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور وہ ماموں سے کسی کی شکایت نہیں لگاتی تھی پھر بھی سب اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس نفرت کے زہر کا تریاق اس کے پاس نہیں تھا، نہ جانے کیا چیز نفرت کو ختم کرتی ہے، اس نے تو سب گر آزما لیے مگر ناکام ہی رہی۔

اس نے اس نفرت اور ذلت کے ساتھ کمپرومائز کرلیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جب ممانی خاصے بگڑے موڈ میں بڑی بدلحاظی سے دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

اس نے بلا ارادہ ہی کتاب بند کردی۔

''آدھا دن تو تم باہر گزار کر آتی ہو اور باقی کا وقت اس کمرے میں...... تم تو نواب زادی ہو ناں۔ ہم تو تمہاری خدمت کے لیے یہاں موجود ہیں، تمہیں تو گھر کے کسی کام کی بھی پروا نہیں ہے۔ تمہیں تو بس مفت کی روٹیوں سے غرض ہے۔'' ممانی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر جلے بھنے انداز میں کہا۔..... وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''ممانی...... آپ بتائیں، میں سب کام

کر دوں گی۔'' وہ صلح جو انداز میں بولی۔

''ایسی فرمانبرداریوں کے ڈرامے میرے سامنے نہ کیا کرو۔ اس مکر و فریب سے تم اپنے ماموں کو بے وقوف بنا سکتی ہو پر مجھے نہیں، رات کے کھانے کے برتن دھونا اور کچن صاف کرنا اب تمہاری ذمّے داری ہے، مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے جو تمہیں مفت میں برداشت کروں اور تمہاری خدمتیں بھی کرتی رہوں۔ اور تم...... نواب زادیوں کی طرح اس کمرے میں پلنگ پر بیٹھی رہو۔''

وہ لڑاکا عورتوں کے سے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولیں۔

وہ خاموشی سے کچن میں آگئی اور سنک میں جمع برتن دھونے لگی، گھر کا کام ہی تو کرنا تھا، اسے منظور تھا۔ اب وہ یہاں کوئی مہمان تو نہیں تھی ناں، اس نے خود کو سمجھایا۔

''کچن اچھی طرح صاف کرنا اور خبردار رات کو فریج سے کچھ چوری چھپے نکال کر کھایا تو......'' انہوں نے حقارت بھرے انداز میں کہا۔

رامین نے اس اہانت کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی لیا۔ وہ اب تلخیوں کو خاموشی سے پی جانا سیکھ رہی تھی۔

''اور اچھی سی چائے بنا کر تیمور کو دے آنا، بیچارہ ساری رات پڑھتا رہتا ہے۔'' انہوں نے سخت لہجے میں اگلا آرڈر دیا۔

''جی اچھا......'' اس نے گویا خود کو بخوشی اُن کی غلامی میں دے دیا تھا۔

ماموں کو سن گن ملی تو وہ کچن میں آگئے۔

''رامین بیٹا! تم کیوں یہ سب کام کر رہی ہو؟'' وہ اسے برتن دھوتے دیکھ کر ناگواری سے بولے۔

''تو رامین کون سی کوئی مہمان ہے یہاں...... اب اسے یہاں رہنا ہے تو تھوڑا بہت کام تو کرنا پڑے گا...... لڑکیاں اپنے گھروں میں کام کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔'' ممانی فوراً تڑخ کر بولیں۔

''جی ماموں...... میں گھر میں فارغ ہی تو رہتی ہوں اور میں یہ کام اپنی خوشی سے کر رہی ہوں، ممانی اکیلی کیا، کیا کریں گی۔'' اس نے ممانی کو خوش کرنے کی ایک سادہ سی کوشش کی۔

''جوان جہان لڑکی ہے، اس عمر میں لڑکیاں کہاں تھکتی ہیں، اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں رہا کہ تم سب لوگوں کی خدمتیں کرتی رہوں۔'' ممانی نے ترشی سے کہا۔ ماموں چپ ہو گئے۔ یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی جس پر وہ زیادہ ٹوکتے، لڑکیاں تو اپنے گھر میں کام کیا ہی کرتی ہیں اور یہ رامین کا گھر تو تھا۔

وہ خاموشی سے پلٹ آئے۔

رامین نے کچن کا کام مکمل کر کے تیمور کے لیے چائے بنائی، اس نے ڈرتے، ڈرتے تیمور کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے اس کی کرخت آواز آئی۔ رامین سے بولا ہی نہیں گیا۔

''کون ہے بابا...... اندر آجاؤ'' وہ بیزاری سے بولا۔

رامین جھجکتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ وہ کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔ اسے چائے کی پیالی لاتے دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''تم کیوں چائے لائی ہو؟ میں نے تو امی سے کہا تھا؟'' وہ بے حد کرختگی سے بولا۔

''جی، ممانی نے کہا تھا۔'' وہ چور سی بن گئی، اس سے تو بہتر تھا کہ ممانی کو انکار کر دیتی۔

''آئندہ میرے کمرے میں آنے کی زحمت مت کرنا، چاہے کوئی بھی کہے...... مجھے تمہاری منحوس صورت سے نفرت ہے، سمجھ گئیں بات۔'' وہ دبے، دبے انداز میں غرایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میز پر چائے کی پیالی رکھی اور وہاں سے بھاگتے ہوئے واپس آئی۔

''میری توبہ جو آئندہ کبھی ان کے کمرے میں گئی۔'' وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

''ماموں کے دونوں بچے ممانی پر ہی گئے ہیں، مجال ہے کہ ماموں سے انہوں نے کوئی اچھی عادت لی

ہو۔'' وہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے سلگتے ہوئے سوچنے لگی۔

☆☆☆

ماموں اسے کالج چھوڑ کر آئے تو کچھ چپ، چپ سے تھے......انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ بس چائے کا...... ایک کپ ہی پیا، وہ کوئی بہت خاص بات کرنے کے لیے ممانی کے پاس بیٹھ گئے۔

''چھوڑ آئے مہارانی کو؟ میں کہتی ہوں کہ کوئی وین لگوا دو، کب تک روزانہ صبح سویرے اسے چھوڑنے جاتے رہو گے اور آدھی دوپہر کو واپس لاتے رہو گے......اس عمر میں کس عذاب میں اپنی جان کو ڈال لیا ہے۔'' انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

''ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے، یوں سمجھ لو کہ میرے دل کی آواز ہے۔'' ماموں نے تمہید باندھی۔

ممانی کو کسی خطرے کا احساس ہوا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''ہائے...خیریت ہو، کوئی ڈھنگ کی بات تو کبھی تمہارے دل و دماغ میں نہیں آتی، اب کون سی بجلی گرنے والی ہے ہم لوگوں پر۔'' وہ چوکنی ہو گئیں۔

''اتنی بھی بدگمانی ٹھیک نہیں ہوتی۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

''اچھا، اب کہہ بھی دو، صبح سویرے کون سی بات دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔'' انہوں نے... بے چینی سے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ رامین اور تیمور کی نسبت طے کر دیں......رامین کے لیے تیمور سے بہتر اور کون ہو گا۔'' انہوں نے یہ کہہ کر ممانی پر گویا بجلی گرادی۔ ممانی اچھل پڑیں......قہر آلود نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

''آئندہ ایسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں......آخر ایسے بے ہودہ خیالات تمہیں ہی کیوں آتے ہیں۔ حد ہوتی ہے، خود غرضی کی کیا تمہیں اس لڑکی کے علاوہ بھی کوئی نظر آتا ہے؟ کیوں ساری زندگی اسے بوجھ کی طرح ہمارے سروں پر سوار کرنا چاہتے ہو...... تیمور اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنی کلاس فیلو ثمنی کو پسند کرتا ہے، جوان اولاد کے ساتھ ہمیں زبردستی نہیں کرنی چاہیے، رامین پڑھ لکھ لے......تو اس کے لیے کوئی اور اچھا رشتہ مل جائے گا۔'' ممانی کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

''میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی......سوچا تھا ایسا ہو جائے گا تو ہم سب کے لیے اچھا ہو گا۔'' ماموں نے شکستہ سے انداز میں کہا۔

''تم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے کب کے محروم ہو چکے ہو، برائے مہربانی یہ کام مت کیا کرو، لے دے کے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔'' ممانی کا بی پی ہائی ہونے لگ گیا۔ ان کا لہجہ چیخ گیا۔

''بات سنو......اگر مجھے کچھ ہو گیا تو رامین کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھنا۔'' وہ نڈھال انداز میں بولے ان کی آواز میں عجیب سی تھکن تھی۔

''تمہیں اتنی جلدی کچھ نہیں ہونے والا......اتنے خوش قسمت نہیں ہیں ہم لوگ......'' ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

ماموں بے بسی سے خاموش ہو گئے۔

ممانی ان کی آنکھوں کا خالی پن نہیں دیکھ سکیں۔

''جاتے، جاتے بھی مجھے اس لڑکی کی خادمہ بنا دینا، اس کا خیال رکھوں، اس کی خاطریں کروں، خواہ مخواہ کی بیٹی بنا لوں۔ میرے بڑھاپے کی تو تمہیں کوئی فکر نہیں ہے۔'' وہ غم و غصے سے بولیں۔

ماموں کی خاموشی پُراسرار تھی مگر ممانی سمجھ ہی نہیں پائیں۔

☆☆☆

پھپھو، وسیم بھائی کے ساتھ رامین سے ملنے آئی تھیں۔ بہت سے پچھتاوے پھپھو کی زندگی میں شامل ہو گئے تھے۔ ممانی اُن سے سرسری سے انداز میں ملیں۔ البتہ ماموں نے ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ وہ چند دن کے لیے رامین کو اپنے ساتھ ہی لے آئیں، رامین کے جاتے ہی ممانی نے سکون کی سانس لی۔

پھپو، رامین کو نم آنکھوں سے دیکھتیں، اس کا ماتھا چومتیں، اسے پیار کرتیں، وہ ان کے مرحوم بھائی کی لاڈلی بیٹی تھی۔ ان کا دل بھر بھر آتا۔

پھپو کا گھر سادہ سا تھا۔ رامین کا یہاں دل لگ گیا تھا۔ پھپو کی محبت اور شفقت اسے بہت اچھی لگتی۔ پھپو نے اسے کتنے ہی قصے سنا ڈالے، اس کے ابو کے بچپن کے قصے، شرارتیں، چھوٹی، چھوٹی کتنی ہی باتیں...... وہ اچھے سامع کی طرح سنتی رہتی۔ پھپو کی بیٹی علیزہ عرف گڑیا سے اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔

''تم واصف بھائی کے گھر خوش تو ہو ناں......؟''

پھپو نے بہت پیار سے پوچھا۔

''جی پھپو، مگر میں واپس جا کر ماموں سے بات کروں گی اور یہاں آپ کے پاس ہمیشہ کے لیے آجاؤں گی۔'' وہ پھپو کی محبت سے متاثر ہوگئی تھی اور اس نے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

''ہاں بیٹا! جب تمہاری پھپو کا گھر موجود ہے تو تمہیں وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ واصف بھائی بہت اچھے ہیں مگر ہمارا رشتہ زیادہ قریبی ہے۔'' پھپو نے خوش ہو کر کہا۔

''امی نے میری ذمے داری انہیں سونپی تھی۔ بس اسی لیے میں اُن کے ہاں رہتی ہوں مگر میں اُن سے بات کرلوں گی اور پھر اپنا سامان لے کر یہاں آجاؤں گی۔'' اس نے آسانی سے پلان بنالیا۔

''تمہاری امی نے مجھے کافی فون کیے تھے، بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی زیادہ بیمار ہوگی کہ دنیا سے ہی چلی جائے گی۔ مجھ سے بہت غلطی ہوئی کہ میں نے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ہم نے پرانی رنجشوں کو ہی یاد رکھا، کبھی تعلقات بحال کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ نہ جانے ہم ایسا کیوں کرتے ہیں، ساری زندگی ایک دوسرے سے نہیں ملتے اور مرنے کے بعد بھول نہیں پاتے۔'' پھپو آبدیدہ ہوگئیں۔

''امی، آپ نہ روئیں، غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں غلطی کرنا، انسان کی فطرت ہے اور اسے سدھارنا اس کی حکمت...... رامین اب ہمارے پاس ہی رہے گی، اس طرح آپ کو اپنی غلطی کے ازالے کا موقع بھی مل جائے گا۔'' گڑیا نے پھپو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سمجھایا۔

''ہاں، میں واصف بھائی سے خود بھی بات کرلوں گی، مجھے زیادہ فکر رخسانہ بھابی کی ہے، وہ بہت تیز طرار اور چالاک عورت ہیں، نہ جانے رامین کو کیسے برداشت کر رہی ہیں۔''

پھپو کے لہجے میں فکر مندی تھی...... رامین ان کے درست اندازے پر حیرت زدہ تھی۔ مگر بولی کچھ نہیں...... اسے بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، رخسانہ ممانی کے بارے میں پہلے ہی لوگوں کو پتا تھا۔

''اور رامین کا کالج تو یہاں سے قریب بھی ہے، آنے جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' گڑیا نے مسکرا کر کہا۔

''پھپو! آپ کی اور ابو کی بہت دوستی ہوتی تھی ناں......'' اسے اپنے مرحوم ابو کی باتوں سے عشق تھا۔

''ہاں، ہم دونوں میں بہت دوستی تھی۔ بہت پیار بھی تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو وہ رومال سے آنکھیں رگڑ، رگڑ کر روتا رہا۔ میری ڈولی کو اسی نے پیلے رنگ کے پھولوں سے سجایا تھا، میکے سے سسرال تک میری ڈولی کو کندھا دیا...... آہ! میرا پیارا بھائی، میرا ماں جایا، اتنی خاموشی سے دنیا سے چلا گیا۔''

پھپو نے اپنی دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کیں۔

''پھپو، آپ کی اور امی کی کبھی کیوں نہیں بنی؟ کیا آپ لوگوں کی کوئی لڑائی ہوئی تھی؟'' رامین نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''نہیں، بس بیٹا! انسان بہت چھوٹے دل کا مالک ہوتا ہے، مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا کہ تمہاری امی مجھ سے والہانہ انداز میں نہیں ملتیں، وہ بہت خاموش طبع عورت تھی۔ میں سمجھتی کہ اسے ہمارا آنا اچھا نہیں لگتا

ہے، ہم میں دوستی نہیں ہو سکی، اپنے بھائی سے گلہ کیا کہ وہ بیوی سے ہماری عزت نہیں کروا سکا۔ اس کے لیے تو بس بیوی اور بیٹی کی اہمیت تھی۔ اور ایسی ہی چھوٹی، چھوٹی باتیں رنجشیں پیدا کرتی رہیں۔ تم شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں ہم لوگ بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ ہم نے تمہارے ابو کو کئی بار دوسری شادی کا مشورہ دیا یہ بات شاید تمہاری امی کو ناگوار گزری تھی۔ فاصلے بڑھ گئے اور اگر فاصلے کم نہ کیے جائیں تو وہ خلیج بن جاتے ہیں، تمہارے ابو کی وفات کے بعد تمہاری امی کا رویہ مجھے سرد سا لگا۔ نہ اس نے مجھ سے رابطہ رکھا اور نہ میں نے...... ضد اور انا زندگی کو بڑے نقصان سے دوچار کرتی ہے پھر بہت بعد میں مجھے اس کا فون آیا، میں نے توجہ ہی نہیں کی کہ اب بیمار ہوئی ہے تب اسے میری یاد آ گئی، آہ...... کاش ہم لوگ اسلام کے صلہ رحمی کے اصولوں پر عمل کر سکیں۔'' پھپو چند لمحے خاموش رہیں، انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں، رامین سنجیدگی سے ان کے لفظوں پر غور کر رہی تھی۔

''بہن بھائی بھی عجیب ہی ہوتے ہیں، ساتھ رہتے ہیں تو لڑتے رہتے ہیں اور جب دور ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے کی یاد میں تڑپتے رہتے ہیں۔'' پھپو نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اچھا اب یہ اداس باتیں ختم کریں، کوئی اچھی، اچھی سی باتیں کریں، رامین بھی کیا سوچتی ہوگی کہ یہاں کتنا افسردہ اور ٹریجک سا ماحول بنا رہتا ہے۔'' علیزہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

رامین بہ مشکل مسکرائی۔

اس نے چند بہترین دن پھپو کے گھر گزارے۔ اس کا وہاں دل بھی لگ گیا۔ پھپو نے ماموں سے فون پر رامین کو ساتھ رکھنے کی بات کر لی

تھی۔ رامین نے بھی ماموں کو یہی کہا کہ وہ پھپو کے گھر خوش ہے اور ان کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے۔ ماموں بخوشی راضی ہو گئے مگر پھپو سے کہا کہ کچھ دن رامین کو ان کے ہاں رہنے دیں۔ پھر ماموں اسے اس کے سامان سمیت خود پھپو کے گھر چھوڑ آئیں گے، چند دن ہی کی تو بات تھی پھپو راضی ہو گئیں۔

اور رامین جس دن واپس آئی اس رات ماموں کافی دیر تک لاؤنج میں بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔

''بیٹا، تم اپنی پھپو کے گھر رہنا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں...... بس مجھ سے ملنے آتی رہنا، جب تک میں زندہ رہوں۔'' انہوں نے بڑی آس کے ساتھ کہا۔ اس نے بڑی بے قراری سے انہیں دیکھا۔

''کیوں نہیں ماموں، آپ کہیں گے تو میں روز آپ سے ملنے آؤں گی۔'' وہ جذباتی ہو گئی۔

''روز نہیں، بس مہینے میں ایک دو بار۔'' وہ سوچتے ہوئے بولے۔

''چلیں، میں ہر ہفتے آپ سے ملنے آؤں گی۔'' اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

ماموں کتنی ہی دیر چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

''تمہاری امی، اپنی جوانی میں بالکل تمہاری طرح تھیں۔'' وہ ماضی میں گم ہو گئے۔

''اچھا! بہت سے لوگ یہی کہتے ہیں۔'' وہ بہت بے ساختہ بولی۔

''ہم دونوں میں بہت محبت تھی۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولے۔ ''اتنی کہ شاید ہمیں بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔'' ان کے چہرے پر بیتی یادوں کے عکس جھلملانے لگے۔

''وہ ہمیشہ میری یادوں میں رہی...... اس کی یادیں میری زندگی کے جیتے جاگتے لوگوں سے زیادہ اہم ہو گئیں...... میرا دل اسی کا تھا اور اسی کا ہی رہا۔ دل کے معاملے عجیب ہوتے ہیں، ہمیں اسی سے محبت ہوتی ہے جن کا مقدر ہمارے نصیب کے ساتھ جڑا نہیں ہوتا۔''

وہ آج بہت زیادہ اداس تھے، نہ جانے کیوں......

''ہمیں ٹیلی پیتھی نہیں آتی تھی مگر ہم دونوں ہمیشہ ایک دن ان دیکھے رابطے میں جڑے رہے جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ محبت کا ایک آفاقی رابطہ بھی ہوتا ہے۔'' واصف ماموں آج اسے بہت بوڑھے لگ رہے تھے۔

''ماموں! آپ آج اتنے اداس کیوں ہیں؟''

رامین اُن کی اداسی دیکھ کر خود بھی افسردہ ہو گئی۔

''میں تو بہت سالوں سے اداس ہوں مگر کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ بے ساختگی سے بولے۔

''اگر آپ کہتے ہیں تو میں یہاں سے نہیں جاتی۔'' اس نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔ ماموں اس کے محسن بھی تو تھے۔ وہ انہیں دکھ دے کر خوش بھی تو نہیں رہ سکتی تھی۔

''نہیں بیٹا، تم ضرور جاؤ، اپنا سامان پیک کر لو، میں تمہیں خود چھوڑ آؤں گا۔ جب تم مجھ سے ملنے نہیں آسکو گی تو میں ملنے آجایا کروں گا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اپنی امی کی چیزیں جو میرے پاس امانتاً رکھی ہیں وہ بھی لے جانا...... تمہاری امی ایک بہت اچھی انسان تھی۔ وہ ساری زندگی تمہارے ابو کے ساتھ وفادار رہی...... دنیا میں مجھے کبھی کوئی اس جیسا نہیں لگا۔'' وہ جذب سے کہہ رہے تھے۔ نہ جانے ممانی کب وہاں آگئی تھیں۔

''اوہو...... اپنی سابقہ محبوبہ کے گُن گائے جا رہے ہیں، میری تو آج تک کبھی تعریف نہیں کی...... اور آج بھی اسی عورت کو یاد کر رہے ہو۔ نہ جانے کیسی عورت تھی...... مر گئی مگر لوگوں کے دل سے نہ اتری۔'' ممانی زہر خند لہجے میں بولیں، ان کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت تھی۔

''رامین بیٹا، تم جا کر اپنا سامان پیک کر لو...... میں تمہیں صبح ہی چھوڑ آؤں گا۔ یہاں رہ کر تم بھی اس نفرت کا شکار ہو جاؤ گی۔'' وہ ممانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف منہ کر کے کہنے لگے اور رامین تابعداری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بڑی جلدی عقل آگئی، اب تو رامین کے بڑے

دعوے دار پیدا ہوگئے ہیں، شکر ہے سر سے بلا ٹلے گی۔'' رامین، ممانی کو نظر انداز کرتی اپنے کمرے میں آگئی..... ممانی کو تو لڑائی کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔

ماموں اس رات ایسے سوئے کہ پھر کبھی اٹھے ہی نہیں۔ اس دن سب سے زیادہ رامین روئی، اسے ماموں کا ایک، ایک جملہ ایک، ایک لفظ یاد آ رہا تھا۔ وہ اُن کے لفظوں کے آنسو محسوس نہ کرسکی تھی۔ اسے ان کی آنکھیں یاد آتیں..... کسی روتی ہوئی تحریر کی طرح نمناک سی آنکھیں.....

ممانی نے بھی شاید دنیا دکھاوے کو آنسو بہائے، تیمور بھی بظاہر رنجیدہ و سنجیدہ پھرتا رہا سویرا آپا بھی سکتے کے عالم میں بیٹھی رہیں۔

قل کے بعد پھپو نے رامین کو لے جانا چاہا مگر حیرت انگیز طور پر ممانی نے اسے روک لیا کہ ابھی اس کے ماموں کو گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں وہ رامین کو چہلم کے بعد ہی بھیجیں گی۔

رامین سمجھی کہ ماموں کی وفات کے جھٹکے کی وجہ سے ممانی اتنا بدل گئی ہیں، وہ بھی ممانی کے خیال سے وہیں رک گئیں۔ علیزہ اپنے ایگزامز کی وجہ سے نہیں آسکی تھی..... اس نے سوچا تھا کہ امی، رامین کو یہاں لے آئیں گی تو وہ یہیں اس سے تعزیت کرلے گی۔

آہستہ، آہستہ کرکے سب مہمان جانے لگے..... مگر ممانی نے اسے نہ جانے دیا..... ممانی کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا وہ اب اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگی تھیں۔ ممانی کی بلیک میلنگ اور جذباتی دباؤ کی وجہ سے اس نے پھپو کو بھی انکار کردیا کہ جب تک ممانی مکمل طور پر نارمل نہیں ہوجاتیں وہ یہیں رہے گی..... اس پر ماموں کا قرض تھا۔ وہ ممانی کو اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ممانی سوتے میں ڈر جاتی تھیں..... وہ شدید بیمار ہوگئیں، تیمور بھی خاموش ہوگیا تھا۔

چہلم کے بعد زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ اور پھر اچانک رامین کی زندگی بدل گئی۔

ممانی نے رامین کے سب زیور اپنے قبضے میں لے لیے، جن سے وہ ابھی تک آگاہ نہیں تھیں۔ تیمور نے اس کی چیک بکس قبضے میں لے لیں۔

ممانی نے رامین کو گھر کے اسٹور نما کمرے میں منتقل کردیا۔ ان کی نفرت بہت خطرناک تھی، اس نفرت نے انہیں انسان سے شیطان بنا ڈالا۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ لوگ آخر اس کے ساتھ ایسا کیوں کررہے ہیں، کیا لالچ انسان کو اس قدر اندھا کردیتا ہے۔ ممانی اس چھوٹے سے کمرے کو ہر وقت لاکڈ رکھتیں۔ رامین ایک قیدی بن گئی تھی۔ ممانی کے ظلم کی وہ داستان شروع ہوئی کہ بیان سے باہر تھی۔ وہ اسے صرف ایک وقت کا کھانا دیتیں، وہ اس پر تشدد کرتیں، تیمور بھی اُن کا ساتھ دیتا، انہیں رامین کو اذیت دے کر خوشی ملتی تھی۔

''امی..... کب تک اس مصیبت کو ہم اپنے سر پر سوار کرکے بیٹھے رہیں گے، پلیز اس لڑکی سے جان چھڑا لیں۔'' تیمور الماری سے کاغذات نکالتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''اتنا عرصہ میں نے اسے دل پر پتھر رکھ کر برداشت کیا ہے اب ایسے ہی مفت میں جانے نہیں دوں گی اور مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ اس کی پھپو کو اب بھتیجی پر اتنا پیار کیوں آرہا ہے، وہ عورت اس کا پیسہ ہتھیانے کے چکر میں ہے مگر ہم بھی بے وقوف نہیں ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ تیمور کم عمر تھا، ماں کے دباؤ میں تھا، وہ ماں کی آنکھوں سے دیکھتا اور انہی کے دماغ سے سوچتا تھا۔ تربیت کا شر اسے برائی کی طرف مائل کرنے لگا۔

''اس لڑکی کے بینک میں لاکھوں روپیہ ہے، وہ ہمیں کسی طرح نکلوانا ہے، اس سے چیک تو میں سائن کروالوں گی، بس آہستہ، آہستہ ہی ساری رقم نکلوالیں گے..... اس کے زیور تو اب میرے ہیں، ساری زندگی تمہارے باپ نے مجھے کوئی سونے کی چیز نہیں بنا کردی، اب دیکھو، بیٹھے بٹھائے کتنے زیور مل گئے۔'' انہوں نے مکار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کمزور نفس کے لوگوں کو

شیطان بہت جلدی اپنا شکار بنالیتا ہے۔

''امی! ہماری گاڑی بہت پرانے ماڈل کی ہے، اور اب اس کی عمر بھی پوری ہوچکی ہے، رامین کی گاڑی نئے ماڈل کی اور بہت اچھی حالت میں ہے، کیوں نہ ہم اس کی گاڑی اپنے نام کروالیں...... جب بیچیں گے تو لاکھوں روپے مل جائیں گے۔'' اس کا لالچ بڑھنے لگا۔

''ارے یہ تو میں نے بھی سوچ رکھا ہے اگر ہماری بات نہیں مانے گی تو مار، مار کر اس کا حشر بگاڑ دوں گی۔'' انہوں نے بے انتہا نفرت سے کہا۔

رامین نے احتجاج کیا تو ممانی اور تیمور نے اسے شدید ٹارچر کیا۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی، وہ ان حالات سے خوفزدہ ہوگئی۔ وہ وہی کرتی رہی جو ممانی اسے کہتیں۔ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی جارہی تھی۔ وہ اس قید سے نکلنا چاہتی تھی، قید انسان کو ذہنی طور پر ختم کردیتی ہے، اس نے ممانی کی منتیں کیں مگر اسے تھپڑ کی صورت میں جواب ملتا۔ وہ سمجھ گئی کہ شیطان صفت لوگوں کے دل پر منتیں، آنسو اور آہیں بالکل اثر نہیں کرتیں...... وہ انہیں ایک کے بعد دوسرا چیک سائن کر کے دیتی رہی...... وہ جانتی تھی کہ جب وہ خالی ہوجائے گی تو یہاں سے باہر پھینک دی جائے گی۔ وہ رہائی کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کے لیے تیار تھی۔ ممانی نے جبراً اس کی گاڑی بھی اپنے نام کروالی۔ وہ کچھ نہیں کرسکی بے ضمیر لوگوں کو دلیلیں قائل نہیں کر پاتیں...... سب کچھ ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسلتا رہا۔ انسان اس وقت بے بسی کی انتہا پر کھڑا ہوتا ہے۔ جب خود کو تباہ و برباد ہوتے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور کچھ کر نہیں پاتا۔

پھپو، وسیم بھائی کے ساتھ رامین سے ملنے کے لیے آئیں تو ممانی نے بہانہ بنا دیا کہ وہ تو اپنے کالج کے ٹرپ کے ساتھ مری گئی ہوئی ہے۔ اسٹور کے فرش پر اوندھی لیٹی رامین کو کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کے پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ پھپو واپس چلی گئیں۔ ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔

وہ دن رات اپنے ماں باپ اور ماموں کو یاد کر کے روتی رہتی۔ وہ ایک جہنم میں زندگی گزار رہی تھی۔ وہ دنیا کے دوزخ سے پہلی بار آشنا ہوئی تھی۔

''ممانی...... مجھے یہاں سے جانے دیں، میرا سب کچھ آپ اپنے پاس رکھ لیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے...... بس مجھے رہائی دے دیں...... میں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ روتے ہوئے اُن کی منتیں کرتی رہتی۔ اس کے پاؤں موٹی رسی میں بندھے رہنے کی وجہ سے سوج گئے تھے۔

''ساری کارروائی پوری ہولینے دو...... پھر تمہیں رہائی مل جائے گی۔ پھر تم چلی جانا اپنی غریب پھپو کے پاس...... دیکھیں گے خالی ہاتھ اور خالی جیب وہ تمہیں کس طرح لاڈ پیار سے رکھیں گی۔'' ممانی نفرت سے بولیں۔

''اور بات سنو میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں، تمہاری غریب پھپو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اگر کبھی کسی کے سامنے زبان بھی کھولی...... تو تمہیں چوری کے الزام میں جیل بھجوادوں گی۔'' وہ اسے دھمکاتی رہتیں، اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا۔

''نہیں، میں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس نے حق کی جنگ لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ اپنے سب حقوق سے دستبردار ہوگئی تھی۔ اسے اب سمجھ آئی تھی کہ کمزور اور تنہا لوگ کیوں اور کیسے اپنے قیمتی حقوق دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اسے ماموں کی باتیں یاد آتیں، وہ کہا کرتے تھے کہ اسے بہت سے محاذوں پر تنہا لڑنا ہوگا، وہ ٹھیک کہتے تھے۔

اس رات ممانی.... کسی شادی کے فنکشن میں گئی ہوئی تھیں تیمور شام سے ہی گھر نہ آیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنی دوست حمنیٰ کے ساتھ باہر گزارتا تھا۔ ممانی نے دیر سے گھر آنا تھا۔ تیمور اُن کے گھر

سے جانے کے پندرہ، بیس منٹ بعد ہی آ گیا۔ اسٹور کی چابی ممانی کے پاس اور ایک اس کے پاس ہوتی تھی۔ وہ کچھ پوچھنے کے لیے رامین کے پاس آیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ اس نے مدھم روشنی والی لائٹ جلائی، فرش پر چادر بچھائے وہ بے خبر سو رہی تھی۔

اس کے لمبے سیاہ بالوں نے اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا دوپٹا قریب ہی پڑا تھا۔ وہ ایک جواں سال اور بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔ تیمور بھول ہی گیا کہ اس سے کیا پوچھنے آیا تھا۔ نفرت کے باوجود اس کا نفس بیدار ہو گیا۔ اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھانے چاہے مگر شیطان کے بہکاوے نے اسے واپس نہیں جانے دیا۔ ممانی کی تمام ہدایتیں اس کے ذہن سے یکلخت نکل گئیں، رامین اکیلی تھی، بے سہارا تھی، مجبور اور بے بس تھی، اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو گیا۔

رامین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے تیمور کو اپنے بالکل قریب بیٹھے دیکھا تو خوفزدہ ہو گئی۔ گھبرا کر اس نے اپنا دوپٹا اٹھانا چاہا مگر اس کا ہاتھ تیمور کی سخت گرفت میں آ گیا۔

رامین خوف سے چیخ چلا بھی نہ سکی۔ اس نے ایک رات میں ہی زندگی کا بدترین چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ ایسا زاہد تو نہیں تھا کہ سڑک پر پڑا خزانہ نہ اٹھاتا۔ وہ انسان سے شیطان بن گیا۔ نفس کا غلام بن گیا۔ اس نے رامین کو دھمکایا کہ اگر اس نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ وہ نیم مردہ حالت میں اس کی دھمکیاں سنتی رہی، اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔

اسے بری طرح پامال کرنے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا اور پھر ساری رات گھر نہیں آیا۔ ممانی بارہ بجے واپس آئیں، رامین ساری رات ہچکیوں سے روتی رہی، درندے صرف جنگل میں ہی نہیں رہتے، گھروں کے اندر، شرافت کے نقاب میں بھی چھپے ہوتے ہیں۔ کاش کہ وہ خود کو بچا سکتی۔

اگلے چند ہفتوں میں ممانی نے اس میں واضح تبدیلیاں دیکھیں، اس کی حالت عجیب سی ہوگئی تھی۔ وہ سارا دن کچھ نہیں بولتی، اس کی سوجی ہوئی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہتے رہتے۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اس کے لبوں سے دبی، دبی سسکیاں نکلتیں۔

ممانی نے اس کی اس حالت کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے بڑے ظلم سے گزر چکی ہے۔

ممانی اور تیمور نے آہستہ آہستہ اس کے بینک سے ساری رقم نکلوالی تھی اور اس کا سب کچھ چھین کر انہوں نے خالی ہاتھ، خالی دامن اسے رہا کر دیا تھا۔

وہ لٹی پٹی سی حالت میں پھپو کے گھر گئی۔ پھپو کو محسوس نہیں ہوا کہ اس کے وجود سے لپٹا عزت کا آنچل تار، تار ہو چکا ہے۔

پھپو نے رامین کی چیزوں کا مطالبہ کیا تو ممانی مکر ہی گئیں کہ انہوں نے تو کچھ لیا ہی نہیں...... نہ جانے رامین نے اپنا سارا اثاثہ کس کو سونپ دیا۔ پھپو پریشان تھیں۔ رامین کا بینک اکاؤنٹ خالی تھا، زیور، گاڑی، کسی چیز کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں گئیں۔ رامین سے کچھ پوچھتیں تو وہ کوئی جواب نہ دیتی، بس روتی رہتی۔

گڑیا نے رامین کا بہت ساتھ دیا۔ اس کے کالج کے ذریعے اس کی تعلیمی اسناد نکلوائیں، اسے امتحانوں کی تیاری کروائی، رامین نے بڑی مشکل سے امتحان دیے، وہ ایسی لڑکی تھی جو بھری جوانی میں ٹوٹ گئی تھی۔

ممانی اپنی جیت پر نازاں تھیں۔ تیمور کے منہ کو لالچ لگ گیا تھا۔ اسے حمنیٰ سے محبت تھی مگر حمنیٰ مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ اس سے شادی تیمور کو سوائے ذمے داریوں کے اور کچھ نہ دیتی۔ اس نے حمنیٰ کے ساتھ صرف وقت گزارا، وہ بے وقوف نہیں تھا جو ایک مڈل کلاس معمولی لڑکی سے شادی کر لیتا۔

رامین نے ابتر ذہنی حالت میں امتحان دیے...... پھپو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں کہ رامین کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی مگر رامین ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت گم صم رہتی یا روتی رہتی، اس کا کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔

پھر پھپو کو کوئی عجیب سا احساس ہوا۔ رامین کا وجود بدل رہا تھا۔ وہ پتھر کی طرح ساکت رہ گئیں۔ انہیں طرح، طرح کے واہمے آنے لگے۔ ان کا دل جیسے کسی پاتال میں ڈوب گیا۔ وہ زبردستی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور اُن کے بدترین خدشے سچ ثابت ہوئے۔ پھپو پر بیٹھے، بیٹھے قیامت گزر گئی۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی گھر آکر انہوں نے روتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اس کی اس حالت کا ذمے دار کون ہے، وہ اتنا عرصہ کیوں خاموش رہی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ اس کے ساتھ کسی نے ظلم کیا ہے مگر وہ درندہ کون تھا۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا۔ رامین کے ہونٹوں سے دبی، دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

''مجھے بتاؤ رامین! وہ کون تھا؟ تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں؟ تم نے احتجاج کیوں نہیں کیا؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ ہم کتنی بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں؟'' پھپو اپنا سر تھام کر روتے ہوئے بولیں، ان کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ ان کے اعصاب مفلوج ہو گئے تھے۔

''میں نے بہت احتجاج کیا...... پھپو! مگر میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔'' اس نے خود پر چڑھایا خول توڑ دیا۔ اب چھپانے کا کیا فائدہ...... اب تو اسے موت سے بھی ڈر نہیں لگتا تھا تو ان لوگوں سے کیا خوف آتا۔

پھپو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ ان کے مرحوم بھائی کی بیٹی تھی، ان کی عزیز بھتیجی...... ان کا خون...... وہ کیسے ایسی سفاکی اور درندگی کا شکار ہو گئی تھی۔ انہیں اخبارات اور ٹی وی چینلز پر چلنے والے ایسے بہت سے درندگی کے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ برائی کب ان کے گھر تک پہنچ گئی۔

انہیں کیوں نہ پتا چلا، وہ پسینے میں نہا گئیں۔

''پھپو! وہ کبھی نہیں مانے گا...... میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، کوئی گواہ نہیں...... میں اسے کبھی گناہ گار ثابت نہیں کر سکتی...... وہ الٹا ہر چیز کا الزام مجھ پر ڈال دے گا...... میں اور ذلت نہیں سہہ سکتی۔'' وہ دبی دبی سسکیوں کے ساتھ کرب سے رو رہی تھی۔ پھپو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ وہ غم اور دکھ کی انتہائی منزل پر کھڑی بے بسی سے اسے روتے دیکھ رہی تھیں۔

پھپو کے شکوک ٹھیک ہی ثابت ہوئے تھے۔ ممانی اور تیمور کے علاوہ اور کون تھا اس گھر میں...... کسی باہر والے نے تو نقب نہیں لگائی تھی۔ درندہ تو گھر میں ہی رہتا تھا۔

وہ کرسی پر ڈھے گئیں۔ اُن کا دم گھٹنے لگا۔ لوگوں پر قیامتیں گزر جاتی ہیں اور وہ پھر بھی زندہ رہتے ہیں۔ عجیب بات ہی تو تھی۔

یہ بات ایسی نہیں تھی کہ چھپائی جا سکتی۔ پھپو نے پھوپا کو اعتماد میں لیا۔ وہ دونوں ممانی سے بات کرنے ان کے گھر گئے۔ اسے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی تھا۔

ممانی انہیں دیکھ کر سمجھیں کہ وہ رامین کے پیسوں کی بات کرنے آئے ہیں، تیمور اکھڑے، اکھڑے انداز میں وہیں بیٹھا تھا۔ ممانی بے حد سرد مہری سے ملیں۔

پھپو کے انکشاف پر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تیمور چور سا بن گیا مگر اس نے اپنی کمزوری پر غصے اور مکاری کا پردہ ڈال دیا۔

''آپ لوگ اپنے ہوش میں تو ہیں؟ آپ لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے بیٹے پر اتنا گھٹیا الزام لگائیں۔ اپنی بدکردار بھتیجی کے کرتوت چھپانے کے لیے آپ کو کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا۔'' ممانی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ ہماری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ دونوں اسی وقت ہمارے گھر سے نکل جائیں...... بہت ہو گیا...... کسی کے گھر آ کر اُن پر کیچڑ اچھالتے ہوئے آپ لوگوں کو شرم نہیں آئی؟ نہ جانے کس کا گناہ میرے سر پر ڈال رہے ہیں۔'' تیمور بری طرح سے مشتعل ہو گیا۔ وہ بڑی بدتمیزی اور بدلحاظی سے بولا۔

''ہم یہاں بات کرنے آئے ہیں...... کس پر کیچڑ اچھالنے کے لیے نہیں آئے۔'' پھوپا نے بہت سبھاؤ سے بات کی۔

''میں تو کہتی ہوں کہ یہ تمہارے بیٹے کا کارنامہ ہی ہوگا...... تیمور تو رامین سے اس دن سے نفرت کرتا ہے جس دن وہ اس گھر میں آئی تھی۔ اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے میرے بیٹے کو پھنسا رہے ہو۔'' ممانی نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر سفاکی سے کہا۔

دونوں کو شدید جھٹکا لگا۔ ممانی نے تو اُن کے بیٹے پر ہی الزام لگا دیا تھا۔ وہ دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ ان کی بھی ایک بیٹی تھی، ممانی کی زبان کے آگے تو خندق تھی، وہ کس، کس کا منہ بند کرتے، کس، کس کو صفائیاں دیتے۔ الزامات کے اس کھیل میں نقصان تو اُن ہی کا تھا۔ آج چار لوگوں کے سامنے یہ بات ہوئی، کل چالیس لوگ اسے جان جاتے اور ایسی باتیں خوب پھیلتی ہیں۔

''رخسانہ بھابی، ہم اس بات کو یہیں دفن کر دیتے ہیں، بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، آپ بھی ایک بیٹی کی ماں ہیں، جو بات یہاں ہم سب کے درمیان ہوئی؟ وہ یہیں ختم ہو جانی چاہیے...... ہم اس کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں، وہ بہترین منصف ہے۔''

پھوپا مصلحت سے کہنے لگے۔ پھپو نے ان کا کندھا ہلا کر کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے پھپو کو روک لیا۔

وہ جان گئے تھے کہ تیمور کبھی اپنا گناہ نہیں مانے گا...... اور وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس کو سزا دے سکتے۔

''آئندہ تم لوگوں کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے، رامین سے نہ تو ہمارا کوئی تعلق ہے اور نہ ہم اس کے کسی فعل کے ذمے دار ہیں۔'' ممانی نے منہ پھیر کر

درشتی سے کہا۔

''بھابی...... ہمارا مقصد آپ کی بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ رامین کی حالت بہت خراب ہے، اس نے خود تیمور کا نام لیا ہے، ورنہ ہم کبھی یہاں نہ آتے۔ اگر تیمور اور رامین کے درمیان کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہے تو ہم ان دونوں کی شادی کر سکتے ہیں۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔''

پھوپا جہاندیدہ اور ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ انہوں نے تلخی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

ممانی تو اچھل پڑیں...... تیمور خفگی سے پھوپا کو دیکھنے لگا۔

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنے بیٹے پر پورا اعتماد ہے۔ وہ رامین سے شدید نفرت کرتا ہے، وہ ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم لوگ کیوں ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔'' وہ تڑخ کر بولیں۔ پھپھو اور پھوپا دونوں خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''بھابی آپ ایک بار تیمور سے تنہائی میں بات کر لیں۔ ہم اس مسئلے کو مل کر بیٹھ کر حل کر لیں گے۔'' پھوپا نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے آخری بات کی۔

''اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ، ورنہ میرا بیٹا تم دونوں کے بڑھاپے کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔'' انہوں نے بدتمیزی سے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر کہا۔

وہ دونوں خاموشی سے وہاں سے آ گئے تھے...... وہ سمجھ گئے کہ ممانی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆

کچھ حادثے انسان کو توڑ دیتے ہیں، ختم کر دیتے ہیں، پھپھو خود کو الزام دیتیں، انہیں رامین کو وہاں لاوارثوں کی طرح نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ کاش کہ وہ اسے زبردستی ہی ساتھ لے آتیں...... رامین تو کم عمر تھی، ناسمجھ تھی، وہ تو سمجھدار تھیں، انہوں نے کیوں اتنی غفلت برتی...... رامین کی حالت خراب تھی۔ وہ اب اس مسئلے سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتی تھیں۔ وقت گزر چکا تھا۔

علیزہ اس کے پاس آ کر اسے تسلی اور دلاسے دیتی...... پھپھو اور پھوپا نے اس کڑے وقت میں اس کی بہت مدد کی۔ وہ لوگ وہاں سے شفٹ کر کے دوسری کالونی میں چلے آئے اور وہیں شیرو پیدا ہوا...... پھوپا سیدھے سادے آدمی تھے، ان کے دل میں خوفِ خدا تھا۔ پھپھو کو اپنی غلطیوں کا مداوا بھی کرنا تھا۔ انہوں نے دنیا کے خوف کو پسِ پشت ڈال کر خدا کا خوف دل میں رکھا۔ پھپھو دوبارہ اسے دنیا کے جنگل میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

شیرو نے آتے ساتھ ہی رامین کی زندگی بدل دی۔ پھپھو نے سب ملنے والوں کو یہی بتایا ہوا کہ رامین، شیرو کی پیدائش سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی، سسرال والوں نے مڑ کر آج تک نہیں پوچھا۔ شیرو بہت خوب صورت بچہ تھا۔ گول مٹول اور صحت مند...... اس کی مسکراہٹ میں رامین کا دل دھڑکتا تھا۔ رامین نے ایک اچھے اسکول میں جاب کر لی۔ شام کو وہ ایم اے کی تیاری کرتی، وہ اسکول چلی جاتی تو شیرو کو پھپھو سنبھالتیں۔ پھپھو نے رامین کی تنخواہ کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہونے دیا۔ وسیم بھائی بہت اچھی جاب پر تھے۔

شیرو کی محبت نے اس کی ماضی کی تلخیاں بھی بھلا دی تھیں...... اس نے اپنی ساری زندگی اپنے بیٹے شیر دل کے نام کر دی...... وہ اس کے معصوم چہرے کو دیکھتی تو اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ زندگی یونہی رواں دواں تھی۔ دو سال بعد جب اس نے ماسٹرز کر لیا تو اسے ایک انٹرنیشنل اسکول میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ بھرتا گیا۔ علیزہ بھی ایک کمپنی میں جاب کر رہی تھی، گھر میں خوش حالی تھی...... علیزہ اور رامین کی دوستی مثالی تھی۔ رامین کو لگتا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہو گئی ہے اور اب برے دن کبھی دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں آئیں گے۔

شیرو پانچ سال کا ہو گیا تو اس کی زندگی میں ایک اور بھونچال آیا...... ایک ایسا زلزلہ جس نے صرف اسے ہی نہیں بلکہ سارے گھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ)



برستا ساون اور میں

غزالہ فرخ

ٹپ پہلی بوند پڑی...... ٹپ...... ٹپ...... دوسری، تیسری بوند پڑی۔ میں یک دم اٹھ بیٹھی، ہم بہنوں کے کمرے کے باہر کاٹھ کباڑ کے لیے چھوٹا سا حصہ بنا ہوا تھا وہاں ابا میاں نے بچت اسکیم کے تحت پکی چھت ڈلوانے کے بجائے ٹین کی چھت ڈال دی تھی۔ گھر کا وہ حصہ مجھے بہت برا لگتا جتنی صفائی رکھنے کی کوشش کرو اجلاپن آتا ہی نہیں تھا مگر اس کی یہ بات مجھے پسند تھی کہ وہاں بارش کا پہلا قطرہ بھی اتنی آواز پیدا

کرتا کہ میں سوئی ہوئی بھی بیدار ہو جاتی۔

مجھے بچپن سے ہی برستا ساون اور امڈ، امڈ کر آتے بادل بہت بھاتے۔ سونیا میری جڑواں بہن جو مجھ سے پورے پچاس منٹ بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے خیالات اور پسند ناپسند میں جیسے پچاس برس کا فرق تھا۔ اماں بتاتیں کہ وہ ہمیشہ بادل کی گرج سے ہی گود میں دبک جاتی۔ آنکھیں سختی سے موندھ لیتی، کتنی ہی دیر آنکھیں نہ کھولتی حتیٰ کہ سہم کر خود ہی سو جاتی اور میں...... اماں ہنس کر بتاتیں کہ تم تو چھوٹی سی بچی، بادل، بارش سے ایسے خوش ہو جاتی تھیں کہ جیسے ابھی نہانے چل دو گی۔

ٹپ، ٹپ، ٹپ...... بارش بتدریج تیز ہونے لگی تھی میں یک دم بستر سے اٹھ بیٹھی، پتا نہیں کیا وقت تھا۔ لوڈ شیڈنگ کے باعث لائٹ آ نہیں رہی تھی مگر کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی، خاصا اندھیرا تھا ہمارا کمرا تھا ہی کتنا...... شاید کاٹھ کباڑ کا ہی کمرا تھا۔ ہم دونوں بہنیں بڑی ہوئیں تو اماں، ابا پاس سلانے سے گھبرانے لگے۔ تبھی یہ کمرا ہمیں وقف کر دیا گیا۔ اندازے سے ہی ذرا آگے بڑھ کر کھڑکی تک پہنچ سکی تھی، میں نے ہاتھ باہر کر دیا۔ ایک دم بجلی چمکی اس کی روشنی میں میرا ہاتھ یک دم دودھیا سا لگنے لگا۔ اور اس پر پڑنے والی وہ پھوار...... مجھے ایک دم یوں لگا کہ میں اس خوب صورت موسم کے فسوں کے زیرِ اثر آ گئی ہوں۔ برستا ساون میرے لوہے کی سلاخوں سے باہر نکلے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ بارش کے قطرے میری ہتھیلی پر آن جمع ہوتے تو میں ہاتھ بند کر لیتی۔ پانی دونوں اطراف سے گر جاتا تو ہاتھ پھر کھول دیتی مجھے اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا کہ اماں چلی آئیں، ہاتھ میں لالٹین تھامے ذرا آگے کر کے مجھے غور سے دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر گیلے ہوتے میرے ہاتھ کو......

''پگلی ہو گئی ہے تو، تو بالکل بھیگ رہی ہے۔ یوں آدھی رات کو بیمار پڑ گئی تو پھر......''

''لو بھلا اماں نمک کی بنی ہوئی ہوں میں کیا جو یوں ذرا سا پانی پڑنے سے گھل جاؤں گی۔''

''تجھے تو جانے کب عقل آئے گی۔ اب بھلا پتا چل ہی گیا تھا کہ بارش ہو رہی ہے تو جہاں سے چھت ٹپک رہی ہے وہاں نیچے ڈول رکھ دیتی اور پر دو تہیاں بچھی تھیں انہیں اتار لیتی اور......''

بارش کے متعلق ایسی غیر رومانی اور عجیب سی گفتگو میرا سارا مزہ ختم ہونے لگا اپنا ہاتھ باہر نکالا، لالٹین کی روشنی میں ہی تولیا ڈھونڈا چہرہ اور بال بھی ہلکے سے نم ہو گئے تھے انہیں خشک کر کے بارش سے متعلق احتیاطی تدابیر میں اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

بارش رات ہی کس وقت ہوئی۔ صبح دھوپ چمک رہی تھی اور ماحول بالکل ہی بدلا، بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اماں، ابا اور بھائی کو کام پر بھیج چکی تھیں۔ میں اماں کے پاس آ بیٹھی۔

''اماں کیا کھلاؤ گی آج......'' اماں نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تو خود ہی کہہ اٹھی۔ ''چائے پراٹھا یا پھر چائے رس۔''

''ارے نہیں آج پھیونی منگائی ہے تیرے ابا سے۔'' اماں فخریہ بولیں دل تو اب بھی خوش نہیں ہوا مگر جانتی تھی کہ پھیونیاں منگانے سے اماں کے بجٹ پر کافی اثر پڑا ہو گا اس لیے اماں کا دل توڑ نہیں پائی۔ آج اماں نے سبز چائے بنائی تھی، واقعی ناشتا مزیدار لگا یونہی اماں سے بولی۔

''اگر آج پھر بارش ہو جائے تو......''

''تو پھر مسئلہ ہی ہے صوفی، کئی دنوں سے مرچوں کو دھوپ لگوانے کے لیے چھت پر رکھنا ہے روزانہ ستارے دیکھتی ہوں آسمان پر ندارد ہوتے ہیں تو روزانہ صبح نیچے لے آتی ہوں اور اوپر برساتی کی چھت میں تیرے ابا نے اس دفعہ الٹی اینٹ کا پلستر کروا دیا پھر بھی ٹپکنے لگی ہے، دیکھ مرچی یہیں پڑی ہے بان کی چارپائی پر۔''

''اماں پلیز...... چائے پھیونی کا مزہ بھی غارت ہو رہا تھا۔ میرا جی چارہ رہا تھا کہ کوئی خوب صورت

موسم کے بارے میں پیاری، پیاری باتیں کرے، سونیا محلے کے اسکول میں کے جی کلاس ٹیچر بن گئی تھی، وہ اسکول جا چکی تھی۔ کوئی سہیلی سکھی تھی نہیں، محلے کی لڑکیوں سے میل جول بڑھایا ہی نہیں، دونوں ہم عمر بہنیں تھیں، آپس میں دل لگی کر کے وقت گزر جاتا تھا۔

سونیا لوٹ آئی تو کاپیوں کا ایک گٹھا ہاتھ میں تھامے۔

''توبہ کے جی کلاس دیکھو اور کاپیاں دیکھو۔''

میرا دل گھبرا گیا۔

''کلرنگ کی کاپیاں ہیں۔''

''لو اِن کو بھلا کیا چیک کرنا۔''

''بس صوفیہ بی بی نوکری کی تو نخرہ کیا۔ آج بڑی باجی کا حکم تھا کہ بچوں کی یہ کاوش گھر لے جاؤ اور ان پر چمکیلے ستاروں والے اسٹیکر لگاؤ تاکہ ان کی مائیں خوش ہوں۔''

''واہ آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' میں ہنسی۔ کھانا کھا کر ہم اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔

''تجھے پتا ہے سونیا رات بارش ہوئی تھی۔''

''ہاں تیری اور اماں کی خوب کھڑ بڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں تو بس آنکھیں بند کیے پڑی رہی تھی۔''

''تو، تو آنکھیں کھول لیتی تو یہ برستا پانی تیرا کیا بگاڑ لیتا۔''

''بس صوفی دعا کر اس دفعہ بارشیں خیر کی ہوں، جانتی ہے کتنا نقصان ہوا پچھلی دفعہ، ویسے ہی ہمارا ملک بے شمار مسائل کا سامنا کیے ہوئے ہے اور اوپر سے یہ بارشیں کہیں سیلاب کی آفت نہ آجائے اس پر۔''

''تو بھی بس استانیوں کی طرح سوچنے لگی ہے سونی۔''

''دیگی تھوڑا سا اور پڑھ لیتی تو دماغ میں تھوڑی سی وسعت آہی جاتی۔ ملکی حالات سے آگاہی اور پھر اس کی خیریت کے لیے دعا گو ہونا...... یہ تو بڑی فطری سوچ ہے۔''

''ٹھیک ہے...... مگر آج اگر بارش ہوئی تو سوجی کے پورے تل کر کھلاؤں گی تمہیں، میں نے پپو سے سوجی اور سوکھا ناریل منگا رکھا ہے۔'' میری بات پر وہ مسکرا دی اور بچوں کی کاپیوں پر اسٹارز کی شکل کے اسٹیکر لگانے لگی۔

☆☆☆

میں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی تھی، یہ گھر ہماری جائے پناہ تھا اور یہی گلی یہی محلہ ہماری شناخت...... تنگ سی گلی تھی مکان ساتھ، ساتھ جڑے ہوئے گویا آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں، چھت سے چھت پیوستہ تھی، بچپن میں ہم ایک سے دوسری چھت پر ایک جست میں جا پہنچتے۔ ذرا بڑے ہوئے تو اماں نے سخت قوانین نافذ کرنے شروع کر دیے۔ ہم دونوں گو جڑواں تھے مگر میں قد میں بھی سونی سے بڑھتی چلی گئی اور جسم بھی دھان پان نہیں تھا۔ پہلی نظر میں اپنی عمر سے بڑی نظر آنے لگی تو اماں کی روک ٹوک پہلے میرے اوپر شروع ہوئی، فراکوں کے ساتھ کھڑے پاجامے سی کر پہنائے گئے اور بالوں کی بھی کس کر چوٹی ہونے لگی بلکہ میں چیختی رہ جاتی اور اماں میرے بالوں میں ڈھیروں تیل ڈال کر میری ہیئت کو عجیب سا بنا دیتیں۔ چھتوں کی پھلانگیں چھلانگیں بھی بند کر دی گئی تھیں۔ پڑھائی میں تو دل لگتا ہی نہیں تھا۔ آٹھویں کلاس میں دو مضامین میں فیل ہوئی تو اماں نے گھر بٹھا لیا۔ بس تب سے اس گھر کی چار دیواری میں ہی قید ہو کر رہ گئی تھی۔

سنا تھا کہ اکھٹے پیدا ہونے والے مزاج میں بالکل مختلف ہوتے ہیں، ہم دونوں بہنوں پر یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی۔ دھان پان سی سونیا خود کو سمٹا کر رکھتی اور میں اماں کا دیا ہوا دوپٹا گلے میں کہیں جھول جاتا، چوٹی کے بل بکھر کر چہرے پر آن پڑتے...... ان سب سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن ہو جاتی۔

سونی کے اسکول میں آج بزم ادب تھا اس لیے وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے کے لیے کہنے لگی۔ سونی تو جانے کو تیار تھی مگر مجھے اماں کے دیے کپڑے پسند ہی نہیں آئے تھے۔ اس عید پر بنا ہوا سوٹ تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص پر اماں نے مقیش کے پھول بنائے تھے۔

یہ کپڑے تو مجھے پسند تھے مگر گھر میں ٹی وی تھا جانتی تھی کہ اب قمیصوں کا یہ اسٹائل چلتا ہی نہیں۔ اب تو کلی دار بڑے، بڑے فراک کسی کے دونوں کونے دونوں اطراف سے لٹکے ہوئے مگر وہ تو سادہ سی قمیص تھی۔ سونی نے اپنے دونوں سوٹ میرے آگے رکھ دیے مگر اس کے بھلا مجھے کیا پسند آتے، مرتی کیا نہ کرتی وہی گلابی سوٹ پہنا، اماں تو مجھے دیکھ کر بلائیں لینے لگیں۔

''دیکھ تو پری لگ رہی ہے۔''

''دعا کرا ماں اُڑ ہی جاؤں۔'' میں غصے میں بولی۔

''کیوں اکیلی کیوں اڑے میری پیاری! کوئی راجکمار آئے گا اپنے سنگ لے اڑے گا تجھے۔'' اماں جذباتی ہوگئیں ہم دونوں بہنیں چل دیں۔ اسکول بہت دور نہیں تھا پھر بھی دو تنگ گلیوں سے گزر کر تھوڑی کھلی جگہ تک جانا تھا۔ صوفی بڑی باجی (میڈم) سے ڈر رہی تھی۔ تو ذرا تیزی سے آگے بڑھی، میں کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ یک دم کوئی چلنے لگا، میں چونک کر مڑی...... وہ عباس تھا ہمارا پڑوسی، بچپن تو یونہی مل جل کر ہنسی ٹھٹول کرتے گزرا تھا۔ مگر ذرا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اماں نے ایسی جھجک ڈالی کہ نہ قدم باہر ڈالنے دیا نہ آنکھوں کو بے لگام ہونے دیا۔ مگر اب وہ میرے بالکل پاس تھا۔

''اب ہم سے بھی پردہ کروگی، اپنے بچپن کے ساتھی سے۔'' انداز بڑا ہی دوستانہ اور لہجہ شیرینی سے بھرا...... میں نے دوبارہ آنکھ اٹھا کر اسے تکا۔ خاصا بانکا سجیلا نکلا تھا وہ، چہرے کی رنگت سپید تھی اور خوب صورت ہونٹوں کے اوپر سجی وہ سیاہ مونچھیں...... مجھے یوں اپنی طرف غور سے تکتا پایا تو گڑبڑا گیا۔

''کیا دیکھنے لگیں، ارے کیا ڈھونڈنے لگیں صوفی۔''

''اس اتنے بڑے مرد میں اپنے بچپن کے ساتھی کو۔'' میں کھلکھلا کر بولی اور تیزی سے آگے چل دی۔ گلی کے نکڑ پر ایک ساعت کو مڑ کر اسے دیکھا، وہ ان سیاہ مونچھوں تلے خوب فیاضی سے مسکرا رہا تھا۔

''خالہ اماں، صوفی باجی سے بولیں مجھے ذرا اردو کا قاعدہ پڑھا دیا کریں۔'' ساتھ والے گھر سے رضو آئی بیٹھی تھی۔ اماں کپڑے دھو رہی تھیں اور وہ کامل مستعدی سے نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہی تھی۔ ننھی سی بچی کی کارکردگی دیکھ کر میں حیران ہی رہ گئی۔ ایک میں تھی کسی کام میں ڈھنگ تھا نہ سلیقہ مگر ننھی رضو کا مطالبہ بڑا ہی عجیب تھا۔

''لو بھلا وہ کہاں اتنی پڑھی لکھی ہے جو محلے کی بچیوں کو سبق دیتی پھرے۔'' اماں بھی حیران ہوئیں۔

''میں جانتی ہوں خالہ اماں، صوفی باجی زیادہ پڑھی نہیں مگر اخبار پڑھ لیتی ہیں، اردو میں بہت اچھی ہیں، سونی باجی کے پاس وقت ہوتا تو میں اُن ہی سے کہہ دیتی اور......'' اماں بات کو طول دے رہی تھیں کیونکہ رضو اُن کے دھلے کپڑے الگنی پر بکھیرے جا رہی تھی۔

''خالہ اماں میں فیل ہو جاؤں گی، اچھا یوں کرو کہ گھر کے کام کردوں گی آپ کے...... فیس تو دے نہیں پائیں گے ہم۔'' تبھی اماں کا دل پسیج گیا۔

''چل ٹھیک ہے آجایا کر...... مگر تو ہی آئے گی یہاں...... صوفی تمہارے گھر نہیں آئے گی۔''

''ارے نہیں خالہ۔'' اماں مان گئیں۔ رضو گویا ناچتی گاتی واپس گئی تھی۔ ارے رضو پڑھائی کی اتنی شوقین تو کبھی نہیں تھی۔ اب بھلا پڑھائی کا دورانیہ بڑھنے پر اتنی خوش تھی مگر اگلے روز ہی یہ مسئلہ حل ہوگیا جب...... رضو اپنے بستے میں اپنے قاعدوں کے ساتھ ایک ہرے نگوں والا ہیئر کلپ لے کر آئی۔

''یہ کیا ہے رضو ارے اتنا پیارا کلپ کہاں سے لیا؟'' اس شیطان کی ٹوٹی نے بڑے منجھے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر چپکے سے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''عباس لالہ نے بھیجا ہے یہ۔''

میں یک دم سناٹے میں آگئی۔ عباس کو اماں کے ساتھ گلی میں آتے جاتے اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا تھا۔ کل ہی سرِراہ ملاقات ہوئی ایک نگاہ ذرا تفصیلی سی ڈال لی تھی اس پر، اس کی وجہ سے اتنی لفٹ لے گیا کہ اپنی

بہن کو میرے گھر بھیج دیا اور اتنی ڈھٹائی کہ تحفہ بھی بھیج دیا۔ ٹھیک ہے بندہ بھی اچھا ہے، پُرکشش سا اور تحفہ بھی خوب جگمگا رہا تھا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ میں اسے قبول ...... میں ابھی سوچوں کے منجدھار میں پھنسی تھی کہ رضو کسی کے آنے کی آہٹ پا کر اسے میری جھولی میں پھینک کر یہ جا وہ جا۔

اگلے روز رضو کی کاپی کے آخری صفحے پر لکھا ہوا آ گیا۔

''شکریہ جانِ من۔'' گویا وہ سمجھا میں نے یہ تحفہ خوشی سے قبول کیا۔ اس ننھے سے پیغام نے تو میرے پسینے ہی چھڑا ڈالے۔ حالت ابتر سی ہوگئی۔ رضو نے میری حالتِ زار دیکھی تو بھاگ کر ایک گلاس پانی کا لے آئی۔

''صوفی باجی میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

''ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں تم قاعدہ کھولو۔''

بات مذاق نہیں رہی، رضو تواتر سے آتی رہی اور اس کی کاپی کے آخری صفحے پر کوئی نہ کوئی ننھا سا پیغام، کوئی بازاری سا عشقیہ جملہ رقم ہوتا، میرے حسن کی تعریف میں گھٹیا سے شعر بھی لکھے ہوتے۔ میں نے کبھی ان پیاموں کا جواب نہیں دیا۔ کبھی نہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ سب کچھ بھلا سا لگنے لگا تھا۔ میری خشک بیزار سی زندگی میں جیسے بہار کا دبیز سا جھونکا آیا پھر...... میری ٹین کی چھت پر بجنے والا بارش کے قطروں کا وہ جلترنگ بج اٹھا تھا۔

سبز نگوں والا کلپ میں اپنے سنگ رکھتی پر بالوں میں لگانے کا حوصلہ نہیں ہوا، ایک روز رضو زبانی پیغام لے آئی۔

''عباس لالہ کہتے ہیں کل گھر آ جائیں پڑھانے۔''

''نہیں......'' میں سرتاپا کانپ گئی مگر وہ سیدھی اپنی خالہ اماں کے پاس چل دی۔

''خالہ اماں کل امی، خالہ کی طرف جائیں گی گھر اکیلا ہوگا۔ کل صوفی باجی میری طرف آ کر پڑھا دیں تو۔''

''ارے نہیں بالکل نہیں۔'' اماں فوراً بولیں۔

''اماں ساتھ میں تو گھر ہے، ہو آئے گی...... اسے تو آپ نے گھر میں ہی پھنسا ڈالا۔'' اس وقت سونی ہی میری مدافعت کے لیے سامنے آئی۔ اماں کو یہ بات پسند تو نہیں آئی مگر شاید دل میں یہ خیال آ گیا کہ یہ تو گھر کی دہلیز سے نکلتی ہی نہیں سو مجھے اجازت دے دی۔

میں اگلے روز پڑوسن خالہ کے گھر تھی۔ رضو نے درست کہا تھا وہ اپنی بہن کی طرف گئی تھیں مگر عباس وہیں موجود تھا۔ گھر کے کمرے میں کھڑکی کے بالکل سامنے...... میں بچی نہیں تھی جوانی کی امنگوں اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ عباس پر ڈالی ایک نظر اس کی طرف سے بھیجے یہ پیغام مجھے بڑا بہادر اور مختلف بنا گئے تھے۔ اماں کی نظر بچا کر نکلی تھی کیونکہ آج بننے سنورنے کو کسی کو متاثر کرنے کو، رجھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی سلائیاں پھیری تھیں یہ بڑی، بڑی آنکھیں کاجل بھرا تو نشیلی بھی ہوگئیں۔ کپڑے تو اماں کے ڈر سے ڈھنگ سے نہ پہن سکی مگر چہرہ بہتر کر لیا اور بالوں میں وہ سبز نگینوں کا کلپ بھی لگا لیا تھا۔ عباس نے میرے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھے تو سامنے آ گیا۔

''چل بھاگ رضو اپنی استانی جی کے لیے ٹھنڈی پیپسی کی بوتل لا۔''

''اپنے لیے بھی لے آؤں لالہ؟''

''ہاں لے آنا چٹوری بلی، یہ لڑکی تو مجھے قلاش کر دے گی۔'' وہ مسرور سا بڑبڑا رہا تھا۔ رضو بھاگ کر باہر نکلی تو وہ میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہاں تک آنے کی ہمت تو کر چکی تھی مگر اس کی قربت...... جیسے میرے ہوش اڑا رہی تھی۔

''ہم نے استانی جی کو گھر سے نکال ہی لیا۔'' وہ لگاوٹ سے بولا۔

میں کچھ نہیں بولی مگر استانی جی کا لقب مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ میرے چہرے کے ناگوار تیور اسے شاید سب کچھ سمجھا گئے۔

''اپنی جان کہہ دوں...... یا پریوں کی رانی اور یا

پھر محل میں رہنے والی ملکہ...... محل میں رہنے والی کیوں میرے دل میں رہنے والی ملکۂ عالیہ......'' اس نے بات مذاق میں شروع کی تھی مگر جلد ہی اس آواز جذبات سے بھیگنی شروع ہوگئی۔ میں قریب پڑے تخت پر ڈھے سی گئی۔ ایسی باتیں بھلا میں نے کہاں سنی تھیں۔ بانکے سجیلے عباس کے خوب صورت ہونٹوں سے نکلنے والی وہ باتیں......میرے لیے امرت بن گئی تھیں۔ ان کی شیرینی میری زندگی کو نہال کرگئی تھی۔ تبھی اسے محسوس ہوا کہ میں تو اسی وقت سے خاموش تھی۔

''تم کچھ نہیں کہو گی جانِ عباس۔''

''نہیں، آج میں صرف سننا چاہتی ہوں' آج میرا سارا بدن جیسے کان بن گیا ہے، تم کہتے رہو اور میں صرف سنتی رہوں۔'' میں یہ سب کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی بس سوچا ضرور اور مسکرادی۔

اگلی ملاقات بس سرسری سی تھی۔ اماں نے کھیر بنائی تو ایک پیالہ بھر کر خالہ پڑوسن کے گھر بھجوانا چاہا اور اس کام کے لیے مجھے بولا، مجھے کیا چاہیے تھا، میں دوپٹا سر پر لپیٹ کر بھاگی......مگر مجھے وہ نظر نہیں آیا۔ خالہ خوش ہوئیں۔

''آج صبح تمہارے خالو کی صحت کے لیے پڑھائی شروع کی تھی تو میٹھا لے آئی اچھا شگون ہوگیا۔''

اب انہیں بھلا کیا معلوم کہ میں کس شگن کی تلاش میں آئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو گوہرِ مراد نظر نہیں آیا۔ دل اداس ہوگیا۔ قدم بھاری ہوگئے واپس جانے کو تھی کہ دروازے سے وہ داخل ہوتا نظر آیا، قدم رک گئے۔

''ارے عباس دیکھ تو صوفی کتنے مزے کی کھیر لائی ہے۔''

''اچھا اماں کھلاؤ تو۔'' میں رک گئی تھی خالہ چمچ لینے اندر چل دیں۔

''اب نہیں رہا جاتا جانِ عباس رات چھت پر۔''

''نہیں۔'' میں ایک سیکنڈ کی ہزارویں ساعت میں بولی۔

''خدا کے لیے صوفی، میں مرجاؤں گا۔''

خالہ چمچ لے کر آگئی تھیں میں چپکے سے باہر چلی آئی۔

☆☆☆

سوفی کے اسکول میں امتحانات چل رہے تھے وہ کے جی کلاس کی ٹیچر تھی، اس کلاس کے تو پرچے بھی نہیں ہو رہے تھے مگر اسے دوسری کلاسز کے پرچے چیک کرنے کے لیے دیے گئے وہ بیچاری پرچوں میں سر دے کر بیٹھی تھی۔ اماں، دال کو بگھار لگا رہی تھیں بھائی اپنے دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔ ابا کی طبیعت کچھ ماندی تھی سو وہ اندر کمرے میں لیٹ رہے تھے اور میں کسی مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مجھے اس کا ساتھ' اس کی قربت اچھی لگتی تھی، وہ میری تعریف کرتا' میں خود کو ہواؤں میں اڑتا... محسوس کرتی مگر اتنا بڑا قدم......شاید ہی میں ایسا کبھی کرسکتی، اماں کو میرے چہرے کی شکست وریخت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

''کیا ہوا صوفی......ٹھیک تو ہے رنگ اُڑ رہا ہے تیرا۔''

''نہیں تو اماں۔'' میں یوں گڑبڑا گئی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی۔

''جا دودھ پتی بنالے' دو رس بھی لے' لے ساتھ میں۔'' اماں فیاض بن رہی تھیں سوچا بیٹی خوش ہوجائے گی مگر جانتی نہ تھیں کہ ان کی بیٹی کی خوشی اس کی زندگی کی ترجیحات کتنی تبدیل ہو چکی ہیں۔ بھائی دوست سے مل کر واپس آگیا تھا۔ اماں نے سب کو کھانا دے دیا اور ہم سونے کو چل دیے۔ اب یہ وقت تھا جو مجھے ایک پل صراط کی طرح لگ رہا تھا، میں یہ راستہ پاٹنا نہیں چاہتی تھی میری اماں کا اعتماد، بھائی کا مان، ابا کی غیرت، میری پیاری بہن کا بے لوث پیار...... یہ سب مجھے اس غلط قدم کو اٹھانے سے روک رہے تھے اور میں واقعی رک گئی، میں نے اپنی خواہشات کو اپنے جذبوں کو تھپک، تھپک کر سلا دیا مگر خود رات بھر نہیں سو پائی۔

اگلے روز پیغام آیا۔ ''ظالم، صوفی میں نہیں بولتا۔'' مجھے ہنسی آگئی کیا بچپنا تھا یوں رات کو تنہا چھت پر چلے آنا کیا آسان بات تھی۔

''نہ بولو خود ہی رہ نہ پاؤ گے۔'' آج پہلی دفعہ

میں نے رضو کی کاپی میں درج اس پیام کے آگے لکھ دیا۔ جواب آیا۔

''چلو کفر تو ٹوٹا۔''

''زیادہ کی امید نہ رکھنا۔''

''امید پر دنیا قائم ہے۔''

ہمارے درمیان یہ ننھے، ننھے جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ایک دو دفعہ میں پڑوسن خالہ کی طرف بہانے سے گئی آنکھوں کی پیاس کو بجھایا۔ اس کی قربت کو اس کے ساتھ کے احساس کو اپنے اندر سمونے کی کوشش بھی کی مگر یہ عشق کا جذبہ بڑا ہی سرکش ہوتا ہے جب من میں سر ابھارے تو پھر دنیاداری، انا، سب بھول بھال جاتی ہے۔ میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی مگر میں اپنے اندر اٹھنے والے جذبات کے طوفان سے خوفزدہ ہوگئی تھی تبھی تو خود ہی لکھ بیٹھی۔

''اپنی اماں کو بھیجو ناں۔''

''تھوڑا انتظار کرلو، مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔''

''بڑا آدمی بننے تک چاہے میں یہاں موجود ہی نہ رہوں۔''

''کہاں جاؤ گی، اب میرے چاہے بنا تو تمہارا جنازہ بھی نہیں جاسکتا۔'' یہ آخری پیغام تھا گویا ابھی وہ مجھے اپنا بنانے میں ٹال مٹول کررہا تھا۔ میرا دل دکھ گیا، دل میں پکا عہد کرلیا کہ اب ناراض رہوں گی کوئی بات، کوئی پیغام نہ بھجواؤں گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی رضو کو خسرے کی وبا نے گھیر لیا۔ وہ تو یوں بھی آنے کے قابل نہیں تھی بلکہ اماں نے بھی اُن کے گھر جانے یا اس کے یہاں آنے پر زبردست پابندی لگادی۔ یہ سلسلہ ٹوٹ گیا کہاں تو میں اس سے ناراض ہونے کے خیال میں تھی کہاں اسے سامنے پانے اور اس سے ڈھیروں باتیں کرنے کو تڑپ گئی۔

تبھی ایسے موقع پر میری پیاری سونی ہی میرے کام آئی اس کے اسکول میں آج نتیجہ نکلنا تھا۔ بچوں نے تھوڑے سے پروگرام بھی تیار کر رکھے تھے۔ سونی مجھے بھی ساتھ لے گئی یوں لگتا تھا کہ وہی وقت وہی لمحہ لوٹ آیا ہے۔ وہی گلی...... سونی کی وہی تیز رفتاری اور میری وہی سست رفتاری تھی جس نے ہمارے پیار کی پہلی ملاقات کا روپ دھار لیا تھا۔ آج بھی سب کچھ ویسا ہی ہوا۔ عباس میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''نہیں ملے گی تو یہیں کھڑا جان دے دوں گا۔''

''اماں کو بھیجو......''

''یہ کیا پہاڑا یاد کرلیا تو نے...... جب تک اماں نہ آئے گی میں یونہی تڑپ کر مرجاؤں گا۔'' میں خاموش رہی آگ تو دونوں طرف ہی برابر لگی ہوئی تھی۔

''آج رات دس بجے کے بعد صرف پانچ منٹ کے لیے۔''

''صرف پانچ منٹ......'' میرا انداز پسپائی لیے ہوئے تھا۔

''چھ منٹ ہوئے تو گلا کاٹ دینا میرا۔''

وہ بلا کا لفاظ تھا لفظوں کا کھلاڑی اور...... اور جو خود من ہارے ہو اس کے لیے تو اتنی محنت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تبھی تو ساری تفاصیل ایک طرف رات دس بجے کے بعد میں اوپر تھی، وہ اپنی چھت پر تھا مگر دونوں چھتیں بس ایک ننھی سی دیوار کے علاوہ جیسے ایک دوجے کے گلے مل رہی تھیں۔

میں اس کے سامنے تھی ہمارے درمیان اینٹوں کی بنی ایک ننھی سی دیوار تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے میرا دل دھک، دھک کررہا تھا سارا خون جیسے رخساروں میں آن رہا تھا۔ وہ میری کیفیت سے خوش ہوا۔

''تم اور بھی زیادہ حسین اور قاتل ہوگئی ہو صوفی جان؟'' اس کی سرگوشی میرے تن من میں بجلی سی دوڑ گئی تھی میں جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے روک دیا۔

''پلیز جانِ عباس خاموش ہوجاؤ ایک لفظ نہ بولو میں بس اس بات کا یقین کرلینا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنا جانا اور مجھ پر اعتماد کرکے چلی آئیں۔ مگر صوفی اب ایک لفظ بھی نہ بولنا۔''

اور واقعی وہ پانچ منٹ ہم دونوں ایک لفظ نہیں بولے۔ بس ایک دوجے کی موجودگی کو محسوس کرتے

رہے اور قربت کے یہ لمحے اپنے وجود میں جذب کرتے رہے۔ پھر اس رات...... شاید رات بھر سوئی نہیں تھی یا پھر جلد جاگ گئی تھی۔ مجھے نہیں یاد بس اتنا یاد ہے کہ باہر برآمدے میں آئی تو اماں قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں مجھے پاس پایا تو میرے وجود پر ہولے سے پھونک ماردی اس پھونک کی تاثیر جانے کیا تھی کہ میں سر سے پاؤں تک پانی، پانی ہوگئی...... اماں میرے گرد اپنی عبادت، اپنی عقیدت کا حصار بنا رہی تھیں اور میں...... میں کس ڈگر پر چل نکلی تھی۔

رضواب ٹھیک تھی خالہ پڑوسن نے اسے نہلا کر محلے بھر میں گڑ والے چاول بھی بانٹ دیے تھے مگر میں نے اسے سختی سے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ میں اس بات کو یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کہانی کا انجام چاہتی تھی، ہاں اگر عباس درست طریقے سے مجھے اپنانے کا راستہ اختیار کرتا تو یہ باب کھولا جا سکتا تھا۔

عباس نے اس رات کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی، اس نے مجھے چھوا تک نہیں، وہ اینٹوں کی دیوار ہمارے درمیان شرافت کی دیوار ثابت ہوئی تھی مگر اماں، ابا کی تربیت مجھے اس روز سے ہی اپنی اس حرکت پر شرمسار کر رہی تھی۔ پچھتاوے کے بچھو مجھے کاٹے جاتے تھے۔ اسی لیے میں بس خاموش ہوگئی تھی اور خود کو حالات کے دھارے پر بہا دیا تھا۔

☆☆☆

ٹپ...... ٹپ...... ٹین کی چھت پر وہ مانوس سی آواز جلترنگ ثابت ہو رہی تھی۔ دل ٹوٹ گیا تھا جسم پژمردہ سا ہو رہا تھا مگر بارش کی آواز نے جیسے جسم میں توانائی اور حرارت سی پیدا کر دی تھی۔ میں ہمیشہ ہی بارش میں اماں کو کہتی۔

"اماں میں نہاؤں گی بارش کے پانی سے ڈھیر سارا۔"

"نہ بیٹی! بچیاں گھروں کے اندر ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"میں اب بھلا ان برستے بادلوں کو گھر کے اندر کیسے لے لاؤں۔" جانے یہ خیال کیسے دل میں در آیا۔ بارش کے قطرے دل کو بے چین کر رہے تھے۔

ایک بات بوندا باندی پر نہ تھی۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ اماں ابا، اپنے کمرے میں سو رہے تھے اور بھائی بیٹھک میں سوئی بھی بظاہر بے خبر سو رہی تھی اگر جاگ بھی رہی ہوتی تو وہ آنکھ نہ کھولتی، ایک پل کے لیے من میں آئی کہ باہر برآمدے میں چل دوں، آج اپنے تن من کو اس برستی بارش میں سیراب کر دوں۔ دل کے اندر جو پیاس سی محسوس ہو رہی ہے اسے اس رم جھم سے تر کر دوں میرے اندر کی تشنگی ختم ہو جائے۔ میں یونہی خیالات کے خلفشار کے زیر اثر باہر برآمدے میں چلی آئی بارش کا رخ شاید اس طرف کا نہ تھا۔ بارش تھی تو موسلا دھار مگر اندر ہلکی سی پھوار بھی نہ آئی۔ دبے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف چل دی اور ہولے قدموں سے اوپر چڑھنے لگی۔ جیسے کوئی غیر مرئی طاقت مجھے اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ اوپری دروازے تک آئی۔ دروازے کے بالکل قریب اس ننھی سی دیوار کے دوسری طرف کوئی تھا۔ بجلی یک دم کڑکی تیز روشنی میں دیکھ پائی تھی کہ وہ عباس تھا، یک دم مجھے یوں لگا کہ اتنے دنوں کی جدائی نے اسے نحیف بنا دیا ہے۔ یک دم بجلی پھر تیزی سے چمکی۔ دودھیا روشنی عباس کے چہرے کو روشن بلکہ بے نقاب کر گئی اس کی آنکھوں میں حرص اور ریاکاری کی چمک تھی۔ میں ایک دم لرزی میں وہاں سے واپس بھاگ جانا چاہتی تھی مگر وہ ایک ہی جست میں اس دیوار کو عبور کر آیا وہ مکمل شرابور تھا۔ اس کی مضبوط مردانہ گرفت...... اس نے پل بھر میں مجھے اپنے قریب کر لیا۔

"عباس......!" آواز میرے گلے میں پھنس رہی تھی، وہ بولا نہیں بس ہنس دیا مگر وہ ہنسی اس کے چہرے کے خوب صورت نقوش کو مسخ کر رہی تھی۔

"مجھے جانے دو عباس...... خدا کے لیے۔" معاملے کی نزاکت مجھے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کرنے لگی تھی مگر اس نے درندہ صفت شیطان نے مجھے دبوچ لیا۔ مجھے یوں لگا کہ آسمان میرے سر پر گر گیا اور زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسکنے لگی مگر یک دم کیا ہوا

اس برستی برسات میں یک دم روشنی کا ایک مینار نظر آ گیا۔ جس سے ساری کائنات جیسے نور میں نہا گئی، مجھے اپنی آغوش میں لینے کی کوشش میں مصروف ہاتھ ساکت ہو گئے، میں اس گرفت سے آزاد تھی، ہاں میری پیاری اماں لالٹین ہاتھ میں تھامے برساتی کے دروازے کے پاس کھڑی آنکھیں پھاڑے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

☆☆☆

آج گھر میں بہت چہل پہل تھی بھائی نے گھر کو خوب سجایا تھا بلکہ گھر تک پہنچنے والی تنگ گلی میں لال، ہری بتیاں روشن کر رکھی تھیں اس گھر کی پہلی شادی تھی، سونی نے مجھے دلہن بنایا تھا۔ اس رات کے واقعے کے بعد اماں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ واویلا نہیں مچایا، چیخ و پکار نہیں کی بلکہ بالکل خاموش ہو کر میرے لیے جلد شادی کا انتظام کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میری شادی کس سے ہو رہی تھی، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، بس میں تو اماں کے قدموں میں گر کر ان سے معافی مانگنا چاہتی تھی ان کے گلے سے لگ کر پشیمانی کے ڈھیروں آنسو بہانا چاہتی تھی۔ میں تو خواہاں تھی کہ اماں کا روح کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے ایک ماں کا رول نبھایا تھا اور مجھے گناہ کی دلدل میں جانے سے بچا لیا تھا۔ لیکن اماں نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور آج مجھے لال عروسی جوڑا پہنا کر اس گھر سے رخصت کر دیا۔

ابرار احمد اچھے انسان تھے، پہلی نظر میں ہی مجھے سنجیدہ اور بردبار سے لگے۔ میرا نیا گھر میرے میکے سے بہت بڑھ کر تھا۔

میرا گھر گو ایک چھوٹے محلے میں ہی تھا مگر وہ اچھا علاقہ تھا گلیاں اتنی تنگ و تاریک نہیں تھیں اور گھر بھی اچھا خاصا تھا۔ رخصتی سے اگلے روز جب گھونگٹ اٹھا کر میں نے اپنا گھر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ بھلا اماں نے ایسا گھر کیسے ڈھونڈ لیا۔ میرا مکان دو منزلہ تھا۔ نیچے کھلا صحن تھا اور صحن کے ایک طرف بڑا برآمدہ، ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا۔ ابرار احمد نے جہیز کے نام پر اماں سے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔ سارا گھر خوب صورت سامان سے بھرا پڑا تھا۔ عباس سے نفرت تو اسی رات سے شدید ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ابرار احمد جیسے انسان کا ساتھ۔ میں حیران تھی کہ زندگی یک دم اپنے کیسے رنگ مجھے دکھا رہی تھی۔

''آپ آج رات تیار رہیے گا آپ کو کچھ شاپنگ کرا دیں۔'' جاتے وقت ابرار احمد مجھے کہہ گئے تھے۔

باہر کی دنیا میرے لیے بڑی حسین تھی، ابرار احمد مجھے ایک بڑے بازار میں لے گئے تھے۔ جہاں سے میں اپنے لیے کپڑے اور جوتے خریدتی رہی۔

مدد

بے بس کی مدد کرنے سے
مت گھبرا
صلہ جانے، خدا جانے
دیا راہ میں جلاتا جا
ہوا جانے، خدا جانے
خزاں کے خوف سے
مالی تو بزدل ہو نہیں سکتا
چمن آباد رکھ
بادِ صبا جانے، خدا جانے
مریضِ عشق کو یارا
دوا کی کیا ضرورت ہے
مرض جانے، دوا جانے
شفا جانے، خدا جانے

کلام: بلھے شاہ
مرسلہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

جان جائیں

آنسو اپنی بخشش کے لیے اللہ کے سامنے بہائیں اور مسکراہٹ اللہ کی مخلوق میں بانٹ دیں۔ یہی بندگی کا تقاضا اور انسانیت کی معراج ہے۔

از: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

''یہ لباس؟'' میں نے اپنے لیے اورنج اور شاکنگ پنک فرل لگا فراک پسند کیا تھا۔ ''ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں۔'' ابرار احمد یک دم چونکے۔

''آپ کو یہ اچھا نہیں لگا ناں؟''

''نہیں جو آپ کو اچھا لگا وہ لے لیں، گھر میں کوئی عورت تھی نہیں، میں آپ کے لیے بری نہیں بنا سکا ورنہ تو ان دنوں دلہن کپڑوں کے معاملے میں خود کفیل ہوتی ہے۔''

''اماں بھی کچھ ڈھنگ کا دے نہیں پائیں اصل میں سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ......''

''ہاں واقعی اماں جان عظیم ہیں، میری ایک بزرگ سے میرا مسئلہ سن کر وہ فوراً ہی شادی کی ہامی بھر لی۔''

وہ اتنے سادہ سے انداز میں بات کر رہے تھے مگر میری جبیں عرق آلود ہو گئی۔

''اکیلا گھر تھا میرے لیے بھی مشکل تھی اور میری بچی زوہا کے لیے بھی۔''

''زوہا......'' یہ نام ابرار احمد کی بچی کے نام کے طور پر...... مجھے جھٹکا سا لگا۔

''میں آپ کی اماں جان کے اصرار پر خاموش رہا، میں ہر بات کلیئر طور پر بتا دینا چاہتا تھا مگر انہوں نے روک دیا تھا۔'' ہاتھوں میں تھامے کپڑوں کے شاپر جیسے منوں وزنی ہو گئے تھے۔ میری حالت زار دیکھ کر وہ پریشان ہوئے۔ پیکٹ میرے ہاتھ سے تھام لیے۔

''آپ کی پریشانی برحق ہے ہنی مون پیریڈ اور یہ انکشاف ابھی شاید کچھ ہفتے میں خاموش ہی رہتا مگر زوہا کو میں نے جس دوست کی طرف چھوڑا ہے اس کی فیملی کراچی جا رہی ہے۔'' میں خاموش رہی۔

''آپ سن رہی ہیں ناں؟''

''جی......''

''میری پہلی شریک حیات زوہا کو میری گود میں ڈال کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تب میری والدہ حیات تھیں پانچ برس تک وہ زوہا کو اپنے سینے سے لگائے رہیں مگر پھر......'' ابرار احمد کی آواز بھرا گئی۔

''زوہا پھر اکیلی رہ گئی۔ میرے گھر کی ابتر حالت اور زوہا کی پرورش...... میں ٹوٹ رہا تھا تبھی آپ کی اماں جان میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئیں اور......''

گو میں شاک کی حالت میں تھی مگر طبیعت میں تیزی تو تھی ناں ایک دم بول اٹھی۔

''تو آپ اپنے گھر کی دیکھ بھال اور اپنی بچی کی پرورش کے لیے بیاہ کر لائے ہیں مجھے۔''

''جی ہاں، واقعی میرا مقصد تو یہی تھا مگر آپ کو دیکھا تو جانا کہ آپ تو میری بھی تمام محرومیوں کا مداوا ہیں، اتنی دلکش شخصیت کہ میں اپنے سارے مسئلے بھول بھال گیا۔''

اب ہم اپنی بائیک تک آن پہنچے تھے۔ ابرار احمد نے مجھے مضبوطی سے پکڑنے کا کہا مگر میرے ہاتھوں کی گرفت بڑی کمزور پڑ گئی تھی۔ اب میں جان پائی تھی کہ اماں کو اتنا اچھا گھر اور اتنا مکمل داماد چند ہی دنوں میں کیسے مل گیا۔

''کل شفیق میرے دوست کی فیملی کراچی چلی جائے گی۔'' رات جب سونے کو لیٹے تو ابرار احمد ہلکے سے بولے۔

''تو......؟''

''تو کیا کریں اب......؟'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔

''کرنا کیا ہے ابرار، یہ زوہا کا گھر ہے، اسے تو یہاں آنا ہی ہے۔'' کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی جو دل میں تھا کہہ ڈالا اس جواب سے بھلا وہ کہاں خوش ہوئے ہوں گے مجھے احساس تھا مگر...... میں جو چند ہفتوں سے ان کے ساتھ اپنی سنگت کو مثالی سمجھ رہی تھی آنے والے بدلتے ہوئے حالات سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

واقعی زوہا کا گھر تھا، اس کے بابا اسے اگلی صبح ہی لے آئے تھے۔ چھ برس کی زوہا بہت حسین تھی دودھیا رنگت اور نیلگوں آنکھیں، بال سنہرے تھے مسکراتی تو گالوں میں ڈمپل نمایاں ہوتے۔ میں دل سے اقرار

کرتی ہوں کہ اتنے خوب صورت اور پُرکشش بچے کم ہی دیکھے تھے میں نے۔ اس کی ماما بھی ایسی ہی ہوں گی۔'' پہلا خیال دل میں یہ آیا۔ میں اپنی خوب صورتی اور قد کاٹھ پر خوب اتراتی تھی زوہا کو دیکھ کر ہلکا سا احساسِ کمتری میرے اندر پنپنے لگا۔

ابرار احمد بڑے نفیس انسان تھے۔ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے اور زوہا پر بھی پوری توجہ رکھتے۔ زوہا نے مجھے کسی بات سے تنگ نہیں کیا گھر میں کل وقتی ملازمہ تھی، اسے اسکول کے لیے بھی تیار کرتی۔ اس کے کئی چھوٹے، چھوٹے کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔ مگر میں اس کے لیے ممتا کے جذبات بالکل بھی پیدا نہ کر پائی۔

ابرار احمد اپنی دکان سے لوٹتے تو ہم دونوں کو اپنے سامنے پانا چاہتے مگر میں جان بوجھ کر منظر سے ہٹ جاتی۔ زوہا کو ساتھ لپٹا کر پوچھتے ہیں۔

''ماما کہاں ہیں آپ کی؟'' وہ میرے بارے میں کیا جانتی بس خاموش رہتی۔

''ماما گھر میں اکیلی ہوتی ہیں، ان کے ساتھ رہا کریں، کھیلا کریں۔'' وہ سر ہلا دیتی اور جب کبھی موقع دیکھتے تو مجھے بھی پیار سے کہتے۔

''صوفی بیگم، زوہا آپ کی بچی ہے اس کے معاملات میں دلچسپی لیں۔''

''جی، آپ کو کوئی شکایت ہے مجھ سے؟'' میں تیکھی سی ہو کر بولی۔

''نہیں بالکل نہیں مگر آپ اس سے مل کر پیار و محبت کے ساتھ رہیں گی تو شاید زندگی زیادہ حسین اور آزاد ہو جائے گی۔''

''مگر ابرار میں تو آپ کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے آئی تھی۔'' میں بلا کی منہ پھٹ۔

''تو آپ کو کوئی شکایت ہے مجھ سے؟'' میرا ہی انداز اور وہی الفاظ......

''نہیں، بالکل نہیں۔'' میں بول دیتی اور وقت اور پرے سرک گیا۔

☆☆☆

''سن صوفی تو خوش ہے ناں؟'' میری پیاری اماں نے یہ بات شادی کے چھ ماہ کے بعد پوچھی تھی۔ میں اماں کی طرف کم کم ہی آتی تھی۔ سونی بھی کھلی پڑ رہی تھی۔ ابا اور بھائی بساط بھر عزت خاطر کر رہے تھے مگر اماں کچھ سنجیدہ سی تھیں۔

اماں کا سوال مجھے حیران کر گیا تھا۔ ''میں نے یہ سوال پہلے نہیں کیا کہ میں جانتی تھی کہ ابرار احمد اپنی بیوی کو نا خوش کر ہی نہیں سکتے۔''

''اور ان کی وہ بیٹی......؟'' میں تیکھی سی ہو کر بولی۔

''وہ تمہاری بھی بیٹی ہے صوفی......''

''نہیں اماں، وہ میری بیٹی نہیں ہے، میرے اپنے بچے ہوں گے میں انہیں خوب پیار کروں گی اماں جیسے تم ہم سب پر جان دیتی ہو۔''

''پھر آج یہ جان لو بیٹا کہ زوہا ہی تمہاری بچی ہے؟''

''مگر اماں میرے بچے......''

''اللہ تعالیٰ دے گا بیٹا...... مگر یہ بھی تو سوچو ناں زوہا کی ماں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا اور اس کی ماں کے روپ میں تمہیں چنا۔''

''اماں میں کیا کروں، اماں سب کچھ ٹھیک ہے مگر وہ بچی......''

''پگلی ابرار احمد پیار کرنے والا لڑکا ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں مگر وہ زوہا۔''

قریب کھڑی سونی بھی ہنس دی۔

''تو، تو ویسی کی ویسی ہے، ابرار بھائی کی سنگت بھی تمہیں نہیں بدل سکی۔'' رات کو ابرار آئے اور مجھے واپس لے گئے۔ ان کے آنے تک میں اپنے آپ کو نارمل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس روز میں گھر گئی تو مجھے زوہا سے مزید نفرت محسوس ہوئی۔ میں ماں نہیں بن سکی تھی اور یہ بچی ابرار کو ان کی پہلی بیوی کا روپ بن کر ملتی رہے گی۔

دن مہینوں میں گزرتے رہے، ابرار نے اس معاملے کا کبھی ذکر نہیں کیا مگر میرے دل میں ماں بننے

گی خواہش سر اٹھاتی رہی۔ زوہا میری طرف ابھی تک پیار کی طلب نظروں سے تکتی مگر میں پہلو بدل لیتی، موسم بدلتا...... اس کے کپڑے اس کے جوتے یہ تمام ذمے داری ابرار احمد کی ہی تھی مگر وہ مجھ سے گلہ نہ کرتے مہینے سالوں میں بدل رہے تھے۔

کئی رُتیں آئیں اور بیت گئیں۔ ساون آتا مگر میری روح تشنہ ہی رہتی یوں جانو بن برسے گزر جاتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ابرار احمد مزید سنجیدہ ہوگئے تھے۔ مگر وہ میری طرف سے کبھی بے پروا نہیں ہوئے۔ جانے کتنے موسم گزر گئے۔ گھر میں خوشحالی تھی، پہننے میں، کھانے میں، گھومنے میں کسی بھی شے کی کمی نہیں تھی۔

☆☆☆

پہلے تو بارش بوندا باندی کی شکل میں رہی مگر پھر زور پکڑ گئی۔ ابرار دکان سے آئے تو تھک گئے کھانا کھا کر کافی کی طلب ہوئی میں کافی کے دو مگ تھامے بیڈ روم میں آگئی۔

''زوہا کدھر ہے؟'' ابرار بولے۔

''آپا کے پاس......'' میں نے لاتعلقی سے جواب دیا۔

''زوہا کی آپا تو آج گاؤں جانے کے لیے چھٹی مانگ رہی تھی، گئی نہیں کیا؟''

''پتا نہیں۔'' میری لاعلمی پر وہ کچھ خاموش سے ہوگئے اور خاموشی سے ٹی وی کا ریموٹ پکڑ کر چینل سرچ کرنے لگے۔

رات کافی بیت گئی تھی۔ بارش اپنے زوروں پر تھی۔ ابرار کب کے سو چکے تھے، میں نے لاکھ پہلو بدلے مگر نیند کوسوں دور تھی شاید لیٹتے وقت کافی پی لی تھی اس لیے نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ بارش تیز تر ہوگئی۔ جانے کیوں یک دم ٹین کی چھت پر پڑتی بوندوں کی آواز ذہن میں در آئی۔ میں بے قراری ہو کر اٹھ گئی۔ پہلے صحن کی طرف گئی مگر کوئی غیر مرئی سی قوت مجھے کشاں کشاں چھت کی طرف لے گئی۔ آج یونہی برستے ساون کو یوں قریب سے دیکھنے کو جی چاہنے لگا تھا۔

چھت کا دروازہ کھلا تھا، میں حیران ہوئی۔ چند قدم آگے بڑھی، وہاں یکایک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ تھوڑا سا خوف آیا مگر تجسس کا عنصر مجھ پر غالب آگیا۔ میرے سامنے چھت کے عین درمیان میں وہ زوہا ہی تھی۔ موسلا دھار بارش اسے بھگو رہی تھی۔ قریبی گھروں کی بیرونی لائٹس میں وہ مجھے نظر آرہی تھی۔ میں یک دم چونک گئی۔ وہ سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی سی گڑیا تو نہ تھی۔ وہ...... وہ تو بڑی ہوگئی تھی۔ کتنے ہی برس گزر گئے تھے۔ جسم کے نشیب و فراز...... گیلے چپکے ہوئے کپڑوں میں نمایاں ہورہے تھے، بال گیلے ہو کر کمر سے اوپر آن ٹک رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے وہ نوخیز کلی زوہا...... صوفیہ کا روپ دھار گئی۔ برستی بارش میں چھت پر کھڑی وہ زوہا...... میرا دل لرز گیا۔ وہ ننھی کلی نہیں جانتی تھی کہ یہیں قریب ہی کوئی عباس شکار کی تلاش میں دھاک لگائے بیٹھا ہوگا۔ میری ماں نے مجھے مسیحا بن کر بچالیا تھا مگر زوہا...... زوہا کی حفاظت کون کرے گا...... کیا کوئی بھیڑیا اسے یونہی اپنی ہوس کا شکار، نہیں، نہیں ایسا نہیں ایسا ہوسکے گا...... میں اس کی ماں ہوں، زوہا میری بچی ہے، میں، میں اس کے لیے سائبان بنوں گی...... میں اچانک آگے بڑھی مجھے سامنے دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے لرز گئی مگر میرے چہرے پر ممتا اور پیار کی نرمی اسے ایک دم بہادر کر گئی، ایک قدم میں آگے بڑھی اور دو قدم وہ آگے آئی اور میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنے وجود کے ساتھ لگالیا۔ زوہا میرے سنگ لگی تو جیسے میری صدیوں کی تھکان ختم ہوگئی۔ آج اس مہربان ساون نے زوہا کو ایک ماں کا پیار بخشا تھا اور مجھے جیسے میری ذات کی تکمیل کردی تھی۔ ہم دونوں اپنے جذبات کی یلغار میں دیکھ ہی نہیں پائے کہ ابرار ہم سے ذرا دور ہمارے اس جذباتی منظر کو دیکھ رہے تھے اور اس خوب صورت ملن پر اپنی آنکھوں میں اترے ساون کو روک نہ پائے تھے۔



پے اِنگ گیسٹ

پاکیزہ قارئین کے لیے رفاقت جاوید کی ایک انوکھی تحریر......

”گیسٹ روم کا جہاں فائدہ ہوا ہے وہاں خسارہ بھی بے تحاشا ہے۔ ذرا غور سے میری بات سننا تاکہ تمہارے سوالات کا سلسلہ ختم ہو سکے۔“ زنیرا نے زچ ہوتے ہوئے اپنی کولیگ عیشہ سے کہا۔

”جس ڈر سے تم نے اپنی نوکری کو الوداع کہا تھا۔ اسی خوف وڈر کا بھاری بھرکم بھوت تم نے اپنے گھر

میں پال لیا ہے۔ بہتر ہے کہ کسی نیشنل کمپنی کی نوکری پکڑلو، یہ روز، روز کی چخ، چخ سے جان چھوٹ جائے گی۔ تم مصری کی ڈلی ہو نہ ہی کھوٹے کا پیڑا کہ لوگ تمہیں فٹافٹ منہ میں ڈال لیں گے۔ پے انگ گیسٹ تو نری ذلالت اور رسوائی ہے۔ مگر محترمہ سمجھیں تو بات آگے چلے ناں......'' زنیرا سنجیدگی سے بولی۔

''باہر نکلنے اور دوسروں کی نوکری اور جی حضوری کرنے سے پے انگ گیسٹ کا بزنس لاکھ درجے بہتر ہے۔ کیونکہ میں کسی کی محتاج ہوں نہ احسان مند، اپنی باس ہوں اور دوسرے میرے احسان مند ہیں۔'' عیشہ فخریہ انداز میں اکڑ کر بولی۔ ''یہ مزہ تم نہیں جانتیں، اپنی نوکری کر کے دیکھو، پھر مجھ سے بات کرنا۔''

''تو پھر یہ ہر روز کا رونا دھونا چھوڑ دو کہ گیسٹ ادائیگی کیے بغیر ہی غائب ہو جاتے ہیں، وغیرہ، وغیرہ......خدا کا شکر ہے کہ تمہارے پاس بڑا گھر نہیں، ورنہ گھر کے بجائے وہ جھنجال پورہ کا روپ دھار چکا ہوتا۔'' زنیرا زچ ہو کر بولی۔ ''اور تم سے ایک گیسٹ تو سنبھالا نہیں جاتا، بیسیوں کو کیسے قابو کر پاتیں۔ چند دنوں میں ہی وہ تمہیں سڑک پر کھڑا کر دیتے۔''

''اسی لیے تو میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ زندگی گھٹ گھٹ کر جینے کا نام نہیں ہے۔ زندگی کو پُرکشش بنانے کے لیے تھرل کی ضرورت ہے، چاہے تھرل آزمائش اور امتحان ہی کیوں نہ ہو۔'' عیشہ خوش دلی سے بولی۔

''یار سمجھا کرو، اس معاشرے میں اپنے گھر میں پے انگ گیسٹ رکھنے کا مطلب جانتی ہو ناں، تم اپنے پرانے آفس واپس آجاؤ۔ خواہ مخواہ ہی تم نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے اگر اجازت دو تو منیجر سے بات کروں؟'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ہرگز نہیں، میں تھوک کر چاٹنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر آخری اور حتمی فیصلہ کیا ہے جو میرے تمام مسائل کا حل ہے۔'' عیشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کسی اور کمپنی میں جاب پکڑلو، تمہارے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے لیکن تم نہیں مانو گی سمجھ گئی اور میں نے سنا ہے تم شادی کرنا چاہتی ہو مگر کس سے؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔

''بہت جلد یہ خوشخبری تمہیں سناؤں گی۔ ذرا دل تھام لینا کہ کیا تیر چلایا ہے کہ ایک نشانے میں دو شکار۔''

''اچھا، وقت نے تمہیں یہ بھی سکھا ہی دیا۔'' زنیرا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجبوری اور ضرورت بہت بڑا ورس ہے، جو سیکھ...گیا وہ کنارے تک پہنچ گیا۔ جو نادان اور اناڑی وہ بیچ منجدھار میں ہی ڈوب گیا اور میں ڈوبنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''ویسے آپس کی بات ہے کہ تم بہت دور اندیش عورت ہونے کے ساتھ تھوڑی بونگی بھی ہو۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی تو عیشہ نے خفگی و غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''ذرا میری عمر کا حساب کرو کہ وقت پر لگا کر اُڑتا جا رہا ہے؟ اور تمہیں اس کا احساس ہی نہیں، اب میں نے وقت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے اپنا غلام بنالیا ہے۔ آج کے دن میں ایک طلاق یافتہ عورت چالیس کا ہندسہ بھی کراس کر چکی ہوں، دوسری بار جوا کھیلنے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ لیکن کیا کروں؟ بہت مجبور ہوگئی ہوں، اب میں مزید قیدِ تنہائی برداشت نہیں کرسکتی۔'' عیشہ نے اِک سرد طویل آہ بھر کر اپنی امید و بیم میں ڈوبی ہوئی گفتگو جاری رکھی۔

''زندگی میں ہر انسان کو ایک گولڈن چانس ضرور ملتا ہے، اس کا فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے، یہ تو تم بھی جانتی ہو ناں کہ اس معاشرے میں اکیلی عورت سروائیو نہیں کرسکتی۔ جب اپنا سائبان اور جیون ساتھی چھوٹ جاتا ہے تو پھر اپنے تمام خونی رشتے بھی منہ موڑنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ ایسی عورت کی ذمے داری اٹھانے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اور الٹا موردِ الزام

اسے ہی ٹھہرانے لگتے ہیں۔"

"وہ کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو، بس مجھے ڈر ہے کہ تنہائی کے خوف سے تم کہیں جلد بازی میں ہی کوئی فیصلہ نہ کرلو...... یار مجھے غلط مت سمجھو...... تمہاری ہمدرد اور غمگسار ہوں، تمہارا برا نہیں سوچ سکتی۔" زنیرا نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"دیکھو ڈیئر، تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، تم صرف ایک رخ دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی ہو، ذرا روشن پہلو کی طرف تو نگاہ ڈالو...... اگر دو چار سال اور گزر گئے تو پھر کون کرے گا مجھ سے شادی؟" وہ اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ایک دم سے دلاور نامی بھوت نے چھو کر دیوانہ کر دیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں عیشہ کہ ایک مرد کی سیکیورٹی کے لیے اپنا چین و سکون تج کر دو گی ویسے بڑے افسوس کا مقام ہے۔ چاہے یہ فلیٹ دو بیڈ روم کا ہے، تمہاری اپنی پناہ گاہ ہے، تم تعلیم یافتہ ہو، ٹیوشن سے اپنی زندگی کی گاڑی چلا رہی تھیں کہ نہ جانے آناً فاناً کیا ہوا کہ تم نے اس چھوٹے سے فلیٹ کو آوارہ ...... اور لفنگوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ ہر کوئی تم پر کیچڑ اچھال رہا ہے، میں جواب دیتے، دیتے تھک گئی ہوں لیکن تم نے کان ہی لپیٹ لیے ہیں، اب تم آزاد بھی ہو اور تمہیں کوئی اور لعن طعن کرنے والا بھی نہیں اور تمہیں کیا چاہیے۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"companionship,security اور ایک ایسا نام جو میرے نام کے ساتھ جڑ جائے تاکہ لوگوں کی زبان کو تالا لگ جائے۔" اپنے تئیں اس نے دلیل دی۔" اور میں بھی اِک پہچان بن جاؤں، ابھی تو میں اس نام کے بغیر بالکل لاوارث، بدکردار اور بدچلن ہوں، جیل میں بھی قیدی کو القابات سے نوازا جا رہا ہے، ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی، اسی ثانیے ڈور بیل پر دونوں سہیلیاں چونکیں۔

"لگتا ہے تمہارے گیسٹ کی تشریف آوری ہوئی ہے، ناک کٹوا کر رکھ دی ہے۔ گھر کے اندر اس نمونے کے ساتھ...... او مائی گاڈ...... میں تو چلی۔" زنیرا فوراً جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"گیسٹ روم کا دروازہ باہر سے کھلا رہتا تو کیا بہتر نہیں ہوتا۔ اب تو لگتا ہے جیسے وہ گیسٹ نہیں مالک ہے۔"

"او کے...... میری فکر کیوں کرتی ہو؟ میں کل کی بچی نہیں ہوں ... کئی بار لٹ جانے کے بعد بھی باہر کا دروازہ کھلا رکھوں۔ یہ تو سراسر نادانی ہے۔ اب جو بھی آتا ہے کم از کم میری نظر میں تو ہوتا ہے، یہاں ہنکی پنکی نہیں چلے گی۔ عیشہ بھی آخر کار بڑی ہو رہی گئی ہے، اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور مین ڈور کھولنے لگی۔

☆☆☆

"دلاور صاحب مسئلہ کیا ہے؟ خیریت تو ہے، بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔" عیشہ، دلاور کی طرف فکر مندانہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"خیریت اور دلاور دو مختلف نام ہیں، میڈم آپ میرا مقدر بدل نہیں سکتیں۔ میری حالت ملاحظہ فرمائیں۔ نہ ڈھنگ کا لباس نہ کام اور یقین جانیں زندگی سے تنگ آگیا ہوں، کاش میں جاہل ہی رہتا مزدوری تو مل ہی جاتی۔ یہ ملک تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے نہیں رہا۔ مکھن و کریم دوسروں کے لیے اور چھاچھ اس ملک کے لیے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

"جناب ایسی ناامیدی کی باتیں چھوڑ دیں۔ یہ بتائیں کہ انٹرویو کیسا رہا...... اور اگلے انٹرویو کی ڈیٹ ملی کہ نہیں۔" وہ لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میڈم! سفارش اور رشوت کے بغیر سانس لینا بھی ایک معجزاتی عمل ہے، اس معجزے کا ہی شکرانہ ادا کرسکتا ہوں، ورنہ ہر کام کے لیے سفارش، پیسہ اور اسٹیٹس چاہیے۔" وہ آہ بھر کر بولا اور گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائے بیچارہ...... مسکین اور فرشتہ صفت انسان

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اسلام آباد کی سڑکوں پر ہی خرچ ہوگیا ہے۔ اب میں اس سے کیا ڈیمانڈ کرسکتی ہوں کہ مجھے ہر دن کی پے منٹ کرے...... بیچارہ کہاں ڈاکا ڈالے۔ بیچارہ پڑھا لکھا بھی ہے، ذہین بھی ہے لیکن ہے بہت شریف اور غریب...... یہ دونوں نقص اسے زندگی بھر آنکھ مچولی سے روشناس کراتے رہیں گے۔ غیرت مند اور خوددار ایسا کہ کیا مجال کہ کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے...... زبردستی نہ کھلاؤں تو وہ کب کا اس کارِ جہاں سے سدھار چکا ہوتا۔'' یہ سوچتے ہی اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹی اور ٹوٹنے کی آواز پر دلاور نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر نہایت اپنائیت اور لگاوٹ سے کہا۔

''ذرا خود کو بچا کے، میڈم کہیں کرچیاں آپ کے نازک ہاتھوں کو زخمی نہ کردیں۔'' ہمدردی اور توجہ کے چند بولوں نے فرطِ مسرت سے اسے دیوانہ کردیا۔ وہ جھومتی ہوئی پھر کیتلی میں چائے کے لیے پانی بھرنے لگی۔

پاؤں پر گرم چائے کے چھینٹے گرنے کی بھی اسے رتی بھر پروانہیں ہوئی تھی۔ اس خوش کن احساس میں جھومتی ہوئی ہلکی آواز میں گنگنانے لگی۔

''تم اپنا دردوغم مجھے دے دو۔'' خوشیوں کے ہلکورے لیتے ہوئے اس نے ٹرالی میں چائے اور دیگر لوازمات رکھے اور لاؤنج میں صوفے کے سامنے ٹرالی رکھ کر نہایت شیریں لہجے میں دلاور کو آواز دی۔ اس نے یکلخت دروازہ کھول دیا ایسے گمان ہوتا تھا جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی کان لگائے کھڑا ہو۔

''میں جانتی ہوں دلاور صاحب کہ آپ نے دن بھر کچھ کھانے کی تکلیف ہی گوارانہیں کی ہوگی۔ ابھی چائے، پانی سے ذرا معدے کو طمانیت بخشیے پھر آپ کو کھانا ملے گا۔'' وہ اپنائیت سے بولی۔

''نہ باہر میری ماں نہ یہاں کوئی دادرس...... بس ایسی ہی حسرت زدہ زندگی ہے میری۔ میڈم آپ بھی مجھے کھانے کے لیے مجبور کرنا چھوڑ دیجیے۔ اب میں خود کو ایک جونک ہی سمجھنے لگا ہوں۔ جو مسلسل آپ کا خون چوس رہی ہے۔ اب تو فلیٹ کی اس بالکنی سے کود کر زندگی کی تمام کلفتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ میری نمازیں اور دعائیں آسمان پر نہیں پہنچتیں میڈم، انہی گناہ گار، رشوت خور لوگوں میں ہی بھٹکتی رہتی ہیں۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''فارگاڈ سیک دلاور صاحب، آپ کو کسی...... سائیکاٹرسٹ کے مشورے کی ضرورت ہے۔ میں عورت ہونے کے باوجود اپنے مقدر کی لکھت کو مٹانے کے لیے کوشاں ہوں۔ نوکری چھوڑنے کا اِک مقصد تھا۔ وہاں مجھے بندھی ہوئی تنخواہ تو مل رہی تھی؟ لیکن باہر کے لوگوں سے ایکسپوژر زیرو تھا۔ میں نے گھر میں قید ہوکر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے لوگوں تک رسائی حاصل کرنا چاہی...... لیکن ایسی ناکام ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر میں نے گیسٹ روم کا سوچا یہ تجربہ برانہیں رہا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تو وہ ہمہ تن گوش ہوکر سنتا رہا۔ اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے قدرے خوش دلی سے کہا۔

''جناب والا اپنے وطنِ عزیز کی سیاست اور جمہوریت کا تماشا دیکھتے ہوئے چائے نوش فرمائیں اور مجھے دعا دیجیے۔ بس مجھے آپ سے دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''سوری میڈم! کچھ نہیں کھاؤں گا میں۔'' وہ بچے کے مانند بضد ہوگیا۔ ''میں ایسا بے غیرت تو کبھی نہیں تھا۔ آپ کی ہمدردی نے گدھا بھی بنا ڈالا اور الو بھی۔'' وہ مسکرا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ خاموشی سے اسے اس کے باہر آنے کا منتظر تھا اور سوچے جارہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ عورت دھوکے باز، فریبی اور بے وفا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذات کو تو پیار کی مٹی سے گوندھا اور پھر اس میں شہد، وفا اور ایثار کی آمیزش کردی اور بے وقوفی کی حد تک معصوم بنا ڈالا۔ جس دن سے اس عورت کا گیسٹ بن کر اس کے گھر آیا ہوں ایسے گمان ہوتا ہے ماں قبر سے اٹھ کر

میڈم کے وجود میں بسیرا کر گئی ہو۔ زندگی کے ہنگاموں میں ہر طرح کی عورت سے واسطہ پڑتا رہا۔ لیکن میڈم جیسی دلنواز عورت نہ ملی۔''

''دلاور صاحب! آپ میرے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا نہیں کھائیں گے؟ چلیں کہہ دیجیے مائنڈ نہیں کروں گی۔ بلکہ ایسا کیجیے کہ سامنے مرکز سے ہی بریانی کی دو پلیٹیں پکڑ لائیے' میں نے بھی بہت دنوں سے باہر کا کھانا نہیں کھایا۔ چلیے دونوں۔ زبان کا ذائقہ ہی بدلتے ہیں، آخر اس معمولی سی عیاشی پر ہمارا بھی حق ہے۔'' وہ اس کی طرف پانچ سو کا نوٹ بڑھا کر بولی۔

''اگر اب غیریت اور اجنبیت کی باتیں کیں تو خفا ہو جاؤں گی۔''

''میڈم ایسی بات نہیں۔ آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا ایک بار چکھ لوں تو پھر ہاتھ نہیں رکتا بلکہ اوور ایٹنگ ہو جاتی ہے۔'' اس نے نوٹ پکڑتے ہوئے قدرے لجاجت سے کہا۔

''نوکری لگنے دیں۔ آپ کا حساب مع منافع .... چکا دوں گا۔ بہت احسان مند ہوں آپ کا۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور وہ خود کو ہی لعن طعن کرنے لگی۔

''میں، ہر وقت سبزی، دال اور بیف کا لمبا شوربہ سامنے رکھوں گی تو بیچارہ بوٹی ڈھونڈنے کے لیے ہر بار اس میں غوطہ لگانے سے تو رہا۔ وہ میری بھی ضرورت و مجبوری اور بے بسی کا علم خوب رکھتا ہے پھر فکر کس بات کی' اس پر چند نوٹ لگاؤ اور پھر عمر بھر عیش اڑاؤ، آخر کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ دینا بھی تو پڑتا ہے۔ پیسے کا کیا ہے ہاتھ کی میل، عزت تو محفوظ ہے ناں۔''

☆☆☆

ایک سہانی صبح حسبِ معمول وہ نوکری کے لیے تیار ہو کر لاؤنج میں نکل آیا۔ قد آدم آئینے میں اس نے اپنا جائزہ لیا۔ ڈارک گرے کلر کے تھری پیس سوٹ میں وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی غائب تھے اور چہرے پر جو مردنی اور مسکینیت کی چھاپ تھی یہاں کی خاطر داری اور توجہ سے کافور ہو گئی تھی اور پھر روزگاری کا بھی تو اپنا ہی نشہ اور جمال ہوتا ہے جو اس کی شخصیت سے نظر آنے لگا تھا۔ اسے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نوازنے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

''اس عورت کو میرے مالک نے میرے نصیب بدلنے کے لیے چن لیا ہے۔ جو اس قدر مہربان و مسیحا ہے کہ ایک مہینے کی پے منٹ کے بعد اس نے مجھے اک دلنشین احساس دلایا ہے کہ یہ گھر میرا ہی ہے۔ میری مایوسی و اداسی اور شرافت اس عورت پر جادو کر گئی۔ میری انا، غیرت و خودداری نے اس کا دل جیت لیا۔ آج میں اس کی مہربانی اور عنایت سے ایک بیروزگار نہیں بلکہ ایک کمپنی کا منیجر ہوں اور دو مہینے کی جاب نے ہی مجھ میں خود اعتمادی کوٹ، کوٹ کر بھر دی۔ مجھے بات کرنے کا سلیقہ اور تعلقات میں رکھ رکھاؤ کا ڈھنگ آ گیا ہے۔ میڈم میری ناگفتہ بہ حالت نہ بدلتی تو میں آج اس سیٹ پر شانِ بے نیازی سے براجمان نہیں ہوتا۔ بے شک اس عورت کے پاس سفارش تو نہیں تھی۔ اس کے بدل میں اس نے مجھے ایک امیرزادہ بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ تیری معصومیت اور فراخدلی کو سلیوٹ کرتا ہوں۔'' وہ خود کلامی کرتا ہوا مین ڈور کی طرف بڑھا ہی تھا کہ عیشہ کچن سے نکلی...... اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور کھیر کا پیالہ تھا۔ وہ میٹھی اور شگفتہ مسکان کے ساتھ اس کے قریب آ گئی۔

''دلاور صاحب، مجھے ان پر پرانی دقیانوسی حماقتوں پر قطعاً یقین نہیں...... لیکن آج یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔ ماما کہا کرتی تھیں کہ جب امتحان دینے جاؤ یا کسی بڑے کام کے لیے نکلو تو اس کی کامیابی کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے دودھ اور میٹھا کھا کر جانا مت بھولنا، کامیاب ہی لوٹو گی۔''

''ضرور، ضرور......'' وہ ٹائی درست کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میڈم آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس

الفاظ نہیں ہیں۔'' وہ اس سے نظریں ہٹا کر بولا۔ ''آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

''دلاور صاحب! مجھے شرمندہ مت کیجیے۔'' وہ ذرا سا نادم ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا اپنا گھر ہے۔ اس میں احسان مندی کی کیا بات ہے۔''

''میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں...... اور یہ کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے۔ ان دس مہینوں میں ہر لمحے یہ سوچ میری ہمجولی رہی کہ ہم زندگی میں تجربات و مشاہدات سے ہمیشہ منفی اثرات لیتے ہیں۔ اور بہت جلد ہم... بے حس اور ہر طرح کے جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ نہ ہماری سوچ اپنی رہتی ہے نہ ہی اس میں صلاحیت رہتی ہے۔ قوتِ گویائی، لیک آف کونفیڈنس کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے اور انسان ایک زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ نے ایک زندہ لاش کو سائبان دیا اور ایک مضبوط سہارا دیا۔ میرے عمر رسیدہ باپ جنہوں نے مجھے یونیورسٹی تک پہنچانے میں بے حساب قربانیاں دیں۔ اپنی دوسری اولاد کی حق تلفیاں کیں تاکہ میں ایک افسر بن کر اپنے خاندان کے حالات درست کرسکوں۔ مگر میں شومئی قسمت ان کا خواب پورا نہ کرسکا۔ میں گھر میں ہی بیٹھا نوکری کا منتظر رہا کہ آخر میں نے 4 GPA میں انجینئرنگ کی ہے۔ دربدر ہونے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ماں کے شب و روز سمجھانے کے بعد میں نے خفگی اور غصے میں گھر کو خیر باد کہہ دیا۔ سالوں دنیا والوں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا آپ تک پہنچ گیا۔ اور اب میرا مقدر بدل گیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری تین بہنیں آج بھی والدین کے گھر کی دہلیز پر بیٹھی رشتے کی منتظر ہوں گی۔ میرے دو چھوٹے بھائی تھوڑا بہت پڑھ کر کہیں چھوٹی موٹی نوکری سے گھر والوں کی دال روٹی پوری کرنے میں باپ کی مدد کر رہے ہوں گے۔ مجھ پر اتنا پیسہ خرچ کرنے کا انہیں تو رتی بھر فائدہ نہیں ہوا۔ مجھ پر اپنے باپ کا قرض ہے اور بہن، بھائیوں کا احسان۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ ''میں تمام قرض اور احسانات چکانا چاہتا ہوں میڈم۔''

''آج کا مبارک دن خوشیوں کے دیپ جلانے کا ہے۔ آپ کی خوشی میری خوشی اور آپ کا دکھ و درد بھی میرے حصے میں لکھ دیا گیا ہے۔'' یہ سنتے ہی دلاور کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس کی المناک اداس آنکھوں میں بجلی کی لہر دوڑی اور اس نے بھرپور نظروں سے اس کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ اس کا ایسا ردِعمل پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ عیشہ ایک دم جھینپ کر اس سے دو قدم دور ہٹ گئی۔ دودھ کا گلاس لرزتے ہوئے ہاتھوں سے فرش پر گر گیا۔ دل نے سرگوشی کی، دلاور تو بہت نیک طینت شخص ہے، مجھے شک نہیں ہونا چاہیے۔ او مائی گاڈ...... بدشگونی ہوگئی۔ وسوسوں اور اندیشوں سے اس کا دل تیزی سے دھڑکا اور سانس پھول گئی۔ اس نے کھیر کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ دلاور کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیلی اور آنکھوں میں درندگی کی ہولناک پرچھائیاں نمایاں ہوگئیں۔ اس کا جی چاہا کہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اس پر عنایتوں کی بارش برسادے اور عیشہ پہچان نہ پائی۔ ورنہ عورت کی حس تو اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ایک آنکھ کے اشارے سے کردار و اخلاقیات کی تہ تک جا پہنچے۔ نیت کے فتور اور ارادوں کی شیطانیت کی کھوج لگانے میں پل بھی نہ لگائے...... لیکن اگر کوئی بھروسے اور اعتماد کے پردے میں خامیوں اور برائیوں کو نظر انداز کر کے خود کو... بے وقوف بنانے میں اپنی مثال آپ ہی بن جائے تو کیا، کیا جائے۔ یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اسے مسلسل عجیب سی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا جبکہ عیشہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

''دلاور صاحب! آج کے مبارک دن کے گزر جانے کے بعد آج کی شام میں آپ کو ایک اور خوشخبری سنانا چاہتی ہوں، یقیناً آپ سن کر بہت خوش ہوں گے۔'' وہ نہایت ملائمت سے بولی۔ ''آج کا دن میرے لیے بہت طویل اور جان لیوا ہوگا۔ لیکن اس کا

انجام بخیر ہوگا۔ آپ آفس سے وقت پر ہی آ جایئے گا۔ ہائی ٹی پر چلیں گے۔'' اس نے ایک مشہور ہوٹل کا نام لیا۔ وہ ایک دم سے اس کے چہرے پر مرکوز نگاہیں ہٹا کر آئینے میں اپنا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اور دل نے سرگوشی کی۔

'' زمانے کی ستائی ہوئی عورت، جس کے چہرے پر تازگی ہے نہ رعنائی...... یہ مجھے خوشخبری نہیں بلکہ شاید موت کا سندیسہ سنانے والی ہے۔ اس کی وسیع النظری، جان فشانی اور ہمدردی ولگن کا ثمر اسے ضرور ملنا چاہیے۔ میں بری طرح اس کے تانے بانے میں گرفتار تو ہوں لیکن دھاگے ریشم کے ہیں، فولادی کہیں سے نہیں۔''

'' جی ضرور'' کہہ کر وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

آج وہ دن بھر گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف رہی۔ گیسٹ روم کے تمام کورز تو لیے اور چادریں بدل ڈالیں۔ فرنیچر کو خوب رگڑ رگڑ کر چمکایا اور ایک کنگ سائز بوکے ڈریسنگ ٹیبل پر سجا دیا۔ مگر وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ چار بجے سے پہلے وہ نہا دھو کر تھوڑی دیر کے لیے بستر پر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئی اور سوچنے لگی کہ دلاور سے اپنے خیالات کا اظہار کیسے کرے گی، محبت کا اظہار کرنا اس کی فطرت کے منافی تھا۔ حسین سپنوں میں کھوئی وہ دلاور کی زبان سے اعترافِ محبت کے دلنشین لفظوں کو چنتی ہوئی نیند کی وادیوں میں بھٹکنے لگی۔ جب آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا اور اک جان لیوا خاموشی رات گہری ہوئے کا سندیسہ دینے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کر کے موبائل میں وقت دیکھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ندامت سے اس کی پیشانی پر بیزاری وناگواری کی لکیریں ابھریں۔ اور آنکھوں میں عجیب سی جلن اور دل میں کھلبلی سی مچ گئی۔ '' آج تو ہائی ٹی پر جانے کا پروگرام تھا۔ دلاور بہت شریف الطبع انسان ہے، بہت خوش بخت ہوں میں کہ مجھے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آئی ایم شیور اس نے کچن میں

جھانک کر بھی دیکھا نہ ہوگا، بھوکا ہی سو گیا ہوگا۔''
وہ ایک دم سے اچھل کر بستر سے نیچے اتری...... اور غیر ارادی طور پر گیسٹ روم کی طرف چل دی۔ آج سے پہلے اس نے دروازے پر کبھی دستک نہیں دی تھی۔ آج بے اختیار دستک دے کر وہ وہاں پندرہ منٹ تک کھڑی رہی......اور آخر سر کو جھٹکتی ہوئی لاؤنج میں رکھے ہوئے ڈسپنسر سے ٹھنڈا پانی پینے لگی۔

''تنہائی سے مقابلہ کرتے، کرتے میں تھک گئی ہوں، نڈھال ہوگئی ہوں، دنیا میں کیا ہو رہا ہے کچھ خبر ہی نہیں مجھے۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ اس اکتاہٹ اور بوریت زدہ ماحول سے جان چھڑا لوں۔ فیصلہ ہرگز غلط نہیں، شادی تو حلال ہے، اللہ نے مجھے ہر لحاظ سے حفظ و امان میں رکھا۔ کل کی صبح میری آزادی کا سندیسہ لے کر طلوع ہوگی۔'' اس کے ان خوش آئند خیالوں کا سلسلہ اک چھناکے سے ٹوٹا اور وہ بے یار و مددگار ماضی میں بھٹکنے لگی جب وہ اک جنگل میں درندوں کے چنگل میں پھنسی آہ و بکا اور فریادیں کر رہی تھی...۔ کوئی اس کی مدد کو نہ آیا تھا اور اس نے منجدھار سے خود کو بہ مشکل نکالا تھا۔ ایک پرائیویٹ جاب کی جگہ اس نے پرائمری کلاس کے چار بچوں کو اپنے گھر میں ہی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن مہنگائی کے اس دور میں بجلی و گیس کے بلز اور کچن کے اخراجات پورے کرنے مشکل ہوگئے، نوبت دال روٹی کی حدیں بھی عبور کر گئی تو اس نے اپنے فلیٹ میں پے انگ گیسٹ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک کمرے میں ایک ہی فیملی کے افراد ٹھہرائے جاتے، عموماً ایک ہی فرد پر اکتفا کر لیتی۔ شروع میں خواتین اور لڑکیاں ایک آدھ ہفتے کے قیام کے لیے آتیں اور بے منٹ کیے بغیر غائب ہو جاتیں بلکہ جاتے، جاتے کمرے کا سامان بھی اٹھا کر لے جاتیں۔

پھر اس نے ٹین ایج لڑکوں کو فوقیت دی تو ان کے مسائل ناقابل برداشت ہونے لگے۔ اب باری تھی میچور، مڈل ایج مردوں سے ڈیل کرنے کی۔ اپنی بزدلی کو خیرباد کہا اور وہ اب ایک بااعتماد و خود مختار بہادر مہمان نواز بن گئی۔ اب وہ اپنے گیسٹ کو جوتی کی نوک پر رکھتی اور حساب و کتاب میں ایسی بے لحاظ اور کھری نکلی کہ گیسٹ سے ایڈوانس اور سیکیورٹی کی رقم پہلے دن ہی وصول کر لیتی تھی اس لیے گیسٹ اسے تنگ کرنے کے بجائے اس کے رعب داب میں رہتا۔ اپنی فطرت کے مطابق جہاں وہ بے پناہ میٹھی تھی، دوسری طرف حالات نے زہر سے لبریز بھی کر ڈالا تھا۔ اگر اسے کسی کے کردار پر ہلکا سا شک بھی گزرتا تو وہ فوراً اسے چلتا کر دیا کرتی۔ ایک وقت تھا جب اس کی شادی ٹوٹی تھی تو وہ شادی کو پابندی کا نام دے بیٹھی۔ اتنے سالوں بعد آج وہ شادی کے بندھن کو عورت کی آزادی سے منسوب کرنے لگی تھی۔ کیونکہ یہ اس کا اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ اسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر دولت ہے تو عیش و عشرت اور سیر و سیاحت میں زندگی گزارنی چاہیے۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی۔ ایسا تحفظ ہی زندگی کی تمام رونقوں اور رعنائیوں سے روشناس کرا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک مضبوط تحفظ کی تلاش میں ہر گیسٹ کا باریک بینی سے معائنہ کرنے لگی تھی۔

جب سے دلاور پے انگ گیسٹ بن کر اس کے پاس آیا تھا اس کی کم گوئی اور شرافت نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ دلاور اس کی بقیہ زندگی کا بہترین شریک سفر بن سکتا ہے۔ اس کی عمر بھی اسی کے لگ بھگ تھی۔ ایک غریب خاندان کا بے حد حاجت مند اور شریف یہ شخص اس کے دل کو بھا گیا تھا۔

ایک مہینے کے بعد پیسے ختم ہو جانے کی وجہ سے رخصت ہونے لگا تو وہ رو دیا تھا۔ عورت نرم دل اور نرم مزاج کی نہ ہو تو وہ عورت کہلانے کے قابل نہیں ہوتی مگر یہی خوبی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خامی اور غلطی بھی بن جاتی ہے۔ جسے مرد بخوبی جانتا ہے۔ دلاور نے اپنی زندگی کی بہاروں میں ہمیشہ عورت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کسی

ایک کا نہ ہو سکا تھا۔ خاموشی، صبر و تحمل اور کم گوئی اس کی کامیابی کا وہ ہتھیار تھے کہ عورتیں اس پر فریفتہ ہو جاتیں اور جب وہ مظلوم بن کر اپنی کتھا سناتا تو وہ اپنی جمع پونجی اس پر لٹا دیتیں۔ یہاں بھی کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے۔ وہ جیسا بظاہر نظر آتا تھا اس کا باطن اس کے بالکل برعکس تھا۔ جس کے سامنے عیشہ کے اعتماد، یقین اور بھروسے کا دبیز پردہ تھا۔ جس کے پار وہ کچھ دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ صوفے پر نیم دراز دیر تک ماضی کی تلخی، حال کی امید و آس کی کیفیت اور خوش آئند مستقبل کے حسین و لنشین سپنوں میں کھوئی رہی۔

آج پہلی بار اس نے نماز تہجد نہایت خشوع و خضوع سے ادا کی اور فجر کی نماز کے بعد لاؤنج میں ہی دلاور کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے ہوئے تلاوتِ کلام پاک اور ذکر الٰہی کرنے لگی۔

سورج کی روشنی فلیٹ کی بند کھڑکیوں سے بھی چھن، چھن کر اندر آنے لگی تھی۔ پیٹ میں بھوک کے مرغولے بھی اٹھنے لگے۔ قلب و ذہن کی بے کلی و بے تابی بھی آسمان کو چھونے لگی تھی۔ لیکن دلاور کے کمرے کا دروازہ نہ کھلا۔ بات تو قابلِ فکر تھی۔

اکثر و بیشتر دلاور کی خاموشی، کم گوئی اسے بے حد ناگوار بھی گزرتی تھی لیکن وہ پھر بھی مطمئن رہتی کیونکہ کبھی کبھار اس کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ اس کے لیے آبِ حیات بن جاتے تھے۔ دلاور نے اس کی ذہنی سوچ کے مطابق تھا۔ نرم مزاج، بالحاظ اور تمیز دار۔ بالآخر تنگ آکر عیشہ نے گیسٹ روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی مگر جواب ندارد شدتِ جذبات سے وہ بلند آواز میں دلاور کو پکارنے لگی مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس نے فکر مندی و اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرا دلاور کے سامان سے خالی تھا۔

''وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' وہ زور سے چیخی۔

''کیا اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ ہائے میرے چکنا چور خواب مجھے جینے نہیں دیں گے۔ دلاور تمہاری آخری گفتگو کا آخری اور حتمی جملہ مجھے ہمیشہ رُلاتا رہے گا۔''

''میڈم آپ کو ان ہمدردیوں اور چاہتوں کا صلہ ملنا چاہیے۔'' ڈریسنگ ٹیبل پر ایک لفافہ رکھا دیکھا۔ بے چینی سے اٹھا کر اسے کھول کر اس میں درج تحریر پڑھنے لگی۔

''ڈیئر میڈم!

میں نے اس قدر صاف شفاف پھولوں سے سجا ہوا کمرا دیکھا۔ تو میرا دل چاہا کہ آپ کو اسی کمرے کی زینت بنالوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر میں دہل گیا، میں جانتا ہوں کہ آپ ایک پاکباز خاتون ہیں، مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ آپ کو میرے قلب و ذہن میں بسنے کا شوق ہرگز نہیں...... نہ ہی آپ کو مجھ سے والہانہ لگاؤ ہے، نہ ہی محبت کا چکر ہے۔ آپ کو صرف اور صرف ایک مرد کا تحفظ چاہیے اور میں آپ کو ہر وقت دھوکا دینے کے پروگرام بناتا رہا، نہ جانے کون سی طاقت آپ کو میرے شیطانی عمل سے بچاتی رہی۔ میں بہت حیران ہوں آپ نے جیسا مجھے پایا ہے، میں اس کے بالکل برعکس ہوں۔ آپ کے احسانات کا بدلہ میں آپ کو اسی صورت میں دے سکتا ہوں کہ آپ کو اسی وقت تنہا چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں تاکہ آپ میری شیطانیت سے محفوظ رہ سکیں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور میری ایک نصیحت زندگی بھر مت بھولیے گا۔ ''کبھی مرد پر اس کا ظاہر پن دیکھ کر اعتبار مت کیجیے گا۔'' میں نے اپنی زندگی میں عورت کی اسی معصومیت سے خوب فائدہ اٹھایا مگر اب میں نے محسوس کیا ہے کہ میں لاکھوں کے باوجود تہی دست ہوں۔ میں نے آج کمپنی کی جاب چھوڑ دی ہے۔ آپ کے بے شمار احسانات کے بدلے میرے اندر کے انسان نے آپ کی قیمتی عزت و جان بخشی کر دی ہے، بہت مبارک ہو۔ معافی کا خواستگار!

دلاور حسین خان''

وہ چکرا کر وہیں فرش پر گر کر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔

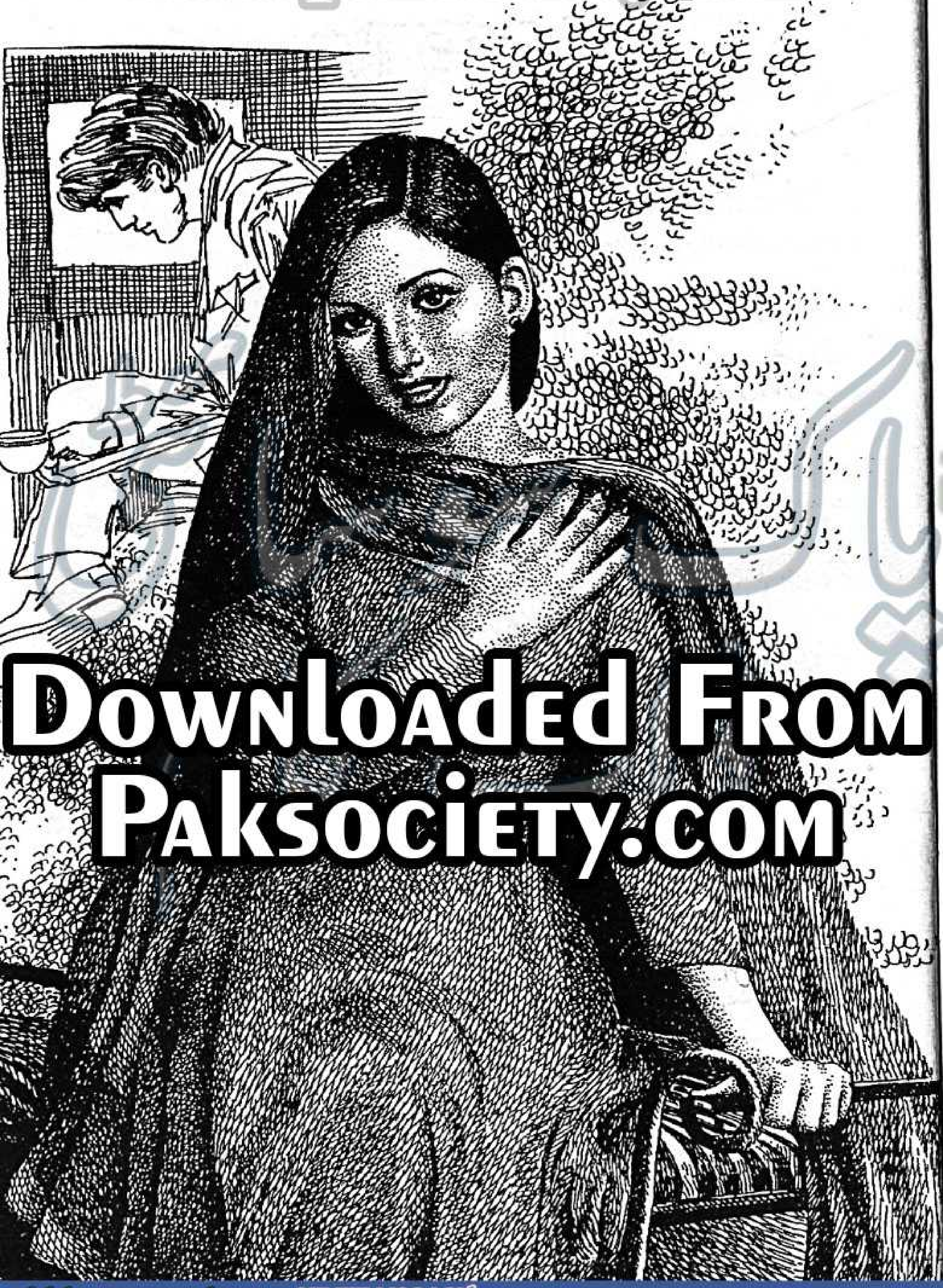
یہ کہاں بچیں کہ دل ہے.....

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں...
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے...
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے...
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوجاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے...
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا...
عبادات، معاملات...
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی...

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

شیخ حماد حسین کی وسیع و عریض کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ تا حدِ نگاہ رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ خوشبوئیں، مسرتیں، مردوں کے فلک شگاف قہقہے، خواتین کی کبھی دبی، دبی کبھی کھنک دار ہنسی کی آوازیں...... اس گھر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سارے جہاں میں سب خیریت ہے۔ شیخ حماد حسین اپنی شادی کی گولڈن جوبلی منا رہے تھے۔ ان کے بیٹے، بیٹیاں، بہوئیں، داماد سب ان کی زندگی کی اس یادگار خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ شیخ حماد حسین کی سب سے چھوٹی بیٹی جو ابھی غیر شادی شدہ تھی، جس کا نام تو ماہین تھا مگر سب پیار سے اسے ماہی کہتے تھے اس وقت اپنی قریبی سہیلیوں کے ساتھ شدت سے ایک خاص مہمان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو شاید اسی مہمانِ خاص کی وجہ سے اکٹھا کیا تھا اور اس خوب صورت تقریب کے بہانے فائدے اٹھایا تھا۔ اس کی سب سے عزیز ترین بچپن کی دوست سفینہ اس وقت سائے کی طرح ماہین کے ساتھ تھی...... ماہین جدھر جاتی سفینہ کا



ہاتھ تھامے رہتی۔ جیسے میلے میں ماں مارے احتیاط کے اپنے بچے کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے نہیں چھوڑتی۔

وہ مہمانِ خاص جس کا شدت سے انتظار تھا۔ اس ملک کا ایک مشہور مصور تھا جس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ شہرت یافتہ ہونے کے باوجود اسے براہِ راست بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔ جن لوگوں سے اس کی راہ و رسم تھی وہ اس کا ذکر یوں کرتے تھے گویا دیو مالائی داستان کے کسی کردار کا ذکر کر رہے ہوں۔ ماہین نے سفینہ کو اس کے بارے میں اتنا کچھ بتایا تھا کہ سفینہ جیسی سنجیدہ مزاج محتاط لڑکی بھی اس کی ایک جھلک دیکھنے کو متجسس ہو رہی تھی۔

شیخ حماد حسین کے تمام مدعو مہمانِ گرامی تقریب میں پہنچ چکے تھے۔ سوائے اس مہمانِ خاص کے جسے دنیا پرنس کے نام سے جانتی تھی۔ جس کا مکمل نام پرنس شہپر خانزادہ تھا۔ مگر شہپر خانزادہ بہت کم لوگوں کو یاد رہتا تھا۔ اس کے فن پاروں کے کونوں پر بھی دستخط کے انداز میں پرنس ہی لکھا نظر آتا تھا۔

شیخ حماد حسین بار، بار رسٹ واچ پر نظر ڈال رہے تھے۔ بہت سے مہمانوں کو جنہیں پرنس سے ملنے اور دیکھنے کا اشتیاق تھا یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود گھڑیال بن چکے ہوں اور ان کے دل پنڈولم کی طرح متحرک ہوں۔ سفینہ، ماہین کے ساتھ مین گیٹ کے آس پاس ہی ٹہل رہی تھی۔ ماہین کے والدین ابھی تک استقبالیہ پر تھے۔ پرنس کو خوش آمدید کہے بغیر وہ یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

سب سے دلچسپ اور حیران کن امر یہ تھا کہ ترقی کی اس انتہا کو چھونے والے دور میں بھی پرنس کے پاس سیل فون نہیں تھا۔ ورنہ ابھی تک دسیوں میسج کا تبادلہ ہو چکا ہوتا۔ بہت بڑے اسٹیج پر پانچ منزلہ اونچا بڑا سا کیک لوازمات کے ساتھ سجایا جا چکا تھا۔ باربی کیو کی خوشبوئیں اب ماحول میں سرایت کرنے لگی تھیں جس سے مہمانوں کو اچھی خاصی تقویت ہو رہی تھی کہ کھانا شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ اللہ، اللہ کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ پرنس نے اپنے اسمارٹ سے پرائیویٹ سکریٹری کے ساتھ محفل میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔

سیاہ ڈنر سوٹ، گولڈن اور ریڈ ڈاٹس کی ٹائی...... چمکتے ہوئے بالی شوز، کسی قیمتی پرفیوم کی روح میں جذب ہو جانے والی مہک...... بالوں کا باوقار اسٹائل، ہونٹوں پر بڑی مہربان سی مسکراہٹ...... چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قدو قامت، نہ دبلا نہ موٹا...... سب کچھ اتنا ہی متوازن جتنا اس کے برش کو متوازن رنگ بکھیرنے میں مہارت ہو چکی تھی۔ اس کی پینٹنگز کے متوازن رنگ غالباً اس کی شخصیت کا پرتو تھے۔

مسٹر اینڈ مسز حماد حسین نے اس کا استقبال کیا۔ پرنس کے سکریٹری نے ہاتھ میں تھاما ہوا چھوٹا سا گفٹ پیک پرنس کی طرف بڑھایا جو پرنس نے اس کے ہاتھ سے لے کر حماد حسین کی بیگم کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

لان میں کچھ دیر پہلے والا شور تھم گیا تھا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب کی نظریں پرنس کے روشن چمکتے دمکتے چہرے پر جمی تھیں۔ ایک ماہر فنکار، کمال کا ہنر مند اور اس پر جاذبِ نظر شخصیت...... عموماً جب کسی مصور کا تصور یا خاکہ ذہن میں آتا ہے تو ایک لگی بندھی تصویر بنتی ہے۔ شکن آلود کرتا پاجامہ، بے ترتیب بال...... کسی کے کاندھوں سے اور پر کسی کے کاندھوں پر پڑے ہوئے قلندرانہ شانِ بے نیازی، چہرہ ہر وقت سگریٹ کے دھوئیں کے حصار میں...... ماہین نے خاموش کھڑی سفینہ کو ٹہوکا دیا اور سرگوشی کی۔

”ہے ناں خاصے کی چیز......!“

”یہ چیز ہے، میں انسان سمجھ رہی تھی۔“ سفینہ نے بھی جوابی سرگوشی کی اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

شیخ حماد حسین، پرنس کو ہمراہ لے کر اسٹیج کی طرف بڑھے۔ سکریٹری، پرنس کے ساتھ سائے کی طرح چل رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی کپڑے سے بنا ہوا بیگ تھا جس میں سے اس نے ایک رومال نکال کر پرنس کو تھما دیا تھا جو پرنس نے چہرہ پونچھ کر اسے واپس کر دیا تھا۔



اسٹیج کے قریب وہائٹ اور گولڈن رنگ کے امتزاج سے تیار صوفے رکھے ہوئے تھے۔ حماد حسین نے پرنس کو صوفے پر بٹھایا، سکریٹری، پرنس کے برابر ہی میں بیٹھ گیا تھا۔ دوسری جانب حماد حسین بیٹھ گئے تھے۔ ابھی مہمان سے کچھ رسمی بات چیت بھی کرنا تھی۔ وہ شخصیت جو کسی کا مہمان بننے پر آسانی سے تیار ہی نہیں ہوتی تھی، آج ان کی عزت افزائی کرنے چلی آئی تھی۔ اسے نشست پر بٹھا کر جلدی سے کیک کاٹنے کیسے اسٹیج پر چلے جاتے...... وضع داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

ماہین، سفینہ کا ہاتھ تھام کر اس طرف چلی آئی جہاں سے پرنس کا آسانی سے مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ قریب ہی ایک راؤنڈ ٹیبل پر دو، تین کرسیاں خالی نظر آگئی تھیں سو ماہین، سفینہ کو لے کر وہاں بیٹھ گئی۔

"کیک کٹنے کے بعد کھانا ہوجائے پھر پرنس سے باتیں کریں گے۔" ماہین نے سفینہ کے کان میں کہا۔

"کیا باتیں کریں گے؟" سفینہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی چونک کر ماہین کی شکل دیکھنے لگی۔

"ارے بس ویسے ہی...... دیکھیں گے بولتا ہوا کیسا لگتا ہے؟" ماہین نے وہ جواب دیا جس کا نہ سر تھا نہ پیر...... مارے جوش وخروش کے آئیں بائیں شائیں ہورہی تھی۔ سفینہ دھیرے سے ہنس دی اس کی نظریں پرنس پر ہی تھیں۔

پرنس کا سکریٹری، پرنس کو سگار دینے کے بعد سگار لائٹر سے سلگا بھی رہا تھا۔

"دیکھا جائے تو بیچارے کی زندگی کتنی مشکل ہے، سگریٹ تک سلگانے کے لیے نوکر رکھا ہوا ہے۔" سفینہ نے اپنے اندر عجیب سی گدگدی ہوتی محسوس کی تو بولے بنا رہ نہ سکی۔

"بھئی...... برش چلاتے، چلاتے اس کے بازوؤں میں درد ہونے لگتا ہوگا...... ایسے بندے کو تو پسے بھی چار ہاتھوں کی ضرورت ہے...... دو کام کے لیے، دو پینٹ کرنے کے لیے......" ماہین ایک لمحے میں پرنس کی وکیل بن گئی۔

شیخ حماد حسین، پرنس کے ساتھ رسمی بات چیت سے فارغ ہو کر اپنی بیگم کے ہمراہ کیک کاٹنے کے لیے اسٹیج کی طرف بڑھے۔

"عمیر سب کو بلاؤ......" فیملی فوٹو بنے گی، جسے بعد میں پرنس اپنے برش سے بنائیں گے...... جو آنے والی نسلوں کے لیے بہت قیمتی گفٹ ہوگا۔" انہوں نے اپنے بیٹے کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"شیخ صاحب...... جو نسل ریڈی ہے اسے تو جلدی سے اکٹھا کریں۔ آپ نے ہمیں ڈنر پر بلایا ہے ناشتے پر نہیں۔" حماد حسین کے ایک قریبی دوست کی بیگم نے جملہ چست کیا۔ وہ اپنی پوتی کو ساتھ لیے آئی تھیں جو بھوک کی وجہ سے انہیں بہت تنگ کر رہی تھی۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا تھا۔ اب لوگ پرنس کے بجائے اس طرف زیادہ دیکھ رہے تھے جہاں من و سلویٰ اتر رہا تھا۔

شیخ حماد حسین کی فیملی کے تمام لوگ آناً فاناً اسٹیج پر چڑھ دوڑے۔ ماہین بھی سفینہ کو کھینچنے لگی۔

"ارے مجھے کیوں کھینچ رہی ہو، اس وقت اسٹیج پر صرف فیملی ممبرز ہوں گے۔" سفینہ نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے ماہین کو عقل کی بات سمجھائی۔

"اوہ ہاں...... ہاں تو ٹھیک ہے، تم بیٹھو میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسٹیج کی طرف دوڑ گئی۔ اس کی بڑی بہن شرمین اسٹیج پر کھڑی درجن بھر سونے کی چوڑیوں سے بوجھل ہاتھ ہلا، ہلا کر اسے بلا رہی تھی۔

سفینہ اب دلچسپی سے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماہین کے جڑواں بھائی اپنی، اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ماں، باپ کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔ شرمین اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ دائیں طرف کھڑی نظر آ رہی تھی۔ سفینہ دیکھ رہی تھی کہ ماہین کی جگہ سیٹ کرنے میں مسئلہ تھا پھر اس نے دیکھا ماہین کے پاپا نے ماہین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اور بیگم کے درمیان کھڑا کر دیا۔ کیمروں کے فلیش کی روشنیاں اسٹیج پر کھڑے تمام لوگوں کو نمایاں کر رہی تھیں۔ ماں، باپ کی شادی کی گولڈن جوبلی منانے والوں کے چہرے الوہی خوشی سے ویسے ہی دمک رہے تھے۔

ماہین نے دوستی کے آغاز ہی میں سفینہ کو بڑی دلچسپ بات بتائی تھی کہ وہ اپنے بڑے بھائیوں سے پورے بائیس سال چھوٹی ہے اور بہن سے بیس سال اس حیران کن تفاوت کی وجہ اس نے اور بھی زیادہ حیرت زدہ کر دینے والی بتائی تھی کہ اس کے والدین کے ہاں شادی کے سات سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی پھر سات سال بعد اس کے جڑواں بھائی پیدا ہوئے تو سب نے کہا اللہ نے چھپّر پھاڑ کر دے دیا اور ساری کمی پوری کر دی۔ پھر دو سال کے وقفے کے بعد شیخ حماد کو بیٹی بھی عطا ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کوئی کمی نہیں رہی لیکن ماہین کی پیدائش تو جیسے ایک خبر بن گئی۔ شیخ حماد حسین اور ان کی بیگم بڑی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن خبر ملی کہ پورے بیس سال بعد اللہ انہیں مزید نواز رہا ہے۔ بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، بڑی شرمائیں اور گھبرائیں کہ جوان بچوں کے سامنے وہ ایک شیر خوار بچی کو کیسے گود میں اٹھائے پھریں گی...... شیخ حماد نے البتہ اس کو اللہ کی مصلحت سے تعبیر کرتے ہوئے آنے والے بچے کو خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔ بیگم کے ذہن سے بوجھ ہٹانے کے لیے انہوں نے ماہین کی پیدائش سے چار مہینے پہلے انہیں ان کی بہن کے پاس امریکا بھجوا دیا۔ وہیں ماہین کی پیدائش ہوئی۔ یو ایس کی بہت سی

بیٹی یقیناً رحمت ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ”اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی (پیدائش) کی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے، وہ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے (بزعم خویش) اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے سنائی گئی ہے۔ (اب یہ سوچنے لگتا ہے کہ) آیا اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ (زندہ) رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے (یعنی زندہ در گور کر دے) خبردار! کتنا برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں (سورۂ نحل)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے دورِ جاہلیت کی اس قبیح رسم کو بیان فرمایا لیکن بشر کا لفظ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ لڑکی کی ولادت تمہارے لیے خوشخبری ہے۔ وہ دنیا میں اللہ کی رحمت بن کر آئی ہے جس سے معاشرے میں بہار آتی ہے۔ لہٰذا بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے کی ممانعت کر کے دورِ جاہلیت کی اس رسمِ بد کا قلع قمع کیا۔ مزید فرمایا گیا۔ ”اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو، ہم ہی انہیں (بھی) روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکی کی ولادت کو اللہ کی نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ خوش قسمت ہے وہ شخص جسے اللہ نے بچی کی نعمت عطا کی۔ اب اگر وہ چاہے تو اسی دنیا میں رہتے ہوئے اپنی آخرت کو سنوار لے اور جہنم کی آگ سے خلاصی پالے، اس کی صحیح تعلیم و تربیت کے حوالے سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اگر کسی شخص کے پاس ایک بیٹی ہو اور وہ اسے اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں عطا کرے گا اور وہ لڑکی اس کے لیے ستر (ڈھال) اور دوزخ کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنے گی۔“ صحیح مسلم میں حضرت فاطمہؓ کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے۔ ”بلاشبہ میری بیٹی (فاطمہ) میرا جگر گوشہ ہے جو چیز اس کے لیے باعثِ دکھ ہو گی، وہ میرے لیے بھی پریشانی کا سبب بنے گی اور جو بات اس کے لیے موجبِ اذیت ہو گی، وہ مجھے بھی تکلیف دے گی۔“

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ ”وہ جس شخص نے تین بیٹیوں کی پرورش کی اور ان کی پرورش کے سلسلے میں دکھ، تکلیف پر صبر کیا اور انہیں اپنے مال میں سے کپڑے پہنائے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔“ (ادب المفرد)

حضرت ابن عباسؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کسی مسلمان کو دو بیٹیاں اللہ کی جانب سے مل گئیں اور اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ دونوں اسے جنت میں داخل کرا دیں گی۔ (ادب المفرد)

مرسلہ: ماہ نور قیصر، راولپنڈی

سہولتوں کے ساتھ جب وہ چار ماہ کی ماہین کے ساتھ پاکستان واپس آئیں تو بڑے بھائیوں اور بہن کو یوں لگا جیسے وہ امریکا سے گڑیا خرید کر لائی ہوں۔ ماہین کی ماں تابندہ جو واپس آتے ہوئے بہت جھجک رہی تھیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بڑے بچوں نے تو اپنی گڑیا سی بہن کو بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہا تھا۔ ایک طرح سے شرمین نے ہی ماہین کو سنبھالا۔ ماہین گھر بھر کی آنکھوں کا تارہ بن گئی تھی۔ مگر جلد ہی اس کے بڑے بہن، بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تو اسے ہوش سنبھالنے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔ شرمین شادی کے بعد کویت چلی گئی تھی اور دونوں بھائی امریکا...... اے لیول میں اس کی دوستی سفینہ سے ہوئی جو یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے بہت گہری ہو گئی۔

لاہور میں بھی دونوں ہاسٹل میں اکٹھی تھیں۔ دونوں ایم بی اے کر رہی تھیں۔ ماہین کے والد شیخ حماد حسین نے ماہین کو اپنا بزنس سنبھالنے کے لیے تیار کرنا تھا اور سفینہ کی ماں نے سفینہ کو اس کے مرحوم باپ کا بزنس سیٹ اپ ہینڈ اوور کرنا تھا جو وہ شوہر کی وفات کے بعد سے خود سنبھال رہی تھیں۔ دونوں کو او لیول کے دوران ہی ٹارگٹ بتا دیا گیا تھا۔

بہت سی باتوں کے مشترکہ ہونے کی وجہ سے ان کی دوستی خود بخود مستحکم ہوتی چلی گئی تھی۔اب حال یہ تھا کہ جیسے ہی پتا چلا کہ حماد حسین اپنی شادی کی گولڈن جوبلی منانے کا پلان کر رہے ہیں تو اُن کے بچے ساری مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر اس تاریخی تقریب میں شرکت کرنے پہنچ گئے تھے۔ ماہین دو دن کے لیے آئی تو اپنے ساتھ سفینہ کو بھی کھینچ لائی۔ والدین کے لیے گفٹ خریدنے بھی اسے ہی ساتھ لے کر گئی تھی۔ کیک کٹنے کے ساتھ تالیوں کا ایک قیامت خیز شور برپا ہوا تھا۔خاندان کی ایک بزرگ خاتون نے جنہیں سفینہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ حماد حسین اور تابندہ کے گلے میں تازہ گلابوں کے ہار ڈالے۔ دونوں کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ کیمروں کی لائٹس سے اسٹیج پر دن کا سماں تھا۔ اسی شور و غوغا کے دوران سفینہ کی نظر پرنس پر پڑی۔ وہ چین اسموکر دکھائی دیتا تھا۔اس کا پرائیویٹ سکریٹری اس کے منہ میں دبے سگار کو شعلہ دکھا رہا تھا۔

پرنس کی نظریں اسٹیج پر تھیں اور وہ اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔اس نے سکریٹری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سکریٹری نے جلدی سے رومال تھمایا۔

’’اُف...... اللہ رے...... یہ نزاکتیں...... بیچارہ رومال دے رہا ہے۔ ارے یہ تو منہ بھی پونچھ سکتا ہے۔‘‘ سفینہ! اس پُرتکلف شخص کو دیکھ کر خود جیسے اچھی خاصی تکلیف میں مبتلا ہونے لگی۔

پرنس کا اچھی صحت کا غماز گلابی چمکتا ہوا چہرہ، اس پر شہزادوں کی سی تمکنت، خود اعتمادی، بیٹھنے کا پُرتکلف شاہانہ انداز...... نظر گھوم پھر کر آخر کار اسی پر جا کتی تھی۔

☆☆☆

’’سفینہ تو اپنی دوست کے ہاں پارٹی میں گئی ہوئی ہے، اس کا پروگرام تو دو دن پہلے سے پتا تھا۔ پر تم کہاں سے ماری، ماری پھر کر آ رہی ہو؟‘‘ سفینہ کی ماں، تاجور خفگی سے چھوٹی بیٹی زارا کو گھور رہی تھیں۔

’’اماں میں انیتا کے ساتھ تھی...... دو مرتبہ کار کا ٹائر پنکچر ہوا۔ سوچیں ٹائر چینج کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ وہ تو ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ہم پر رحم آ گیا کہ بیچاری سی لڑکیاں خوار ہو رہی ہیں، ہم تو ایک مرتبہ ہی ٹائر چینج کر کے حال سے بے حال ہو گئے تھے۔‘‘ زارا نے چہرے پر تھکن ظاہر کرنے کو اپنی طرف سے پورا زور لگایا۔

’’بیٹا وقت سے گھر پہنچنے کی کوشش کیا کرو...... تم نے تو فون پر بتایا تھا کہ رش میں پھنسی ہوئی ہو...... یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ٹائر پنکچر ہوا ہے؟‘‘ تاجور نے اشتباہ ظاہر کیا۔

’’اگر آپ کو بتا دیتی تو آپ فضول میں پریشان ہوتیں...... بار، بار فون کرتیں، اس لیے نہیں بتایا تھا۔‘‘

’’آج کل تو لوگ لڑکوں کی طرف سے فکر مند رہتے ہیں، تم تو پھر لڑکی ہو۔‘‘

’’اماں...... مجھے بھی ایک چھوٹی سی کار دلا دیں ناں۔‘‘ زارا نے اٹھ کر ایک دم سے اماں کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈال دیا۔

’’بالکل نئی، زیرو میٹر...... جس کا چار سال تک کبھی ٹائر پنکچر نہیں ہو۔‘‘ زارا نے اس کے گال پر ایک پیار بھی کر لیا...... فرمائش کو امید افزا بنانے کی کوشش کی۔

’’نئی کار......؟ جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی ہو؟ حالات پتا ہیں ناں شہر کے؟‘‘ تاجور نے اس کی بانہوں کا حلقہ توڑتے ہوئے قدرے خفگی سے گھورا۔

’’اماں، اتنی لڑکیاں نئی کاریں لے کر شہر میں گھوم رہی ہیں...... آپ تو بس!‘‘ زارا نے لاڈ میں منہ پھلا کر بازو یوں سینے پر لپیٹے جیسے فوٹو کھنچوا رہی ہو۔

’’بھئی مجھے بزنس کے بکھیڑوں سے فرصت نہیں۔ ایک نئی ٹینشن افورڈ نہیں کر سکتی...... تم بہت بے پروا ہو،

میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔'' تاجور نے صاف جواب دیا تھا۔
''آپ سفینہ کے لیے بھی کار بک کرا رہی ہیں...... وہ لڑکی نہیں ہے؟'' دل میں چھپی بات زارا کے ہونٹوں پر آہی گئی۔
''اس نے آتے ہی آفس سنبھالنا ہے......اور وہ بہت سنجیدہ اور ذمے دار ہے...... تمہیں کار دلا دی تو بالکل ہی ہاتھ سے نکل جاؤ گی...... آرام سے بیٹا...... وقت آنے دو پھر تمہیں بھی سب کچھ ملے گا...... پہلے اپنی اسٹڈیز تو کمپلیٹ کرلو...... دیکھو سفینہ کو بھی کار فائنل کے بعد ہی مل رہی ہے ناں......؟'' تاجور نے اب بہت پُرسکون انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''بس چھوڑیں اماں...... ہماری کلاس کے لوگ تو اپنے ٹین ایج کے بچوں کو بھی کار کی چابی پکڑا دیتے ہیں۔ آپ تو یونہی مجھے ٹرخاتی رہیں گی۔'' زارا کا موڈ خراب ہوگیا تھا وہ منہ پھلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
''سفینہ نے آج تک کوئی فرمائش ہی نہیں کی......اور اس کی فرمائشیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔'' زارا کے جانے کے بعد تاجور کھڑی سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

انواع واقسام کے کھانوں کی خوشبوؤں سے ماحول مہک رہا تھا۔ چمچوں، پلیٹوں کی کھنکھناتی آوازوں کے بیچ ماہین نے سفینہ کے کان میں سرگوشی کی۔
''پرنس سے کچھ باتیں کرلیں......؟''
''اس کا سکریٹری نظر نہیں آرہا...... بات کرتے ہوئے پرنس کو اچھو لگ گیا تو 'بابا' کو 'مم مم' پلانا پڑ جائے گا۔'' سفینہ نے شرارتاً جواب دیا۔ ماہین کی ہنسی چھوٹ گئی۔
''آؤ ناں...... چلتے ہیں...... اتنی مشکل سے تو اکیلا نظر آیا ہے۔'' ماہین کے ایک ہاتھ میں پلیٹ تھی دوسرے سے سفینہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا...... سفینہ کشاں، کشاں اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔
پرنس کھانا ختم کرکے اب آئس کریم انجوائے کر رہا تھا۔ دونوں عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔
''ہم آپ کا چھوٹا سا انٹرویو کرلیں؟'' ماہین نے بڑی معصوم سی شکل بنا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
''your cards'' پرنس نے اپنا دایاں ہاتھ دونوں کے سامنے پھیلایا۔
''جی......؟'' دونوں کے منہ سے بڑی حیرت سے نکلا تھا...... دونوں کو سمجھ نہیں آئی وہ اُن سے کون سا کارڈ طلب کر رہا ہے۔
''بھئی آپ جرنلسٹ ہیں تو دیکھنا چاہیے ناں آپ کس کے لیے کام کر رہی ہیں؟'' پرنس اُن کی حیرانی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔
''ہم جرنلسٹ نہیں......اسٹوڈنٹس ہیں۔'' ماہین نے فوراً جواب دیا۔
''ابھی آپ اپنے پیرنٹس کے ساتھ کیک کاٹ رہی تھیں۔ میرے پی اے نے بتایا تھا کہ آپ شیخ صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔'' پرنس نے مسکراتے ہوئے دونوں پر باری، باری نظر ڈالی اور واضح کردیا کہ وہ مذاق کر رہا تھا۔
''تھینک گاڈ......اگر آپ کے پی اے آپ کو نہ بتاتے تو آپ ہمیں قیامت تک نہیں جانتے۔'' ماہین نے نہ چاہتے ہوئے بھی طنزاً کہہ دیا۔
''آپ کو تو جان گئے مگر ایک آنرایبل لیڈی جو آپ کے ساتھ ہیں ان کو تو آپ نے ابھی تک انٹروڈیوس

نہیں کروایا۔" پرنس کی آنکھوں میں شریری چمک تھی اس کی نظریں سفینہ پر جمی تھیں۔
آف وہائٹ جدید تراش خراش کا ڈریس پہنے جس پر چھوٹے، چھوٹے گلابی اسٹونز سے بہت نفیس کام بنا ہوا تھا۔ دوفٹ کے سرخی مائل بال پشت پر بکھرائے جو بلوڈرائی کی وجہ سے ذرہ برابر بے ترتیب نہ دکھتے تھے...... اپنی دلچسپی وشوق کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی سفینہ بہت پُرکشش نظر آرہی تھی...... پرنس نے پہلی نظر میں ایک بات نوٹ کی کہ اس کا چہرہ عمر کی بہار کے اثر سے شاداں وفرحاں نظر آتا تھا۔ میک اپ کے اثر سے پاک تھا۔ ہونٹوں پر ہونٹوں ہی کی ہم رنگ لپ اسٹک کی چمک تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اس نے لپ اسٹک ضرور لگائی ہے۔ وہ ایک مصور تھا اور مصور کی نگاہ سے حسن ہمیشہ کلام کرتا ہے...... مصور کو کبھی حسن تلاش کرنے کی مشقت نہیں اٹھانا پڑتی۔ حسن، مصور کی آنکھ میں چھپا ہوتا ہے...... اور رنگوں میں اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔
گلے میں سونے کی نازک چین، اس چین میں پڑا ہوا چنے کے سائز کا دمکتا ڈائمنڈ اسی سائز کے کانوں میں ٹاپس، انگوٹھی...... صرف ایک نظر میں پرنس نے کیا کچھ نہیں دیکھ لیا...... سادگی میں کمال کی آرائش تھی...... تصور میں ایک کینوس آویزاں ہوا اور ایک شاہکار تخلیق ہوگیا۔ تصویر بڑی قیمتی وقیامت تھی۔
وہ جو دل کی کیفیت چھپانے کی زور آزمائی تھی وہی تو مصور کے برش کو کمال عطا کر رہی تھی۔ اسے گویا رنگوں کا انتخاب بتا رہی تھی۔ برش کو دل کی طرح دھڑکنے کی دعوت دے رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کیونکہ وہ مصور تھا کہ ایک عمر ہوتی ہے...... جس میں خوابوں کے سلسلے بارش کی طرح برستے ہیں اور پھر ان خوابوں کو سب سے پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد ایک علیٰحدہ کام ہے مگر مصور کی نگاہ تو آنکھوں میں سجے خواب ہی کینوس پر بکھیرتی ہے اور مصور کے لیے یہ اتنا ہی آسان ہے جیسے پرندے کا اڑان بھرنا۔
"یہ میری اکلوتی اور بیسٹ فرینڈ سفینہ ہے...... ہم دونوں ہر جگہ ساتھ، ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ بھی میری طرح LUMS سے ایم بی اے کر رہی ہے۔"
"اوہ...... سفینہ...... بہت شاعرانہ نام ہے...... کہاں سفینہ کہاں یونیورسٹی...... سفینہ کے ساتھ یا تو ساگر کا تصور آتا ہے یا ساحل کا......" پرنس کے ہونٹوں پر وہی سیراب سی، شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔
"طوفان کا تصور بھی آتا ہے جناب......" ماہین نے برجستہ کہا تھا۔
"ہوں......" پرنس براہِ راست دیکھنے کی خو نہ رکھتا تھا...... ایک نظر...... بس ایسی کہ جیسے پرندہ پھڑ پھڑایا اور اڑ گیا۔

"خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں"

پرنس نے دور کھڑے اپنے سیکریٹری کو اشارے سے بلایا اور پگھلی ہوئی آئس کریم کا گلاس اسے تھماتے ہوئے شعر پڑھا۔
بھرپور مردانہ مخمور آواز جیسے سناٹے میں پُرزور آبشار کی آواز...... جو روح کے تمام روزن کھول کر زندگی کا مکمل ادراک دیتی ہے...... زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے...... موت کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے۔
"آپ اتنے بڑے مصور کیسے بن گئے؟" ابھی سوال ماہین کی طرف سے ہی آیا تھا۔
"آپ کا مطلب...... سکس فیٹ؟" پرنس کی آنکھیں ماہین پر تھیں۔ روح سفینہ کی روح میں محو تھی۔
"ہا...... ہاہا......" ماہین کھلکھلا کر ہنس پڑی...... سفینہ کی مسکراہٹ میں بھی بے ساختگی تھی۔
"ابھی کہاں بڑا ہوں...... ابھی تو بہت چھوٹا سا ہوں......" پرنس کی آنکھوں میں اس کی روح پوری آب وتاب

سے چمک رہی تھی۔

''رہنے دیجیے، بتا رہے ہیں ہمیں...... سوری ٹو سے آپ اپنے لائف اسٹائل سے ہر پل احساس دلا رہے ہیں کہ آپ بہت سپیریئر ہیں۔'' سفینہ جانے کیسے بول پڑی حالانکہ چند سیکنڈز تک اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ پرنس نے چونک کر پھر بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ اس میں ذرہ برابر بھی میرا ہاتھ نہیں...... میں اپنے ماحول کو ساتھ لے کر چل رہا ہوں جس کے لیے میں نے کوئی effort نہیں کی...... جس طرح پیدا ہونے کے بعد مجھے موسم کے مطابق پہننے کے لیے کپڑے مل گئے تھے اسی طرح اور بہت کچھ خود بخود ملتا چلا گیا...... ہم ایسے ہی رہتے ہیں...... گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔'' پرنس نے اپنے مزاج کے برخلاف بڑا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا تھا۔

''گھر میں بھی......؟ آپ اپنے اسٹوڈیو میں بھی اتنا تیار ہو کر جاتے ہیں؟'' ماہین نے معصومانہ حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''آپ کے پاس لگتا ہے بہت سوال ہیں...... ایسا کریں کسی دن فون کر کے گھر آجائیں ساتھ لنچ کریں...... اسٹوڈیو وزٹ کریں...... میں یقین دلاتا ہوں صرف ایک وزٹ سے آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والے سارے سوال ختم ہو جائیں گے اور کوئی سوال......؟'' پرنس اپنے اسی پُرسکون و دلنشین لہجے میں بولا تھا۔ ماہین اور سفینہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''آپ کی آفر سن کر دل تو یہی چاہ رہا ہے، ابھی آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلیں۔'' سفینہ نے ازراہِ تفنن یہ فقرہ کہا تھا۔

''ویلیس گو......'' پرنس کی طرف سے جواب برجستہ ہی آیا تھا۔ اسی وقت کچھ لوگ قریب آگئے اور انہوں نے پرنس کو گھیر لیا۔ پرنس نے ایک پُرتکلف معذرت خواہانہ مسکراہٹ دونوں کی طرف روانہ کی اور آنے والوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یہ آخری توجہ و مسکراہٹ...... کسی افریقی یا بنگالی جادو سے کم طاقتور نہ تھی، سفینہ اور ماہین نے ایک دوسرے کو کھسک جانے کا اشارہ کیا۔

لوگ ابھی تک کھانے میں جتے ہوئے تھے...... کھانا بھی کانٹی نینٹل ڈشز پر مشتمل تھا۔ ہر مہمان کو اپنی فیورٹ چیز بہ آسانی مل رہی تھی۔ سب لوگ بہت انجوائے کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

وہ دونوں بھی اپنی کسی فیورٹ ڈش کی تلاش میں سرگرداں ہو گئیں۔

''کمال شخص ہے یہ۔'' ماہین نے سفینہ کی طرف دیکھا۔

''پُراسرار شخص ہے یہ۔'' سفینہ جانے کس دھیان میں تھی چونک کر گویا ہوئی۔

☆☆☆

''ہائے سچ سفینہ...... وہ تو بہت شاندار ہے...... ورنہ پینٹر کا تصور کرتے ہی ایک حواس باختہ سا بندہ ذہن میں آتا ہے جس کی زلفیں پریشان رہتی ہیں۔'' سفینہ لاہور واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اور زارا اس کے سر پر سوار تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے کسی فارم ہاؤس میں اپنی فرینڈز کو ٹریٹ دینا تھی۔ اماں اتنی بڑی رقم دینے کے لیے تیار نہیں تھیں اسے یقین تھا کہ یا تو سفینہ، اماں کو کنونس کر لے گی یا کچھ پیسے اپنے پرس سے نکال کر دے ہی دے گی۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے رات کی تقریب کے حوالے سے بات شروع کی تھی۔ جس پر سفینہ نے بتایا کہ کل

نامور مصور پرنس شہیر علی خانزادہ بھی تقریب میں مدعو تھا۔ زارا کے لیے یہ بڑی حیران کن خبر تھی۔ کیونکہ وہ خود آرٹ کالج میں پڑھ رہی تھی اور اس نے پرنس کے آرٹ کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔

''میں تو سوچ رہی ہوں یہ تو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے۔ ایک، ایک پل اپنی پسند سے گزار رہا ہے، کسی چیز کی فکر نہیں......بس برش اور رنگوں سے کھیلتا رہتا ہے۔'' سفینہ موسم کے ایک دم بدل جانے کی وجہ سے کپڑوں کے انتخاب میں الجھی ہوئی تھی پھر بھی زارا کو احساس دلا رہی تھی کہ وہ بہن کو بھرپور کمپنی دے رہی ہے۔

"Is he married?" زارا کو اچانک جانے کیا سوجھا۔

"I dont know" سفینہ نے ایک شرٹ بہت احتیاط سے تہ کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی دیر باتیں کیں......اور یہ نہیں پوچھا؟'' زارا کو جانے کیوں اتنی دلچسپی ہو رہی تھی۔

''میں کیوں پوچھتی، میرا کیا لینا دینا اس سے، میرڈ ہوتا تو مسز کو ساتھ لاتا......''

''اتنی شاندار پرسنالٹی ابھی تک کسی کو نہیں پھنسایا نہ کوئی پھنسا......کمال ہے۔'' زارا حیرت سے بڑبڑائی۔

سفینہ نے زارا کی طرف دیکھا۔ موم جیسی سفید، شب خوابی کے گلابی آرام دہ لباس میں بڑی سنجیدگی سے غور و خوض کرتی سفینہ کو تو بالکل احمق دکھائی دی۔

اور وہ سفینہ سے مزید کچھ سننے کے انتظار میں کاندھوں تک ترشے ہوئے سیاہ گھنے بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں قید کر رہی تھی۔

''ڈائیورسی بھی ہو سکتا ہے۔'' سفینہ نے وارڈ روب کا پٹ بند کیا اور دھپ سے بیٹھ گئی۔

''اور یہ بھی کہ کئی بار کا ڈائیورسی بھی ہو سکتا ہے......ایسے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ کوئی نارمل لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟'' زارا نے چوری، چوری ماحول کا جائزہ لیا کہ سفینہ اپنے کام سے فارغ ہوئی یا نہیں......ویسے بھی سفینہ نے اس کی عادتیں بگاڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ تاجور اسے بجٹ سے چلنے کی تاکید کرتیں، جھاڑ پلاتیں تو وہ سفینہ سے کچھ نہ کچھ ہتھیا لیتی۔

''تم پرنس سے ملی نہیں ہو مگر بات زبردست کی ہے واہ......'' سفینہ کو اس کی بات واقعی بہت عاقلانہ لگی تھی۔

''اب اسی خوشی میں اماں سے کچھ پیسے دلا دیجیے۔'' زارا بغیر ردوکد کے فوراً اپنے مطلب پر آ گئی۔

''اچھا تو اسی وجہ سے اتنی دیر سے کسی سی ڈی کی طرح بج رہی تھیں......'' سفینہ نے گہری سانس لے کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ لیے اور مسکراہٹ دبا کر بظاہر خفگی سے گویا ہوئی۔

☆☆☆

''ایک ہٹلر جرمن میں تھا اور ایک میرے گھر میں......میں کبھی بھول نہیں سکتی......میں ہرگز معاف نہیں کر سکتی۔'' لیڈی صوفیہ خانزادہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور آنکھوں کے اطراف پھیلی جھریوں میں جذب ہو گئے۔ درحقیقت یہ جھریاں نہیں......تاریخی تحریریں تھیں۔ پرنس نے نیا برش اٹھا کر ناقدانہ جائزہ لیا۔ اور اپنی پردادی کی طرف بہت رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ اپنے وسیع و عریض اور پرسہولت اسٹوڈیو میں وہ ایک تصور کو رنگوں کی زبان میں پیش کرنے میں مصروف تھا خاکہ تیار تھا تھوڑا سا امپرو بھی کیا تھا۔ کینوس پر ایک ڈیڈ باڈی کفن میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جس پر بے شمار سرخ گلاب پڑے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک دلہن جس کا دوپٹا فرش پر پڑا تھا، بال بکھرے ہوئے، چوڑیاں، ٹیکا، جھومر، کنگن میت کے قریب پڑے ہوئے تھے اور وہ ہاتھوں سے موتیے کے گجرے اتار رہی تھی۔

لیڈی صوفیہ خانزادہ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کینوس اُن کی نظروں کے سامنے نہیں تھا۔ پرنس

کے کھڑے ہونے کے بعد تو بالکل ہی اوجھل ہو جاتا، لیڈی صوفیہ خانزادہ، پرنس کی پشت پر نظریں جمائے اپنی دھن میں بولتی چلی جا رہی تھیں۔
''ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا...... ہمارے لیے یہ محض ایک خبر تھی...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... یہ آگ تو میرے لیے بھڑکائی گئی ہے۔''
''گریٹ مام...... جس دلہن کو شادی سے صرف آدھا گھنٹے پہلے جبکہ وہ مکمل دلہن بن چکی ہو...... یہ پتا چلے کہ اس کا دولھا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ محبت کی اس انتہا پر جہاں انتظار دوزخ کی آگ میں جلنے جیسا ہوتا ہے ہمیشہ کی جدائی کی خبر...... کیا یہ خبر سننے والے کو مر نہیں جانا چاہیے؟'' پرنس نے برش سے رنگوں کو انوکھا امتزاج دینے کی سعی کرتے ہوئے اپنی پردادی لیڈی صوفیہ خانزادہ کی طرف دیکھا۔
اس وقت اسٹوڈیو میں وہ اپنے اس خاص اور آرام دہ لباس میں تھا جو وہ صرف اسٹوڈیو میں ہی استعمال کرتا تھا۔ کٹ سلیوز شرٹ اور اور دنیا کی بہترین جینز، جس کا کپڑا بیلجیم میں تیار ہو کر یورپ اور امریکا پہنچتا تھا۔
''اوہ گاڈ...... میں کیوں زندہ ہوں؟ پرنس...... جوک کرنے کا بھی کوئی ٹائم ہوتا ہے...... میری عمر اس وقت 88 سال ہے...... میں 8 اگست 1928ء کو آئرلینڈ میں پیدا ہوئی۔''
''گریٹ مام...... آپ ایک سال کم کریں...... ابھی آپ صرف 87 ایئرز اولڈ ہیں 87 years only'' پرنس نے اپنا اینگل سیٹ کرتے ہوئے جواب دینے اور تصحیح کرنے کی بدقت تمام فرصت نکالی۔
''او گاڈ...... میں کافی پینے کا ارادہ کر رہی تھی۔'' لیڈی صوفیہ نے اپنی واٹر پروف مسکارا سے بوجھل پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
''why'' پرنس صرف کمپنی دینے کی خاطر کچھ بولنے پر مجبور تھا۔ درحقیقت اس کی ساری توجہ کینوس پر تھی۔
''میں سوزن سے کہتا ہوں، وہ کافی بنا کر لے آئے گی۔'' پرنس نے پردادی کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے دیوار پر نصب انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''نہیں، نہیں...... تم پوری بات نہیں سنتے...... بالکل اپنے باپ کے دادا پر گئے ہو...... وہی جسے میں ہٹلر کہتی ہوں۔''
''اوہ سوری......'' پرنس نے اپنی جلد بازی پر معذرت چاہی۔
''میں یہ کہہ رہی تھی، میں کافی انجوائے کرنے کا پروگرام کینسل کر چکی ہوں کیونکہ کافی یادیں پیدا کرتی ہے...... ماضی میں لے جاتی ہے اور میرا فی الحال ماضی کو یاد کرنے کا کوئی موڈ نہیں۔ میں ریسٹ کرتی ہوں...... carry on my dear son'' یہ کہہ کر لیڈی صوفیہ نے اپنی نشست چھوڑ دی اور اپنی سوئس لان کی خوب صورت پرنٹڈ ساڑی کا آنچل سنبھالتی اسٹوڈیو سے باہر جانے لگیں۔
''اوکے ڈیئر مام...... ہم ڈنر پر ملتے ہیں۔''

☆☆☆

''دیکھو بیٹا، فضول خرچی کی عادت عورت کے لیے تو بالکل بھی اچھی نہیں ہوتی۔ عورت گھر بناتی ہے، جس کے لیے اس کے ہاتھ میں ہر وقت مناسب پیسہ ہونا چاہیے۔ اسے گھر کا بجٹ بنانا ہوتا ہے، بچوں کے اچانک آ جانے والے اخراجات، تقریبات میں لینا دینا، دکھ، بیماری، دوا، علاج وغیرہ۔'' تاجور، زارا کو بہت آرام و محبت سے ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
''اماں! آپ اتنی امیر ہیں اور باتیں کتنی غریبانہ کرتی ہیں، پیسہ ہوتا کس لیے ہے، اسی عمر میں تو پیسے کو انجوائے

کرتے ہیں، بڑھاپے میں تو سلائس و پورج پر بھی گزارہ ہو جاتا ہے۔'' زارا نے اپنی مخصوص بے ساختگی اور بے تکے پن کے ساتھ تاجور کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

''یہ پیسہ تمہارے ہی کام آئے گا...... میں قبر میں لے کر تو نہیں جاؤں گی مگر بے تکے پن سے اخراجات ہوں گے تو یہی پیسہ کم دِکھے گا......'' تاجور نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پھر سعیِ ناکام فرمائی۔

''اماں...... ہم لاکھوں کماتے ہیں، ہزاروں نہیں...... اتنا پیسہ تو سو سال میں خرچ ہوگا...... اور پاکستان میں ایورج عمر بس پچاس سال ہوتی ہے...... اماں پلیز، بس اس مرتبہ پیسے دے دیں، سمجھائیں نہیں، آئندہ کبھی آپ سے زیادہ اماؤنٹ نہیں مانگوں گی......'' وہ بچوں کی طرح مچلی۔

''کوشش کروں گی میں بھی پرنس جیسی آرٹسٹ بن جاؤں...... پھر میری ایک، ایک پینٹنگ پانچ، پانچ لاکھ میں سیل ہوگی۔ سال میں چار پینٹنگز بھی نکل گئیں تو مجھے بیس لاکھ بہت ہیں۔'' زارا کی آنکھوں میں حسین خوابوں کی جھلملاہٹ ہیرے کی چمک سے کم نہیں تھی۔ وہ بڑے لاڈ سے اپنا سر ماں کے کندھے سے ٹکائے بیٹھی تھی۔ ایک طرح کا دھرنا تھا کہ اپنی منوا کر ہی جان چھوڑے گی۔

''شیخ چلی سے تیچ رکھنے کی ضرورت نہیں...... اور یہ پرنس کون ہے؟'' تاجور نے اس کے بازوؤں کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہائے اماں، نہ کریں، آپ پرنس کو نہیں جانتیں۔ اتنا بڑا آرٹسٹ...... میرے بیڈروم میں بیڈ کے بالکل اوپر جو پینٹنگ لگی ہے وہ پرنس ہی کی تو ہے۔'' زارا کو یوں صدمہ ہوا جیسے تاجور نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔

''اچھا وہ پینٹنگ...... جو تم اپنا سارا اکاؤنٹ خالی کر کے لائی تھیں...... ایسا کیا ہے بھئی اس میں...... دو چار رنگ برنگی مچھلیاں بدھ مت کے زمانے کے تالاب میں تیر رہی ہیں۔'' تاجور نے بیزاری سے کہا...... وہ ٹھہریں بزنس پرسن...... گارمنٹ فیکٹری جس میں اعلیٰ کوالٹی کی جینز تیار کی جاتی تھیں۔ ایک ٹریڈنگ کمپنی جو سفینہ انٹر پرائزز کے نام سے تھی...... مون اسٹار گروپ آف کمپنیز کی ممبر تھیں...... اتنا کام مرد کے سر پر ہو تو کمائی کا احسان جتا، جتا کر آدھا ہو جاتا ہے۔ مگر تاجور بڑی ہمت و حوصلے سے مرحوم شوہر کا بزنس نہ صرف سنبھال رہی تھیں بلکہ اسے اب تک بڑھاوا بھی دیتی چلی آرہی تھیں۔

زارا نے اپنا سر یوں پکڑا تھا جیسے چکر آرہے ہوں۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' تاجور نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اتنی انسلٹ...... اماں وہ فش نہیں ہیں...... symble ہیں اور وہ تالاب نہیں، عورت کا دل ہے۔ اس نے ایک بہت ہی حسین خیال پینٹ کیا ہے۔''

''اچھا بس، بس...... یہ سب بھرے پیٹ کی مستیاں ہیں، سیدھا سیدھا دل دِکھانے کے بجائے اسے تالاب بنا دو'' تاجور نے بیزاری سے کہا۔

''اماں، آپ بہت خراب ہیں، بس بھی کریں، اتنی انسلٹ بہت ہے۔ آپ کو پتا ہے سفینہ پرسوں اسے مل کر بھی آچکی ہے۔ اس نے شاید آپ کو نہیں بتایا۔''

''سفینہ کہاں ملی ہے اسے؟'' تاجور کو سب کچھ بھول گیا۔ چونک کر خاصے پریشان کُن لب و لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''ارے، ماہین کے فنکشن میں۔'' اس نے جُھلا کر جواب دیا۔ ہر بات کی وضاحت کرنا پڑ رہی تھی، پیسے ملنے کا چانس پھر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''او اچھا، اصل میں وہ بہت سمجھدار لڑکی ہے، نپی تلی بات کرتی ہے، کوئی خاص بات ہوتی ہے تو مجھے ضرور

بتاتی ہے، تمہاری طرح نہیں ہے۔'' تاجور جانے کے ارادے سے اٹھنے لگیں۔

''چھوڑیں اماں، نہ پرنس کی بات کرتے ہیں نہ سفینہ کی، کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کھڑے ہو کر پھر ماں کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈال دیا۔

''ٹھیک ہے، اس مرتبہ تو میں تمہیں اتنا ہیوی اماؤنٹ دے رہی ہوں، آئندہ مجھ سے پوچھ کر عہد نامے کرنا، سمجھیں۔''

''اوہ..... مائی گریٹ اماں.....'' زارا نے کامیابی کی خوشی میں تاجور کا گال چوم لیا۔ اسے اپنی اس صلاحیت کا پتا تھا کہ جو ٹھان لے، کر کے ہی دم لیتی ہے۔ اور ادھر تاجور کا چہرہ جانے کن سوچوں سے پُر تھا۔

☆☆☆

''میری آنکھ سے گرنے والا آنسو
اگر ساحل پہ ٹپک گیا ہوتا
دیکھتے ہی دیکھتے بکھر گیا ہوتا
ساحل خود ساگر بن گیا ہوتا''

مس آشا..... ساحل کی ٹیبل کے ایک طرف کھڑی لیٹر پیڈ پر لکھے اشعار پڑھ رہی تھی..... اسی لمحے ساحل نے اسے آلیا۔

''بری بات ہے مس آشا..... یہ کرائم ہے، آپ ایک تو میری غیر موجودگی میں میرے روم میں تشریف لے آئیں پھر اس پر سے میری پرائیویٹ چیزیں بھی چیک کر رہی ہیں۔''

''سوری، سوری سر...... میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی...... میڈم تاجور نے آج ایگزیکٹوز کی ایمرجنسی میٹنگ کال کی ہے...... آپ منیجر ہیں، ظاہر ہے یہ سب آپ کو دیکھنا ہے اور مجھے بھی آپ کی تھوڑی سی مدد چاہیے۔''

''تھینک گاڈ...... صرف مدد چاہیے، پیسے تو نہیں چاہییں ناں...... آج کل جیب بہت ہلکی ہے۔''

''بھگوان کی دیا سے بہت ہے، آپ مجھ سے ادھار لے سکتے ہیں۔'' آشا جو تاجور کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی...... بہت شوخ اور ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔

''ادھار محبت کی قینچی ہے۔'' ساحل اپنی فطری چرب زبانی سے مجبور تھا۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' آشا نے اداس سی شکل بنا کر کہا۔

''پہلے بتا دیتا تو پھر کیا ہوتا؟'' ساحل کو حیرانی ہوئی۔

''تو میں ساون کے ساتھ انگیجمنٹ نہ کرتی، سوری اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''ارے آپ کو کھڑے، کھڑے اتنی خوش فہمی کیوں ہورہی ہے۔'' ساحل اب تھوڑا سا پریشان ہوا...... اتنے دن سے ساتھ ہے جانتی نہیں کہ مذاق کی عادت ہے۔

''میں سمجھی یہ شعر آپ نے میری محبت میں لکھا ہے۔'' آشا کھلکھلا کر ہنسی۔

''دو جگہ تو آپ نے صرف اپنا نام لکھ کر جگہ فل کی ہے، ایک جگہ اپنا اور دوسری جگہ اُس کا لکھ دیتے۔''

''اُس کا...... وہ کون ہے؟'' ساحل بھی آسانی سے پریشان ہونے والا نہیں تھا مگر آشا کامیاب جارہی تھی۔ لمحے بھر کو چکر تو دے دیا تھا۔

''بھئی جس کی خاطر یہ شعر لکھے ہیں۔'' آشا نے وضاحت کردی۔

''وہ تو ابھی کسی اور سیارے پر رہتی ہے، مجھے تو خود بھی نہیں پتا وہ کون ہے۔ بس ایک حسین تصور میں گم رہتا ہوں کہ وہی تصور مجھ سے شعر لکھوا دیتا ہے۔'' ساحل اپنی ریوالونگ چیئر پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور لیٹر پیڈ اٹھا کر اپنی تخلیق کردہ شاعری پر نظر دوڑانے لگا...... نظر کہہ رہی تھی اپنے اشعار پر خود ہی فدا ہوا جارہا ہے۔

''سر تو میڈم کو کیا بولوں......؟ آپ انہیں یہ ٹوٹے پھوٹے شعر سنانے کب آرہے ہیں؟'' وہ مسکرائی۔

''اتنی دیر سے آپ کو انٹرکام کررہی تھی...... رسپانس نہیں ملا تو خود آگئی۔ آپ اِدھر نہیں ملے تو یہ شعر پڑھنے لگی۔ بس اور کیا!'' اس نے شاید صفائی پیش کی تھی۔

''سر آپ اپنی شاعری کی بک پرنٹ کروائیں ناں...... ایک دم سے مشہور ہوجائیں گے۔'' آشا اس کے روم سے نکلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''یہ شاعری کہاں...... یہ تو خود کلامی ہے۔ ساٹھ ستر ہزار روپے سیلری لینے والے کو یہ عیاشی زیب نہیں دیتی۔'' آشا کے نکلنے کے بعد خود کلامی، بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہوگئی تھی۔

''ایگزیکٹوز اکٹھے ہورہے ہیں...... سر جوڑ کر بیٹھیں گے کہ ملین کو اوور نائٹ بلین کیسے کیا جاسکتا ہے۔'' ساحل کے ہونٹوں پر اچانک تلخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

☆☆☆

''یار...... پرسنالٹی تو غضب کی ہے...... میرا دل چاہتا ہے اسے اس کے گھر میں دیکھنا چاہیے۔'' ماہین ناول سے گیلے بال آزاد کرتے ہوئے سفینہ سے مخاطب تھی جو بڑے انہماک سے veronica Roth کا ناول Divergent پڑھ رہی تھی۔ ابھی، ابھی چیپٹر 13 اسٹارٹ کیا تھا۔ ماہین کی پُرجوش آواز نے گویا پُرسکون تالاب میں پتھر دے مارا تھا۔ اس نے بڑی بیزاری سے صفحہ موڑ کر ناول ایک طرف پٹخ دیا اور ماہین کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہیں پرنس فوبیا ہوگیا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے تمہارے پاس۔'' وہ چڑ کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہارا موڈ کیوں خراب ہوگیا...... تم یہاں Veronica Roth پڑھنے آئی ہو؟ فائنل سیمسٹر بقول مما کے، سر پر کھڑا ہے۔'' ماہین برا مان گئی وہ جس اسپرٹ کے ساتھ پرنس کو ڈسکس کرنا شروع ہوئی تھی اسے جواب میں وہ اسپرٹ نہیں ملی تو بد دل ہوگئی۔

''فائنل سیمسٹر چاہے آج ہو جائے، پروا نہیں میری تیاری ہے...... تم فکر نہیں کرو۔'' اس نے فوری کہا۔

''ہاں، مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے اگر تم پرنس کو ایسے ہی یاد کرتی رہو گی تو پیپرز کیسے دو گی؟'' سفینہ بے ڈھب انداز میں پاؤں پھیلا کر بیڈ پر دراز ہوگئی۔

''ارے، ارے میرے کپڑے...... پاؤں ہٹاؤ، آج ہی لانڈری سے پریس کرائے تھے، تمہیں پتا ہے ناں لانڈری چارجز کا...... ہینگر سے اتارنے کا جی نہیں چاہتا۔'' سفینہ کے پاؤں کے پاس ماہین کا ڈریس ہینگر سمیت پڑا ہوا تھا۔

''تو بیڈ پر کیوں پھینک دیا...... کہیں لٹکا دو، کچھ طریقہ، سلیقہ سیکھ لو۔ ہوسکتا ہے ایم بی اے کے فوراً بعد تمہاری شادی ہو جائے۔ فہد تو دن گن رہا ہوگا، بیچارے کو لٹکایا ہوا ہے آسٹریلیا میں...... مگر...... کہیں پرنس کی وجہ سے؟'' سفینہ نے شرارتاً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اوہ...... گڈ گڈ پرنس! وہ تو فکشن ہے جسے صرف ڈسکس کیا جاسکتا ہے، بھئی میں تو جب سے لاہور واپس آئی ہوں بس حیرت سے یہی سوچتی رہی ہوں، پاکستان میں ایلیٹ کلاس کے parallel وکٹورین کلاس کی باقیات بھی ہیں مگر ایک بات ہے یہ لوگ تو یہاں خود کو بہت لوٹلی فیل کرتے ہوں گے...... جیسے کوؤں کے بیچ راج ہنس آگیا ہو۔''

''خبردار...... ہم کوے نہیں ہیں۔'' سفینہ نے برا مان کر بات کاٹ دی۔ ہاسٹل میں وہ دونوں ایک ہی روم شیئر کرتی تھیں۔ دونوں کے سونے، جاگنے، کھانے، پینے کے اوقات ایک تھے۔ کلاس ایک تھی اور ایک دوسرے سے کرنے کے لیے اتنی باتیں ہوتیں کہ انہیں کسی تیسرے سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔

البتہ جب کپڑے پریس کرنے کامن ایریا میں جاتی تھیں تو دوسری لڑکیوں سے ہیلو ہائے ہو جاتی تھی یا پھر کبھی، کبھی کچن اپنی پسند کا کچھ بنانے کا موڈ ہوتا تو وہاں ہاسٹل کی کچھ ہیلتھ کانشس سلیقہ شعار لڑکیوں سے گپ شپ ہو جاتی۔ جو جنک فوڈ سے پرہیز کرتی تھیں۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی بڑی ہو چکی ہو...... اور اتنا پریکٹیکل ہو کر سوچتی ہو۔'' سفینہ نے ماہین سے پھر شرارتاً کہا تھا۔ ''میں تو ڈر گئی تھی کہ بیچارے فہد کا کیا ہوگا؟''

''فہد، اس کی جگہ پر تو دنیا کا کوئی بادشاہ بھی نہیں آسکتا...... وہ تو صرف پرنس ہے۔'' ماہین کے لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی چاہت میں کتنی مستحکم ہے۔ ''فکشن اور مسٹری کے ساتھ تھوڑا سا ٹائم گزارنا اچھا لگ سکتا ہے۔ مگر یہ جاب فل ٹائم چلتی نہیں۔'' ماہین اب جلدی، جلدی بالوں کو ڈرائیر سے سکھا رہی تھی۔ کمرے میں ڈرائیر کے بے ہنگم شور نے مزید بات کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

☆☆☆

''صحرا میں پورا چاند
شہر میں برقی روشنیاں
جنگل میں جگنو
اور دل میں تُو

اور...... میں......''

زارا حیرت سے ساحل کا لیٹر پیڈ اٹھائے پلکیں جھپکاتے ہوئے انتہائی بچگانہ ٹوٹی پھوٹی شکستہ سی تحریر میں لکھی گئی آزاد نظم پڑھ رہی تھی۔ اچانک کسی نے اس کے ہاتھ سے لیٹر پیڈ اُچک لیا......

"excuse me its a crime" ساحل فوراً سامنے آکر کہہ رہا تھا۔

''آپ اس ٹیبل پر بیٹھ کر یہ فضول سی اردو پوئٹری کرتے ہیں، بتاتی ہوں اماں کو......'' زارا نے ساحل کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں حیرت جامد ہو چکی تھی...... حلیے سے انتہائی الٹرا ماڈرن دکھائی دینے والا ساحل اندر سے اتنا شاعرانہ ہو سکتا ہے وہ مان ہی نہیں سکتی تھی۔

زارا سے ساحل کی یہ پہلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آٹھ ماہ سے ساحل یہاں جاب کر رہا تھا۔ زارا اکثر اپنے ضروری کاموں سے پیٹرو ڈیٹر کے انداز میں تاجور سے ملنے آفس آجاتی تھی اس لیے کہ تاجور کے گھر پہنچنے کا کوئی فکس ٹائم نہیں تھا اور زارا کی فطرت میں صبر نہیں تھا۔ پاکٹ منی ختم ہو جانے کے بعد تو اس کے دو تین چکر لازمی لگ جاتے تھے اور اماں سے ملاقات سے پہلے اسے ساحل سے لازمی گزرنا ہوتا تھا۔

''یہ آپ نے خود لکھی ہے یا کہیں سے کاپی کی ہے؟'' ساحل لیٹر پیڈ دراز میں رکھ رہا تھا اور زارا تھانیدارنی بنی سوال کر رہی تھی۔

''کاپی کی ہے......'' ساحل نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

''اُف کتنا بُرا سلیکشن ہے آپ کا......!'' زارا نے منہ بنا کر ساحل کی طرف دیکھا۔

''تھوڑا صبر کریں...... اپنے الفاظ ضائع نہ کریں...... ایک دن آپ مانیں گی کہ میرا سلیکشن کمال ہوتا ہے۔'' ساحل کا لہجہ بلا کا معنی خیز تھا۔

''اینی ہاؤ میم از سو بزی...... آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے۔'' ساحل نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ اس کو ٹہلانے کی کوشش کی۔

''ارے، یہ آپ مجھ سے کس طرح بات کرتے ہیں؟''

"Mind it...I am your,s junior boss" زارا نے گھور کر ساحل کی طرف دیکھا تھا۔

''باس کبھی جونیئر نہیں ہوتا...... سینئر موسٹ باس بنتا ہے...... اور باس ایک ہی ہوتا ہے۔ جیسے ایک اسٹیٹ کا ایک بادشاہ ہوتا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں ہوتیں جیسے کائنات میں دو خدا نہیں ہو سکتے۔''

''اسٹاپ......'' زارا نے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

''Have some manners please'' زارا نے بڑی خفگی سے ساحل کو ٹوکا تھا۔

''شیر کا بچہ بھی شیر ہوتا ہے، اب آپ کچھ نہ بولیں ورنہ ڈیبیٹ شروع ہو جائے گی...... اتنی دیر سے کھڑی ہوں...... بتاتے کیوں نہیں اماں کے پاس کوئی ہے یا وہ روم میں اکیلی ہیں؟''

''میں مینیجر ہوں۔ پی اے نہیں...... آپ آشا سے پتا کریں۔'' ساحل کو پتا تھا خوب صورت، دولت مند لڑکی کن اداؤں سے متاثر ہو سکتی ہے اب وہ بے نیازی کے تیر ترکش سے نکال رہا تھا۔

''زارا، بیٹا...... آپ اِدھر کیا کر رہی ہو؟'' پشت سے تاجور کی آواز آئی تو ساحل ایک دم سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور زارا نے چونک کر اپنی پشت پر کھڑی تاجور کو دیکھا تھا۔

(جاری ہے)

کام، کام اور صرف کام

شمیم فضل خالق



کام کر، کر کے تو میرا بیڑا غرق ہوگیا، ساری زندگی یہ خواہش دل میں پنپتی رہی کہ کاش کبھی ہمارے گھر میں بھی کوئی نوکر ہو جو وقت بے وقت میرا ہاتھ بٹایا کرے لیکن بچپن پھر جوانی اور اب بڑھاپا...... لیکن کبھی اس خواہش کی تکمیل کا وقت نہیں آیا اور شاید آئے گا بھی نہیں۔ میں نے سنک میں پڑے ڈھیر سارے گندے برتنوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جل کر سوچا...... بات نا آسودہ خواہشات کی ہو رہی تھی اور میری ہزاروں خواہشوں میں ایک نوکر کی خواہش سب سے پہلے نمبر پر تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا مختلف کاموں کے مدو جزر میں خود کو گھومتے پایا تھا۔ دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں، میں اپنے ماں، باپ اور تین بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی...... ہونے کو تو اکلوتی بہن اور بیٹی تھی اور اصولاً تو مجھے لاڈلی ہونا چاہیے تھا لیکن میرے ساتھ اس کے برعکس ہوا، ہوش سنبھالا تو اماں کو

سر درد کی مریضہ پایا۔ وہ سر پر پٹی لپیٹے چار پائی پر پڑی رہتیں تب میرا اچپن پوری طرح رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے اماں نے کام پر لگا دیا۔ ابا کی دال، دلیے کی چھوٹی سی دکان تھی وہ بھی اپنی گلی کے نکڑ پر...... آمدنی تو نہ ہونے کے برابر تھی لیکن گھر کسی طور چل ہی رہا تھا...... میں اسکول بھی جاتی اور گھر آ کر گھر کا سارا کام کرتی...... بھائیوں کی خدمت کرتی، اماں کی تیمارداری، ابا کے احکامات بجالاتی۔ سارا دن میرا اسی بھاگ دوڑ میں گزر جاتا۔ رات کو جب بستر پر پڑ جاتی تو ٹانگیں درد سے بے حال ہو جاتیں۔

''یا اللہ ان کاموں سے میری کب جان چھوٹے گی؟'' میں خود سے سوال جواب کرتی جانے کب نیند کی وادی میں کھو جاتی۔

ایک دن میں اسکول سے اپنی ایک سہیلی آسیہ کے گھر گئی۔ واہ بھئی کیا ٹھاٹ تھے اس کے...... نوکر نے چائے لا کر سامنے رکھ دی۔ آسیہ اور میں دونوں گپیں لگاتے رہے۔ آسیہ کسی کام کے لیے نہ اٹھی...... ایک میں تھی، کبھی کوئی بھولی بھٹکی سہیلی آ بھی جاتی تو بیچاری کو اماں سے ہی گپیں لگانی پڑتیں...... میں اس کے لیے چائے، پانی کے غم میں ہلکان ہوتی رہتی...... اس لیے تو عرصہ ہوا کبھی کوئی سہیلی میرے گھر نہیں آئی تھی۔ وقت کے ساتھ، ساتھ ایک نوکر کی خواہش میرے دل میں فزوں تر ہوتی گئی تھی لیکن یہ خواہش، خواہش ہی رہی، سوچا تھا چلو باپ کے گھر نوکر نصیب نہیں ہوا لیکن شادی کے بعد جب میری اپنی حکومت ہوگی تو میں میاں کے سامنے اپنا پہلا مطالبہ یہی رکھوں گی کہ وہ میرے لیے ایک عدد نوکر کا انتظام کردے لیکن واہ ری قسمت...... شادی ہوئی تو وہی بڑا کنبہ اور لاتعداد ذمے داریاں اور وسائل نہ ہونے کے برابر...... میاں کسی دفتر میں چپراسی تھے...... ایک بیمار ساس، سسر تھے، دو شادی شدہ نندیں تھیں جو ہر دوسرے روز ماں، باپ سے ملنے آجایا کرتیں اور تب میری دوڑیں لگ جاتیں...... دو جیٹھانیاں تھیں جو الگ رہتی تھیں لیکن ان کا ہر سنڈے ہمارے گھر بسر ہوتا...... سو کام والی میں ہی تھی۔ زندگی پہلے سے زیادہ مشکل لگنے لگی۔ میری زندگی کا مقصد قائداعظم کے فرمان کی طرح کام، کام اور صرف کام تھا...... ایک رات میاں کو زیادہ مہربان پایا تو دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا، ویسے بھی اب میرے اندر ایک نئی زندگی سانس لینے لگی تھی اور مجھے آرام کی بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

''رفیق! اگر ہم ایک جز وقتی ملازمہ رکھ لیں تو......'' میں رفیق کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے ناز سے بولی لیکن انہیں تو جیسے میری بات سے کرنٹ لگ گیا۔

''کیا...... کیا کہا تم نے...... فرخندہ ایک بار پھر کہو......'' وہ اچھل پڑے۔ میں ڈر کر چپ ہوگئی۔

''ہماری سات پشتوں میں کسی نے نوکر نہیں رکھے...... سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں، میری بھابیوں کو دیکھو، میری بہنوں کو دیکھو...... کس کے گھر میں نوکر ہیں اور تم......'' وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

''اور ویسے بھی تم کون سا نوکروں والے گھر سے آئی ہو...... وہاں کیا سارا کام خود نہیں کرتی تھیں۔ اماں نے اسی لیے تو تمہیں چنا تھا کہ تم نے سارا کام اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔''

میں چپ ہوگئی اور پھر کبھی میاں سے ایسی کوئی فرمائش نہ کی اور کام کو اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر لگی رہتی...... وقت گزرتا گیا، خدا نے دو پھول ایک بیٹا اور ایک بیٹی میری جھولی میں ڈال دیے...... دو بچوں کے ساتھ کام اور بھی بڑھ گیا۔ کنبہ اب بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگا تھا...... ساس، سسر وفات پا گئے، جیٹھانیاں اور نندیں اپنے گھروں میں اور آل اولاد میں اس طرح مصروف ہوگئیں کہ اب انہیں کبھی کبھار ہی آنے کا موقع ملتا...... لیکن میرا تو وہی معمول تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے لیکن میں اسی خوش اسلوبی سے سارا کام نپٹایا کرتی تھی۔

وقت نے ایک اور کروٹ لی، بچے جوان ہوگئے، میاں کا سہارا چھوٹ گیا۔ وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں گزر گئے، بیٹی کی شادی جیٹھ کے بیٹے سے ہوگئی۔ بیٹا ایک سرکاری دفتر میں کلرک لگ گیا...... میری نندیں میرے

بیٹے پر اپنا حق جمانے لگیں کہ اُن کا بھتیجا ہے سو وہ ان کی بیٹیوں میں سے کسی کا انتخاب کرے گا...... میں نے ساری عمر نندوں سے بنا کر رکھی تھی اس اہم معاملے میں بھی ان کی بات کو اولیت دی۔ میرے بیٹے اخلاق نے اپنی پھپو کی چھوٹی بیٹی تصور کو چن لیا، میں تصور کو بیاہ کر لائی تو خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی کہ چلو تو کر ساری زندگی نہیں ملا لیکن ایک بندہ ایسا تو گھر میں آ گیا جو کاموں میں میری مدد ضرور کرے گا......لیکن واہ ری قسمت......تصور کو میری نند نے گھر کا کوئی کام نہیں سکھایا تھا۔ وہ گھر میں چھوٹی تھی سو اسے گھر کے کاموں سے دور رکھا گیا تھا۔ میں نے اس بات کو جھگڑے کی بنیاد نہیں بنایا اور ہمیشہ کی طرح کاموں میں مگن رہی۔ تصور کے صبح اٹھنے سے قبل میں ساری صفائی کر لیتی، اخلاق کو ناشتا دے کر دفتر بھیج دیتی، سارے برتن دھو لیتی۔ تصور جب تک اٹھتی میرا سارا کام ختم ہو گیا ہوتا، حتیٰ کہ سبزی ترکاری کاٹ کر رکھ دیتی۔ بلکہ تصور کا ناشتا بھی تیار کر لیتی، تصور میری بہت احسان مند تھی، وہ اکثر کہتی۔

''مامی......آپ سب کام کر لیتی ہیں، میرے کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا۔''

میں اسے کوئی جواب نہ دیتی لیکن دل ہی دل میں سوچتی کہ جس بندے کے نصیب میں کام، کام اور صرف کام لکھا ہو وہ کسی سے کیا گلہ کرے......ظاہر ہے نصیب کا لکھا تو بھگتنا پڑتا ہے ناں......ورنہ بہوؤں کے آنے سے تو ساسیں چارپائیوں پر بیٹھ کر حکم چلاتی رہتی ہیں اور میں ایک ایسی بدنصیب ساس تھی جو اب بھی جوان چھوکریوں کی طرح بیٹے، بہو کے سامنے پھرکی کی طرح گھومتی رہتی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو اخلاق کی ترقی ہو گئی......وہ سینئر کلرک کی پوسٹ پر آ گیا، ہمیں ایک سرکاری تین کمروں کا صاف ستھرا کوارٹر مل گیا۔ یہ ایک سرکاری کالونی میں تھا......ہم نے اپنا سامان باندھا اور وہاں شفٹ ہو گئے۔ کام بہت زیادہ تھا، میں اور تصور تھک کر چور ہو گئے، تصور آج کل دوسرے جی سے تھی سو میں اسے زیادہ کام نہیں کرنے دے رہی تھی۔

سنڈے کا دن تھا۔ اخلاق بھی گھر پر تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ میں جتنا کام سمیٹتی پھیلاوا اتنا ہی بڑھ جاتا۔ اخلاق باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ایک ساتھ ایک پختہ عمر کی موٹی تازی خاتون تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اماں، یہ ماسی نصیب ہے، یہاں کے کئی گھروں میں کام کرتی ہے، اسے میں آپ کی مدد کے لیے لایا ہوں، کام اتنا زیادہ ہے کہ آپ رات تک بھی اسے اکیلا پورا نہیں کر سکتیں۔''

مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی......لیکن اس کی بات سچ تھی، ہم نے مل کر شام تک سارا کام ختم کر لیا......اخلاق نے اسے کچھ رقم دے کر رخصت کیا لیکن صبح مجھے بخار چڑھ گیا۔ اور میرے بخار نے اخلاق سے مستقل نوکر رکھنے کا فیصلہ کرایا۔ اور تب ماسی نصیب کو کام پر رکھ لیا گیا۔ ایک طویل عرصے کی دعائیں میری اس عمر میں پوری ہو گئیں۔ میرے دل میں جو خواہش ایک عرصے سے پل رہی تھی آج اس نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ میں اپنے اندر کی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ خوشی میرے رگ وپے میں دوڑ رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے نیا جنم لے لیا ہو، کیا میرے لیے بھی کوئی چائے کا کپ بنا کر دے گا؟ کیا مجھے بھی چارپائی پر کھانا ملا کرے گا، سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے دبے لفظوں میں اخلاق سے کہہ دیا۔

''بیٹے، تمہاری جیب پر اثر پڑے گا......آج کل نوکروں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔''

''میری تنخواہ بڑھ گئی ہے اماں......گھر بھی سرکاری ہے اور ویسے بھی یہ ماسی نصیب زیادہ پیسوں کی ڈیمانڈ نہیں کرتی۔'' اخلاق نے کہا۔ تصور تو پہلے سے یہ چاہتی تھی کہ گھر میں نوکر آئے سو اس نے کوئی نکتہ نہیں اٹھایا۔ اگلی صبح میری زندگی کی انوکھی صبح تھی، فجر کی نماز پڑھ کر میں ہمیشہ جھاڑو لے کر صفائی کا آغاز کرتی لیکن آج تو باہر سے جھاڑو کی آواز آ رہی تھی، یہ اتنی صبح صبح آ گئی ہے۔ میں نے حیرت سے سوچا اور بستر پر واپس پڑ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی جب مجھے نیند کے جھونکے آنا شروع ہوئے تو

دروازے پر ٹھک، ٹھک کی آواز سنائی دی۔

"کون؟" میں نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"چائے لائی ہوں بی بی۔" ماسی نصیب نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور مع ٹرے اندر آگئی۔ میری رگ، رگ میں خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں...... ایک تو چارپائی پر بنی بنائی چائے کا مزہ اور دوسرے بی بی کے نام کا لاحقہ...... سچ مچ سواد آگیا۔ کبھی کسی نے بی بی نہیں کہا تھا۔ کبھی اس طرح چائے نہیں ملی تھی بغیر مشقت کے...... خواہش دیر سے سہی پوری تو ہوگئی تھی۔

"میں آج سب سے پہلے آپ کے گھر آگئی ہوں بی بی بس آپ ہانڈی کا بتادیں کہ کیا بنانا ہے، دلہن بی بی اٹھیں گی تو اُن کے لیے ناشتا بنادوں گی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

میں نے بڑے مزے سے چائے پی...... اس سے ہانڈی کے بارے میں بات کی اور پھر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اب تو یہ روٹین شروع ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، وہ جن کی بچی گھنٹوں کا کام منٹوں میں سلجھا دیتی، میں فارغ بیٹھے بیٹھے، اوبنے لگی تھی۔ ناشتا، کھانا سب چارپائی پر مل جاتا تھا، میں کوئی کام کرنے کی کوشش کرتی بھی تو وہ منع کردیتی۔

"نہ جی...... آپ اس عمر میں تکلیف نہ کریں، میں کرلوں گی سب۔" میں چڑ جاتی...... کیا ہوگیا تھا میری عمر کو...... کیا اب تک میں نے اکیلے اس گھر کو نہیں سنبھالا تھا...... ایک دن میں جب نماز کے لیے اٹھ رہی تھی گھٹنوں میں بڑے زور کا درد اٹھا۔ میں اوئی، اوہ کرکے بیٹھ گئی۔ خیر جیسے تیسے نماز پڑھ لی۔ لیکن جب دو تین بار ایسا ہوا تو میں نے اخلاق سے کہہ دیا۔

"اخلاق، میرے گھٹنوں میں بہت درد ہورہا ہے، تم کالونی کے سرے پر جو ڈاکٹر ہے اس سے دوا لے آنا میرے لیے۔"

"ویسے تو اماں، ڈاکٹر مریض کو دیکھے بغیر دوا نہیں دیتے پھر بھی بات کرلیتا ہوں...... اگر درد کی دوائی لکھ لی تو میں لیتا آؤں گا۔" اخلاق بولا۔

اگلے دن میں فجر پڑھ کر چائے کا انتظار کرتی رہی لیکن چائے نہ آئی آج جھاڑو کی مخصوص چھڑک، چھڑک کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو ماسی نصیب ندارد تھی...... میں نے جھاڑو اٹھایا اور سارے گھر میں جھاڑو دی پھر اپنے لیے چائے بنائی، سبزی بنائی اور ہنڈیا چڑھادی...... میں سرشاری سی سارے کام کرتی رہی، اخلاق کے سامنے ناشتا رکھا تو وہ بولا۔

"اماں...... رات کو میں ڈاکٹر سے گولیاں لے آیا ہوں، آپ کے گھٹنوں کے درد کی۔"

میں نے حیرت سے سوچا کہ آج میں نے اتنے کام کیے لیکن مجھے گھٹنوں میں کوئی درد محسوس نہیں ہوا جبکہ چارپائی پر بیٹھتی تو گھٹنوں کا درد سوا ہونے لگتا، تصور کمرے سے باہر آکر بار، بار جمائیاں لے کر کہہ رہی تھی۔

"ماسی نصیب کچھ دن کی چھٹی پر گئی ہے ماں...... میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔"

"یہ کام والیاں بھی بہت بہانے باز ہوتی ہیں ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا اور چھٹی پر چلی گئی۔" اخلاق کو غصہ آگیا تھا۔

"اخلاق بیٹے ایک بات کہوں؟" میں نے باری، باری بیٹے اور بہو پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

"ہاں، ہاں اماں......" اخلاق چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"بیٹے...... ماسی نصیب کو مستقل چھٹی دے دو۔"

"کیوں اماں......؟" اخلاق نے حیرت سے میری طرف دیکھا، تصور بھی حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بس بیٹا......" میں اپنے گھٹنوں کو ہاتھ سے دباتے ہوئے بولی۔

"مجھے اپنے آپ کو اپاہج نہیں بنانا...... اپنے گھٹنوں کا درد سوا نہیں کرنا...... مجھ سے میرا کام، میری ذمے داری مت چھینو...... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں، مرنا نہیں چاہتی...... چارپائی پر پڑے رہنا تو مرنے کے برابر ہے، میں مرتے دم تک قائداعظم کے فرمان پر چلنا چاہوں گی، یعنی کام، کام اور صرف کام......!"



کوئی حقیقت ہے نہیں

فرحین اظفر

اسے شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی انوشے اوراس کے گھر والوں کی فطری محرومی کے متعلق آگاہی حاصل ہوگئی تھی۔

اوپر تلے چار بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اس کی ساس اور سسر نے اولادِ نرینہ کی خواہش کو دل ہی دل میں دبا لیا تھا مگر اس کی شادی کے بعد چھوٹی تو چھوٹی بڑی سالی بھی جس محبت سے اس کی خاطر مدارات کرتی، ساس، سسر اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے، گھر کے

معمولی سے معمولی مسئلے اس کے گوش گزار کر کے اس سے رائے مانگی جاتی۔ پھر اس کا احترام کیا جاتا اور... حتی الامکان اسے فوقیت دینے کی کوشش کی جاتی۔ اس عزت و احترام کے تسلسل نے بجائے اس کی گردن میں سریا فٹ کرنے کے کمر کے خم میں اضافہ ہی کیا تھا۔

انہیں بیٹے کی چاہ تھی اور اسے ماں، باپ کی...... سو داماد کے روپ میں اور سسرال والوں کی شکل میں خدا نے دونوں ہی فریقین کی خواہشوں کو کیا خوب پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا بلکہ خواہشوں کے بجائے احتیاج کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

زندگی اگر نامکمل تھی تو انوشے نے آ کر اسے مکمل کر دیا تھا اور اگر خوب صورت تھی تو اب حسین ہوگئی تھی۔

ہر اتوار کی شام کو وہ اسے لے کر سسرال پہنچ جاتا اور کھانا کھا کر واپسی ہوتی۔ اس دوران گھریلو سے لے سیاست تک دنیا جہان کے مسئلے مسائل، تغیرات، حالات و واقعات پر سیر حاصل بحث ہوتی، تبصرے اور تجزیے ہوتے، وہ خود بھی دلچسپی سے شریک رہتا۔ گاہے بگاہے انوشے کو بھی دیکھتا رہتا جو کبھی تو ماں، بہنوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول پائی جاتی اور کبھی میٹھی میٹھی نظروں سے اسے تکتی ہوئی اور کبھی وہ اس چوری پر پکڑی جاتی تو جھینپ بھی جاتی اور کبھی مسکرا دیتی۔

وہ ایسا ہی ایک ویک اینڈ تھا جب شادی کے بعد پہلی بار ان کے معمول میں رکاوٹ پڑ گئی۔

”ہم کل تمہاری امی کے گھر نہیں جا سکیں گے۔“ چائے پیتے ہوئے کسی سے فون پر بات کر کے حسن نے فون بند کیا تو سنجیدگی سے اسے پیغام دیا۔

”کیوں؟“ استری کرتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا رکے۔

”کل شام میرا بھائی آ رہا ہے پنڈی سے۔ نوکری کے سلسلے میں ایک دو دن رکنے کے لیے۔“

اس کا خیال تھا کہ ماں کے گھر نہ جا سکنے پر انوشے ضرور بھائی کی آمد پر ناک بھوں چڑھائے گی لیکن وہ ایڑھیوں کے بل گھومی تو اس کا کھلا ہوا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔

”واقعی؟ آپ نے پہلے بتایا نہیں کہ آپ کا کوئی بھائی بھی ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”بھائی یعنی کزن...... وہ پنڈی والے چچا تھے ناں اسلم چچا، وہ ان کا بیٹا ہے ہماری شادی پر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آ سکا تھا۔“

”اوہ اچھا......!“ اس نے سر ہلا کر شرٹ کو ہینگر میں ڈالا اور پھر فرصت سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”بہت خوشی کی بات ہے، میں اچھا سا کھانا بنا لوں گی۔ اچھا سا ویلکم دوں گی، خوش ہو جائے گا۔“ اس کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔

”ہاں، ہاں کر لینا، اسے بھی خوش...... پہلے مجھے تو خوش کرو۔“

وہ پل میں ہی شوخ ہو گیا۔

☆☆☆

مغرب کے سایوں کو پھیلنے کی جلدی تھی اور اسے اپنا پھیلاوا سمیٹنے کی...... کھانا تیاری کے آخری مرحلے سے گزر کر سجاوٹ کی جانب خوش اسلوبی سے رواں دواں تھا۔

اس نے بری کے جوڑوں میں سے ایک سادہ اور نفیس لباس کا انتخاب کیا اور مناسب میک اپ کر کے کانوں میں وہ ٹاپس پہن لیے جو اسے منہ دکھائی میں حسن کی طرف سے ملے تھے۔ حسن عصر سے ذرا پہلے ہی اپنے کزن فرحان کو ریسیو کرنے ایئرپورٹ جا چکا تھا اور ذرا دیر پہلے اسے گھر کے لیے ایئرپورٹ سے روانگی کی خبر بھی دے دی تھی۔ اسی لیے اس کے ہاتھوں نے تیزی دکھائی اور جس وقت وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو گھر کھانوں کی لذیذ اور اس کا اپنا وجود قیمتی پرفیوم کی دلفریب مہک سے معطر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”واہ بھابی، کیا خستہ اور کرارے پراٹھے بنائے ہیں قسم سے۔ یوں لگ رہا ہے زندگی میں پہلی بار کسی

نے پراٹھا کھلایا ہے۔''

چھوٹے سے گھر میں فرحان کی آواز گونج رہی تھی اور کچن سے ڈائننگ ٹیبل تک مارچ کرتی انوشے کی کھلکھلاہٹ سے گھر بھرتا جارہا تھا۔

حسن نے فرحان کی وجہ سے آج آفس سے چھٹی کرلی تھی۔ وہ صرف دو دن کے لیے انٹرویو کی غرض سے آیا تھا اس کے بعد اسے واپس پنڈی لوٹ جانا تھا۔

انوشے نے اپنی محبت اور سلیقہ مندی سے محض چند گھنٹوں میں ہی اس کے دل میں پسندیدگی، احترام اور خلوص کی سند حاصل کرلی تھی۔ اس کے ایک، ایک انداز اور ہر، ہر بات سے انوشے کے لیے پسندیدگی جھلک رہی تھی۔

حسن کا دل تفاخر کے عجیب سے احساسات سے معمور تھا۔ وہ محبت سے کبھی اپنے بھائیوں جیسے کزن کو دیکھتا اور کبھی عزیز از جان بیوی کو...... جو خود بھی بہت تھوڑے سے وقت میں فرحان کی محبتوں کے آگے ہتھیار ڈال کر اسے چھوٹے بھائی کا درجہ دے چکی تھی۔

جبھی رات کو کیے جانے والے اہتمام سے ہٹ کر اس نے صبح خاص فرحان کی پسند کے پراٹھوں، حلوے اور آلو کی ترکاری کا ناشتا تیار کیا تھا۔ اور جب اشتہا انگیز خوشبوئیں اڑاتے ناشتے کے ساتھ بھاپ اڑاتے دودھ پتی کے فل سائز مگ سامنے آئے تو فرحان تو جیسے غش کھانے والا ہوگیا۔

''سواد آگیا بادشاہو!'' اس نے خالص لاہوری انداز میں حسن کو مخاطب کیا۔

''آپ نے تو میرا دل ہی جیت لیا بھابی، ورنہ یہاں آنے سے پہلے میں بہت پریشان تھا کہ پتا نہیں بھابی کس مزاج کی ہوں گی۔ میری آمد کو پسند بھی کریں گی کہ نہیں...... لیکن بھابی نے تو مجھے بہنوں سے بڑھ کر مان دیا۔ بہت شکریہ بھابی......'' وہ ممنونیت سے بولا۔

''بہن بھی کہتے ہو اور شکریہ بھی......'' وہ مسکرائی۔

''چلیں شکریہ واپس لے لیتا ہوں اور جہاں آپ نے مجھے اتنی محبت اور خلوص دیا وہاں آدھا کپ چائے اور بھی دے دیں تو بڑی مہربانی......''

''میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے چائے بنانے چل دی۔

☆☆☆

دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ فرحان کا نہ صرف انٹرویو کامیاب ہوگیا بلکہ وہ جاب پر اپائنٹ ہونے کے بعد پنڈی سے کراچی ان کے گھر دوبارہ رہنے کے لیے بھی آگیا۔

انوشے اس کی سنگت میں خوش تھی۔ یوں تو فرحان سارا دن آفس میں گزار کر شام میں ہی گھر آتا تھا لیکن حسن اور اس کی نوکری میں فرق تھا۔

حسن دوپہر کے کھانے پر گھر آتا اور شام تک دوبارہ نکل جاتا۔ اس کے جانے کے ذرا دیر بعد ہی فرحان گھر آجاتا۔ یوں انوشے جو فرحان کی آمد سے پہلے اکثر حسن کے شام میں ڈیوٹی کے لیے نکلتے وقت منہ بسورتی رہتی تھی۔ اب ہمہ وقت خوش باش ہنستی کھلکھلاتی دکھائی دیتی۔

فرحان نے اس کے اندرونِ خانہ بہت سے چھوٹے، چھوٹے مسئلے مسائل بھی حل کردیے تھے۔ شام میں چائے کے بعد وہ خود ہی پودوں کو پانی دے دیتا۔ انوشے کھانے کی تیاری کرتی، صحن سے ہوا کے جھونکوں کے سنگ آتی ہوئی بیلے کی کلیوں کی خوشبو سونگھ، سونگھ کر خود بھی معطر ہوتی رہتی۔

گھر کے باہر کے سارے کام، یوٹیلٹی بلز اور گروسری کی خریداری بڑی حد تک وہ پوری کردیتا۔ زیادہ موڈ ہوتا تو رات کے کھانے کے بعد چائے بنا کر وہ تینوں اکٹھے بیٹھتے کبھی، کبھی جب حسن پر زیادہ ہی نیند کا غلبہ ہوتا تو اس کے سونے کے بعد بھی وہ دونوں جاگتے کوئی ان ڈور گیمز کھیلتے اور کبھی کوئی ڈراؤنی فلم دیکھ لیتے۔

اس دن بھی اس کا کچھ ایسا ہی ارادہ تھا۔ جب کمرے سے باہر نکلتے سے حسن نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

''کہاں جارہی ہو؟''

"فرحان ایک نئی مووی لایا ہے۔ سوچا تو تھا کہ آپ کے ساتھ دیکھوں گی لیکن آپ کو تو صرف اپنی نیند سے پیار ہے۔"

"اوں ہونہہ...... نیند سے زیادہ مجھے تم سے پیار ہے جبھی تو بلا رہا ہوں۔" اس کی خمار بھری آواز میں ایک انوکھا سا بلاوا تھا۔ جیسے کوئی مدھ سر چڑھ کر بولے۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی۔

"پلیز...... حسن پلیز ابھی نہیں، ابھی مووی دیکھنے دیں۔"

حسن حیران رہ گیا...... وہ باہر جانے کے لیے بری طرح مچل سی گئی تھی۔ اس نے ایک دم ہی اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا اور وہ ہنستی ہوئی منہ چڑا کر مچھلی کی طرح باہر پھسل گئی۔

پیچھے حسن کے لیے سوچوں کے بے شمار در وا کر کے۔

☆☆☆

"کتنے دن کے بعد شکل دکھائی ہے...... بالکل عید کا چاند بنتی جا رہی ہو۔" اس بار پہلی دفعہ یوں ہوا کہ امی کے لبوں سے ایک میٹھا سا شکوہ نکلا اور وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"کیا کروں امی، جب سے فرحان گھر آیا ہے ناں، باؤلا ہی کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔"

"کیوں آپی! ایسا بھی کیا، آپ تو بالکل ایسے بات کر رہی ہیں جیسے کوئی اپنے چنو منو کے بارے میں کرتا ہے۔"

"شانزے کی بچی...... بے شرم۔" اس نے جھینپ کر اس کو ایک دھپ لگائی۔ پھر بات بدل کر فرحان کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئی۔

"اگر وہ اتنا ہی اچھا ہے اور برسرِ روزگار بھی ہے تو تم اس سے شانزے کے بارے میں بات کرو ناں......؟" امی کب سے اس کے منہ سے اس کے دیور کی تعریفیں سن رہی تھیں۔ شانزے بھی پاس ہی تھی اس کے ہٹتے ہی امی نے ماؤں والی مخصوص بات کی اور وہ ایک خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔

"واقعی امی......! یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔" اس کا دل لمحے بھر میں کئی بار بلیوں اچھل گیا۔

"آج ہی جا کر کہتی ہوں۔"

"اوں ہوں...... بچی رہو گی کب تک...... یوں ڈائریکٹ نہیں، پہلے حسن سے کہو، دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ تم نے تو اب تک اس کی اچھائیاں ہی دیکھی ہیں ناں...... حسن کو اس کے بارے میں اچھی طرح علم ہوگا۔ پنڈی میں اس کے دوست احباب کیسے ہیں، ملنا جلنا کن لوگوں میں ہے، گھر والوں کے ساتھ کیسا ہے۔"

وہ تابعداری سے سر ہلانے لگی مگر یہ بات ایسی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسی ہفتے شانزے کو فرحان کی دلہن بنا کر گھر لے آئے۔ اپنی بے تابی پر وہ خود ہی ہنس رہی تھی۔

☆☆☆

ڈیک پر لگے گانے فل والیوم میں بج رہے تھے۔ اتنے کہ گھر سے باہر تک آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے جب اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے کا منظر بے اختیار اس کا خون کھولا گیا۔

میں اگر کہوں تم سا حسیں، کائنات میں نہیں ہے کہیں
تعریف یہ بھی تو سچ ہے کچھ بھی نہیں

انوشے سامنے ہی کچن ایپرن باندھے بنا دوپٹے فرحان کے داہنے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیے گول، گول گھوم رہی تھی اور فرحان کی نظریں، مسکراتے ہوئے اس کا سراپا تک رہی تھیں۔

وہ دونوں خود میں یوں گم تھے کہ انہوں نے حسن کو وہاں آتے دیکھا ہی نہیں تھا۔ حسن نے خود ہی آگے بڑھ کر پلیئر آف کیا تو دونوں ہڑبڑا کر جیسے ہوش میں آئے۔

"ارے، آپ...... حسن آپ کب آئے؟"

انوشے نے جلدی سے قدموں میں رلتا ہوا دوپٹا اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

حسن کے چہرے پر چھائی سنجیدگی گواہ تھی کہ اسے یہ منظر ناگوار گزرا ہے۔

"پانی لے کر آؤ...... میں کمرے میں ہوں۔"

☆☆☆

"آئی ایم سوری حسن!" وہ سامنے کھڑی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اس نے اس سے پہلے حسن کو سنجیدہ تو دیکھا تھا لیکن غصے میں کبھی نہیں۔ اس لیے اس کی حالت بھی زیادہ ہی غیر ہوگئی۔ معمول سے تیز دل دھڑکنے لگا اور حسن کے اسے کچھ بھی نہ کہنے کے باوجود پسینے چھوٹ گئے تھے۔

حسن کچھ دیر تو یونہی اسے دیکھتا رہا پھر جب اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ خود ہی کافی شرمندہ ہے تو ہاتھ پکڑ کر اسے برابر میں بٹھالیا۔

"گانے کس نے لگائے تھے اتنی اونچی آواز میں؟" وہ سنجیدہ لیکن نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔

"وہ...... فرحان نے ہی لگائے تھے۔"

"تو تم نے منع نہیں کیا۔"

"نہیں وہ...... اصل میں وہ بہت خوش تھا کیونکہ میں نے باتوں، باتوں میں امی کی پسندیدگی اور شانزے کے بارے میں اس کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ معاملہ سمجھ گیا اور خوشی میں ڈیک لگا کر......"

"انوشے! تم جانتی ہو، مرد اور عورت اگر نامحرم ہوں تو ان کے درمیان شیطان ہر وقت اور ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ انہیں ورغلانے اور بہکانے کے لیے...... وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔"

جانے کیوں اور کیسے، ایک اس قدر مستند اور جانی مانی بات کا حوالہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ وہ جو اسے ہلکے، ہلکے انداز میں تنبیہ کرنا چاہ رہا تھا۔ بالکل انتہائی اور آخری بات کر بیٹھا...... اور یہ حقیقت ہی تو تھی۔

بجائے اس کے کہ وہ اسے دنیاوی الفاظ میں منع کرتا۔

"تمہارا یوں اونچی آواز میں گانے سننا ٹھیک نہیں۔"

"ایسے ڈانس کرنا اچھی بات نہیں۔"

"وہ کیا سوچتا، لوگ کیا کہیں گے، محلے والے، میں...... یہ...... وہ...... کچھ نہیں۔" انوشے کا منہ کھل گیا۔

ایک شام خود اپنے لیے گزاریے

مہینے میں کم از کم ایک شام خود اپنے لیے مخصوص کیجیے...... یہاں اپنے سے مراد آپ خود نہیں بلکہ اس میں آپ کے شریکِ حیات بھی شامل ہیں۔ اپنے وسائل کے مطابق کوئی تفریحی جگہ منتخب کیجیے...... یہ سارا وقت کہنے سے زیادہ سننے میں گزاریں۔ گھر کے ماحول سے ہٹ کر کسی پارک، تفریح گاہ میں جا کر بیٹھیں۔ پاپ کارن، ایک آئس کریم یا برگر ہی سہی۔ آنے جانے میں ٹرانسپورٹ کی زحمت بھی برداشت کریں۔ کسی رکاوٹ، کسی کمی کو خاطر میں نہ لائیں۔ ایک دوسرے سے الجھے بغیر وقت گزاریں، ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے کی کوشش کریں، براہِ راست مکالمہ بھی زندگی کی ضرورت ہے، جس کا گھر میں موقع کم ہی ملتا ہے۔ تفریح کو ممکنہ حد تک تفریح بنائیں۔ اس سے ذہنی سکون بھی ملے گا اور آپ کو زندگی کے معمولات سے نمٹنے کے لیے توانائی بھی فراہم ہوگی۔

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

"جی......!" وہ یوں اسے دیکھنے لگی جیسے وہ ابھی ابھی چاند سے اتر کر آیا ہے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے خفگی سے سر جھکا لیا۔

"کیسی بات؟" اب کے اس نے جان کر انوشے کو وضاحت کے لیے اکسایا تھا۔

"وہ چچ......!" وہ زچ ہوئی۔

"جیسی آپ سوچ رہے ہیں، وہ میرے لیے بھائیوں جیسا ہے۔"

"بھائیوں جیسا ہے ناں، بھائی تو نہیں۔"

"تو بات تو ایک ہی ہے۔"

"بات ایک ہی نہیں ہے، خیر...... آئندہ خیال رہے، بھائی ہونے میں اور بھائی جیسا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔" اس نے بات سمیٹنے کی غرض سے الفاظ سمیٹے اور لہجے کو ہلکا پھلکا کرلیا۔

"کوئی فرق ورق نہیں، صرف ذہنیت کا فرق ہے اور بس......"

"کیا مطلب......؟" وہ واش روم کے

دروازے پر رک کر مڑا۔

''مطلب یہ کہ میری ذہنیت آپ کی طرح گندی نہیں ہے۔'' اسے ڈر تھا کہ اس کی بات حسن کو غصہ دلا سکتی ہے، اس لیے بول کر جھپاک سے باہر نکل گئی اور اس کے اس انداز پر غلط ہونے کے باوجود حسن کی ہنسی نکل گئی۔

☆☆☆

سمے کا مالک سکہ، سکہ کر کے دن کی پوٹلی سے رات اور رات کی پوٹلی سے دن کے سکوں کا الٹ پھیر کرتا رہا اور ایک دن بالکل اچانک رات میں سونے کے لیے لیٹتے ہوئے حسن چونک گیا۔

''انوشے۔''

''جی......'' وہ بڑے بجھے، بجھے انداز میں ہاتھوں پر کوئی کریم لگا رہی تھی۔

''کچھ دنوں سے تم بڑی چپ، چپ سی ہو۔''

''نہیں......آپ کا وہم ہے۔'' وہ یونہی ٹھس سی بولی۔ اس کے الفاظ اور انداز میں واضح فرق تھا۔ پھر بھی حسن نے تردید کی نہ تائید......

''تمہیں نہیں لگتا......فرحان پنڈی جا کر ہمیں بالکل بھول ہی گیا۔'' اس نے جواب نہیں دیا......حسن نے اس کی خاموشی کو بطورِ خاص نوٹ کیا۔

''کیا بات ہے، تم جواب نہیں دے رہیں میری بات کا۔''

''پتا نہیں سر بھاری، بھاری سا ہے۔''

حسن نے محبت سے بازو پھیلایا۔ وہ اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''تمہاری امی نے بات چلانے کو کہا تھا شانزے کی فرحان کے ساتھ......اس کا بھی کچھ جواب نہیں آیا۔''

''ہاں وہ......'' اس کے دل میں درد سا اٹھا۔

''بات ختم ہوگئی شروع ہونے سے پہلے ہی۔''

''کیوں......اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''فائدہ ہی کوئی نہیں تھا۔ فرحان نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی کسی کزن کو پسند کرتا ہے، میں آتی ہوں ٹیبلٹ کھا کر۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں......اور اپنی بات کہنے کے لیے حسن الفاظ ہی تلاشتا رہ گیا۔

''اگر وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا تو مہینوں پہلے کی ایک شام کو انوشے کے ساتھ گانا لگا کر ڈانس کرنا......وہ کس خوشی میں تھا۔''

اور دوسری طرف کچن میں پانی کا بھرا گلاس غٹاغٹ چڑھاتی انوشے دنوں پرانا منظر یاد کر کے کڑھ رہی تھی۔

جب بالکل اچانک ہی حسن نے آفس سے فون کر کے اسے چار پانچ لوگوں کے لیے اچھا سا کھانا بنانے کو کہا تھا۔ اور اس کے پاس اس حساب سے کھانا بنانے کے لیے جو برتن تھے وہ بہت اونچے کیبنٹ پر رکھے تھے۔

اس کی شامتِ عقل تھی یا شامت اعمال کہ وہ فرحان کو نیچے کھڑا کر کے دیگچا اتارنے اسٹول پر چڑھ گئی۔ اور جس وقت اس نے دھول اور گرد میں اٹا اوندھا دھرا دیگچا اتار کر نیچے جھک کر فرحان کو پکڑایا تو اسی لمحے......عین اسی لمحے اس کا جارجٹ کا دوپٹا کندھے سے پھسل کر ایک طرف کو جھول گیا اور......کبھی کبھی کوئی لمحہ دو دھاری تلوار جیسا ہوتا ہے یا اس لمحے میں منکشف ہوتی حقیقت ہی آری کی طرح چیر کر رکھ دیتی ہے۔

اور وہ وہی لمحہ تھا، وہ وہی حقیقت تھی اور وہ وہی آگہی تھی۔ جب اس نے فرحان کی نظروں کا زاویہ بدل کر کہیں اور جمتے دیکھا......ایک لمحے میں خود پر گزرنے والی قیامت یا خود پر گر پڑنے والی بجلی کی کڑک اتنی زوردار تھی کہ اس سے سہی نہ گئی۔

وہ وزنی دیگچا چھوڑ کر بری طرح لڑکھڑا گئی۔ قریب تھا کہ اس قد آدم اسٹول سے سیدھی نیچے آگرتی کہ دو بازوؤں نے اسے سہارا دے دیا۔ جانے سہارا دیا یا بے سہارا کر دیا۔ جانے سہارا دیا یا حصار میں لے لیا۔ جانے سہارا دیا یا......وہ تڑپ کر دور ہوئی اور رخ پھیر گئی لیکن وہ لمحہ جو اس پر سے ہو کر گزر چکا تھا وہ واپس پلٹ آیا۔ بالکل

اس کی پشت پر... اتنے نزدیک کہ اس کی سانسوں کی تپش اس نے اپنی گردن پر محسوس کی۔

''کیا ہوا؟'' کسی نے بظاہر ہمدردی کے لیے پوچھا تھا۔ لیکن وہ ایک سرگوشی ،کوئی سرگوشی نہیں، کسی سانپ کی سی پھنکار تھی۔

''چوٹ تو نہیں لگی؟'' اور چوٹ تو لگ چکی تھی لیکن جسمانی نہیں تھی۔ اس کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ اس کے دماغ...... اس کے اعصاب اور سب سے بڑھ کر اس کے اعتبار پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ وہ شور بھی نہیں مچا سکتی تھی۔ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ بس خاموشی سے اپنی جگہ رخ موڑ کر کھڑی بری طرح بلبلا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ پلٹ نہیں سکتی تھی۔ اور پلٹ نہیں سکتی تھی اس لیے زمین پر گرا اپنا دوپٹا بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن وہ تو اٹھا سکتا تھا۔ جو اس کا بھائی نہیں تھا مگر بھائی جیسا تھا۔

اور یہی...... یہی وہ نکتہ تھا جو آج سمجھ آیا تھا آج...... اب کہیں جا کر اور اس انداز میں کہ وہ بھائی جیسا تھا...... بھائی نہیں تھا۔

ورنہ وہی دوپٹا جو اس کے پیروں میں رل گیا تھا اس وقت انوشے کے سر پر آ ٹھہرا ہوتا۔

اس نے پلٹے بغیر دو قدم آگے بڑھائے اور سنک سے بالکل چپک گئی۔

''یہاں سے جاؤ۔'' اس کی سرد آواز میں اتنی قطعیت تھی کہ اگر فرحان کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو ایک بار میں سمجھ جاتا لیکن وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''لیکن مجھے بتاؤ تو سہی......''

''جاؤ......'' اب کی بار اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ در و دیوار تک گونج اٹھے اور دوسری طرف جیسے وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی پلٹا تھا۔ پھر دہلیز پر اس کے قدم آخری بار انوشے نے روکے تھے۔

''جتنی جلدی ہو سکے اپنا کہیں اور ٹھکانا کرلو...... وجہ جاننے کی ضرورت نہ تمہیں ہے نہ مجھے۔''

اور وہ واقعی چلا گیا تھا۔

پہلے کسی دوست کے گھر کرائے پر اس کے بعد پنڈی ٹرانسفر کروا کے۔ یہاں اس نے اپنی امی سے بھی شانزے کے بارے میں وہی بہانہ بنایا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے حسن سے کہا تھا۔

''فرحان کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے۔'' معاملہ تو ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے دل و ذہن پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے زندگی بھر کے لیے آگہی بھی دے گیا۔

''انوش......!'' پشت پر ایک بار پھر آواز گونجی تھی لیکن یہ آواز تو کسی بے حد مہربان شخص کی تھی۔ کسی بہت اپنے، محرم کی۔

''جی......'' اس نے بے ساختہ چہرہ رگڑا تو اندازہ ہوا کہ اس کے آنسو کب بہہ نکلے پتا ہی نہیں چلا۔

''کب سے یہاں کھڑی ہو، کیا ہوا...... رو رہی ہو۔'' اسے پریشان ہونا ہی تھا۔

''نہیں بس وہ...... کوئی بات یاد آ گئی تھی۔'' سوں، سوں کر کے اس نے معصومیت سے آنسو پونچھے۔

''ہم...... م...... م...... ضرور فرحان کی کوئی مسخری یاد آ گئی ہوگی، ہے ناں۔'' اس نے بے حد محبت سے کہتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا اور وہ تردید کر سکی نہ تائید...... ہاں دل میں خود سے ضرور کہا۔

''نہیں...... اللہ کی بنائی ہوئی حد بندی کے فوائد اور اس کی حقیقت یاد آ گئی تھی۔''

وہ خاموشی سے حسن کے بازو کے حصار میں چلتی ہوئی بیڈ روم تک آ ئی تھی۔ لیکن کوئی اس کے دل میں مسلسل گواہی دے رہا تھا۔

''بے شک میرا رب سب سے بہتر جاننے والا ہے اور میرے لیے وہی رشتے بہتر ہیں جو اس نے خود میرے لیے بنا کر دنیا میں بھیجے۔''

اسے سرسری انداز میں حسن کی کہی گئی بات ابھی ابھی یاد آ ئی تھی۔

''منہ بولے رشتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔''

دیارِ صبح کے اجالوں میں

نایاب جیلانی

آخری حصہ

آنے والے دن انتہائی بوجھل، بے جان، روکھے اور سرد تھے۔ کیونکہ اب ہادی اور اسما کے درمیان اختلافات کی ایک نئی فصیل کھڑی ہوگئی تھی۔ جو آپس میں "تکرار" اور "لڑائی" میں لپٹ کر گفتگو ہوا کرتی تھی اس کا انجام بھی ہو چکا تھا۔

اسما، ہادی کو اپنی شکل تک نہیں دکھاتی تھی۔ وہ اسے بہانے، بہانے سے بلا، بلا کر آوازیں دے، دے کر تھک جاتا تھا۔ اس کی پکار پر اسما، پھولن دیوی کو اندر بھیج دیتی تھی۔ خود جانے سے گریز کرتی کہ اس دفعہ ہونے والی اپنی تذلیل کے بعد اسما نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ہادی کے کسی "جھکیے" میں نہیں آئے گی۔

وہ ہادی کے کسی جال میں نہیں پھنسے گی جس میں بلا کر وہ اسے قید کرتا پھر "بے عزت" کر کے رکھ دیتا...... ہر دفعہ اسے آزمانے کے کوشش کرتا۔

اس رات کی بے عزتی اسما سے بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ اس ذلت کی آگ ہمہ وقت گھیرے رکھتی...... وہ اس کی انا پر ہر دفعہ ضرب لگانے والا کون ہوتا ہے۔

اسما نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ ہادی کے قریب تو کیا سامنے بھی نہیں جائے گی گو کہ وہ اس کے سارے کام...... خود کرتی تھی۔ ضروریات کا خیال بھی رکھتی تھی ہر چیز وقت پر تیار بھی کر دیتی۔ تاہم خود اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ یہ اس کا خاموش احتجاج بھی تھا اور بدلہ بھی...... انتقام بھی تھا اور اپنے تئیں وہ بڑی مطمئن تھی...... اب آگ دوسری طرف لگی تھی۔ پہلے وہ اسما کے التفات پر چڑتا تھا، اس پر طنز کرتا تھا، اس کی انا پہ چوٹ مارتا تھا۔ اور اب وہ اب کے التفات کو ترستا تھا۔

ایک ساتھ، ایک کمرے میں رہتے ہوئے شاید ایک دوسرے کو دیکھنے کی، لڑنے کی اور ایک دوسرے پر اپنی، اپنی بھڑاس نکالنے کی عادت ہوگئی تھی۔

اور وہ اسما کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اپنے اور اسما کے درمیان موجود رنجش کی اس سب سے بڑی "وجہ" تک کو فراموش کر چکا تھا۔

وہ "وجہ" جس نے ہادی جیسے تیز طرار کو پورا ایک سال الو بنائے رکھا تھا۔ وہ وجہ جس کو بنیاد بنا کر اس نے اسما کا گھونگھٹ الٹتے ہی اسے دھتکار دیا تھا۔

وہ وجہ جو کئی مہینے تک اسے اسما سے نفرت کرنے، حقیر جاننے اور تذلیل کرنے پر مجبور کرتی رہی تھی۔ جس کے لیے وہ اسما کے حقوق سے نظر چرا کر اس کے ہر حق کو ضبط کیے بیٹھا تھا۔ جس کی خاطر اس نے اپنے والدین اور بہن، بھائیوں کو تکلیف میں بتلا رکھا تھا۔



اس وجہ کا اچانک ہادی کی زندگی سے نکل جانا ایک حیران کن معجزہ تھا۔ ہادی کا اسما کی طرف پلٹ آنا بھی حیران کن معجزہ تھا۔

لیکن اس کے پیچھے کون سی بڑی وجوہات تھیں...... سب کچھ منظرِ عام پہ کیسے آیا تھا؟ ہادی کا دل کیسے پلٹا تھا؟ سب کچھ روزِ روشن کی طرح کیسے عیاں ہوا تھا۔

اس آخری جھڑپ کے بعد کون سی حقیقت آشکار ہوئی تھی؟ جس نے ہادی کو اتنا حیران، متعجب اور مشتعل کردیا تھا۔

وہ اپنے بے وقوف بنائے جانے پر نہیں۔ اتنی بڑی چال چلنے والے دماغ پر غیظ کھا رہا تھا۔

وہ آخری جھڑپ جو اسما اور ہادی کے درمیان ایک نئی خلیج بن کر ابھری تھی...... اس کے بعد کون سی آگہی کے در وا ہوئے تھے جو ہادی کو غصے، آگ اور پچھتاوؤں کی برزخ میں بھڑ بھڑ جلاتے رہے۔

لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی زندگی میں در آنے والی ”بے ترتیبی“ کی ترتیب بدلنے کے لیے خود کو نئے سرے سے تشکیل دے رہا تھا۔

محض اپنے ماں، باپ یا بھائیوں، بہنوں، بھابیوں کے لیے نہیں...... بلکہ خود کے لیے اپنی ذات کے لیے...... اور اس لڑکی کے لیے جو واقعی معصوم، بے قصور اور بے خطا تھی۔ جس کا گناہ صرف اتنا تھا وہ اپنے باپ کی پسند پر سر جھکا کر نئی امنگوں اور چاہتوں کی امید لیے ہادی کی زندگی میں داخل ہوگئی تھی اور ہادی نے اپنی کم ظرفی میں کیا، کیا نہیں کیا تھا؟ کون سا دکھ اسے نہیں دیا تھا؟ کون سا زخم اسے نہیں دیا تھا؟ کس، کس گھاؤ پہ وہ مرہم لگاتا؟ اس نے تو سراپا فگار کردیا تھا اسے جو اپنی سعادت مندی، اطاعت گزاری اور حیا میں بڑی، بڑی حسیناؤں کو پاش، پاش کردینے کی طاقت رکھتی تھی۔

وہ اسما خلیل جو ہادی کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ جسے ہادی نے سراپا خزاں بنا دیا تھا۔ اور اب اس

پُر لازم تھا وہ خزاؤں کی ان تمام رتوں کے رخ موڑ دیتا...... وہ اسما کی زندگی سے ہر ویرانی، بے یقینی اور دکھ کو ختم کر دیتا...... وہ اسما کی زندگی کو مسرتوں، خوشیوں اور چاہتوں سے بھر دیتا۔

لیکن اس کے لیے اسما کا ہادی کے قریب آنا ضروری تھا۔ اسما کا ہادی پر اعتبار کرنا ضروری تھا۔ وہ اعتبار جسے ہادی نے خود اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے، ٹکڑے کر دیا تھا۔ اس اعتبار کو ''بحال'' کرنا ضروری تھا۔ اسما کے دل کو یقین دلانا ضروری تھا اور اپنے برے سلوک کی ہر وجہ کا بیان کرنا ضروری تھا۔ بہت ساری ڈھکی حقیقتوں کو اسما کے سامنے لانا ضروری تھا۔ وہ ساری ''سچائیاں'' جن کو اسما نہیں جانتی تھی۔ اب تک بھی نہیں جانتی تھی اور اپنے تئیں وہ ہادی سے سب کچھ چھپا کر بیٹھی تھی۔ اور اب تو وہ خود بھی ہادی سے ''چھپ'' کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ ہادی سے ناراض تھی۔ اس پر غصہ تھی کیونکہ ہادی نے اس کی قدم، قدم پر توہین کی تھی۔ اب یہ ہادی منحصر تھا کہ وہ کس طرح سے خود اپنی راہوں میں بکھیرے کانٹے چنتا اور اٹھاتا ہے۔

لیکن کانٹے چننے کی شروعات تب ہوتی، اسما کا دل جیتنے کی تب کوششیں شروع ہوتیں جب وہ ہادی کو پورے گھر میں دکھائی دیتی۔

وہ اس کے آنے سے پہلے ہی کونوں میں جا گھستی۔ جب وہ رات ایک بجے تک جمائیاں لیتا نیند میں دُھت ہو جاتا تب وہ دبے قدموں کمرے میں آتی۔ صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی روپوش ہو جاتی۔

پھر اس کا ناشتا بھی میز پر لگا ملتا، کپڑے تیار ہوتے، جوتے پالش ہوتے، رومال، موزے، گھڑی، والٹ اور موبائل تک چارج ملتا۔ لیکن اسے چارج کرنے والی خود نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔ اسی روٹین میں ڈھیروں دن گزر گئے۔ ہادی کی تلملاہٹ اب فکر میں بدل چکی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اسما سیریس قسم کی ناراض ہو چکی ہے۔ وہ اسما کی شروعات سے لے کر اب تک ہر ناراضی کو ختم کر سکتا تھا اگر وہ اسے ایک ''موقع'' دینے کی کوشش کرتی...... وہ اسے سب کچھ بتا دیتا، جس سے وہ خود بھی انجان تھا اور اسما بھی بے خبر تھی...... اسی بے خبری میں ان کے بڑے، بڑے نقصان ہو رہے تھے۔

اور آج اس نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ وہ اسما کو ڈھونڈ نکالے گا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالے گا۔ جو اتنے دنوں سے اندر لاوا جمع ہو رہا تھا، اسے باہر نکالنے کے لیے اسما کا سامنے ہونا بہت ضروری تھا کیونکہ وہ بہترین سامع واقع ہوئی تھی۔ وہ اسے سن سکتی تھی، سمجھ بھی سکتی تھی اور منہ توڑ جواب بھی دے سکتی تھی۔

پھر اس نے اسما کو اپنے سامنے لانے کے لیے ایک جامع پلان تشکیل دیا۔ اس صبح اسے فیکٹری جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ آرام سے بستر میں اینٹھتا رہا پھر کروٹیں بدل، بدل کر تنگ آ چکا تو اٹھ کر فریش ہوا۔

الماری کھولی تو اپنی نئی شرٹ پریس شدہ دکھائی دی۔ اس نے کچھ سوچ کر شرٹ ہینگر سے اتار لی.... پھر اس نے استری پلگ میں لگا کر گرم کی۔ جب استری گرم ہو چکی تو اس نے جگہ، جگہ سے شرٹ کو خوب دھواں نکلنے تک جلایا۔ بعد ازاں کسی اور تخریب کاری کو سوچتا رہا پھر اپنا نسبتاً سستا موبائل واش روم میں بھری بالٹی کے اندر پھینک آیا۔ اس کے بعد ہادی نے اپنے غیر ضروری کاغذات نکال کر انک میں لتھیڑ لیے.... سب کچھ کر کرا کے اب وہ پوری اداکاری کے ساتھ بلند آواز میں چنگھاڑ رہا تھا۔

''دیوی جی......!'' اس کی ہانک کچن تک سنائی دی تھی۔ اسما اور دیوی جی دونوں ہی دہل گئیں۔

''دیوی جی......! ذرا اپنی باجی جی سے فرمائیں، اپنے درشن تو کرائیں۔'' ہادی کا اسپیکر پورے گھر میں گونج رہا تھا۔ اماں اور بابا لاؤنج میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اس پکار پر دونوں کے چہروں پر معنی خیز سا تبسم نمودار ہوا...... اسما انہیں چائے دینے کے لیے آئی تھی۔ ان دونوں کی معنی خیز ہنسی...دیکھ کر وہ بری

طرح سے خجل ہوئی۔

اماں اور بابا اسے شرارتی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ ہادی کی اسما کے ساتھ بڑھتی ہوئی ''بے تکلفیاں'' ان دونوں میاں، بیوی کے تمام خدشات کو اڑانے کے لیے کافی تھیں۔ وہ اسی بات پر مطمئن اور مسرور تھے کہ ہادی گھر آتے ہی اسما کو تلاشنے لگتا ہے اور گھر آنے کے بعد اس کی پہلی پکار میں اسما کا نام سرفہرست ہوتا ہے بابا بہت خوش تھے کہ ہادی کو عقل آگئی ہے۔ اس کے کھوتے دماغ میں گھسا خناس نکل گیا ہے۔

اور اس وقت ہادی کے بھونپو کو آن ہوتا دیکھ کر بابا نے اسما کو کچن میں جانے سے روکا۔

''اسما! اندر جاؤ، وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ دیکھو، ہماری سماعتوں پر رحم کھاؤ، پہلے اس کی بات سنو۔ ورنہ تمہیں بلانے کے چکر میں وہ ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے گا......'' بابا کے شرارتی لہجے پر وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ جس طرح وہ نگاہ بچا کر کچن میں دوبارہ جا رہی تھی۔ بابا کی نظر پڑتے ہی اس کا رخ بدل گیا۔ اب چار و ناچار اسے اپنے کمرے کی طرف جانا پڑا۔ اور پورے ڈیڑھ ماہ بعد پھر سے ہادی کی صورت دیکھ کر اپنے دبے ہوئے غصے کو باہر نکالنا تھا جبکہ وہ اسما کے پیچ و تاب کھانے سے قطع نظر ابھی تک چلا رہا تھا۔

''دیوی جی! سنا نہیں تم نے۔ کیا کان دلدار خان کے اگلدان میں چھوڑ آئی ہو؟ تم پہ سارے کوئٹہ کا قہر نازل ہو...... تم پر چڑیل کی رفتار دن دگنی، رات چوگنی چڑھے...... تمہارے معدے پر قحط پڑے...... اور تمہارے ڈیلوں میں مرچیں گھسیں...... تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں دیوی جی......! جن ہاتھی جیسے ہاتھوں کے ساتھ تم میرے نقصان کرتی ہو...... میری نئی نکور کنواری شرٹ کو جلا دیا؟ میرے اتنے مہنگے موبائل کو پانی میں پھینک دیا۔ میرے اتنے اہم کاغذات پر سیاہی الٹ دی...... تمہارا اکھ نہ روے دیوی جی......! دیوی جی! میں آخری مرتبہ وارننگ دے رہا ہوں۔ اپنی جان کی امان چاہتی ہو تو کچن میں کھڑی اپنی باجی جی کو گت سے پکڑ کر میرے روبرو حاضر کر دو...... ورنہ، میں تمہیں ابلتے پانی میں دھکا دے آؤں گا۔ اپنے بلڈوزر جیسے وجود سے دھکا دو...... اور باجی جی کو میرے قدموں میں گھسیٹ لاؤ...... ورنہ......'' ہادی کا بھونپو بج، بج کر آخری حدوں تک پہنچ چکا تھا جب اسما نے آندھی، طوفان کی طرح دروازہ دھاڑ سے کھولا...... سامنے ہی ہادی کھڑا تھا۔ اپنے انک میں لتھڑے کاغذات ایک ہاتھ میں پکڑ کر، ایک ہاتھ میں نئی نکور جلی ہوئی شرٹ تھی۔ پانی سے بھری بالٹی کارپٹ پر رکھی تھی جسے وہ بطور ثبوت واش روم سے اٹھا کر لایا تھا۔ جس کے اندر اس کا موبائل فون پڑا نوحہ کناں تھا۔

اسما کی آنکھیں پہلے غصے اور پھر حیرت کی شدت سے پھٹ رہی تھیں۔ وہ مارے تحیر کے ارے، ارے کرتی رہ گئی۔ ...... یہ کیا ہوا تھا؟ اور کس نے کیا تھا؟ پھولن دیوی تو اس کمرے میں آتی نہیں تھی۔ اسما نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ ''کیوں چلا رہے ہو؟'' کیونکہ چلانے کی وجہ تسمیہ سامنے موجود تھی۔ اس کا دماغ ہی گھوم گیا۔

''یہ سب کس نے کیا؟'' اسما نے چکراتے ہوئے سر کو بہ مشکل تھاما۔ ''یہ سب کس کی شرارت ہے؟'' ہادی کے لیے اس کا حواس باختہ ہونا ہی کافی تھا۔

''میرے ان بچوں کی جو عالم بالا میں تڑپ رہے ہیں...... دنیا میں آنے کے لیے......'' وہ جل کر غصے میں بولا۔

ہادی کا جواب پہلے تو اسے سمجھ نہیں آیا۔ پھر جب بات پلے پڑی تو اس نے ہادی کو گھور کر دیکھا۔

''کبھی کوئی بات ڈھنگ کی کر لیا کریں...... میں پوچھ رہی ہوں، یہ کس کا کارنامہ ہے؟'' اسما شرٹ کو اس کے ہاتھ سے کھینچ کر جھرجھراتے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس کی حیرت اور تفکر کا کوئی انت نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ شرٹ کو صحیح سلامت الماری میں لٹکا دیکھ چکی تھی۔ تب شرٹ پر ایک داغ نہیں تھا۔ اور اس وقت مکمل جلی

ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اسما کا دماغ کیسے نہ گھومتا۔

''جنوں کا...... بھوتوں کا، چڑیلوں کا۔'' ہادی نے کلس کر کہا۔ ''اب مجھے کیا پتا، کس نے اتنی بے دردی کے ساتھ میری شرٹ پر اپنی جلن نکالی ہے، تم خود سے پوچھو۔''

''میں خود سے؟'' اسما کا مارے حیرت کے منہ کھل گیا تھا۔ ''کیا یہ میں نے کیا ہے؟''

''تو اور کس نے کیا ہے؟'' وہ چمک کر بولا۔

''اس کمرے میں تمہارے علاوہ کون آتا ہے؟ کیا میری دو تین اور بھی بیویاں ہیں؟ جو تم سے نظر بچا کر میرے کمرے میں دندناتی پھرتی ہیں؟ جاتے سے میرے ہاتھوں تمہاری ''گت'' بنوانے کے لیے ڈھیر سارے نقصانات کر جاتی ہیں۔''

اسما اس کی بلاوجہ ہانک پر توجہ دیے بغیر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ کچن میں چولھا جل رہا تھا۔ ناشتا تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ اور صبح صبح ہادی نے یہ الگ سے پنچایت لگا رکھی تھی۔ اسما کے پلے تو کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

''دوسری اور تیسری کے خیالوں میں ہی رہنا۔'' اس کا انداز واضح طور پر کسیلا تھا۔ ''لیکن آپ کو کوئی گھاس ڈالنے والی نہیں اب۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔'' ہادی پھڑک کر رہ گیا۔

''ارے، میں ایک پکار لگاؤں تو گیٹ کے باہر لائنیں کھڑی ہو جائیں گی۔ تم مجھے سمجھتی کیا ہو؟''

''بھکاریوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔'' اسما نے اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ وہ تاؤ کھا کر رہ گیا۔

''میں پوچھتا ہوں، میرے نقصان کون کرتا ہے؟'' موضوع سے ہٹتے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر اسما کو گھسیٹ لایا تھا۔

''مجھے کیا پتا؟ کوئی چڑیل ہو گی...... جسے مجھ سے رقابت کی وجہ سے آپ کو ستانے میں مزہ آتا ہو گا۔ آپ کی زوجہ محترمہ بننے کی خواہش رکھتی ہو گی۔'' اسما نے تپ کر کہا۔

''چڑیل ہی تو ہے۔'' ہادی اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر رہ گیا۔

''کہاں ہے وہ؟'' اسما نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ میرے سامنے کھڑی۔'' ہادی کا انداز بدل گیا۔ کسیلے تاثرات کی جگہ نرمی اتر آئی تھی۔ اسما اس طرز تخاطب پہ بل کھا کر رہ گی۔ پھر اس نے تاک کر اس کے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو دیکھا۔ یہ معاملہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''زبان سنبھال کر بات کیا کریں...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' اسما نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تو ہادی معنی خیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔

''یعنی کہ دھمکی...... بلے اوئے بلے۔'' اس نے سر دھن لیا۔ ''ہاں بتاؤ، ورنہ کیا کرو گی تم؟'' وہ اسے بولنے پر اکسا تا مزے سے کہہ رہا تھا۔ کتنے دنوں بعد اسما آج ہاتھ لگی تھی۔ وہ بھی اس کی بھرپور ذہانت کی وجہ سے...... اسے اپنی ''چال'' پر پیار آ گیا تھا۔ اور اس تکرار بھی...... جو اتنے ڈھیر سے ہفتوں بعد مزہ دوبالا کر گئی تھی۔ وہ اسما کے ساتھ لڑنے کا عادی ہو چکا تھا۔

''ورنہ، آپ کی ''مکارانہ چال'' کو آپ پہ الٹ دوں گی۔'' وہ دانت کچکچا کر بالٹی پہ جھک آئی پھر اس نے موبائل نکال کر ہاتھوں میں لیا...... ہادی اس کے جواب کو سمجھ نہیں پایا۔

''کیا مطلب؟'' وہ لمحہ بھر کے لیے ہونق ہوا...... اسما نے شرٹ کھینچ کر دوبارہ جائزہ لیا...... پھر موبائل دیکھا۔ پھر کاغذات نظر میں رکھے۔ بعد میں اس نے اپنی تیز حسیات سے کمرے میں پھیلی ناگوار بو کو محسوس کیا جو اندر آتے ہوئے بھی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

اس نے نگاہ گھما کر آئرن اسٹینڈ کی طرف دیکھا پھر قدم اس طرف بڑھا دیے۔ ہادی کو اچنبھا ہوا تھا۔ یہ کیا کرنے لگی تھی؟

اسما نے استری پہ ہاتھ رکھا اسے استری گرم محسوس ہوئی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر ہادی کو دیکھا وہ کچھ بوکھلا رہا تھا۔ اسما ایک مرتبہ پھر اس کے قریب آئی تھی۔ اب وہ ہادی کے انک لگے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اناڑی پن سے کاغذات خراب کرنے کے چکر

میں وہ اپنا پول خود کھول چکا تھا۔ اب اس نے بالٹی سے موبائل نکالا۔

موبائل آل ریڈی خراب تھا یعنی ناکارہ ہوا رکھا تھا جسے ہادی نے بالٹی میں گرا دیا تھا۔ محض ڈرا مار چانے کے لیے۔ وہ اس سب کا راز پا چکی تھی۔ اسما اب کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اور وہ نگاہیں چراتا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''شرٹ کو خود بلا کر پہلے سے ناکارہ ہوا موبائل پانی میں ڈبو کر، کاغذات انک سے خراب کر کے الزام ہمارے سر رکھنے کا مطلب اور مقصد پوچھ سکتی ہوں۔''

اسما نے چبا، چبا کر اپنے الفاظ ادا کیے وہ بوکھلاتا ہوا پہلے تو آئیں بائیں کرنے لگا تھا پھر ڈھٹائی سے مسکرا دیا تھا۔

''مقصد تو صاف ظاہر ہے، تمہیں یہاں بلانا۔''

وہ آنکھوں میں شرارت لیے مسکراتا رہا۔ اسما کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیل گئی تھیں۔

ہادی کی خباثت پر اسما مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے پلٹنے ہی لگی، جب ہادی نے ارے، ارے کرتے ہوئے زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ اس جھٹکے کے ساتھ کہ اسما اپنا توازن بحال نہیں رکھ سکی اور اسی جھٹکے کے ساتھ ہادی سے ٹکرا گئی۔ اس کی ناک اس کے کندھے سے لگی تھی۔ اسما کی تکلیف سے بے ساختہ آہ نکل گئی لیکن دوسرے ہی پل اچانک کچھ عجیب ہوگیا تھا۔ ہادی نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار تان لیا۔ یوں کہ اسما اس حصار میں پھڑ پھڑا بھی نہ سکی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چھوڑیں مجھے۔'' اسما نے مارے غصے اور جھنجلاہٹ کے بے ساختہ کہا۔ ہادی کی یہ گستاخی یا شرارت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ احساسِ توہین سے سلگ اٹھی۔ اس نے اسما کو چھونے کی جرأت کیوں کی تھی؟ کیا وہ ایسی گری پڑی تھی؟ جب وہ چاہتا تذلیل کر دیتا، جب چاہتا دھتکار دیتا، جب چاہا ہاتھ بڑھا کر تھام لیتا..... اور وہ اس کے اتنے سے التفات پر اس کے قدموں میں بچھ جاتی۔

ہادی کو شاید یہی بھول تھی لیکن اسما کی انا کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ اپنی بار، بار تذلیل کروانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

''اس کو بدتمیزی نہیں کہتے..... پیار کہتے ہیں۔''

اس نے پیار کا تھوڑا عملی مظاہرہ بھی کیا تو اسما مزید مشتعل ہوگئی۔

''پیار.....؟'' اسے کرنٹ لگا..... یوں محسوس ہوا جیسے ہادی نے اسے کوڑا دے مارا ہو۔ وہ ذلت و توہین کے احساس سے سرخ پڑگئی۔ کیا اس کی اتنی ہی اوقات تھی؟ اپنے برے رویے پہ ایک حرفِ معذرت کے بغیر اپنا حق جتانا۔ وہ ایک بوند معذرت کی حق دار بھی نہیں تھی۔

اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرنے کے بعد اب وہ دوستانہ تاثرات سجا کر کھڑا تھا۔ کیا سالی تعلقات کے لیے؟ اسما کا روم، روم سلگ اٹھا تھا۔

''مجھے آپ کا پیار نہیں چاہیے۔'' اسما نے بہت سوچ سمجھ کر اسے منہ توڑ جواب دیا..... وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ پھر کھل کر مسکرا دیا تھا۔

''کیا واقعی؟'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''یہ تم دل سے کہہ رہی ہو؟'' وہ ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کوئی شک ہے کیا؟'' اسما نے تلخی سے جتلایا تھا..... وہ پھر سے گہری سانس کھینچتا مسکرا دیا۔

''مجھے شک نہیں..... یقین ہے، تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور میری محبت بھی چاہتی ہو۔'' اس نے بڑے یقین بھرے لہجے میں اسما کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''بڑی خوش فہمی ہے؟'' وہ تڑخ کر رہ گئی۔

''کیا ثابت کردوں؟'' ہادی نے ایک مرتبہ پھر مسکرا کر اس کی خفا، خفا آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ غصہ، دکھ، کرب، بے بسی اور لاچاری بھی۔

وہ ہادی پر غصہ کر رہی تھی لیکن بے بس بھی تھی۔ وہ اس پر جتنا چاہے غصہ کر لیتی لیکن اسے چھوڑنے کا ارادہ کرنے کا گمان تک نہیں کر سکتی تھی۔

''کیسے ثابت کریں گے۔'' اسما کا لہجہ غضبناک ہو گیا تھا۔ اسے ہادی کی ڈھٹائی پر غصہ آتا رہا۔

"تمہیں اپنا کر۔" ہادی نے بڑی عجیب بات کہی
اسما کو پہلے اچنبھا ہوا تھا پھر وہ استہزائیہ مسکرادی۔
"اور یہ بڑا آسان ہے ناں......؟" اس کا لہجہ بہت کاٹ دار تھا۔ ہادی اس کے طنز مزے سے سہہ گیا۔
اب اسما کی باری تھی۔ وہ اپنی باری پچھلی نادانیوں میں پوری کر چکا تھا۔ اب اسما کو موقع دے رہا تھا وہ اپنی بھڑاس اور غصہ نکال لیتی۔ ہادی کو جی بھر کے برا بھلا کہہ لیتی۔ اس کے بعد مطلع صاف ہو جاتا لیکن کیا مطلع اتنی آسانی کے ساتھ صاف ہو سکتا تھا؟ کیا سب چیزوں کی ترتیب لوٹ سکتی تھی؟
اسما شدید حیران اور دم بخود تھی۔ ہادی کو کیا ہو رہا تھا؟ بلکہ اتنے دنوں سے ایسا ہی چل رہا تھا۔ وہ جتنا اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ اتنا قریب آنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیا ہادی کی پسند بدل گئی تھی؟ کیا ہادی پچھلی باتوں کو بھلا چکا تھا؟ کیا ہادی اسے اپنانا چاہتا تھا؟
لیکن ایسا کیا ہوا تھا جس نے ہادی کے دل کو بدل دیا۔ کچھ بھی ہو جاتا، اسما کے لیے یہ بدلتی صورتِ حال بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ تب تک کہ جب اسے ہادی کی نیت کا پتا نہ چل جاتا کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ ہادی کا بدلنا، التفات کے پھول نچھاور کرنا اور پیار، پیار کا راگ الاپنا ایک گہری سازش کے سوا کچھ بھی نہیں......وہ اسے پیار کے جھانسے دے کر اپنی زندگی سے نکال کر باہر کرنا چاہتا تھا؟ کیا یہ ٹھیک تھا؟
☆☆☆
ہادی کے دل کا موسم کیا بدلا باہر کا موسم بھی بدل گیا۔ سردیاں اپنے اختتام کی طرف رواں دواں تھیں۔ اب پودوں پر نئی کونپلیں کھلنے کا موسم تھا۔ سبز پتوں کی پازیبیں بجی تھیں اور ننھی، منھی کلیاں شاخوں پر کھلتی تھیں۔
ہادی اس دن جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ طبیعت خاصی خوشگوار تھی۔ اور آج کل تو وہ ویسے بھی بڑا خوش مزاج نظر آتا تھا۔ بہانے، بہانے سے اسما کے اردگرد گھومتا، اسے بلاوجہ کاموں میں الجھا کر تکرار کرتا۔ اسے تنگ کرتا، چڑاتا اور بولنے پر اکساتا......اسما جو اتنے دنوں سے اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کی حرکتوں پر عاجز آ کر پھٹ پڑتی۔ وہ بدو جواب دیتی اور ہادی اپنے مقصد کی کامیابی پر خوشی سے...... بے حال ہو جاتا۔
دراصل اسما کا اسے نظر انداز کرنا اسے اپنی طرف متوجہ کر گیا تھا؟ یا اسما نے اپنے حسنِ عمل سے ہادی کے دل کو اپنی طرف دھیرے، دھیرے کھینچ لیا تھا؟ یا ساتھ رہتے رہتے، ایک کمرے میں اجنبیوں کی طرح سوتے، سوتے وہ ایک دوسرے سے آشنا ہو گئے تھے؟ کچھ نہ کچھ تو ضرور تھا۔
اسما سے کی جانے والی شدید نفرت کا دھیرے، دھیرے انجام ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ نفرت ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اسی دن زمین بوس ہو گئی تھی جب ہادی کو بہت ساری حقیقتوں کا ایک ساتھ علم ہو گیا تھا۔
اس روز وہ سرِشام گھر آ گیا تھا۔ لبوں پر کوئی گیت گنگناتا ہوا۔ اماں، اماں پکارتا ہوا، اماں اس کی پکار پر دہل کر تخت سے اٹھی تھیں۔
"کیا ہوا ہے لڑکے! کیوں دہلا رہے ہو۔" اماں کی گھبراہٹ کا کوئی شمار نہیں تھا۔ ہادی اندر آ کر جوتے اتارتا دھپ سے صوفے پر ڈھے گیا تھا۔
"ہونا کیا ہے، وہ آپ کا باندر داماد آ گیا ہے۔" ہادی نے اپنے ہی انداز میں گلریز کے آنے کی اطلاع دی تھی۔
"ارے کب آیا؟" اماں بے ساختہ خوش ہو گئیں۔
"کل......اور ابھی وہ دونوں یہاں آ رہے ہیں۔" ہادی نے مزید بھی اماں کو خوش کرنا چاہا تھا۔ اماں جیسے نہال ہو گئیں۔
"جگ، جگ آئے......اس کا اپنا گھر ہے۔ کشف اور گلریز دونوں آ رہے ہیں ناں......؟"
"جی آپ کی بیٹی اسے اکیلا آنے دیتی ہے؟" ہادی نے ٹکڑا لگایا تھا۔ اماں نے اسما کو زور سے آواز دے کر کشف کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ ساتھ کھانے پہ اہتمام کرنے کی ہدایت بھی دی تھی۔ اسما بھی

بے ساختہ خوش ہو گئی۔

"اچھا ہے اماں! کچھ رونق تو رہے گی۔"

"کیوں؟ تو میں اتنی بڑی رونق دکھائی نہیں دیتا؟ لوگ تو مجھے جانِ محفل کہتے ہیں۔" ہادی نے اترا کر کہا۔

"مجھے دیکھ کر لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔" اس نے مزید مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا۔

"جوکروں کا اور کام ہی کیا ہے؟" اسما نے اماں سے بچ بچا کر فقرہ الٹ ہی دیا۔ ہادی لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

"ہیں......؟ یہ تم نے جوکر کسے کہا؟ اماں! ہنس رہی ہیں آپ......آپ کی باتمیز بہو مجھے جوکر کا نام دے رہی ہے۔" اس نے فوراً اماں کی ہمدردی چاہی تھی۔ اسما صاف مکر گئی۔

"اب الزام مت لگائیں، پسند تو ویسے نہیں کرتے، اب الزامات لگانا شروع کر دیے آپ نے۔" اس نے طنزیہ انداز میں جتلایا۔ ہادی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا وہ پھر سے فارم میں آ گیا۔

"کون کافر "ناپسند" کرتا ہے؟" ہادی کے لہجے میں کچھ تو تھا جس نے اسما کو چونکا دیا تھا۔

"کیا سب کچھ یاد دلا دوں؟" اسما نے اذیت کی لہر دباتے ہوئے پھر سے طنز کیا۔ ہادی کی صورت اتر گئی۔ چہرے پر مردنی چھا گئی، آنکھیں بجھ سی گئیں۔

"تو اسما پچھلے حوالوں پہ طنز کرنے سے باز نہیں آئے گی، اب بھگتو ہادی۔"

"تم بھلا نہیں سکتیں؟" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ اسما کی آنکھوں میں کانچ سے چبھنے لگے۔

"آپ نے کبھی بھلانے کے لیے کہا تھا؟" وہ لب کاٹتی انتہائی درشتگی سے بولی پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"اگر اب کہہ دوں......اور میں سب کہہ دوں؟ تو کیا تم پچھلا سب کچھ بھلا دو گی؟" ہادی اس کے پیچھے تیزی سے کچن میں آ گیا تھا۔ اماں نے انہیں آگے پیچھے اٹھتے دیکھا تو مسکرا دیں۔ بیٹے کی بہو کے لیے...... بے قراری نے انہیں شاد سا کر دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ شکر تھا، ہادی سنبھل گیا تھا۔ اسما جیسی نیک بیوی کو پا کر اس کے دماغ کا خناس باہر نکل آیا تھا۔ اس کا غصہ جاتا رہا تھا۔ اب تو ہادی کی خوش مزاجی ان میاں، بیوی کو ہر وقت سرشار اور خوش رکھتی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھیں۔ ہادی نے سنبھل کر انہیں سرخرو کر دیا تھا۔

اس وقت اسما جھنجلا کر کچن میں آ گئی تھی۔ اسے ہادی کی تکرار کا پتا تھا۔ جان بوجھ کر بات کو لمبا کر دیتا اور اسما کو کشف اور نگریز کے لیے پُرتکلف کھانا بنانا تھا۔ کیونکہ کشف اس کی شادی کے بعد پہلی بار مرتبہ آ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے کوکنگ کی شروعات کرنا چاہی، ہادی اس کے سر پر بلا کی طرح نازل ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہی نہیں اعصاب پر بھی بری طرح سوار تھا۔ اسما جھنجلا گئی کیونکہ اس کی باتیں وہی تھیں پرانی، گزرا ہوا وقت یاد دلانے والی۔ جو وقت اسما اپنے والد اور بھائی کی عزت اور خوشی کی خاطر زہر کی طرح پی گئی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی کہ اس پر کیا کچھ بیت چکا ہے۔

اور ہادی بات کو گھما پھرا کر اسی تلخ ترین وقت کے گرد حصار کھینچ لیتا تھا۔ وہی باتیں جو اسما کا دل ادھیڑ دیتی تھیں۔ وہی اذیت جو تب اسے لہولہان کیے رکھتی۔ وہی شرمساری جو اسما کو اپنی ہی نظر میں گرائے رکھتی کہ اس کے شوہر نے اسے دھتکار دیا تھا۔ ناپسند کر دیا تھا۔ اور وہ تب بھی اسی گھر میں رہنے پر مجبور تھی کیونکہ اس معاشرے کے مروجہ اصولوں میں بیاہی ہوئی لڑکی کا میکے کی دہلیز پر آنا کئی طرح کی دفعات لگا دیتا تھا۔ اس سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کا جرم بھی معمولی نہیں تھا۔ سو بہت ساری زنجیروں میں جکڑی اسما ضبط اور صبر کرنا تو جانتی تھی لیکن اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں اور ظلم کو بھلانا اتنی آسانی کے ساتھ ممکن نہیں تھا۔ چاہ کر بھی ممکن نہیں تھا۔ بہت کوشش کے بعد بھی ممکن نہیں تھا۔

اور ابھی ہادی پھر انہی زخم ادھیڑ دینے والے دنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دستو اسما! میں اگر اب کہہ دوں؟ اور سب کہہ دوں؟ تو کیا تم مجھ پر یقین کر کے پچھلا سب کچھ بھلا دو گی؟" وہ نراس و آس میں ڈولتا بڑی امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس سے سب کچھ بھلا دینے کی درخواست کر رہا تھا؟ کیا وہ سب کچھ بھول سکتی تھی؟ کیا سب کچھ بھلانا آسان تھا؟

اور اگر سب کچھ بھلا دینا آسان بھی ہوتا تو ایک عورت اپنی نفی ہوتی یا تذلیل و توہین کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی یہ بہت مشکل تھا اور واقعی مشکل تھا۔

اسما کی خاموشی ہادی کے لیے سوہانِ روح تھی۔ اس کے اندر بے چینیوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اتنے صبر والا نہیں تھا جو اس کی چپ کو سمجھ کر واپس پلٹ جاتا۔ اسے جواب چاہیے تھا۔ وہ بھی من پسند، دل پسند جو اس کے اندر موجود اضطراب کو ختم کر دیتا۔ اس کی تکلیف کو کم کر دیتا۔ اس کے بے سکون دل کو شاد کر دیتا جو آگ اور بے قراری کی جلن اسے تڑپا رہی تھی اس پر پھوار ڈال دیتا۔

اگر وہ بدل گیا تھا تو اسما کو بھی بدلنا تھا...... ہر صورت، ہادی کو ایسی ہی دھونس جمانا آتی تھی۔

"اسما! جواب دو، میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔" وہ بے قراری سے اس کے قریب آ گیا تھا۔ پھر اس نے اسما کے ہاتھ سے زبردستی پیاز، لہسن پکڑ کر ٹوکری میں اچھال دیے۔ اسما پہلے تو جھنجلا گئی تھی پھر اس کی سنجیدگی اور اضطراب کو دیکھ کر اسے کہنا پڑا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔ مختصر بتا دیجیے۔" اسے دعوت کا اہتمام کرنے کی جلدی تھی اور وہ ہادی کے ٹل جانے کی منتظر تھی۔ ہادی نے کچھ دیر کے لیے سوچا تھا پھر آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر سب کہہ دیا۔

"میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں۔" وہ ذرا رکا پھر گلا کھنکھار کر بولا۔ "دراصل مجھ سے کال پر "اسما" بن کر گلناز نہیں تمہاری کزن اسمارابات کرتی تھی۔" یہ انکشاف اتنا معمولی نہیں تھا جسے سن کر اسما اپنے پیروں پر کھڑی رہتی یا اپنے حواسوں کو سلامت رکھ پاتی یا اتنے بڑے پہاڑ سے انکشاف کو اپنی ننھی سی ذات پر جھیل پاتی، سب کچھ سن کر بھی لوہے کی طرح مضبوط رہتی، وہ اس انکشاف پہ بھربھری ریت کی طرح ڈھے گئی تھی۔ کچے گھڑے کی طرح ٹوٹ گئی تھی۔ ذرات کی طرح تحلیل ہو گئی تھی۔ وہ پورے قد کے ساتھ "زمیں بوس" ہو گئی تھی۔

یہ ہادی نے کیا کہہ دیا تھا؟ کیسا بھالا اس کے اندر اتار دیا تھا۔ کیسا نیزہ دل میں کھبو دیا تھا۔ کیسے دل کا خون کر دیا تھا؟ اس انکشاف کے بعد اسما کا نروس بریک ڈاؤن ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ اسما، ہادی کے پاس کھڑی تھی کچھ دیر پہلے ان کے درمیان کوئی بات چل رہی تھی۔ پھر اسما کا اچانک بے ہوش ہو کر گر جانا ایک کہرام مچا گیا تھا۔ پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اور ایک قیامت بپا تھی، پھولن دیوی کے بین اور واویلا...... اماں کا بار، بار غش کھانا...... کشف اور گلریز کا پہنچ جانا...... اسما کا ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانا ایسے لگ رہا تھا جیسے لمحوں میں سب کچھ فنا ہو گیا ہے۔

ہادی پہ قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسما ان حالوں میں پہنچ جائے گی اسما یوں خرد سے بیگانہ ہو جائے گی۔ اس کے انکشاف کو وہ سہہ نہ پائے گی۔

اماں ہادی کو کسی طور پر بھی معاف کرنے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کے ذہن میں پختہ خیال تھا۔ ہادی نے کچھ کہا ہے۔ جو اسما اس طرح بے ہوش ہو گئی کہ ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں لوٹی۔

وہ اتنا بے قرار، دیوانہ ہوتا صدمے سے بے حال تھا جب اماں کے کچوکے بھی اسے اور لہولہان کر ڈالتے۔

"ارے، پسند نہیں تھی۔ یوں تو نہ کرتے، اسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑتے، میں ہادی! تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ اسپتال کے ٹھنڈے کاریڈور میں پھپک پھپک کر روتی اسے دھتکار رہی تھیں اور ہادی ماں کے الزام پر تڑپ، تڑپ گیا۔

"کس کافر کو پسند نہیں تھی؟ کون اسے مارنا چاہتا تھا؟" وہ اذیت و درد کو نہ سہتا خود بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ تب گلریز اور کشف اسے سہارا دیتے رہے تھے۔ اور کوئی مانتا یا نہ مانتا...... سمجھتا یا نہ سمجھتا...... یقین کرتا نہ کرتا لیکن ایک بات اٹل حقیقت کی طرح سامنے تھی۔ ہادی کی انتھک کوششوں اور ڈھیروں دعاؤں کی بدولت اسما نے اپنی بینائی کو لوٹتے پایا تھا۔

وہ جو ایک دھند تھی ہادی کی دعاؤں، محبتوں اور چاہتوں کی بدولت چھٹتی جارہی تھی۔

اور اسما اندھیروں میں ڈوبتی ابھرتی، ہادی کے ان انکشافات پر دم بخود ہوتی ابھی تک مہر بہ لب تھی۔ پنڈی سے عاشر اور بابا آئے تھے ساتھ گلناز اور اس کی امی بھی...... اسما کی اچانک بیماری کے لیے ان کا آنا جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جب اسما کئی مرتبہ گلناز کو دھتکار چکی تھی۔ کئی مرتبہ اسے میسجز پہ گالیاں دے چکی تھی۔ اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرچکی تھی۔

دھند کے پار منظر اب بھی غیر شفاف تھے لیکن رشتے اتنے شفاف، صاف اور روشن حقیقت کے مانند کھل کر سامنے آگئے تھے کہ اسے اب بھی یقین نہ آتا۔

ہادی کے بتادینے پر، یقین دلانے پر اور پھر گلناز کا آکر تصدیق کردینا۔ جیسے کوئی جواب ادھورا نہیں رہ گیا تھا۔ ہر جواب مکمل تھا۔ ہر حقیقت سامنے تھی۔ اپنی کریہہ صورت اور بدنما کردار کے ساتھ۔

اس دن اسپتال کے کمرے میں غروبِ آفتاب کی سنہری کرنوں کو الوداع کرتا ہادی مہر بہ لب اسما کے قریب آیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی، دلاسے اور اعتماد بخشنے ڈھیرے ڈھیرے بتارہا تھا۔

"میں نے کہا تھا...... اگر سب کہہ دوں تو پچھلا بھلا دوگی؟ اور تم تب بھی اتنی ہی خاموش تھیں جتنی کہ اب...... میں تمہیں شروعات بتاؤں...... یا انجام بتاؤں۔ وہ ایک حقیقت جو پسِ آئینہ کو آئینہ بنا کر سامنے لے آئی۔ وہ حقیقت جو سارے جھوٹوں کو بے نقاب کر گئی۔ ایک کہانی، عام سی کہانی جو چھوٹی، چھوٹی کالونیوں میں چھوٹے، چھوٹے گھروں میں آنکھ کھولتی، سانس لیتی اور اپنی عمر کے سال و ماہ گزارتی آگے بڑھتی ہے۔ بڑی عام سی، روایتی سی، چھوٹی سی کہانی...... جس میں نہ کچھ عجیب ہوتا ہے نہ کچھ غریب ہوتا ہے لیکن اس میں احساسات، جذبے کبھی غریب یا مفلس نہیں ہوتے، نہ عجیب ہوتے ہیں۔ یہ عمر کے ساتھ، ساتھ نمو پاتے ہیں، بڑھتے ہیں، نشوونما پاتے ہیں، ایک بیج کے مانند کاشت ہوکر ایک فصل کے مانند ابھرتے ہیں۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہوتا ہے وہ فصل کس نیت کے ساتھ ابھری، بڑی ہوئی، پک کر تیار ہوئی...... نیت سے مراد احساس کا نام ہے...... وہ ایک احساس جو اس نے یعنی اسمار اشکیل نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں محسوس کیا۔ وہ احساس کون سا احساس تھا؟" ہادی نے سیاہ جلد والی ڈائری کا پہلا صفحہ کھولا اور اس کی آواز پورے کمرے کی فضا کو بوجھل اور دم بخود کررہی تھی۔

اسما کی سماعتیں ایسے چوکنا تھیں اگر ہوا بھی گزرتا تو اسے آواز آجاتی۔ ہادی اسے اس اسمارا کی زندگی کے ماہ و سال کی کہانی سنا رہا تھا جو اسمارا اس کے ساتھ، اس کے آنگن میں کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔ جس کے بارے میں اسما کا دعویٰ تھا وہ اس کی بہترین دوست ہے۔ اور اسی اسمارا کو اسما جانتی تک نہیں تھی...... کیونکہ جس اسمارا سے ہادی متعارف کروارہا تھا۔ وہ اسمارا تو اسما کی نگاہ سے ہمیشہ اوجھل رہی تھی۔ وہ اسمارا تو کوئی اور تھی جسے اسما آج تک بھی نہ جان پاتی...... اگر...... اگر ہادی ان انکشافات سے پردہ نہ اٹھاتا...... وہ انکشافات جو اسما کو بسترِ مرگ تک لے آئے تھے۔ وہ انکشافات جن کو سن کر وہ اب بھی دھاڑیں مار، مار کر روتی تھی۔ اس کا دل پھٹتا تھا۔ اس کی روح کرلاتی تھی۔ اور وہ سخت اذیت میں مبتلا تھی۔ ہادی نے ڈائری کا صفحہ پلٹا اور اسما کے قریب اس کی آنکھوں کے سامنے لے آیا۔ اس انداز میں کہ وہ ڈائری کو پکڑ کر کھڑا تھا...... اور اسما کی نگاہیں سطر، سطر پر پھسل رہی تھیں۔ اور وہ اسمارا کی لکھائی

کو پہچانتی دم بخود سی لفظوں کی آنکھ مچولی میں کھو گئی۔

جہاں اسمارا اپنے ایک اور ہی وجود کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے دل پر شب خون مارتی ہوئی۔

"وہ گلابی جاڑے کے دن تھے۔ اتنے خوشگوار بھی نہیں، مجھے جاڑا پسند نہیں تھا۔ ہر طرف سیلاہٹ اور گیلاہٹ بکھر جاتی تھی۔ دیواروں اور فرش سے سوندھی سوندھی باس آتی تھی جو طبیعت کو بوجھل کر دیتی، بیزار کر دیتی تھی اور مجھ پر تو جو بوجھل پن ازل سے سوار تھا۔ ہر وقت کا ایک نادیدہ بوجھ، جو کسی کو بتاتی یا نہ بتاتی...... ظاہر کرتی یا نہ کرتی میرے اندر دور تک جڑیں پھیلائے موجزن تھا۔ جو مجھے عجیب سے احساسِ کمتری میں مبتلا رکھتا...... مجھے رنجیدہ رکھتا، میں اسمارا شکیل...... اپنے ماں، باپ کی اکلوتی، لاڈلی اور ایک لمبے عرصے تک ہر چیز پر اپنا ہی حق اور اجارہ داری سمجھنے والی...... اس وقت اس شکنجے میں کیسے بوجھل پن کا شکار ہوئی تھی۔ جب مجھے پتا چلا...... ہاں، جب مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا، میں خلیل پھپا کے گھر میں، ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی مغرور شہزادی تھی۔ کسی اور کے در پر پڑی...... یہ انکشاف کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ جس نے مجھ سے میری ذات کا فخر چھین لیا۔ مجھ سے میری پہچان چھان کاٹ کے دور پھنکوا دی۔ مجھے میری نظر میں ذلیل کر دیا۔ میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی، میں تن کر چلنے کے قابل نہیں رہی...... اور یہ پہلا انکشاف میری روح پہ اتارنے والی کوئی اور نہیں ہماری پڑوسن گلناز تھی۔ وہی گلناز، عاشر کی دیوانی...... اس سے میرے کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے۔ میری امی کو بھی وہ پسند نہیں تھی۔ یوں میری نظر میں بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن اس گھر میں گلناز کو بہت پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ کیونکہ گلناز اور اسما کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ گلناز جو میرے "رقیبوں" میں کبھی شمار ہوتی تھی۔ اسما کی دیرینہ سہیلی تھی اور اس سے جب بھی میری منہ ماری ہوتی وہ مجھے طعنہ دیے بغیر نہ رہتی۔

"زبان سنبھال کر بولا کرو، جو خود کسی کے محتاج ہوں، وہ اتنا اکڑتے نہیں...... یہ اسما کا حوصلہ ہے جو تمہیں برداشت کرتی ہے۔ میں ہوتی تو تمہیں ایک منٹ میں اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔ تم ناقابلِ برداشت قسم کی ہستی ہو۔" گلناز کے یہ الفاظ میرے لیے تیزاب سے کم نہیں ہوتے تھے۔ وہ مجھے نہیں...... در پردہ میرے باپ کو بھی محتاجی کے طعنے دیتی تھی۔ ہم تین لوگ خلیل پھپا کے اعصاب پر ایک بوجھ کی طرح سوار تھے۔ میرے ابو ناکارہ انسان تھے۔ اپاہج، ہلنے جلنے والے بھی نہیں تھے۔ اور خلیل پھپا تب سے ہمیں ترس کھا کر اپنے گھر لے آئے تھے۔ جب سے ماموؤں نے بھی ہمیں دھتکار دیا تھا۔ ہمیں اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔

کون کرتا تین جانوں پر خرچ...... ابو کی بیماری، امی کی تلخ زبان...... اور میرے نخرے بھلا ماموؤں کو ہمیں گھر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے نخرے برداشت کرنا ان کی بیویوں کے حوصلوں سے اوپر کا کام تھا سو ہمیں یہاں آنا پڑا۔ ہم تب سے خلیل پھپا کے گھر میں اپنے پورے راج پاٹ کے ساتھ رہتے آرہے تھے اور میرے نخرے اٹھانے والے یہاں پر تین لوگ اور بھی موجود تھے۔ وہ تین لوگ جو مجھے...... بے دریغ چاہتے تھے جن کی محبت کو میں اپنا حق سمجھتی تھی، میری امی اور ابو کے بعد...... خلیل پھپا، عاشر اور اسما...... مجھے میری ہی ذات میں منفرد بنانے والے...... یہ لوگ میرے زرخرید غلام تو نہیں تھے مگر غلاموں سے بڑھ کر میری قدر اور خدمت میں پیش، پیش رہتے۔

عاشر کی میں بچپن سے منگیتر تھی اور عاشر مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ ہاں، تب میرے دل میں بھی عاشر کا خیال بسیرا کرنے لگا۔ عاشر اچھا تھا، گڈ لکنگ، پڑھا کو اور نوکری والا...... سب سے بڑھ کر مجھے چاہنے والا...... پھر اس گھر پر میری حکومت رہنا تھی عمر بھر...... امی مجھے یہی احساس دلاتی تھیں کہ میں عاشر کو اپنے حسن کے حربوں سے قابو کرتی رہوں، اسے کہیں

اور جانے مت دوں...... کہیں اور سے مراد......؟ کسی اور سے مراد؟ یقیناً ہمارے پڑوس میں......وہی میری ازلی رقیب گلناز، جو نہ جانے کب سے عاشر کی چاہ میں پاگل ہو رہی تھی۔ اور عاشر اسے منہ تک نہیں لگاتا تھا۔ اسے دیکھتا تک نہیں تھا، عاشر کہیں اور کیسے دیکھ پاتا؟ مجھ سے اس کی نگاہیں ہٹتی تو تب ناں؟ وہ میرے حصار سے نکلتا تو تب ناں؟ اسے گلناز کی بے کھوٹ محبت نظر آتی، گلناز کی چاہت دکھائی دیتی۔ اور اسما سے میری کوئی رقابت نہیں تھی۔ کوئی عداوت نہیں تھی، وہ کم گو سی کزن تھی، فرمانبردار نند تھی۔ خدمت گزاری میں اس جیسا کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اسما نہ کبھی بری لگی نہ اچھی......بس بیچ کا معاملہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا۔ کاش آگے بھی ایسا ہوتا مگر یہاں پہ میری سیدھی سادی زندگی میں بڑا مشکل موڑ آ گیا تھا۔ لکھوں تو کیسے لکھوں؟ سمجھ نہیں پاتی؟ میری ایک غلطی، میری ایک ضد، میری ایک نادانی، میری ایک کم عقلی......مگر دل کا بوجھ ہٹانا تو ہے......الٹنا تو ہے۔ پھر اس ڈائری پہ کیوں نہیں؟ تم تک کیوں نہیں؟ تاکہ تم مجھے معاف کر سکو......گلناز اور میرے درمیان ہمیشہ فاصلہ رہا۔ نہ وہ مجھے پسند کرتی تھی نہ میں اسے۔ وہ مجھے اس لیے نہیں پسند کرتی تھی کہ میں عاشر کی منگیتر اور محبوبہ تھی۔ وہ مجھے بغیر کسی وجہ کے ناپسند تھی۔ میں اور امی اس کو تپانے اور ستانے کی خاطر پوری کالونی میں اس کے خلاف بے پر کی اڑا کر اسے ٹارچر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ، ساتھ میں اسما کو بھی لپیٹے۔ لمبے خط، فون اور میسج لکھ کر گلناز کے خلاف کرتی۔ کیونکہ میں چاہتی تھی گلناز کا اس گھر میں آنا جانا ختم ہو جائے۔ مجھے لگتا تھا، گلناز میری راہ کا کانٹا ہے۔ مجھے جب بھی نقصان پہنچا......تو وہی پہنچائے گی، شروع سے میرے دل کو یہی دھڑکا تھا۔ گلناز ہی میرے رقیبوں میں سرِفہرست تھی۔ اسما کو میں کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھی۔ پھر اسما سے کسی کو گلہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بھی نہیں......کیونکہ اسما ایک بے ضرر کردار تھی۔ وہ کسی کو برا کہتی تھی نہ سمجھتی تھی۔ نہ اسے میرے ذہن کی بدلتی کیفیات کی خبر تھی، نہ وہ ٹوہ میں رہتی تھی لیکن اس بے ضرر کردار کے ساتھ میری اچانک ٹھن گئی تھی۔ اسما میری رقیب کیسے بن گئی؟ اسما کو میں نے اپنا دشمن کب سمجھا؟ وہ مجھ سے دور کیسے ہوئی؟ ہماری دوستی میں دراڑ کیسے آئی، ہم ایک دوسرے سے کیسے الگ ہو گئیں، وجہ کوئی اتنی معمولی نہیں تھی جسے آرام سے بیان کر دوں؟ بڑا مشکل مرحلہ تھا یہ سب لکھنا اور پڑھنا......اور کہنا، سننا میں تو خود حیران تھی میرے ساتھ کیا ہوا؟ ایک عام سے بندے کی تصویر نے مجھ پر کیسا جادو کر دیا......؟ میں خود سے اور اردگرد سے بیگانہ ہو گئی......میں اپنے آپ میں نہ رہی......اور میں کسی کے لیے بھی نہیں رہی......میں خود غرض بن گئی، لکھوں تو کیسے لکھوں؟ کہوں تو کیسے کہوں؟ اپنی خود غرضی کا قصہ؟ اپنی مادیت پرستی اور ہوس کا بیان؟ کیسے سب کہوں؟ میری بیچاری سی بے ضرر، کم گو کزن اپنی پڑھائیوں میں لگی رہی اور میں اس کا منگیتر لے اڑی......ارے، اڑی کہاں؟ بس وہیں تک رہی......اسی چار دیواری تک؟ اسی گھر میں جو ہادی کو دیکھ لینے کے بعد کسی جیل سے کم نہ لگتی تھی۔ یہ گھر جو بھی عاشر کے حوالے سے پیارا تھا اب کوئی قبرستان سا دکھتا......ایک کھنڈر سا، ویران، بے رنگ، بے رونق......انتہائی برا، بوسیدہ، کم از کم ہادی کے گھر جیسا تو نہیں تھا، تب مجھے اس گھر سے بیزاری ہو گئی تھی، وہ دن بڑا خوشگوار طلوع ہوا تھا......اس دن کی خوب صورتی کے بارے میں کیا لکھوں؟ شاید الفاظ کم پڑ جائیں، مجھے اس دن سے پیارا کوئی دن آج تک نہیں لگا۔ وہ دن سنہری حرفوں سے لکھنے والا دن تھا۔ بڑا گلابی، گلابی سا......اس دن میں نے ہادی کو روبرو دیکھا تھا۔ اتنا قریب کہ مجھے گمان نہیں ہوتا، یقین تو دور کی بات تھی میں خود میں نہ رہی......اور ہادی بھی مجھے دیکھ کر دم بخود رہ گیا......میرا حسن کوئی ایسا تو نہیں تھا کہ جو کسی کو ایک نگاہ میں جکڑ لینے کی صلاحیت نہ رکھتا؟ تب ہادی بھی میری ایک نظر کا اسیر ہو گیا......مجھے تب ہی

اندازہ ہوگیا تھا، ہادی کا دل مجھ پر آگیا۔ ایک حیران کن معاملہ اس دن پیش آیا تھا۔ جب ہادی ہمارے گھر آیا، تب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ عاشر، پھپا، امی، ابو وہ دروازے سے آگے نہ بڑھا، میرے اصرار پر بھی، جب اسے پتا چلا کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں...... وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ بہت جلدی میں تھا، ٹھہرا نہیں، گیٹ سے آگے بڑھا ہی نہیں۔ اس کا محتاط رویہ میرا دل لوٹ کر لے گیا۔ اور میرے حسن کی صوفشانی نے ہادی کا چین چرالیا۔ مجھے اس کی گفتار، انداز اور حاضر جوابی اپنے سحر میں جکڑ گئی پھر اس دن والا اس کا محتاط رویہ؟ لیکن جاتے سمے اس نے جو الفاظ کہے وہ میرا چین اڑا لے گئے تھے، ہادی نے کہا۔

”اسما میں نے آپ کو ویسا ہی پایا۔ جیسا منگنی کی تصویروں میں دیکھا...... جیسا بابا نے بتایا۔ آپ بہت حسین ہو...... اور میں خوش نصیب......“ ہادی کے یہ الفاظ مجھے کبھی بھولے نہیں...... وہ مجھے اسما سمجھ رہا تھا۔ اور اس نے مجھے اسما ہی سمجھا...... منگنی کی تصویروں میں ہر طرف میں ہی چھا رہی تھی۔ پھر اصل اسما کہاں سے نظر آتی؟ ہادی مجھ پر فدا ہوا اور میں ہادی پہ...... بعد کے مرحلے اتنے آسان تھے کہ یقین ہی نہیں آتا...... ہادی میرے اتنے قریب آتا گیا لیکن یہ کیسے ہوا؟ عاشر کے موبائل سے ہادی کا نمبر چرا کر اسے پہلی کال کرنے سے لے کر اچانک اسما کی شادی طے پا جانے تک میں ایک خواب کے سفر میں اڑتی رہی، اڑتی رہی، یہاں تک کہ میری پتنگ کی ڈورا اچانک کٹ گئی۔ میں زمیں بوس ہوگئی۔ کیا میرے تصور میں تھا کہ ہادی اور اسما کی شادی ہی طے پا جائے گی؟ میں تو کچھ اور سمجھ رہی تھی۔ اور ہوتا کچھ اور جا رہا تھا۔ اور سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا؟ یہ مجھے تب سمجھ نہیں آتی تھی اب آ رہی تھی۔

جب مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ عبدل انکل دراصل ہادی کے لیے میرا پروپوزل لائے تھے اور پھپا نے عاشر کا نام بیچ میں لے کر عبدل انکل کو مایوس کر دیا تھا۔ پھر اپنی اسما کا ٹکٹ لگوا لیا...... تب سے ہی ہاں، تب سے ہی مجھے اس گھر نے عاشر سے اور اسما سے نفرت ہوگئی تھی۔

مجھے لگتا تھا، پھپا، عاشر اور اسما ہی میری خوشیوں کے قاتل ہیں، اگر عاشر اور میری بچپن کی بات طے نہ ہوتی تو آج میرا ہادی کے ساتھ رشتہ جڑ جاتا۔ اگر عاشر بیچ میں نہ آتا تو مجھے میری محبت ہمیشہ کے لیے مل جاتی۔ ہادی مجھے مل جاتا۔ پھر اس کا پروپوزل تو میرے لیے آیا تھا، اسما بیچ میں کیوں آگئی، میرے ساتھ کتنا برا ہوا تھا۔ کتنا عظیم دھوکا ہوا تھا۔ کتنا ظلم ہوا تھا۔ وہ کم روسی اسما ہادی کے گھر عیش کرتی اور میں اس پانچ مرلے کے مکان میں زندگی کو زنگ آلود کر دیتی...... یہ مجھے کہاں گوارا تھا۔ کیسے گوارا تھا؟ کس طرح گوارا تھا۔ پھر اس صورت میں کہ ہادی کو بھی مجھ سے محبت تھی۔ میرا ہر وقت کا اس سے رابطہ تھا حتیٰ کہ اس کی بہن، بھابی تک...... میں نے انہیں اپنی ایک، ایک فوٹو بھجوائی تھی۔ وہ لوگ غلط فہمی کا شکار تھے۔ اور مجھے ہی اسما سمجھتے رہے، میں نے بھی انہیں اصل حقیقت نہیں بتائی تھی۔ میں کیوں انہیں اصل سچ بتاتی؟ اب سوچتی ہوں اگر تب انہیں بتا دیتی تو حالات مختلف ہوتے...... شادی کی تاریخ تک میں کسی بھی فیصلے تک پہنچ نہ سکی۔ ہادی سے اچانک رابطہ ختم ہوگیا، ان دنوں میں آدھی پاگل ہو چکی تھی۔ پوری، پوری رات ہادی کا نمبر ٹرائی کرتی تھی، سیکڑوں کے حساب سے میسج کرتی، روتی رہتی، یہاں تک کہ خلیل پھپا کی مکاری، چالاکی سب کچھ جھوٹ، سچ بتا دیتا، کیسے پھپا نے میری جھوٹی منگنی عاشر سے ظاہر کر کے میرے ماں، باپ اور عبدل انکل کو دھوکا دیا تھا۔ میں نے اپنے دل کا سارا غبار میسج کے ذریعے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد میں مطمئن ہوگئی، اتنا تو میں جان گئی تھی۔ میرا کوئی بھی واویلا یا غلط قدم اسما کی شادی رکو نہیں سکتا، اسی صدمے نے مجھے بیمار کر دیا...... اور میں اسما کی رخصتی تک بیمار ہو کے منظر سے غائب رہی۔

اسما کی شادی کے بعد کچھ عرصہ میں نے خود پر صدمہ سوار رکھا پھر اچانک فیشن ڈیزائننگ کی کلاسز کے دوران میرا یہ صدمہ ختم ہوتا ہوتا آخر اپنے انجام کو پہنچ گیا

تھا تب مجھے حیرت ہوتی کہ زندگی اتنی محدود نہیں تھی محض ایک عاشر اور ہادی تک، ہادی سے مجھے جو کشش نما محبت ہوئی تھی وہ خود بخود دم توڑ گئی۔ کیونکہ اکیڈمی جانے کے دوران مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے ہادی سے محبت نہیں تھی۔ اگر یاد کروں...... یا بہت سوچوں تو ایک مرتبہ اسما کے چند الفاظ نے مجھے عجیب سی ضد دلا دی تھی...... اسے اعتماد تھا کہ اس کا منگیتر عام لوگوں کی طرح نہیں...... نہ وہ آج کل کے لڑکوں کی طرح فون ٹائپ چیزوں کو پسند کرتا ہے...... میں نے سوچا، ہادی کو اسی بہانے آزما لیتے ہیں، اسی آزمانے کے چکر میں مجھے ہادی سے محبت ہو گئی تھی جو اچانک زعیم علوی کو دیکھ کر ختم بھی ہو گئی۔

میں ایک لمبے سوگ میں پڑے رہنے کو بھول کر زعیم علوی کی شخصیت میں ڈوب گئی۔ وہ فیشن کی دنیا کا بادشاہ تھا۔ دبئی میں رہتا تھا اور کسی ایگزیبشن کے لیے پاکستان آیا تھا۔ وہ میرے حسن کا اسیر ہوا اور میں اس کی دولت اور پرسنالٹی کی...... یوں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ جس میں کسی عاشر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور ہادی تو اس میں تھا ہی نہیں۔ وہ تو ہوا کا جھونکا تھا اور چلا گیا۔ میں زعیم علوی میں مگن تھی جب عاشر کو میرے افیئر کی بھنک پڑ گئی لیکن یہ افیئر اب والا نہیں تھا۔ جی ہاں، وہ پہلے والا...... یعنی ہادی کے ساتھ میری دل لگی اور ٹائم پاسنگ یا پھر اس کی آزمائش کا وہ پیریڈ...... عاشر کا یہ شک، یقین میں تب بدلا جب اس نے میرے موبائل میں ہادی کا نمبر دیکھ لیا اور کچھ میسج وغیرہ بھی...... تب عاشر سخت ہراساں...... پریشان اور مشتعل تھا۔ پھر وہ کوئٹہ چلا گیا۔ اور میں دبئی...... میری بلا سے، وہ ہادی سے باز پرس کرتا یا اسما کو سب کچھ بتاتا، میں نے تو صاف مکر جانا تھا۔ اور گلناز کا نام لے دینا تھا۔ ویسے بھی مجھے ان سب کی اب پروا نہیں تھی اگر حقیقت کھل بھی جاتی سب کچھ عیاں بھی ہو جاتا، میرا خیال تھا امی کو زعیم پسند تھا سو میرے لیے اگلے مرحلے مشکل نہیں تھے۔ مگر جب میں نے شادی کے بارے میں امی، ابو سے ذکر کیا تو وہ دونوں ہی ہتھے سے اکھڑ گئے...... امی بھی زعیم کو میرے شوہر کے حوالے سے پسند نہیں کرتی تھیں۔ انہیں بھی وہ معمولی تنخواہ دار عاشر پسند تھا...... جو عمر بھر مجھے ترسا، ترسا کے مارتا...... اور میں سسک، سسک کر اسی گھر میں اپنی زندگی کو ختم کر لیتی، آخر کیوں؟ مجھ سے یہاں پر ایک غلطی ہوئی، کورٹ میرج سے پہلے اپنی امی، ابو کو منا لیتی اور ہادی سے ایک میسج پہ معافی مانگ لیتی، بات ختم...... لیکن بات ختم کہاں تھی؟ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ ہادی اور اسما کے درمیان تعلقات ابھی تک خراب ہوں گے۔ میں سمجھی تھی اسما کا حسنِ عمل ہادی کو مجھے بھلانے میں تاثیر کا کام کرے گا۔ لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ جب عاشر کوئٹہ سے آگ بگولا واپس آیا یعنی اس کے شک کی کچھ نہ کچھ تصدیق ہو گئی تھی۔ اسما کی زندگی کا کوئی ''خلا'' دیکھ کر۔

''بظاہر وہاں پہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا اندرونی طور پر بھی کچھ ٹھیک ہے، تمہاری وجہ سے میری بہن کا گھر برباد ہوا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' عاشر کے دھمکانے نے مجھے حقیقتاً بہت پریشان کر دیا تھا۔ میں تو ہادی اور ہادی کا قصہ بھول چکی تھی۔ وہ ٹائم پاسنگ، وقتی کشش اور آزمائشی پریڈ پلان مجھے اب تو ہادی یاد تک نہیں تھا۔ پھر مجھے حیرت تھی۔ ہادی، اسما جیسی لڑکی کو پا کر بھی میرے خیالوں میں تھا؟ کتنا احمق تھا اور یہ سب قصۂ پارینہ بن چکے تھے لیکن مجھے لگ رہا تھا میرے ساتھ کچھ اچھا ہونے والا نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں...... سو میں نے زعیم سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے کورٹ میرج کر لی...... امی، ابو کچھ عرصہ تک ناراض رہے پھر انہیں ماننا ہی پڑا...... کہ نہ مان کر وہ کہاں جاتے؟ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ میری محبت میں مجبور تھے۔ میرا یہ قدم عاشر کے لیے ایک دھچکے سے کم نہیں تھا۔ لیکن میرے اندازوں کو یہاں پر منہ کی کھانی پڑی۔ میں جو سوچ رہی تھی کہ عاشر میرے غم میں دیوانہ ہو کر گلی، گلی صدائیں لگائے گا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ میری کورٹ میرج کو سن کر بھی بڑا پُرسکون تھا۔ اور ایک دن مجھے اس کے پُرسکون ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وہ

کیوں اتنا چین سے تھا؟ اس نے مجھ سے باز پرس کیوں نہیں کی تھی؟ ایک مرتبہ بھی میرے سامنے جھکا نہیں۔ اس نے اپنے بابا یعنی خلیل پھپا سے کہا...... ہاں تب ہی کہا تھا۔ جوامی کی زبانی مجھ تک بھی پہنچ گیا۔

"اسمارا اس قابل تھی ہی نہیں کہ میری بیوی بنتی...... جس نے رشتوں کی پاکیزگی کا بھی خیال نہیں رکھا...... میری بہن کے گھر اور بر پہ نظر لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے ایسی مادیت پرست لڑکی سے کوئی سروکار نہیں۔ جسے دولت کی ہوس ایک ہوس پرست انسان تک کھینچ کے لے گئی۔ جو آوارہ اور کردار میں زیرو ہے۔"

اس کے یہ الفاظ میرے منہ پر طمانچہ تھے۔ عاشر نے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ لیکن تب میں عاشر کو للکار اور دھتکار آئی تھی۔ ایک حرفِ معذرت کے بجائے الٹا اسے ذلیل کرتی رہی...... طعنوں اور طنز کے تیروں ساتھ، میں نے اسے غریب، ناکارہ اور کنویں کا مینڈک تک کہا تھا۔ لیکن ضمیر کی خلش نے مجھے بہت جلد احساس دلا دیا۔ میں جو کھو آئی تھی، وہی میرا قیمتی اثاثہ تھا۔ وہی میرا سرمایہ تھا۔ تب تک میرے ہاتھ سے کشتی کے چپوار گر چکے تھے اور میں طوفانی موجوں کی زد میں ڈوبتی اور ابھرتی رہی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا...... ہاں، اسما، گلناز اور پیارے عاشر...... (اچانک تحریر بے ربط ہو گئی تھی) تم نے ٹھیک کہا، میں تمہارے قابل نہیں تھی۔ تمہارے قابل تو گلناز تھی، وہی جو تمہارے لیے خالص تھی، صرف تمہارے لیے۔ مجھے میرے ہر برے عمل کی سزا مل گئی...... زعیم علوی کی صورت میں۔ جو عاشر کے اندازوں سے بڑھ کر ذلیل، گھٹیا اور...... کیونکہ اسے نگر نگر گھومنے کا سواد ہے۔ میرے تغض، کینے اور مادیت پرستی نے مجھے نہ ختم ہونے والی سزا میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ آزمائش کبھی ختم نہیں ہو گئی۔"

یوں لگ رہا تھا لفظ، لفظ رو رہے ہیں، بین کر رہے ہیں اور اپنی کم فہمی پہ نوحہ کناں ہیں۔ ڈائری کا آخری صفحہ آنسوؤں سے گیلا تھا اور اسما بغیر کسی کے بتائے بھی جانتی تھی کہ یہ آنسو کے قطرے کس کی آنکھوں سے گرے تھے؟ کون تھا جو اب بھی پچھتاوؤں میں گھر کر آنسو بہاتا تھا، کون تھا آخر؟ ہادی نے اس کے سامنے سے ڈائری اٹھالی تھی۔ اب وہ اس کا صفحہ، صفحہ پھاڑ رہا تھا۔ پھر اس نے اسپتال کے کمرے کی کھڑکی کھول کر تمام کاغذ کے پرزے ہوا میں اچھال دیے تھے۔ اب وہ دھیرے، دھیرے چلتا ہوا اسما کے قریب آرکا تھا۔ پھر وہ اسما کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ اسما کے گالوں پر بکھرے آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے اور وہ تڑپ، تڑپ کر روتی بے خیالی میں ہادی کے کندھے سے آلگی۔ یہ ایک بے اختیارانہ عمل تھا۔ ہادی نے اسے جی بھر کے رونے دیا...... رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے...... اور اندر جمی کائی اور کثافت باہر نکلتی ہے۔ وہ اپنی بھڑاس نہیں نکال رہی تھی۔ وہ اپنے سارے دکھ، ساری تکلیفوں، بدگمانیوں اور آنسوؤں کو اندر سے کھرچ، کھرچ کر اکھاڑ رہی تھی۔ اسے یہ سب کرنا ہی تھا۔ کیونکہ بدگمانی کے پردے کھسک چکے تھے۔ اس کے لیے اسمارا کا ایک، ایک عمل دم بخود کرنے والا تھا۔

کیا یہ اس کی وہی کزن تھی جسے ان سب نے اپنی آنکھوں کا تارہ بنا رکھا تھا؟ اور اسمارا نے ان سب کے ساتھ کیا، کیا؟ اس نے ان سب کے دلوں پر کیسا شب خون مارا تھا؟ مگر اس سب میں خود اسمارا نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ لیعنی اپنی کج فہمی کے چکر میں اس نے محض کھویا ہی کھویا تھا...... پایا تو کچھ بھی نہیں...... وہ جزا سزا کے بعد ہی ان تک اپنے معافی میں لپٹے الفاظ لے کر پہنچی تھی جو تقدیر کی ٹھوکر سے سنبھل کر آئے اسے معاف کر دینا چاہیے؟ اسمارا معافی میں لپٹے الفاظ لے کر پہنچی تھی۔

....

اسمارا معافی کی حق دار تھی؟ اگر یہ لوگ معاف کر بھی دیتے تو اس کے پچھتاوے کم ہو سکتے تھے؟ اور اسما بہت سارو چکنے کے بعد اپنے ہلکے ہوتے دل پر ایک تازہ احساس ابھرتا محسوس کر رہی تھی۔ یہی احساس ہادی کے دل کو بھی

تازگی سے لبالب بھر رہا تھا۔ ان دونوں کی دھڑکنوں کے تال ملے تو ایک ساتھ دونوں کے لبوں پر روشن مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اسما کو سنبھل جانے کی مہلت دینے کے بعد اپنی روداد سنانی چاہی...... ابھی اس کے دل پر بھی بوجھ دھرا تھا۔ اس کے لہجے میں بہتے پانیوں کی سی روانی تھی۔ اور وہ اپنا حالِ دل سنانے کو بے تاب تھا کیونکہ صبر اس میں تھا ہی نہیں۔

”اور تمہیں میں یہ سب میں تب ہی بتا دیتا...... جب مجھے پتا چل گیا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا تم پر حقیقت آشکار ہو...... تمہیں تکلیف ہو جبکہ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جب تم تک پوری حقیقت پہنچے تب تک ہم دونوں کے درمیان موجود خلیج کا خاتمہ ہو جائے، میں تم پر اپنا اعتبار بحال کرنے کے بعد یہ سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مگر عاشر کا اصرار بڑھتا رہا، وہ چاہتا تھا تمہیں سب کچھ بتادوں جو ہم دونوں کے لیے باعثِ تکلیف اور حیران کُن تھا۔ جانتی ہو اسما! تمہیں دیکھ کر شادی کی پہلی رات مجھے حقیقتاً شاک لگا تھا۔ میں ایک عام سا انسان ہوں، جذبات رکھتا ہوں اور غلطیاں بھی کرتا ہوں، میں اپنے تاثرات، رویّے اور اعصاب پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ یہ ایک بشری تقاضا تھا، میں نے جس کی توقع کر رکھی تھی یا جس اسما کو سوچ رکھا تھا جسے دیکھ رکھا تھا، جس سے باتیں کی تھیں، وہ تم نہیں تھیں، میرے لیے یہ دوسرا دھچکا تھا۔ ایک عظیم جھٹکا، ایک پُر اذیت مرحلہ...... تم میری اس وقت کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتیں، میں تب پاگل ہو رہا تھا۔ پہلے صدمے سے کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ پھر غم و غصے اور اشتعال سے پھر حقارت و نفرت کا سلسلہ چلا۔ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا، تمہیں بہت کچوکے لگائے، تمہیں ذہنی اذیت دی، اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن تب سچویشن ہی کچھ ایسی تھی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا، میرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ مجھے ہر کوئی دھوکے باز لگتا، میں اپنے والدین سے بھی ناراض ہو گیا، اپنے بہن، بھائیوں سے بھی......اور تم تو میرے غصے کی ہاٹ لسٹ پہ

اس یادگار عید کا واقعہ

بہت پہلے کی بات ہے میں کوئٹہ بلوچستان ہاسٹل میں رہتی تھی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ یعنی اسٹوڈنٹ تھی۔ تمام اسٹوڈنٹ کو عید سے دو دن پہلے چھٹی دی کیونکہ سب کو ہی معلوم تھا کہ عید دو دن بعد ہوگی۔ خیر کلاس میں حاضری دینے کے بعد تمام اسٹوڈنٹ اپنا ضروری سامان لے کر اسٹیشن پہنچیں اور کوئٹہ ایکسپریس پر سوار ہوئیں اور سفر کا آغاز خوشی خوشی شروع کیا۔ عید کی خوشی بھی تھی اور ایک سال بعد گھر والوں سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ شام کو ٹرین میں روزہ کھولا اور سوچا کہ کسی اسٹیشن سے کچھ لے کر سحری کر لیں گے اور روزہ گھر والوں کے ساتھ کھولیں گے۔ رات دس بجے ٹرین میں افراتفری پھیل گئی۔ ہم لوگ بھی بہت پریشان ہوئے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا۔ سامنے سیٹ پر بیٹھی عورت نے بتایا کہ اعلان ہوا ہے کہ کل عید ہے، وہ بیچاری بھی اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ راولپنڈی جا رہی تھی۔ یہ سن کر پشاور اور دور دور جانے والی اسٹوڈنٹ نے رونا شروع کر دیا کہ ہماری عید تو ٹرین میں ہی ختم ہو جائے گی۔ خیر ہم شام پانچ بجے گجرات پہنچے، سردیوں کے دن تھے اندھیرا پھیل چکا تھا۔ عید ختم ہو چکی تھی گھر والے ہمیں اسٹیشن پر لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم امی جان کے گلے لگ کر خوب روئے، اب عید تو واپس اگلے سال ہی آنی تھی۔ یہ عید میری زندگی کی یادگار عید تھی...... جس کے پل پل میں روتی رہی تھی اور بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ اور اب آج اس واقعے کو سوچتی ہوں تو مسکرا کر رہ جاتی ہوں۔ مختصر کہ ہمارے ملک میں ریلیں تو ہمیشہ ہی لیٹ ہوا کرتی ہیں...... تعلیمی اداروں میں پہلے سے تعطیلات ہو جانی چاہئیں تاکہ سب مسافر بھی اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ جائیں۔

تحریر: فرخندہ جعفری، گجرات

تھیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے مسکرایا۔
''پھر وقت کچھ آگے بڑھا تو تمہارے رویے، حلاوت، نرمی، محبت اور حسنِ اخلاق نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ گو کہ پہلے پہل مجھے یہی لگتا تھا کہ تم یہ سب بھی ڈھکوسلا کرتی ہو لیکن بعد میں مجھے تمہاری نیک نیتی پر یقین آگیا۔ تم اندر سے بھی اتنی ہی خالص، شفاف اور حلیم تھیں جتنی کہ باہر سے۔ تم شیشے کی طرف شفاف تھیں، بے داغ تھیں، تمہارا رویہ ہی مجھے اپنا گرویدہ بنا رہا تھا۔ اگر یہ حقیقت نہ بھی کھلتی تب بھی مجھے تم تک ہی آنا تھا اسما...... وہ اس لیے کہ اللہ نے تمہارا ساتھ ہی میرے لیے آسمانوں پر لکھا تھا۔ ہمارا جوڑ اللہ نے بنایا تھا۔ پھر اسے کوئی کیوں اور کیسے توڑ سکتا تھا؟ پھر کچھ وقت گزرا تو میرے غصے، اشتعال اور جذباتیت پر گرد پڑی اور کچھ عقل کی کھڑکیاں، دروازے کھلے......
تب عزہ کے اصرار پر میں نے اس سارے ڈرامے کی کھوج میں اپنا خاصا وقت برباد کیا۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ میرے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ مجھے تب 'کچھ' کچھ نہیں بہت حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ تم اس ڈرامے کا حصہ نہیں ہو اور پلان ماسٹر کوئی اور ہے...... اس دن جب تم عزہ سے فون پر بات کر رہی تھیں تب میں ایک پورے دن کے لیے پنڈی چلا گیا تھا، میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ اور اب میرا تجسس عروج پر تھا۔ مجھے اس سارے معاملے کو کھول کر سامنے لانا تھا...... اور پھر عاشر کا آنا بھی مجھے کھٹکا گیا۔ وہ اتنا ڈسٹرب تھا کہ مجھے اس کی ڈسٹربنس نے بھی متجسس کر دیا تھا۔ پھر میں نے اللہ کا نام لے کر اس کھوج کی شروعات کی اور پہلے ہی مرحلے پر مجھے گلناز نے بہت کچھ بتا دیا۔ اسے بھی اسما کی حرکتوں کا 'کچھ' کچھ اندازہ تھا۔ اس نے تمہیں بھی بتانا چاہا تھا مگر تم اس کا فون نہیں سنتی تھیں۔ میسج کا رپلائی بھی نہیں کرتی تھیں اور ایک مرتبہ کیا بھی تو محض گالیاں اور کوسنے دیے، وہ بیچاری دلبر داشتہ ہو گئی، اس کے بعد کی کہانی تمہارے سامنے ہے، اسمارا نے خود اس ڈائری کو گلناز تک پہنچایا تھا اور اپنے جرائم کا اعتراف بھی کر لیا...... اور تھوڑی بہت اسے سزا بھی مل گئی۔ سو، میں نہیں چاہتا، اب ہمارے درمیان بھی اسمارا ڈسکس ہو، میں اپنی غلطیوں اور نادانیوں کی معافی مانگتا ہوں، چاہو تو سب کچھ بھلا کر اپنے اس خادم کو معاف کر دو کہ بشری تقاضوں کے تحت کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں سو حسن پرستی مجھ میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی، اب اس نگاہ کا قصور ہے یا کیا مجھے تم سا پری جمال چہرہ کسی حسینہ کا نہیں لگتا...... کیا میں امید رکھوں تم مجھے معاف کر دو گی؟'' ہادی نے اس کے ہاتھ نرمی اور ملائمت سے دباتے ہوئے بڑے نرم گرم جذبات کے ساتھ التجا کی تھی گو کہ بادبان تو کھل ہی چکے تھے۔ چڑھے دریا اتر چکے تھے اور طوفان کے رخ بدل چکے تھے، بدگمانیوں کے غبار چھٹ چکے تھے، مطلع صاف تھا، روشن تھا، رنگین بھی تھا، کیونکہ اسما نے اس سارے قصے میں ہادی کو ''بری'' قرار دے دیا تھا۔ اگر اسمارا نے ہادی کو بے وقوف بنایا تھا یا کسی بھی طور ضد میں آزمایا تھا یا کسی وقتی جذبے کے تحت اس کو اپنے حصار میں کھینچا تھا تو آج سے بہت پہلے ہی اسمارا کے حسن کا وہ حصار ٹوٹ چکا تھا۔
اسما کی خدمت گزاری، اطاعت، قناعت اور محبت نے ہادی کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اسمارا کی چال خود بخود الٹی طرف نکل گئی تھی۔ اور اس سارے پروسس میں عاشر اور گلناز کا ملن اسمارا کی طرف سے دیے گئے ہر دھوکے، فراڈ، بے وفائی اور ذلت کے بدلے میں اللہ کی طرف سے سب سے بڑا انعام تھا۔
گلناز کی سچی محبت رنگ لائی تھی اور اسے عاشر جیسے مہربان بندے کا ساتھ نصیب ہو گیا تھا۔ اور اسمارا اپنے ہی غلط فیصلے کے حصار میں بطورِ سزا آج تک... پھڑپھڑا رہی تھی۔ اور اس وقت اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر جھانکتی اسما کھلے آسمانوں سے اترتی شفق کو دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہی شفق جو دیارِ صبح کے اجالوں کو گھما پھرا کر اس کے آنگن میں کھینچ لائی تھی...... ہمیشہ کے لیے۔

ختم شد

سمجھوتا

رفعت شبانہ

"ارے بہو کیا بات ہے، کہاں ہو تم...... نظر نہیں آرہی ہو، میں یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا گھر کا فون خراب ہے۔ بہت دن ہو گئے آمنہ کا فون نہیں آیا۔" عطیہ بیگم نے بہو کو آواز دیتے ہوئے معلوم کیا۔

"ہاں اماں فون خراب ہے تین چار دن سے۔ جنید نے شکایت کروادی ہے، انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر آپ نے آمنہ سے بات کرنی ہے تو میں موبائل سے بات کرا دیتی ہوں۔" نازلی نے اماں کی



بات سن کر انہیں تسلی دی۔

"ارے وہ جو موبائل ہے ناں اس سے میرے کان میں درد ہونے لگتا ہے۔ میرا کان گرم ہو جاتا ہے اور موئی آواز بھی ٹھیک نہیں سنائی دیتی لیکن چلو مجبوری ہے تم ملاؤ نمبر......" ساس اماں نے موبائل سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بہو سے کہا۔

"ہاں اماں، وہ آمنہ کا دو تین مرتبہ میرے پاس فون آچکا ہے لیکن میں نے آپ سے اسی وجہ سے بات نہیں کرائی کہ آپ موبائل پر بات کرنا پسند نہیں کریں گی۔" نازلی نے وضاحت دیتے ہوئے نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل بجتی رہی دو تین مرتبہ کرنے کے بعد آمنہ نے فون اٹھایا۔

"ہاں بھابی کیسی ہیں آپ، خیریت ہے سب...... امی کیسی ہیں؟"

"ہاں، تم امی سے بات کرو۔" ہیلو، ہیلو ہاں بیٹا کیسی ہو، طبیعت کیسی ہے۔ خرم بیٹا کیسا ہے اتنے دنوں سے اپنی ماں سے بات ہی نہیں کی۔" اماں نے پُرشکوہ انداز میں بیٹی سے بات کی۔

"ہاں امی میں بس ٹھیک ہوں سب، بہت یاد آتے ہیں، امی میرا یہاں سسرال میں ابھی تک دل نہیں لگا...... یہاں میں بہت گھبراتی ہوں سارا دن بوریت ہوتی ہے۔"

"ارے بیٹا گھبرانے کی کیا بات ہے، وہ تو تمہارا اپنا گھر ہے، تم کو اپنا دل لگانا پڑے گا۔ آج تم اکیلی ہو اللہ نے چاہا تو اللہ تمہاری گود بھی بھرے گا تو پھر تمہارا دل بھی لگنے لگے گا اور تمہاری ساری بوریت اور گھبراہٹ بھی ختم ہو جائے گی...... ابھی تو تمہاری شادی کو چھ ماہ ہی ہوئے ہیں اور تم نے منفی سوچوں کو اپنے دماغ میں جگہ دینی شروع کر دی۔ بیٹا گھر بستے، بستے بستا ہے۔ اس کے لیے صبر اور برداشت کی ضرورت ہے۔" اماں نے آمنہ کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ناراض ہو کر بولی۔

"امی آپ تو ہر وقت نصیحتیں کرنے بیٹھ جاتی ہیں، میں اِدھر پریشان ہوں اور آپ کو میری کوئی پروا ہی نہیں ہے۔"

"تمہاری ہی تو پروا ہے جب ہی تمہیں گھر بسانے کے مشورے دے رہی ہوں۔ ورنہ بیٹی کو واپس اپنے گھر لانے میں کتنے گھنٹے لگ سکتے ہیں، بیٹی کا گھر بسانا اور اس کو خوش رکھنا ماں، باپ کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے بیٹا۔"

امی نے آمنہ کو سمجھایا تو وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولی۔ "امی میں آپ کے پاس آکر رہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں بیٹا، آؤ بھی، خوشی آؤ اپنے شوہر کے ساتھ آؤ...... تم اکیلے آؤ گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا اور پھر یہاں تمہاری بھابیاں اور بھائی وغیرہ تم کو اکیلا دیکھ کر کیا سوچیں گے اور تم کیا کہو گی۔" اماں نے آمنہ کو باتوں، باتوں میں ساری اصلیت سے آگاہ کر دیا۔

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون آف کر دیا۔

"دیکھو میرا کان کتنا گرم ہو گیا۔"

بہو نے اماں کے کان کو ہاتھ لگا کر سہلایا اور بولی۔ "اماں کیا بات ہے آمنہ پریشان ہے کیا؟"

"ہاں بیٹی، تم سے کیا بات چھپانی۔ تم ہماری بیٹی کے مزاج سے واقف تو ہو وہی ضد، وہی بچپنا اور وہی بے صبراپن۔"

"کیا کوئی بات ہوئی ہے؟" بہو نے استفسار کیا۔

"بات تو کچھ نہیں ہوئی لیکن آمنہ کہتی ہے میرا دل نہیں لگتا...... کوئی بھی میرا خیال نہیں رکھتا...... سارا دن میں اکیلی ہوتی ہوں......" اماں نے بیٹی کا شکوہ بہو سے کہہ سنایا۔

"اماں آپ فکر نہ کریں، میں آمنہ کو سمجھاؤں گی، وہ ناسمجھ ہے، بچی ہے۔" بہو نے ساس کو تسلی دی۔

"فکر کیسے نہ کروں، وہ میری اکلوتی لاڈلی بیٹی ہے، اس کے دکھ پر میں پریشان ہو جاتی ہوں، آخر اس ماں کا میں کیا کروں......"

ساس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اس نے سوچا کہ مجھے اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ آمنہ میری بات ضرور مانے گی۔ وہ اماں کو تسلی دیتے

ہوئے کچن کی طرف چلی گئی اسے ابھی دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنی تھی۔ اماں نے آج بیسنی روٹی کی فرمائش کی تھی۔

☆☆☆

اس گھر میں تین بیٹے اور تین بہویں ساتھ رہتی تھیں۔ آمنہ تینوں بھائیوں سے چھوٹی تھی اس لیے اس کی شادی بھی سب سے آخر میں ہوئی۔ اس نے ایم اے انگلش کیا ہوا تھا۔ شکل کی بھی خوب صورت تھی اس کے لیے بہت سے رشتے تھے آخر کار بڑی بہو کے ماموں زاد بھائی خرم کو سب نے پسند کیا جو ایم بی اے تھا اور بینک میں ملازم تھا۔

آمنہ کا سب ہی خیال رکھتے تھے لیکن بڑی بھابی کی وہ بہت لاڈلی تھی۔ ساری باتیں وہ بڑی بھابی سے کرتی تھی۔ ویسے دونوں چھوٹی بہویں بھی اچھی تھیں لیکن آمنہ کی ساری راز داری بڑی بھابی سے ہی تھی۔ ویسے تو دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ نازلی جب رخصت ہو کر آئیں تو اس وقت آمنہ میٹرک میں تھی۔ وہ پہلے بھی سب کی لاڈلی تھی، بڑی بھابی کے ساتھ اس کی کافی دوستی ہوگئی تھی لیکن جب آمنہ کی شادی ہوگئی تو سب ہی بہت اداس تھے اور جب وہ میکے ملنے آتی تو سب بہت خوش ہو جاتے۔

آمنہ اپنی سسرال جا کر بھی اپنے میکے کی محبتوں کو نہیں بھولی تھی اور ہر چیز میں موازنہ کرتی تھی۔

خرم کے گھر میں ساس، سسر کے علاوہ دو جیٹھ اور جیٹھانیوں کے علاوہ ایک بیوہ نند بھی تھی اور اس نند کا ایک پندرہ سالہ بیٹا بھی تھا۔ نند کے شوہر کا انتقال روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوگیا تھا اس لیے وہ بیٹے کو لے کر میکے آگئیں۔ ظاہر ہے ماں، باپ ہی بیوہ یا مطلقہ بیٹی کا سہارا بنتے ہیں۔

آمنہ کو نند کا یہاں رہنا بہت کھٹکتا تھا..... وہ سوچتی یہ تو ہمارا گھر ہے، نند اپنے اسی فلیٹ میں جائے یہاں کیوں رہتی ہے لیکن سسرال میں رہنے والے تمام لوگ اس کا بہت خیال رکھتے اور کہتے کہ یہ ہماری بیوہ بہن ہے، اس کا ہمارے سوا کوئی نہیں ہے اس لیے یہ یہیں رہے گی۔

آمنہ نے دبے لفظوں میں کبھی کہا بھی تو اسے ... کورا جواب ملا...... جس سے اس کے دل میں اپنی نند کی نفرت اور زیادہ ہوگئی۔ خرم نہ صرف اپنی بہن کا خیال رکھتے بلکہ اس کے بیٹے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے......

لیکن خرم نے بیوی کی بھی تمام ضرورتوں اور خوشیوں کا ہمیشہ خیال رکھا...... انہوں نے بھی آمنہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ ساس، سسر بھی اسے بہت چاہتے تھے لیکن نہ جانے کیوں آمنہ کا یہاں ابھی تک دل نہیں لگتا تھا۔

آمنہ کی بے دلی کی ایک بڑی وجہ میکے کا لاڈ پیار بھی تھا۔ وہاں اس کی ہر بات مانی اور سنی جاتی تھی۔ وہ وہاں سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس پر کوئی خاص ذمے داری بھی نہیں تھی لیکن شادی کے بعد وہ ایک نئے ماحول میں آئی تو اس میں اسے کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔

''امی میں ایک ہفتے کے لیے یہاں رہنے آئی ہوں۔'' آمنہ جو صبح سے آئی ہوئی تھی امی کے یہ کہنے پر کہ خرم میاں کب لینے آئیں گے۔ اس کے منہ سے جھٹ یہ جملہ نکلا۔ اس کی بات پر بھابیوں نے ایک دم آمنہ کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر ایک ساتھ بولیں۔

''ہاں، ہاں بالکل...... کیوں نہیں...... ضرور رہو، اچھا ہے ہم بھی انجوائے کریں گے۔ بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ بچوں کے اسکول کی چھٹیاں ہیں اور ہاں آمنہ، خرم کیسے ہیں، کیا وہ چھوڑ کر گئے تھے؟'' چھوٹی بھابی نے پوچھا۔

''نہیں بھابی، وہ آفس میں تھے، میں تو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔'' آمنہ نے جواب دیا۔

شام کو بھائی وغیرہ آگئے تو آمنہ کو گلے لگایا۔ خرم کا پوچھا۔ اور اس کے رہنے کے متعلق سنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا۔ خوشگوار ماحول میں سب نے ساتھ کھانا کھایا اور پھر سب اپنے، اپنے کمروں میں چلے گئے۔

آمنہ، اماں کے کمرے میں آگئی۔ وہاں کچھ دیر بڑی بھابی بھی ٹھہری رہیں پھر وہ بھی چلی گئیں تو آمنہ نے اپنا بوجھ ہلکا کیا۔

''امی اب میں نہیں جاؤں گی سسرال...... میں

آپ کے پاس رہوں گی۔"
"کیوں بھئی کیوں یہاں رہوگی پھر خرم کا کیا ہوگا......اور اگر تم نے یہاں رہنا تھا تو شادی کیوں کی، اب تمہارا گھر یہ نہیں ہے تمہارا گھر، تمہاری سسرال ہے جہاں تمہارا شوہر رہتا ہے۔"
"بس امی رہنے دیں اپنا فلسفہ...... میرے اوپر کیا گزر رہی ہے آپ کو کیا پتا...... آپ میری بات نہیں سمجھ رہیں۔ وہاں مجھے اپنی زندگی پہاڑ جیسی لگتی ہے۔"
"لیکن بیٹا اسی پہاڑ سے راستے بنا کر حل نکالا جاتا ہے، مسئلے ہوتے ہی حل ہونے کے لیے ہیں، تم مفاہمت کی راہ پر آؤ اگر کوئی غلطی کروگی تو بگاڑ پیدا ہوگا۔"
"امی آپ میری بات کیوں نہیں سمجھتی ہیں وہاں سب لوگ آپا کا اتنا خیال رکھتے ہیں اور مجھ سے اتنا نہیں پوچھتے کہ تمہاری پسند ناپسند کیا ہے، تمہیں کیا اچھا لگتا ہے، سارے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نبھاتے ہیں اور ان کو میں نظر نہیں آتی ہوں۔" آمنہ نے کافی غصے سے کہا۔
"وہ سب ٹھیک ہے بیٹا، تمہیں اپنی ذات کو منوانا پڑے گا، تمہیں چاہیے کہ تم انہیں اپنا عادی بناؤ...... تاکہ وہ سب تمہارے بغیر نہ رہ سکیں لیکن اس کے لیے قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے۔ ان کے درمیان ہی اپنی جگہ بناؤ...... انہی کے ساتھ رہنا سیکھو......" امی اسے سمجھاتے، سمجھاتے نیند کی وادی میں چلی گئیں تو وہ بھی منہ بسور کر سوگئی۔
"ارے آمنہ اٹھو...... دیکھو دس بج رہے ہیں اور تم ابھی تک سو رہی ہو، اٹھو ناشتا کرو......" امی کے اٹھانے پر وہ ہڑ بڑا کر اٹھ گئی۔ اس نے سوچا اگر اس وقت میں اپنی سسرال میں ہوتی تو میری ساس مجھے دس مرتبہ اٹھا چکی ہوتیں...... ابھی کل ہی جب میں گیارہ بجے اٹھی تو کیسے کہہ رہی تھیں۔ "بیٹا جلدی اٹھ جایا کرو، عورتیں دیر سے اٹھیں تو گھر میں نحوست ہوتی ہے، تم نے اپنی نمازِ فجر بھی ضائع کردی۔ اور یہ بات جب میں نے امی کو بتائی تو وہ الٹا مجھے ہی کہنے لگیں کہ تمہاری ساس نے کون سی غلط بات کہی ہے۔ یہاں تمہارے میکے میں بھی تو سب فجر کے وقت اٹھتے ہیں تمہیں بھی جلدی اٹھنا چاہیے۔"
"چلو آمنہ ٹیبل پر آجاؤ ناشتا تیار ہے۔" آمنہ نے باتھ روم میں بھابی کی آواز سنی تو لاؤنج میں آگئی جہاں ٹیبل پر اس کا ناشتا ڈھکا رکھا تھا، وہ ناشتا کر کے کچن میں آگئی اس نے دیکھا وہاں تینوں بھابیاں کام میں مصروف ہیں، ایک آٹا گوندھ رہی ہیں، دوسری بھابی برتن دھو رہی ہیں اور بڑی بھابی امی کے ساتھ سبزی بنا رہی ہیں۔
"بھابی، یہ ساری سبزی امی بنائیں گی کیا......؟"
"نہیں میں کاٹوں گی، امی تو مٹر چھیلیں گی۔" بھابی نے جواب دیا۔
اس نے تصور میں سوچا ابھی چار دن پہلے ساس نے آمنہ سے کہا کہ یہ ساگ باریک، باریک کاٹ لو تو آمنہ نے ٹال مٹول سے کام لیا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی کہ میں کیوں کاٹوں میرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے اور جب واپس آئی تو آپا نے نہ صرف سارا ساگ کاٹ لیا تھا بلکہ دیگر سبزی کاٹ کر اور ان سب کو فریج میں بھی رکھ دیا تھا۔ اور پھر آپا اٹھ کر کچن میں گئیں اور وہاں سے ٹھنڈے شربت کا گلاس لا کر آمنہ کو دیا کہ یہ لو پیو بہت گرمی ہے۔ اس نے بڑے نخروں سے شربت پیا تھا لیکن ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئی۔
وہ یہ سب خود سوچ کر تھوڑی سی پشیمان ہوئی اور سوچنے لگی یہاں بھی تو سب بھابیاں کام کر رہی ہیں لیکن ایک دم سر کو جھٹک دیا۔
دوپہر کو کھانے کے بعد آمنہ امی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔
"امی آپ تو اپنی بہوؤں کو ٹوکتی بھی نہیں ہیں اور میری ساس ہر وقت مجھے کچھ نہ کچھ بولتی رہتی ہیں۔" وہ مسلسل میکے اور سسرال کا موازنہ کیے جارہی تھی۔
"ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی کہہ رہی تھیں بیٹا صبح اٹھ

کر نماز اور قرآن پڑھا کرو اور اپنے شوہر کو اپنے ہاتھوں سے ناشتا کروایا کرو...... اس کا ناشتا تمہاری ذمے داری ہے۔ تمہاری نند روز بھائی کو ناشتا کراتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کی خدمت کروگی تو اس سے محبت بھی پیدا ہوگی۔'' اس نے ماں سے گویا ساس کی شکایت کی۔

''بیٹا آج کل کے ناسمجھ لوگ روک ٹوک کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ ان تمام باتوں میں جو تمہاری ساس نے تم سے کہی ہیں کوئی بھی غلط بات نہیں ہے۔ میں نے اپنی بہوؤں کو شروع سے ہی سمجھا دیا تھا اس لیے مجھے ان کو ٹوکنے کی ضرورت نہیں، وہ سب اپنا کام ٹھیک طریقے سے کر رہی ہیں اگر غلط کریں گی تو ان کو ٹوکنا پڑے گا۔''

امی نے اس کی بات سن کر کہا۔ آمنہ سوچنے لگی۔ میری ماں کیسی ہیں ایک مرتبہ بھی انہوں نے میری حمایت نہیں کی لگتا ہے کہ ان کو اب مجھ سے پیار نہیں ہے اب ان کے پیار میں بھی کمی آگئی ہے۔

''امی آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے، آپ کو میرا یہاں رہنا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' آمنہ نے ساری باتیں سوچنے کے بعد امی سے کہا۔

''ہاں، بیٹی تم ٹھیک کہتی ہو اگر میں نے تم سے زیادہ محبت کی یا اس کا اظہار کیا تو تم اپنا گھر نہیں بسا سکتیں، تم کو ایک ہی گھر کا انتخاب کرنا پڑے گا اور وہ گھر ہے تمہارے شوہر کا۔'' وہ ماں کو دیکھنے لگی۔

''بیٹا شادی کے بعد بہت مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں، شروع کے کٹھن حالات کا مقابلہ کرلو تو پھر آسانی ہی آسانی ہے۔''

''امی رمضان میں کتنے دن رہتے ہیں؟'' آمنہ نے امی سے پوچھا۔

''تین چار دن باقی ہیں۔''

''صرف تین چار دن......'' آمنہ اتنے دنوں میں سب تاریخیں بھول گئی تھی۔ اس دوران خرم کے فون آتے رہے لیکن بڑی بھابی کے موبائل پر کیونکہ وہ اپنا موبائل آتے وقت بھول گئی تھی۔

ایک دو مرتبہ وہ آمنہ سے ملنے بھی آیا اور ساتھ چلنے کو بھی کہا لیکن آمنہ کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ دونوں بھابیوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

رمضان کا چاند نظر آگیا تھا۔ سب بھابیاں، بھائی اور...... بھتیجا، بھتیجی سب اماں سے ملے اور سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور دعائیں لیں۔

وہ سوچنے لگی کہ میں بھی آج سسرال میں ہوتی تو مجھے بھی تو دعائیں ملتیں لیکن ایک دم سوچنے لگی کہ چلو اچھا ہوا میں یہاں ہوں ورنہ کتنا مشکل ہوتا کہ سحری میں اٹھ کر پراٹھے بناؤ، وہ اپنے خیالات میں گم تھی کہ اس سے اماں نے کہا۔

''بیٹا تم اپنی سسرال فون کر کے چاند کی مبارک باد دے دو۔'' آمنہ نے سنی ان سنی کر دی۔

سحری میں سب بھابیاں اٹھی ہوئی تھیں۔ آمنہ نے بھی سحری کی اور نماز کے بعد سوگئی۔

صبح اٹھی تو خرم نے پھر فون کیا لیکن آمنہ نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ شام کو افطاری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سب روزے سے تھے۔ اچھی خاصی رونق تھی۔

غرض کہ یہاں رمضان کافی اچھے گزر رہے تھے کیونکہ بھابیاں یہاں اس کو کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ بھابیاں ساری سحری اور افطاری امی کے مشوروں سے تیار کرتیں۔ لیکن آمنہ سے کوئی مشورہ نہیں کرتا، آمنہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ یہاں اب وہ اجنبی ہے اس کی جگہ اب یہاں غیر محسوس طریقے سے ختم ہو رہی ہے۔

رمضان کے آخری عشرے میں وہ بالکل بور ہونے لگی۔ اب وہ واپس جانا چاہتی تھی خرم بھی یاد آرہا تھا اور اب اس کی سوچ بھی بدل رہی تھی لیکن انا آڑے آجاتی۔

ایک شام وہ کچن میں گئی تو بھابیاں افطاری تیاری کر رہی تھیں۔

''بھابی آج سالن میں بنالیتی ہوں۔''

''نہیں آمنہ، تمہارے بھائی میرے ہاتھ کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا پسند ہی نہیں کرتے...... اس لیے رات کا کھانا میں ہی بناتی ہوں۔'' آمنہ سوچنے لگی یہ منجھلے بھائی میرے ہاتھ کا ہی کھانا پسند کرتے تھے لیکن اب۔

''بھابی آج کالے چھولے بنائے ہیں۔''

''نہیں آمنہ، دراصل بچے کالے چھولے پسند نہیں کرتے اس لیے نہیں بنائے۔'' آمنہ کو دوسرا جھٹکا محسوس ہوا۔

''اچھا بھابی لائیں میں شربت بنا لیتی ہوں۔''

''نہیں آمنہ اب یہاں شربت نہیں بنتا، اب سب لسی پیتے ہیں۔ بچوں کو بھی یہی پسند ہے اس لیے میں نے بنا کر فریج میں رکھ دی ہے۔''

غرض اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اس گھر میں سب جگہیں بھر چکی ہیں اب اس کی کوئی جگہ نہیں اسے اپنی جگہ اپنی سسرال میں ہی بنانی ہوگی۔ وہ افسردہ دل کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

ٹی وی لاؤنج میں سب بیٹھے تھے اور عید کے کپڑوں پر بات کر رہے تھے، طارق روڈ جانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پروگرام بن رہے تھے۔ تب یہ طے ہوا کہ اسی دو تین دن میں شاپنگ مکمل کر لی جائے۔ آمنہ ایک کونے میں بیٹھی سب کے پروگرام سن کر اوپر سے خوش ہو رہی تھی لیکن اندر سے بہت ڈسٹرب تھی۔

روزانہ سب مل کر مہندی، چوڑیوں، کپڑوں، درزی، میک اپ، بیوٹی پارلر وغیرہ کے پروگرام بنا رہے تھے۔ آمنہ سوچ رہی تھی کہ کسی طریقے سے خرم اس کو لینے آ جائے تاکہ وہ بھی عید منائے۔ طارق روڈ جا کر کپڑے خریدے، چوڑیاں خریدے لیکن کس طرح......؟

آمنہ کی شادی کے بعد پہلی عید تھی۔

''آمنہ تمہاری پہلی عید ہے، چلو آج تم ہمارے ساتھ چلو شاپنگ کرنے......'' یہ سن کر آمنہ رونے لگی۔

''آمنہ اگر تم کہو تو میں خرم کو بلا لوں، تم اپنی خوشی سے اپنے گھر چلی جاؤ اور دھوم دھام سے عید مناؤ۔''

آمنہ نے بھابی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

آج ستائیسواں روزہ تھا۔ افطاری کے بعد سب نماز پڑھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے تھے کہ اچانک بیل کی آواز پر آمنہ چونک گئی...... بھتیجے نے دروازہ کھولا تو اس نے اپنی ساس، نند اور خرم کو آتے دیکھا اس کی ساس آگے آیا اور پیچھے خرم تھے۔ اندر لاؤنج میں آتے ہی ساس نے آمنہ کو گلے لگایا اور پھر آپا نے بھی آمنہ کو پیار کیا اور گلے لگایا۔ سب خوشی سے یہ منظر دیکھتے رہے ان لوگوں نے...... بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کی پھر چائے کا پُرتکلف دور چلا۔ تینوں بھابیاں بہت خوش تھیں۔

''آمنہ تیار ہو جاؤ ہم تمہیں لینے آئے ہیں، یہ تمہاری پہلی عید ہے ہم سب یہاں سے شاپنگ پر چلیں گے چلو بس تیار ہو جاؤ۔'' آپا نے بڑے پیار سے کہا۔

بڑی بھابی نے آمنہ کو جلدی سے تیار ہونے کا کہا اور آمنہ تیار ہو کر اپنی ساس، شوہر اور نند کے ساتھ ہنسی خوشی سب کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گئی۔

اماں نے شکرانے کے طور پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے کہ اللہ ہر لڑکی کو اپنے گھر میں آباد رکھے۔

آمنہ کو خرم کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے آج بڑے تحفظ اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے خرم کی پسند سے بہت ساری چیزیں خریدیں۔ آپا نے بھی اس کے لیے ایک سوٹ خریدا۔

آمنہ کو بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ اپنے اصل گھر جا رہی ہے۔ اب وہ سکون اور خوشی کے ساتھ عید منائے گی۔

آمنہ پیا سنگ ڈھیر ساری شاپنگ کر کے گھر پہنچی تو سب ہی گھر والوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ رات بستر پر پُرسکون انداز میں لیٹتے ہوئے وہ یہ سوچ رہی تھی۔ شکر ہے میری ماں نے میری غلط باتوں پر حوصلہ افزائی نہیں کی ورنہ آج میرا...... گھر دوبارہ نہیں بستا۔

ناولٹ

آئینوں کے درمیاں

شائستہ عزیز



انہوں نے اپنا امپورٹڈ فیس واش ہتھیلی پر تھوڑا سا ٹپکا کر پوری قوت سے دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑ کر جھاگ بنایا اور دونوں ہاتھ چہرے پر ملنے شروع کردیے، جب تک اُن کے ہاتھوں میں دم باقی تھا وہ چہرہ مسلتی رہیں پھر انہوں نے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارنے شروع کیے اور دیر تک یہ عمل کرتی رہیں جب تھک گئیں تو روزانہ کی طرح آج بھی بغور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، آئینہ جیسے انہیں صاف منہ چڑا رہا

تھا۔ وہی گہری سانولی رنگت، چھوٹی، چھوٹی چندھیائی ہوئی آنکھیں، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، پھیلا ہوا دہانہ اور بالائی ہونٹ کے اوپر چنے کی دال کے برابر مسا جس پر ہلکا، ہلکا سا کالا رواں تھا جو ان کی بدنمائی میں اور بھی اضافہ کرتا تھا۔ وہ کم رو اور بد ہیئت تھیں مگر کچھ بھی تھا ان پر سیکڑوں عورتیں جان نچھاور کرنے کو تیار رہتیں۔ لوگ ان کا منہ اور ہاتھ، پیر چومنے کو بے قرار رہتے اور وہ بھی کشادہ دلی کے ساتھ یہ سب خوشی، خوشی کرواتیں۔

آج نوچندی جمعرات تھی، انہوں نے روزانہ کی طرح اپنے مہنگے قیمتی میک اپ کے سامان سے خود کو سجانا شروع کر دیا تھا۔ کسی نے بھی ان کا اصل چہرہ نہ دیکھا تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاتی تھیں۔

اپنی سوتی سبز خوب صورت چادر کو انہوں نے سر اور چہرے کے درمیان لپیٹا اور قدم ایوانِ محمدی کی طرف بڑھانا شروع کر دیے۔

یہ شمع باجی تھیں، ایوانِ محمدی کی کرتا دھرتا، سب کی محبوب......

☆☆☆

ارحم اپنی کمپیوٹر ٹیبل پر لیپ ٹاپ پر کام کرنے میں مگن تھا۔

سامنے بیڈ پر ماہین بیٹھی تھی، گم صم، کھوئی، کھوئی دانتوں سے ناخن کترتی ہوئی، اس نے ارحم کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

''ارحم، میں نے نیٹ پر ایک بہت بڑی گائنا کالوجسٹ کو سرچ کیا ہے۔''

ارحم کا جواب نہ پا کر وہ دھیرے، دھیرے چلتی ہوئی اس کے کندھے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اور اس کا کندھا ہلا کر اسے متوجہ کیا۔

''تم نے سنا ارحم میں نے کیا کہا ہے؟'' ارحم کی انگلیاں تھوڑی دیر کو رکیں۔ اس نے سر اٹھا کر استفہامیہ نظروں سے ماہین کو دیکھا۔

''کہو کیا کہہ رہی ہو؟'' ارحم تھوڑا سا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے ایک ٹاپ کی گائنا کولوجسٹ کو سرچ کیا ہے، تم چلو گے مجھے وہاں لے کر؟'' ماہین کی نظروں میں التجا تھی، درخواست تھی، درد تھا۔ ارحم نے گہری سانس لے کر لیپ ٹاپ بند کیا اور کھڑے ہو کر ماہین کے دونوں شانے تھام کر نرمی سے کہا۔

''دیکھو ماہین، ہم نے بہت علاج کروالیا ہے، سارے ٹیسٹ کروالیے ہیں سب کلیئر ہیں، تم بس اب صبر کرو اور قدرت کی طرف سے کسی معجزے کا انتظار کرو۔'' ارحم نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

''نہیں ہوتا مجھ سے صبر۔'' ماہین نے چلاتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

''تم اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو، تم مرد ہو صبر کر سکتے ہو مگر ایک عورت اس معاملے میں صبر نہیں کر سکتی، میں تھکتی، ٹوٹتی جا رہی ہوں، میرے اندر پلنے والی مامتا کو کسی پل چین نہیں ارحم۔'' یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔ ارحم نے مجبور اور بے بس نظروں سے اسے دیکھا۔

اس کے گرد بازو کا گھیرا تنگ کر کے وہ اسے بیڈ کے پاس لایا اور اسے بٹھا دیا۔ اس کی ہتھیلی کی پشت کو دھیرے، دھیرے تھپکتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو ماہی کہ مردوں کے کوئی جذبات نہیں ہوتے، تمہارے اندر ممتا ہے تو میرے اندر بھی بہت جوالا مکھی ہے، جوار بھاٹا ہے مگر ہم.... بے بس ہیں، مجبور ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کیسے کچھ نہیں کر سکتے؟'' ماہین نے آنکھیں رگڑیں۔ ''میں آخری حدوں تک جا کر دیکھوں گی، میں اپنی ممتا کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، یہ چھ سال میں نے کانٹوں پر چل کر گزارے ہیں ارحم۔''

''چھ سال...... محض چھ سال ہی تو ہوئے ہیں ماہی...... تم ابھی سے اتنی جذباتی ہو جاتی ہو، قدرت کو مہربان ہوتے کتنی دیر لگتی ہے؟''

''تم جانتے نہیں کیا ارحم وہ جتنا طاقتور ہے اتنا ہی بے نیاز بھی ہے، بے نیازی پر آ جائے تو آزمائش پر

آزمائش ڈالے جاتا ہے میں بہت کمزور ہوں، آزمائش نہیں سہہ سکتی۔''

''ایسی باتیں نہیں کرو ماہی، یہ کفر ہے، خدا کو بری لگ سکتی ہیں تمہاری باتیں۔''

''تو وہ کیوں نہیں سنتا میری؟ میں کس سے کہوں، کہاں جاؤں ارحم...... مجھے ٹوٹنے سے، بکھرنے سے بچالو۔'' ماہین روتے ہوئے اس کے کندھے سے لگ گئی۔

ارحم نے اس کے ریشمی بالوں کو پیار سے سہلانا شروع کردیا۔

☆☆☆

صبح تاجو نے برتن دھوتے ہوئے گم صم سوجی آنکھوں کے ساتھ ناشتا کرتی ماہین کو بغور دیکھا...... وہ سمجھ گئی کہ رات کو پھر اس کی طبیعت خراب ہوئی ہے اور یہ خوب روئی ہے، اکثر ایسا ہونے لگا تھا۔

تاجو کو ماہین پر بہت ترس آیا۔ وہ برتن دھونا چھوڑ کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

''کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو باجی؟ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، آپ یوں رو، رو کر خود پر ظلم نہیں کرو سب ٹھیک ہوجائے گا...... ہاں۔''

''کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا تاجو...... سب غلط ہو رہا ہے، میری ہمت ٹوٹتی جارہی ہے، تجھے نہیں پتا تاجو یہ بے اولادی عورت کو اندر سے کیسے دیمک کی طرح کھاتی ہے، میرا اپنا آپ بھی مجھ پر بوجھ بنتا جارہا ہے۔ میرا وجود مجھے گالی کی طرح لگنے لگا ہے۔''

''آئے ہائے، خدا نہ کرے باجی...... کیسی باتیں کرتے ہو جی آپ...... ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں آپ کی شادی کو، خیر سے لوگوں کے پندرہ، بیس سال بعد بھی اولاد ہوجاتی ہے ابھی تو آپ جوان ہو، سوہنی ہو، رب پر راضی رہو، آپ کا تو مرد بھی اتنا اچھا ہے آپ کو بھلا کس چیز کی کمی ہے جی؟''

ماہین نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''تجھے نہیں پتا تاجو، یہ سب چیزیں ہنستی ہیں مجھ پر، مجھ سے اچھی ہیں یہ سب چیزیں...... اپنی، اپنی جگہ پر تو ہیں ناں میرا تو وجود ہی کہیں گم ہوتا جارہا ہے۔''

تاجو نے تھوڑا قریب ہوکر اس کا کندھا دبا کر سرگوشی کی۔

''باجی، آپ نے ڈاکٹر حکیم تو بہت کرلیے اب میری بھی ایک بات مانو، آپ شمع باجی کو اک واری دکھالیو، بڑی پہنچی ہوئی ہیں جی، بڑے سے بڑا مسئلہ منٹوں میں حل کردیتی ہیں، یہ دو گلیاں چھوڑ کر ان کا بڑا سارا گھر ہے، بڑی خلقت وہاں جمع رہتی ہے جی، ان کے ابا جی بھی بہت پہنچے ہوئے ہیں، یہ ڈھیر سارے مرید ہیں ان کے۔ دونوں باپ، بیٹی بڑے اللہ والے ہیں، بولو تو میں لے چلوں آپ کو وہاں؟''

''میرا علاج ہے ان لوگوں کے پاس؟'' ماہین نے غور سے اسے دیکھا۔

''سب کا علاج ہے وہاں جی...... بس آپ نوچندی جمعرات کو تیار رہنا۔ عصر سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے بڑا رش ہوتا ہے جی وہاں۔'' تاجو نے ماہین کے دونوں کندھے زور، زور سے دبانے شروع کردیے۔

☆☆☆

یہ سبز اور سفید ٹائلز سے آراستہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس کی لوح پر جلی حروف میں ایوانِ محمدی لکھا ہوا تھا۔ عمارت خاصی دیدہ زیب اور دلکش بنی ہوئی تھی۔ یہاں کا دروازہ ہر خاص و عام پر ہر وقت کھلا رہتا۔ ضرورت مندوں اور سائلوں کا یہاں ہجوم رہتا۔

نیچے گراؤنڈ فلور پر دو ہال نما بڑے کمرے...... جو ایک ایوانِ محمدی کے نام سے شمع باجی اور ابا جی کا آستانہ تھا جہاں وہ بیٹھ کر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، درس دیتے اور محافل منعقد ہوتی تھیں۔

دوسری منزل پر شمع باجی کا گھرانا آباد تھا، ان کے چار بچے تھے دو بڑے بیٹے اور پھر دو بیٹیاں بچوں کے نام انہوں نے خود بہت چھان پھٹک کر رکھے تھے، بڑے بیٹے کا نام مکی، چھوٹے کا مدنی، بڑی بیٹی کا نام یثرب اور چھوٹی کا نجف...... شوہر کا نام محمد مزمل مگر سب انہیں صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ زیادہ تر باہر رہتے تھے ان کا کاروبار

کیا ہے یہ کسی کو نہیں پتا۔ سوائے شمع باجی کے۔

تیسری منزل پر اباجی کا حجرہ تھا ایک بڑا ہال نما کمرا سلائی سینٹر تھا۔ جہاں احرام کی چادریں، عبایا، کوٹ اور اسکارف وغیرہ سلتے۔ یہاں سب ضرورت مند اور محتاج بے سہارا لڑکیاں، عورتیں کام کرتی تھیں اور رات کو یہیں سوتیں۔ سب کا خرچہ پانی شمع باجی کے ذمے تھا۔ ایک کمرا مساج روم اور تھراپی روم کے نام سے بھی تھا۔

یہیں شمع باجی کا کلینک بھی تھا جہاں وہ ہربل دواؤں سے علاج کرتیں، ان کی دوائیں بہت مہنگی ہوتی تھیں کیونکہ صاحب انہیں کینیڈا سے درآمد کرتے۔ ایک خاص نام سے ان کا طریقۂ علاج اور دوائیں تھیں، شمع باجی کے پاس میٹر کے نام سے ایک خاص آلہ تھا جس سے وہ علاج کرتیں، یہ ایک خودکار برقی آلہ تھا جسے ہتھیلی کے پریشر پوائنٹس پر رکھ کر مریض کے مرض کی نوعیت جانچی جاتی۔ شمع باجی نے اس علاج کی خاص تربیت لی ہوئی تھی اور وہ اس آلے سے خاص، خاص لوگوں کا ہی علاج کرتی تھیں۔

☆☆☆

''باجی، میں نے ساری معلومات کرلی ہیں۔'' تاجو، ماہین کو بتارہی تھی۔

''شمع باجی ان عورتوں کو دیکھتی ہیں جن کی چالیس نمازیں پوری ہوگئی ہوں پر وہ اپنے کلینک میں سب کا علاج کرتی ہیں، آپ کل ان کے کلینک چلی چلو، نماز تو آپ پڑھتی ہی ہو پر اب پبندی (پابندی) سے پڑھ لیا کرنا، کیوں جی......!''

''میرے سجدے تو بہت طویل ہوتے ہیں تاجو، تجھے کیا پتا میری نماز کیسی ہوتی ہے؟'' تاجو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آہو جی...... مجھے چنگی طرح پتا ہے آپ بہت نیک ہو پر آزمائش میں ہو۔ اللہ نیکوکاروں کو ہی آزماتا ہے۔ بس آپ کل ہمت کرکے چلی چلو۔ اللہ کوئی راستہ بنائے گا ضرور میرے دل کو تسلی ہے۔'' ماہین نے گہری سانس لی۔

''ضرور چلوں گی، میں ہر حد سے گزر جانا چاہتی ہوں۔'' ماہین کی باتیں تاجو کے خاک پلے نہیں پڑرہی تھیں مگر وہ عقیدت سے سر ہلائے جارہی تھی۔

☆☆☆

''تمہارے ہزبینڈ کیا کرتے ہیں؟'' شمع باجی نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں ماہین کے شگفتہ چہرے پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''باجی وہ بینکر ہیں......'' ماہین نے سادگی سے کہا۔ شمع باجی کے چہرے پر جلال کے سائے منڈلانے لگے۔

''بینکوں کا کاروبار سود پر چلتا ہے، سود اللہ اور اس کے رسولؐ سے کھلی جنگ ہے، اپنے شوہر سے کہو یہ نوکری چھوڑ کر کچھ اور کرلے۔ سود کا کام کرنے والوں کے ہاں برکت نہیں ہوتی سمجھ لو یہ بات۔'' شمع باجی نے غصے سے کہا تو ماہین اپنی جگہ سہم سی گئی۔

''تمہارے شوہر کی پچاس ہزار سے زیادہ تنخواہ ہوگی تو میں تمہارا علاج کروں گی ورنہ نہیں۔ ہماری دوائیں ڈالرز میں آتی ہیں، امپورٹڈ ہوتی ہیں ہر کوئی انہیں افورڈ نہیں کرسکتا۔''

''جی، جی ان کی اچھی خاصی سیلری ہے آپ اس کی فکر نہ کریں۔''

''ہوں۔'' شمع باجی نے ہنکارا ابھرا اور اپنا خاص میٹر نکال کر اسے ماہین کی ہتھیلی پر رکھا۔

''جہاں، جہاں اسے کوئی تکلیف تھی بیماری تھی وہ میٹر اسے indicate کرتا تو اس کے اندر کرنٹ سا دوڑ جاتا وہ اپنی جگہ اچھل کر رہ جاتی۔ اس کا اچھی طرح معائنہ کرکے شمع باجی نے نفی میں گردن ہلائی۔

''نو امپاسبل، نہ تم ہارٹ پیشنٹ ہو اور نہ ہی ڈائے بیٹک...... اور نہ تم بانجھ ہوسکتی ہو، گڑبڑ کہیں اور ہے، دیکھنا ہوگا تم نوچندی جمعرات کو میرے آستانے پر آنا میں وہاں تمہیں دیکھوں گی، نماز پڑھتی ہو؟''

''جی...... پابندی سے نہیں مگر پڑھتی ضرور ہوں۔ فجر قضا ہوجاتی ہے۔'' ماہین نے شرمندگی سے کہا۔

''پڑھا کرو، جب تمہاری چالیس نمایں پوری جائیں تو میرے پاس آنا ٹھیک ہے؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں تو ماہین کو بھی اٹھنا پڑا۔

''آنا ضرور...... درمیان کا، کوئی اور راستہ تلاش کرو گی تو بھٹک جاؤ گی، گمراہ ہو جاؤ گی۔'' شمع باجی نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی تو ماہین کے دل میں ان کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔

☆☆☆

شمع باجی اپنے بستر پر تقریباً نیم دراز تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آنکھیں بند اور لب ہل رہے تھے وہ گہرے استغراق کے عالم میں تھیں۔

عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں، ان کی خاص ملازمہ ان کی دستِ راست لالی نے جھجکتے ہوئے ان کے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا۔

انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''وہ باجی، اذان ہو گئی ہے، میں نے سوچا آپ کو نماز کے لیے بیدار کر دوں۔''

''نماز...... نماز تجھے ہر وقت مجھ سے زیادہ میری نمازوں کی فکر رہتی ہے۔'' شمع باجی پوری طرح بیدار ہو کر اس پر غرائیں۔

''تو میری عبادتوں کا عالم نہیں دیکھتی، میری زبان ہر وقت ذکرِ الٰہی سے تر رہتی ہے، میرا ہر، ہر لمحہ ذکر و اذکار میں گزرتا ہے۔ نماز بھی ذکر کی ایک قسم ہے، نماز اور ذکر برابر ہیں تو میری کھوج میں نہ رہا کر اپنے کام سے کام رکھا کر نیک بخت۔''

لالی کو تو بس یہ پتا تھا کہ نماز ولیوں، پیغمبروں پر بھی معاف نہیں تھی، شمع باجی اپنی مرضی سے نماز پڑھا کرتی تھیں۔

''اِدھر آ لالی میرے قریب آ......'' اب شمع باجی کا لہجہ کچھ اور تھا۔ شہد کی شیرینی لیے۔ لالی لپک کر ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

شمع باجی نے اس کے چہرے پر آئی لٹوں کے پیچھے کرتے ہوئے کھوئے، کھوئے خوابناک لہجہ میں کہا۔

''تو کتنی خوب صورت ہے لالی، تو جوانی میں کتنا غضب ڈھاتی ہو گی اگر تو مجھے جوانی میں مل جاتی تو خدا کی قسم تیری زندگی سنوار دیتی، یہ اتنا عرصہ جو تو نے رُل، رُل کر گزارا ہے وہ سب تیرے حسن کا خراج ہوتا۔ پر فکر نہ کر تیری بیٹی گوری تیرا بڑھاپا سنوارے گی، تیرے برے دن گزر گئے لالی...... اپنا تھوڑا سا نشہ مجھے بھی پلا دے، اپنا تھوڑا سا حسن مجھے بھی بخش دے لالی...... یہ دیکھ۔'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔

''میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، تھوڑا سا بس تھوڑا سا......'' لالی کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی، وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''معافی دے دو باجی، آئندہ آپ کو نہیں جگاؤں گی۔ میری توبہ...... میرے خاندان کی توبہ...... آپ کی تو خو شان نرالی ہے، وڈی شان والی ہو آپ۔ میرا آپ کا بھلا کیا مقابلہ...... ہم تو آپ کی جوتیاں سیدھی کر کے کھاتے ہیں۔ معافی بی بی، معافی۔'' لالی سچ مچ رونے لگی۔

شمع باجی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوانہ وار اس کا چہرہ چومنا شروع کر دیا۔ لالی کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے، شمع باجی آج کسی اور ہی کیفیت میں تھیں۔

☆☆☆

حسن ان کی کمزوری تھا، انہیں خوب صورتی سے عشق تھا۔ جنون تھا اور انہیں اتنا ہی بدصورتی سے پالا پڑا تھا۔ شوہر کم صورت، بچے، باپ وہ خود اپنے باپ پر گئی تھیں۔

انہوں نے اپنے ادارے میں کام کرنے والی ساری لڑکیاں اور عورتیں چھانٹ، چھانٹ کر خوب صورت اور حسین رکھی تھیں۔ انہیں بدصورتی سے نفرت تھی۔ وہ کسی کم شکل اور بدصورت چہرے کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ پتا نہیں شوہر کو اتنے سالوں سے کیسے برداشت کر رہی تھیں۔ وہ اکثر اپنے شوہر سے اس بات کا شکوہ کرتیں تو ''صاحب'' ہنس کر ٹال جاتے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''وہ کیا کہتے ہیں، سنا نہیں تم نے کہ اللہ ملائے جوڑی ایک اندھا ایک کوڑی...... ہماری تمہاری وہ مثال ہے شمع بیگم......''

''میں کیا بدصورت ہوں؟'' شمع غصے سے ناک پھلا کر کہتیں۔

''تم نے دیکھا نہیں مزمل کہ عورتیں کیسے مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ میرے ہاتھ، پیر، منہ سب چومنے کو بے قرار...... ہر نوچندی کو گجروں کا ڈھیر لگ جاتا ہے میرے لیے۔ بس ایک تم ہی ناقدرے ہو جو میری قدر نہیں کرتے ورنہ میرے قدر دان تو ہزاروں میں ہیں۔'' وہ گردن اونچی کر کے اترا کر کہتیں۔

''ہاں یہ تو میں مانتا ہوں، جانے کیا جنتر منتر پڑھتی رہتی ہو دن رات جو لوگوں کو یوں پاگل اور جاں نثار بنایا ہوا ہے۔'' مزمل کو اقرار کرتے بنتی۔

''جنتر منتر نہیں صاحب...... عملیات، تسبیحات، وظائف میرے موکل آٹھ بلیاں ہیں اباجی کے پاس چھ، چھ فٹ کی جوان کی موکل ہیں، تم اباجی کو سمجھتے کیا ہو بہت طاقت اور علم ہے ان کے پاس۔'' شمع باجی عقیدت بھرے لہجے میں بتا رہی تھیں۔

''آج کل اباجی کی کس پر نظر ہے؟''

''ہے ایک کوہ نور ہیرا...... مثلِ ماہ نور۔'' شمع باجی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''نام تو ذرا بتاؤ اس کا؟''

''ابھی نہیں...... ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا ہے ابھی میں اس کو تیار ہوتے دیکھ رہی ہوں وہ بہت خاص ہے میرے لیے۔'' شمع باجی کھوئے کھوئے خوابناک لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

مزمل صاحب کے چہرے پر حسرت و یاس برس رہی تھی۔

☆☆☆

''گوری کے ہاتھ میں تو بہت صفائی ہے لالی...... یہ تو بڑی کاریگر بن سکتی ہے۔'' شمع باجی، لالی کے ساتھ سلائی سینٹر کا دورہ کر رہی تھیں۔

اس بڑے ہال نما کمرے میں دس مشینیں تھیں تو دس ہی کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ زیادہ تر مطلقہ اور بیوائیں تھیں، بس ایک گوری غیر شادی شدہ، سولہ سترہ سال کی لالی کی بیٹی تھی۔ بے حد خوب صورت اور اپنے کام میں ماہر......

شمع باجی اسے خاص اہمیت دیتی تھیں اب بھی وہ برملا اس کی تعریفیں کر رہی تھیں۔

''میں نے اباجی سے اس کی بہت تعریف کی ہے وہ اس سے ملنا چاہ رہے ہیں۔'' شمع باجی نے لالی کو بتایا تو فخر سے اس کی گردن اکڑ گئی۔ اباجی کسی کو بلائیں تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی، وہ صرف خاص، خاص لوگوں سے ملتے تھے اور ایک بار اُن کی نظرِ عنایت کسی پر پڑ جاتی تو سمجھو اس کا بیڑا پار لگ جاتا۔

''کل گوری کو تیار رکھنا، میں اسے اباجی سے ملوانے لے جاؤں گی۔'' شمع باجی نے گوری کو بغور دیکھتے ہوئے لالی سے کہا تو اس نے فوراً گردن ہلادی۔

''کیوں نہیں باجی جی...... سو بسم اللہ۔''

☆☆☆

گوری نے نہا دھو کر اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنا اور لال لپ اسٹک بھی لگالی۔ جو لالی نے دیکھ کر اپنے دوپٹے سے رگڑ کر ہلکی کر دی۔

''اباجی برا نہ مان جائیں، بڑے اللہ والے ہیں وہ۔'' گوری ڈر سی گئی، وہ وہاں جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''پتا نہیں کیسے ہوں گے وہ، اماں میں ان سے کیا بات کروں گی؟''

''لے تو نے کیا بات کرنی ہے بس اُن کی خدمت خاطر کرنا، ان کے ہاتھ پیر دبانا جو وہ کہیں چپ چاپ سن لینا آگے سے بولنا نہیں، یہ اللہ والوں کا پتا نہیں ہوتا کب جلال میں آجائیں اُن کے سامنے سر ڈھک کر جھکا کر بیٹھنا، سمجھی کہ نہیں۔''

گوری نے اثبات میں گردن ہلائی۔

ابا جی کو دیکھ کر اس کے رگ و پے میں سنسنی اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔

وہ جتنے ذوق شوق سے اُن سے ملنے آئی تھی کہ کوئی نورانی چہرے والا سفید لمبی داڑھی والا بزرگ شخص ہوگا مگر اسے بہت مایوسی ہوئی۔ ابا جی کے بال اور لمبی داڑھی لال مہندی سے رنگی ہوئی تھی۔

سیاہ رنگت، بڑی، بڑی خوفناک آنکھیں جن میں لال ڈورے تیر رہے تھے، گلے میں سرخ منکوں کی مالا، ہاتھ میں تسبیح رول رہے تھے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کا جبہ پہن رکھا تھا۔

گوری کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان کی رنگت زیادہ کالی ہے یا ان کا جبہ......؟ گوری کو دیکھ کر ایک حریصانہ چمک ان کی آنکھوں میں آ گئی۔

''بہت خوب، تو ٹھیک کہتی تھی شمع مال واقعی بہت خاص ہے۔'' وہ مکروہ ہنسی ہنسے تو گوری کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ فوراً یہاں سے نکل کر بھاگ جائے۔ اس نے گھبرا کر شمع باجی کو دیکھا۔

''چلو آگے بڑھ کر ابا جی کے ہاتھ پاؤں دباؤ، کوئی بدتمیزی، بے ادبی نہ کرنا سمجھیں۔'' شمع باجی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو گوری نے گھبرا کر اُن کی چادر کا کونہ پکڑا۔

''باجی!'' اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔

''چل آگے بڑھ کر ابا جی کو تعظیم دے کوئی شکایت نہ ملے تیری ہاں ورنہ تم دونوں ماں، بیٹی کو نکال باہر کروں گی۔'' شمع باجی نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

گوری نظریں جھکا کر سمٹ کر بت کے مانند بیٹھ گئی۔

وہ دھیرے دھیرے ہل رہی تھی، ابا جی کے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

ارحم فجر کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگتی ماہین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ کیسا انقلاب آیا

کولیسٹرول اور یاد داشت

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اچھا کولیسٹرول یعنی ایچ ڈی ایل دل کی صحت کے لیے بے حد مفید ہے جبکہ برا یا خراب کولیسٹرول یعنی ایل ڈی ایل نہ صرف دل بلکہ انسانی زندگی کو خطرے میں ڈالتا ہے لیکن فرانسیسی ماہرین کی ایک تحقیق نے کولیسٹرول اور انسانی یادداشت کے مابین ربط کے حوالے سے نئے انکشافات کیے ہیں۔ اس تحقیق میں 3673 افراد کو شامل کیا گیا۔ یہ سب سول ملازمین تھے جنہیں 55 برس کی عمر میں اس تحقیق میں شامل کیا گیا 61 برس کی عمر میں ان کے کولیسٹرول اور یادداشت کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج کی روشنی میں ایچ ڈی ایل کی فی ڈیسی لیٹر 40 ملی گرام یا کم مقدار انسانی یادداشت پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے۔ کہ ایچ ڈی ایل کی کم مقدار ناقص یادداشت اور ادھیڑ عمری میں دماغی انحطاط کا سبب بھی بنتی ہے۔

اس تحقیق کے مطابق ہمیں صرف عارضۂ قلب سے ہی نہیں بلکہ ادھیڑ عمری اور اس کے بعد اپنی یادداشت اور دماغی صلاحیتوں کو برقرار رکھنے کے لیے کولیسٹرول کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ عمر کے کسی حصے میں اچھا کولیسٹرول مقررہ حد سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے، باجی کوئی دھاگا کوئی تعویذ ایسا دیں کہ ہمیں بھی سکون ہو۔" شمع باجی اس وقت کسی اور ہی کیفیت میں تھیں، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں انگارہ......

"حاسدوں نے تیرے مرد کی روزی باندھ دی ہے۔ میں تعویذ دوں گی وہ گھر کی دہلیز میں دبا دینا۔ تیرا کام ہو جائے گا۔"

اب ماہین کی باری آئی وہ جھجکتے ہوئے کھڑی ہوئی، وہ سہمی ہوئی تھی یہاں کا ماحول دیکھ کر۔

"جی، میرے اولاد نہیں ہے شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں، سارے ٹیسٹ کروا لیے ہیں، سب ٹھیک ہیں نہ جانے کیا مسئلہ ہے؟" ماہین نے ایک جست میں پوری بات بتادی۔

"ہوں۔" شمع باجی نے سر پوری قوت سے گھمایا آنکھیں اور چھوٹی کرلیں اور مراقبے میں چلی گئیں۔ چند سیکنڈز بعد آنکھیں کھول کر بولیں۔

"کمی تجھ میں نہیں، تیرے شوہر میں ہے اس کا علاج کروا۔"

"نہیں، نہیں، وہ بالکل ٹھیک ہیں، ان کے بھی سارے ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔" ماہین نے فوراً ہی کہا تو لالی نے اسے غصے سے گھورا۔

"باجی کے آگے بحث نہ کرنا، ان کا کہا اٹل ہوتا ہے وہ کبھی غلط نہیں کہتیں۔" شمع باجی نے پُرجلال انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔

"بولنے دے اسے۔ دل کی بھڑاس نکال لینے دے..... ابھی اسے پتا نہیں کہ میرا علم اور کمال کتنا طاقتور ہے اپنے مرد کو باجی کے پاس بھیج وہ اس کا علاج کریں گے۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یا مصور کی پڑھا کر۔ تو بانجھ نہیں ہے، میرے موکل کبھی غلط نہیں بتاتے..... ہر نوچندی کو حاضری دیا کر تیرا کام ہو جائے گا۔ اللہ ہو۔" انہوں نے بات پوری کر کے نعرۂ مستانہ بلند کیا تو ساری عورتیں بھی اللہ ہو کا ورد کرنے لگیں۔ کمرے کی فضا روحانیت سے لبریز ہونے لگی۔ ماہین بھی سب کے ساتھ ورد میں شریک تھی۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے، شمع باجی سونے سے قبل چہرہ اور ہاتھ پیروں کا مساج ضرور کیا کرتی تھیں اس وقت بھی وہ آئینے کے سامنے بیٹھی یہی کام کر رہی تھیں، سامنے ہی بیڈ پر "صاحب" نیم دراز تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔

"آپ کا کام کیسا چل رہا ہے صاحب؟" شمع باجی نے مساج کرتے ہوئے پوچھا۔

"اے ون......" صاحب نے دھواں اگلا۔

"یہ جو تم خوب صورت بننے کے لیے اتنے جتن کرتی ہو، امپورٹڈ کاسمیٹکس استعمال کرتی ہو مگر کوئی فرق تو نہیں نظر آتا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں ان کا مذاق اڑایا تو وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

"لوگ کہتے ہیں میرے اندر ایک پُراسرار کشش ہے، میرے چہرے پر ایک خاص کشش ہے، میں نور کا ہالہ ہوں۔"

"ہو، ہو... ہاہاہا......" صاحب پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے تو وہ باقاعدہ برا مان گئیں۔

"آپ اپنے بزنس کی بات کریں، میرے اوپر ریسرچ کرنے کی ضرورت نہیں آپ کو۔"

"بزنس زبردست جا رہا ہے، میں سوچ رہا ہوں ان دو ملکوں کے علاوہ لندن، امریکا اور کینیڈا میں بھی یہی کام شروع کر دوں۔"

"نہیں، وہاں آپ کا کام نہیں چلے گا بس دو ملک ٹھیک ہیں۔"

"یہ تمہارا علم کہتا ہے یا قیافہ مفروضہ لگا رہی ہو؟"

"بس، میں نے جو کہہ دیا اس پر عمل کریں زیادہ باتیں نہ بنائیں۔ یہ بتائیں آپ کا یہ ٹرپ کیسا رہا؟ مالکوں کو مال پسند آیا۔"

"میرے مالک بڑے جذباتی اور بے صبرے ہیں، ہر چیز ایک دم پرفیکٹ مانگتے ہیں، تمہیں تھوڑی اور محنت کرنا ہوگی۔" صاحب نے دوسرا گہرا کش لیا۔

"ساری میری ہی محنت ہوتی ہے، اس بار آپ کو بہت اچھا مال ملے گا۔ ایک دم فریش اور بیسٹ۔" شمع باجی نے مسکرا کر شوہر کو اطمینان دلایا اور دوبارہ سے مساج کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

☆☆☆

"یہ دیکھ لالی آپا۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں آج مجھے بخش دے تو آج ببلی کی ڈیوٹی لگا دے، ساری رات بخار میں پھنکتی رہی ہوں، میرا جوڑ، جوڑ دکھ رہا ہے آج مجھ سے کام نہیں ہوگا۔" بلو نے لالی کی منت کی تو لالی نے اسے جواباً گھر کا۔

"تمہیں تو نے کون سے پہاڑ توڑنے ہیں؟ ذرا سی مالش ہی تو کرنی ہے، باجی نے تیری ڈیوٹی لگائی ہے آج چوہدری صاحب نے خاص تیری فرمائش کی ہے، تیرے ہاتھ بڑے پسند ہیں انہیں... تجھے تو خوش ہونا چاہیے، منہ مانگا انعام ملتا ہے تجھے اُن کی طرف سے۔" لالی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"بس آپا، آج کی چھٹی اور معافی دے، دے آئندہ منع نہیں کروں گی۔ گوری کو بھیج دے ناں تو، وہ بھی تو تیار ہے اب۔"

"گوری کی بات نہیں کرنا وہ ان کی کاموں کے لیے نہیں ہے، اسے تو زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، میری بیٹی تو بڑی معصوم اور سیدھی ہے تم لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی مقابلہ نہیں آئندہ اس کا نام بیچ میں نہیں لانا باجی سے شکایت کردوں گی ہاں۔" اس کی بات پر لالی کو کرنٹ سا لگا تو وہ غصے سے بولی۔

"ہاں، ہم لوگ تو جیسے فالتو کے ہیں گھاٹ، گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہیں، ہماری ٹریننگ بھی تو شمع باجی نے کی ہے گوری کی بھی وہی کر رہی ہیں۔"

"گوری پر تو ان کی اور ابا جی کی خاص نظر ہے۔ گوری ایسے ویسے کاموں کے لیے نہیں ہے۔ ویسے بھی گوری تو باہر ملک والے کارخانے میں سلائی سینٹر کی انچارج بن کر جا رہی ہے۔ مجھے بھی باجی بھیج دیں گی تم جلو مرو نہیں۔" لالی نے گردن اکڑا کر فخریہ انداز میں کہا تو بلو حیران رہ گئی۔

"تیرے کتنے لمبے ہاتھ ہیں لالی آپا، تو ہر وقت ان کی خوشامد میں بھی تو لگی رہتی ہے۔"

"خوشامد نہیں میری خوب صورتی میری گوری کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

"بڑا ناز ہے ناں تجھے اپنی خوب صورتی پر...... چار دن کی ہے یہ، اور یہاں رہے گی تو کب تک اپنی بیٹی کو باجی کے خاص بندوں سے بچائے گی، بڑے لمبے ہاتھ ہیں باجی کے، تجھے تو سب پتا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" لالی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مجھے سب پتا ہے اور مجھے گوری کی حفاظت کرنا بھی آتی ہے، میں اپنی معصوم بچی کو حریص اور لالچی نظروں سے کوسوں دور رکھوں گی تو زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل تیار شیار ہو کر خوشبو، ڈر لگا کر تیار ہو جا چوہدری صاحب آتے ہی ہوں گے۔ باجی کا آرڈر ہے سمجھی۔"

بلو نے بے بسی سے لالی کو دیکھا اور مرے، مرے قدموں سے تیار ہونے چل دی۔

☆☆☆

"تم ہمارا کلب کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟ اس کی باقاعدہ ممبر بن جاؤ، بہت ممبرز ہیں ہمارے، سب ویل آف اور حسین و ذہین، ہمارے کلب میں کوئی بھی عام شخص تمہیں نہیں ملے گا۔ اسے جوائن کر کے یقیناً خوشی ہوگی اور اس دن تم بتا رہی تھیں تھراپی بھی آتی ہے تو والنٹیئر بن کر یہ کام بھی شروع کر دو۔ تم فارغ تو ہوتی ہو اور قریب بھی رہتی ہو۔ کام کا کام، ثواب کا ثواب...... پھر کیا خیال ہے؟" شمع باجی نے اپنے کلینک میں بیٹھی ماہین کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کی۔

"ہوں، آئیڈیا تو بہت اچھا ہے میرا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا، میں آپ کو ارحم سے معلوم کر کے بتاؤں گی۔"

"اپنے شوہر کو بھی کلب کا ممبر بنا لو وہ بھی فائدے میں رہے گا۔ ہمارے کلب میں بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد بھی ہیں، ہمارے ہاں ممبرز کے گیٹ ٹو گیدر ہوتے رہتے ہیں۔ تم لوگوں کی تنہائی بھی دور

ہو جائے گی۔ سوچ لو مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، میں تو بس ثواب کی غرض سے تمہیں کہہ رہی ہوں، شاید کسی طرح اللہ تمہاری سن لے۔''

شمع باجی نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ ماری، ماہین سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ ماہین نے ارحم کو ساری باتیں بتائی ہوئی تھیں اب یہ بات بھی بتائی تو وہ بولا۔

''نہیں بھئی مجھے تو بخشو، میرے پاس کرنے کو بہت کام ہوتے ہیں تم شوق سے کرو، اچھا ہے تمہارا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا۔''

''اور وہ جو اباجی سے ملنے والی بات میں نے کہی تھی اس پر تم نے کچھ سوچا؟''

''دیکھو ماہین، میں ان چکروں میں پڑنا نہیں چاہتا، نہ ہی میں ان باتوں کو مانتا ہوں۔ ہم نے سارے ٹیسٹ کروالیے ہیں، سب کلیئر ہیں اب بس قدرت کو مہربان ہونے کی دیر ہے، وہ نواز دے تو بہت کرم ہے اس کا اور اگر نہ بھی دے تو میں صبر کرلوں گا۔ کتنے ہی لوگ اس نعمت کے بغیر بھی جی رہے ہیں ہم بھی جی لیں گے۔''

''آہ!'' ماہین نے لمبی سانس لی۔

''کاش میں بھی تمہاری طرح صبر والی ہوتی ارحم...... مگر میرے اندر اتنا صبر اور ضبط کہاں۔''

''تو پیدا کرو، ہم قدرت سے جنگ نہیں لڑ سکتے گناہ ہے یہ۔'' ارحم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم ضرور کلب جوائن کرو، اچھا ہے فضول باتوں اور سوچوں سے آزاد رہوگی، دس لوگوں میں بیٹھو اٹھوگی تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ دنیا میں تم سے بھی زیادہ کتنے اور دکھی لوگ ہیں جو اللہ سے بنا شکایت کے جی رہے ہیں۔''

☆☆☆

آج بارہ ربیع الاول کا دن تھا۔ ایوانِ محمدی سبز اور سفید قمقموں سے جگمگا رہا تھا گویا اس پر نور کی بارش ہو رہی ہو۔

ایوانِ محمدی کا آستانہ بھی روحانیت سے سرشار تھا، مسند پر آج اباجی براجمان تھے، سامنے سیکڑوں مریدین عقیدت سے زانو جوڑے بیٹھے انہیں سن رہے تھے۔ وہ فرمارہے تھے۔

''عزیز دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں، آج عیدوں کی عید ہے، مسلمانوں کی سب سے بڑی عید' جشن مناؤ، چراغاں کرو، محفلیں سجاؤ کہ آج ہمارے آقا ہمارے سردار اس جہانِ فانی میں تشریف لائے اور حق کا بول بالا کیا۔ کفر اور شرک مٹ گیا، حق' باطل پر غالب آ گیا، کمزوروں کو سہارا ملا۔ وہ بے بسوں کا بس.... بے کسوں کا کس ٹوٹے دلوں کا سہارا، اللہ کا پیارا جس نے اس جہانِ فانی کو سنوارا۔ وہ دونوں جہانوں کا بادشاہ تھا ہے اور رہے گا۔ میرے عزیز بھائیوں! تمام فرشتے' جنات، ولی اولیاً سب حرم پاک میں جمع ہو رہے ہیں شاید مجھے بھی حاضری کا اشارہ ہو جائے، مجھ سے بھی کوئی ادنیٰ کام لیا جائے۔ میرے بعد میری تعلیمات بھلا مت دینا، ہلاکت میں نہ پڑ جانا مبادا ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ، کدورت، حسد اور بغض سے اپنے دلوں کو صاف کرلو کہ حاسد اور بغضی کی بخشش نہیں، زانی کی بخشش نہیں۔ ہوسکتا ہے مجھے واپس آنا نصیب نہ ہو تو میرے بعد ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لینا، نفاق نہ ڈالنا سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، اور آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مرشد کو نذر ضرور دو، تم مرشد کی نظر کے اور مرشد تمہارے نذر کا محتاج ہے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو، امید ہے تم اپنے مرشد کی باتوں کا احترام کروگے۔''

ان کے آخری کلمات سن کر مریدین نے اپنے، اپنے لائے لفافوں کو ہتھیلی ملا کر تبرک کی طرح ان کے سامنے بڑھایا اباجی اپنے نائب کو لفافہ تھماتے رہے۔

آخر میں اللہ ہو کا ورد ہونے لگا۔ فضا میں روحانیت اور پاکیزگی چھاگئی، ہر زبان پر ذکر اللہ تھا اباجی اپنی سونے کے دانوں کی تسبیح پر آنکھیں بند کیے اللہ ہو کے ورد کے ساتھ عقیدت سے جھوم رہے تھے۔

☆☆☆

''ہم یہ سارا کام فری سروس کے طور پر کرتے ہیں کسی سے کوئی پائی پیسہ نہیں لیتے۔ ہمارے مریضوں میں زیادہ تر بے سہارا بوڑھے اور یتیم بچے شامل ہوتے ہیں خواتین کا مساج اور تھراپی خواتین ہی کرتی ہیں جو ہماری ورکرز ہیں، ان کی رہائش اور قیام و طعام کا سارا خرچہ میرے ذمے ہے، میں سب کا خیال رکھتی ہوں۔'' شمع باجی تھراپی روم اور مساج روم کا وزٹ کرواتے ہوئے ماہین کو سب بتا رہی تھیں۔

''اب تم جو فیلڈ پسند کرو، مساج یا تھراپی، تمہاری مرضی ہے۔''

''آپ اتنا کچھ کیسے کرلیتی ہیں، آپ تو رول ماڈل ہیں سب کے لیے۔'' ماہین نے عقیدت بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔''اس طرح اللہ بھی راضی بندے بھی خوش...... آپ کتنی خوش قسمت ہیں کاش ہر عورت آپ جیسی ہوجائے تو یہ دنیا حقیقت جنت بن جائے۔''

اب وہ دونوں کلینک میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

''ماہین، تم حسین ہونے کے ساتھ، ساتھ ذہین بھی ہو، حسن اور ذہانت میری کمزوری ہیں، میں بہت دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، پتا نہیں تمہیں کیسی لگے میری بات؟'' شمع باجی کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

''جی ضرور کہیے، آپ تو سب کچھ کہہ سکتی ہیں مجھے تو آپ کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔'' ماہین نے عاجزی سے کہا۔

''ماہین میں چاہتی ہوں تم لالی کی جگہ لے لو، تم میں بہت گٹس ہیں تم یہ کام بہت اچھی طرح کرلوگی ویسے بھی میں لالی کو کہیں اور شفٹ کرنے کا سوچ رہی ہوں۔''

''اُف اتنا بڑا کام اور میں؟'' ماہین نے ... جھرجھری لی۔

''یہ کام تو شاید میں نہیں کرسکتی، یہ بہت بڑی ذمے داری ہے، یہ میں نہیں اٹھا پاؤں گی، آپ کسی اور کو دیکھ لیں۔''

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے ماہین، تم اس کام کی اہل ہو جلد کام بھی سمجھ لوگی۔ سوچ سمجھ کر مجھے بتاؤ میں انتظار کروں گی۔''

☆☆☆

''یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی شمع بیگم۔'' مزمل صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے شمع باجی کو مخاطب کیا۔

''گوری تو چلو کام کی ہے، لالی کا میں کیا کروں گا؟ وہ میرے کس کام کی؟''

''ٹکا دینا کسی بوڑھے رئیس کو۔ لالی کی تو لاٹری نکل آئے گی اس کا بڑھاپا سدھر جائے گا۔'' شمع باجی نے بے دردی سے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

''تمہارے خیال میں بوڑھا رئیس اسے ساری عمر اپنی بیوی بنا کر رکھے گا؟ یہ تمہاری خام خیالی ہے شمع بیگم۔ اب حالات وواقعات بہت بدل چکے ہیں، اب اس کام میں بہت کمپیٹیشن ہے لالی کی عمر کی عورتوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔''

''افوہ......'' شمع باجی نے جھنجلا کر کہا۔'' میں بیزار آگئی ہوں لالی سے...... منہ کو آنے لگی ہے، سوال جواب بہت کرتی ہے، وہیں کہیں سمندر میں دھکا دے دینا اسے بھی میری بلا سے۔''

''بہت ظالم اور بے درد ہو شمع بیگم...... سانپ کی طرح کینچلی بدلتی ہو پھر بھی اللہ والی ہو۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم دونوں باپ، بیٹی کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔''

''آئے گی بھی نہیں۔'' شمع باجی نے غصے سے نتھنے پھلا کر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''آپ اپنے ننھے سے دماغ پر زیادہ زور نہ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''اچھا لالی کی جگہ کس کو رکھوگی؟'' مزمل صاحب نے دلچسپی لے کر پوچھا۔

''ہے ایک نایاب، کوہ نور ہیرا...... صاف شفاف، تراشا ہوا۔'' کہتے کہتے شمع باجی کی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں چمک سے بھر گئیں۔

''مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' صاحب کا شوق بڑھا۔

''نہیں، ابھی نہیں وقت آنے پر...... وہ ہرنی ہے میں اسے شیرنی بنانا چاہتی ہوں۔ میں اس کی ایسی تربیت کروں گی کہ وہ میرا کلمہ پڑھتے نہیں تھکے گی۔'' اُن کے لہجے میں جو تھا اسے محسوس کر کے صاحب اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئے۔

''نہیں بتاؤ تمہاری مرضی، چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی۔''

''ہاں، وہ چاند ہی تو ہے، میں اسے ایوانِ محمدی کا چاند بنا کر ہی دم لوں گی۔'' شمع باجی کا انداز فاتحانہ تھا۔

☆☆☆

''شمع باجی مجھے اپنا اسسٹنٹ بنانا چاہ رہی ہیں، انہیں کیا جواب دوں؟'' ماہین اور ارحم ڈائننگ چیئرز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

''ان کی اسٹنٹ کو کیا کام کرنے ہوتے ہیں؟'' ارحم نے نوالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''تقریباً سارے ہی، سب ورکرز کو ڈیل کرنا، آستانے میں آئی خواتین کو دیکھنا، سب کے مسائل پر نظر رکھنا، بڑی ٹف ڈیوٹی ہے، شمع باجی بہت اصرار کر رہی ہیں، وہاں درس بھی ہوتا ہے، میلاد اور محافل بھی ہوتی ہیں بہت کچھ ہوتا ہے وہاں۔ میرا دل چاہ رہا ہے میں ان کی بات مان لوں۔ ویسے بھی دن بھر فارغ تو رہتی ہوں اچھا ہے اللہ سے قربت اور بڑھے گی۔ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا ذکر کرنا، کیوں ارحم؟''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو، میرا بھی اب تو دل کرنے لگا ہے وہاں جا کر یہ سب دیکھنے اور سننے کو۔''

''ہاں تو چلا کریں ناں، ہر نوچندی جمعرات کو مردوں کا بھی اجتماع ہوتا ہے وہاں اور اکثر کلب کے ممبرز کا بھی گیٹ ٹو گیدر ہوتا ہے ایک مرتبہ جا کر تو دیکھیں۔ آپ کا دل پھر خود بخود جانے کو چاہے گا۔ سارے پڑھے لکھے اور ویل آف ممبرز ہیں، ہر مرتبہ لکی ڈرا بھی ہوتا ہے جیتنے والے کو عمرے کا ٹکٹ دیا جاتا ہے۔ شمع باجی کے شوہر کی محمدی ٹریولرز کے نام سے حج و عمرے کی ٹریولنگ ایجنسی ہے۔ ہر مہینے یہ لوگ کسی نہ کسی کو عمرے پر بھجواتے ہیں، سچ میں بڑے نیک اور خدا ترس لوگ ہیں۔'' ماہین نے عقیدت سے کہا تو ارحم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''چلوں گا کسی دن تمہارے ساتھ۔ ابھی تو تم کھانا صحیح سے کھاؤ، تم اب اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ چہرہ دیکھو تمہارا کتنا ڈل ہو رہا ہے۔''

''حیرت ہے۔'' ماہین نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''شمع باجی تو کہتی ہیں میں روز بروز خوب صورت ہوتی جا رہی ہوں۔''

''اللہ والوں کو ہر چیز خوب صورت نظر آتی ہے کیونکہ اللہ خود خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے اللہ جمیل ویحب الجمال۔''

☆☆☆

عاشی، مساج روم سے تیزی سے روتی ہوئی باہر نکلی۔ پیچھے، پیچھے ڈاکٹر ولی محمد... مسکراتے ہوئے باہر آئے اور تیزی سے چلے گئے۔

ماہین، عاشی کو اس طرح روتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عاشی اب روتے، روتے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی تھی، ماہین بھی اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور اسے چپ کروانے کی کوشش کرنے لگی۔

عاشی صبح میں سلائی سینٹر میں کام کرتی تھی اور کبھی کبھی شام میں مساج وغیرہ بھی کر دیا کرتی اسے بری طرح روتے دیکھ کر ماہین پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا عاشی، تم اس طرح کیوں رو رہی ہو بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟'' ماہین نے عاشی کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''خبیث ہر ہفتے تنگ کرنے آجاتا ہے، نام دیکھو اور کرتوت دیکھو شیطان کہیں کا۔'' عاشی اب بھی سسک رہی تھی، ماہین حیران رہ گئی۔

''یہ تم ڈاکٹر ولی محمد کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ وہ تو بہت نائس آدمی ہیں کلب کے فنکشنز میں میری ان سے

ملاقات ہوئی ہے۔ایک دو بار، میں نے تو انہیں بہت اچھا پایا ہے، پتانہیں تم کیوں ایسا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں جب خود کا پالا پڑے گا ناں ایسے مردوں سے تب تم سے پوچھوں گی۔'' عاشی نے ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے نفرت سے کہا۔

''تو تم اندر کیا کرنے گئی تھیں اور وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟'' ماہین نے نا سمجھ آنے والے انداز میں پوچھا۔

''میرے نصیب برے تھے آج یوں سمجھ لو، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی، تم یہاں رہوگی تو خود سب سمجھ آنے لگے گا۔ ہمیں زبان کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔'' عاشی تیزی سے اٹھ کر وہاں سے تقریباً بھاگتی ہوئی نکلی۔

ماہین اپنی جگہ بت بنی بیٹھی تھی، یہ کیا معما تھا، اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

شمع باجی، ماہین کے ساتھ جڑی بیٹھی تھیں، وہ کھوئے کھوئے انداز میں اس کے بال سہلا رہی تھیں اور اسے بغور دیکھے جا رہی تھیں، ماہین کو اُن کے اس نئے انداز سے بہت اُلجھن ہو رہی تھی۔

شمع باجی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''تمہارے غم کا علاج ہے میرے پاس اگر تم مان جاؤ تو......''

ماہین نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ اب اس کے حسن کو سراہ رہی تھیں۔

''تم کتنی خوب صورت اور پُرکشش ہو ماہین...... میں اگر مرد ہوتی تو تم پر فدا ہو جاتی، مرمٹتی تم پر۔'' وہ اس کے لب پر انگلی پھیر رہی تھیں۔

ماہین ان سے تھوڑا دور ہو کر کھسکی۔

''آپ کے پاس کیا علاج ہے میرا بتائیں؟'' ماہین نے اپنی سانسوں کو بحال کرتے ہوئے پوچھا۔

''برا تو نہیں مانو گی؟ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کوئی راستہ نہیں......'' ان کے کہنے کا انداز بہت پُراسرار تھا۔

''اور قریب آؤ میرے پھر بتاؤں گی یہ راز کی

محبت ہو بھی سکتی ہے

پگھل پتھر بھی سکتے ہیں
الٹ دریا بھی سکتا ہے
کوئی آوارہ سا پنچھی
پلٹ کر آ بھی سکتا ہے
وہ شب جو
مجھ پر ہنستی ہے
وہی شب رو بھی سکتی ہے
محبت ہو بھی سکتی ہے

مرسلہ: شبنم میر، سیالکوٹ

بات ہے، میں تمہارے چہرے کو پیار کر سکتی ہوں؟'' ان کا لب ولہجہ ہی کچھ اور تھا اس وقت...... ماہین کو ان کا یہ انداز دیکھ کر بہت اُلجھن ہو رہی تھی۔

اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر انہوں نے کئی گرم، گرم بوسے اس کے چہرے پر ثبت کر دیے۔

ماہین بوکھلا سی گئی۔

''میں کیا بہت بری ہوں ماہین؟'' انہوں نے ماہین پر نظریں جمائیں۔

''کوئی مجھے پیار نہیں کرتا، سب اپنی غرض اور لالچ میں میرے پاس آتے ہیں، میرے قدموں میں بیٹھتے ہیں، میرے دل میں کیا ہے، میرا دل کیا چاہتا ہے یہ کوئی جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔'' ان کے لہجے میں بے بسی اور بیچارگی تھی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ماہین ان کا یہ روپ دیکھ کر حیران پریشان تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے اُگ آئے تھے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''تم مجھے پیار کرو گی ناں؟ لالی بھی مجھے خوب پیار کرتی تھی اس نے میرے بڑے کام نکالے ہیں تم بھی اس جیسی بن جاؤ ناں...... یہ لو...... چہرے پر نہ سہی

ہاتھ پر ہی پیار کرلو میرے اندر بھڑکتی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ آگے کیا، ماہین اپنے اندر سمٹنے لگی۔

شمع باجی پر گویا وحشت طاری تھی۔ انہوں نے ماہین کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔

ماہین نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو چھڑایا اور وہاں سے نکل کر بھاگی۔ پھر کتنے ہی دن ماہین وہاں نہیں گئی، وہ بری طرح الجھ کر رہ گئی تھی شمع باجی کا یہ روپ دیکھ کر...... اس نے نفسیات پڑھی ہوئی تھی اس کے خیال میں ان کے اندر کوئی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ جس کا کھلنا ضروری تھا ان کا کتھارسس ہونا ضروری تھا۔

اسی بے چینی اور خموشی کو ارحم نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ گم صم سی رہنے لگی تھی۔

''کیا بات ہے آج کل ایوانِ محمدی کا خبر نامہ نہیں سنا رہی ہو، تمہاری زبان پر تو ہر وقت شمع باجی کا ذکر رہتا تھا، اب کیا بات ہوگئی ہے تم اتنی خاموش کیوں ہو؟'' ارحم نے ایک دن اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

ماہین نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنی جان چھڑانی چاہی اور اصل بات نہیں بتائی ارحم کو بھی یقین نہیں آیا۔

''تم نے وہاں جانا کیوں چھوڑا ہوا ہے؟ جایا کرو روز...... اس طرح تم فریش رہتی ہو۔ مجھے بھی جس دن ٹائم ملا وہاں جاؤں گا۔''

''نہیں، نہیں تم وہاں نہیں جانا ارحم......'' ماہین بے ساختہ بولی تو ارحم حیران رہ گیا کہ کہاں تو وہ اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی وہاں جانے کے لیے۔

''کیوں بھئی، ایسا کیا ہوگا کہ تم اب مجھے منع کر رہی ہو؟''

''وہ...... وہ وہاں مردوں کے لیے اچھا ماحول نہیں ہے، بس۔'' وہ گڑبڑا کر بولی تو ارحم اور زیادہ حیران و پریشان ہوا۔

''تم تو اتنی تعریفیں کر رہی تھیں وہاں کے ماحول کی اب کیا ہوگیا یکایک بھئی؟''

''بس...... میں نے منع کر دیا ناں، ابھی نہیں جانا وہاں جب میں کہوں تب جانا۔''

''اوکے، اوکے میں کون سا جا رہا ہوں مگر تم ضرور جاؤ، ایک ہفتہ وہاں نہ جانے سے تم بالکل مرجھا کر رہ گئی ہو، اپنا خیال رکھا کرو ڈیئر۔'' ارحم نے ہولے سے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

☆☆☆

شمع باجی اپنے کمرے میں جلے پیر کی بلی کی طرح گھوم رہی تھیں۔ وہ خود کلامی کر رہی تھیں۔

''اس نے مجھے دھتکارا ہے میں اسے سرتاپا بدل دوں گی، میں اس کا قلب تک بدل دوں گی، وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ بڑا زعم ہے اسے اپنے حسن پر...... میں اس کا حسن مٹی میں ملا دوں گی، ذلیل و خوار کردوں گی اسے میں۔'' ان کے اندر جوالا مکھی پھوٹ رہا تھا۔ ضبط کی شدت سے سانولا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے دونوں مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ ابروائیں تنی ہوئی تھیں، ان کا شیطانی ذہن تیزی سے منصوبہ بنا رہا تھا۔ پندرہ دن تک ماہین سوچ و بچار میں مبتلا رہی، بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شمع باجی کی گتھی سلجھا کر ہی دم لے گی، اس کے لیے وہاں روز جانا ضروری تھا سو وہ ایوانِ محمدی چلی آئی، وہاں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی بس لالی اور گوری شفٹ کر دی گئی تھیں۔ اب شمع باجی کو ماہین کی ہاں کا انتظار تھا۔

اس وقت بھی وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

ماہین نے انہیں اس دن کی بات یاد دلانا چاہی، وہ معذرت کرنے لگیں۔

''وہ دراصل کبھی کبھی مجھ پر حسین لوگوں کو دیکھ کر ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میں تم سے اس دن کے لیے معذرت کرتی ہوں، نہ جانے میں اس دن کیا کیا کہہ گئی۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے آپ جو اس دن میرے علاج کی بات کر رہی تھیں میں وہ یاد دلا رہی ہوں آپ کو۔''

''اچھا، اچھا یاد آیا۔'' وہ گردن ہلا کر بولیں۔

''سنو ماہین یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہیے، سمجھیں۔'' ماہین نے اثبات میں گردن ہلائی۔

پھر جوں، جوں وہ بولتی گئیں ماہین کے عضلات تن گئے، دورانِ خون تیز ہوگیا اور آنکھیں خوف اور ذلت کے احساس سے ابل پڑیں۔

''بس کریں پلیز، مجھے آگے نہیں سننا، آپ کو احساس بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اتنا بڑا گناہ؟ آپ نے کیا سوچ کر مجھ سے ایسی گری ہوئی بات کی؟''

''عورت تو اولاد کے لیے کیا، کیا قربانیاں دیتی ہے یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں' یہ جو جگہ، جگہ بانجھ پن کے علاج کے سینٹر کھلے ہوئے ہیں وہاں کیا ہوتا ہے بھلا؟ طریقہ یہی ہے وہاں بھی بس طریقہ کار مختلف ہے۔''

''خدا کے لیے مجھے گمراہ نہ کریں، میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنی گھٹیا بات بھی کرسکتی ہیں اور کتنے روپ ہیں آپ کے شمع باجی۔'' کہتے، کہتے ماہین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میں اتنی گئی گزری بھی نہیں کہ اولاد کے لیے اپنی عزت وناموس داؤ پر لگادوں۔''

''تم جذباتی ہورہی ہو ماہین، گھر جاکر ٹھنڈے دل ودماغ پر سے سوچنا۔''

''میں اب یہاں آؤں گی ہی نہیں۔'' وہ غصے سے کہتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شمع باجی نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

''اتنا غصہ بھی اچھا نہیں، دیکھو تم جس بچے کا مساج کرتی ہو وہ کب سے تمہارا انتظار کررہا ہے، تمہارے علاوہ وہ کسی اور سے مساج نہیں کرواتا۔ پلیز آج اسے دیکھ لو۔ پھر بے شک نہیں آنا چلو غصہ تھوک دو، یہ دیکھو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔'' انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے ہتھیلی سے آنکھیں صاف کیں۔

وہ مساج روم کے آگے کھڑی تھی، شمع باجی نے دروازے کا ہینڈل کھول کر اسے اندر کیا اور تیزی سے دروازہ باہر سے لاک کردیا۔

وہ ان کی اس حرکت پر ششدر رہ گئی چند ثانیے کو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سامنے بیڈ پر کوئی مرد لیٹا ہوا تھا۔ اس کی چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔

وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا ماہین کو نہ کچھ سمجھ آرہا اور نہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شمع باجی سے شدید ترین نفرت محسوس ہورہی تھی۔ اس نے زور، زور سے چلاکر دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔

''کچھ نہیں ہوگا...... یہ ساؤنڈ پروف کمرا ہے، چپ چاپ اپنا آپ میرے حوالے کردو۔''

ماہین کو لگا کہ وہ انگاروں پر کھڑی ہے اور کسی گہری کھائی میں گررہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ماہین کو اپنا وجود مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

ماہین اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی' کچھ بولتی تھی نہ کھاتی پیتی تھی' ارحم پوچھ، پوچھ کر تھک گیا۔ اس کی زبان پر گویا تالے لگ گئے تھے بالکل ابنارمل لگنے لگی تھی۔ اپنے آپ سے بیگانہ سب سے بے پروا...... گھر ملازموں پر چل رہا تھا۔ ارحم سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹروں کے بعد اس نے اسے ماہر نفسیات کو دکھایا سب کا یہی کہنا تھا کہ انہیں گہرا شاک لگا ہے، ارحم یہ جاننے سے قاصر تھا کہ اسے کس بات کا صدمہ ہے؟ کس بات نے اس کی یہ حالت کردی ہے، وہ ایوانِ محمدی معلوم کرنے گیا تو کسی نے اسے صحیح بات نہیں بتائی۔ شمع باجی نے ٹال دیا کہ وہ تو کب کی یہاں سے جاچکی ہے۔ ہم نے ہی اسے نکالا ہے وہ کردار کی ٹھیک نہیں تھی۔

ارحم نے اپنا سر پکڑلیا۔ وہ ماہین کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیسی ہے؟ وہ جلد باز، بے صبری سب کچھ ہوسکتی تھی مگر بدکردار ہرگز نہیں تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے دوائیں کھلاتا، وہ اس سے دور بھاگتی۔

''نہیں، نہیں میرے قریب نہ آؤ، میں ناپاک ہوں، تم بھی ناپاک ہو جاؤ گے۔'' پاکی، ناپاکی اس کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن چکے تھے۔

کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی، ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ آہستہ، آہستہ دوائیں اثر کریں گی تو یہ اس کیفیت سے باہر آجائیں گی بس صبر اور ہمت کی ضرورت ہے، سو یہ دونوں چیزیں ارحم میں کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھیں وہ صبر کرنے پر مجبور تھا۔

☆☆☆

''باجی، اِک واری شمع باجی کو دکھا لیو آپ...... انشاء اللہ فوراً چنگی بھلی ہو جاؤ گی۔'' اس کی یہ حالت دیکھ کر تاجو نے ایک دن کہا تو اسے بہت کچھ یاد آنے لگا اس نے لپک کر تاجو کی گردن پکڑی۔

''کس کا نام لیا تو نے...... کس کا؟'' تاجو سہم گئی۔

''وہ...... وہ بہت بڑی جادوگرنی ہے، فتنہ ہے وہ، شیطان کی چیلی ہے، اب نام نہ لینا اس کا ورنہ تجھے مار ڈالوں گی سمجھیں۔'' تاجو نے بڑی مشکلوں سے اپنی گردن چھڑائی قریب ہی کھڑا ارحم دونوں کی باتیں سن رہا تھا، وہ لپک کر ماہین کے پاس آیا۔

اس نے اسے پیار سے تھام کر کرسی پر بٹھایا، پانی پلایا، بہت دنوں بعد وہ بولی تھی۔ ارحم اس سے بہت کچھ اگلوانا چاہتا تھا بس یہی وقت تھا اس کام کا۔

''تم کیا کہہ رہی تھیں ابھی ماہین، کون فتنہ اور جادوگرنی ہے؟''

''وہ...... وہ شمع ڈائن، جھوٹی، وہاں سب جھوٹے اور بہروپیے ہیں، وہ سب کو ڈرا کر دھمکا کر رکھتی ہے اس نے مجھے بھی...... مجھے بھی۔'' ماہین کہتے، کہتے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

ارحم اسے چپ کروانے لگا، بہت دیر رونے کے بعد وہ چپ ہوئی۔

''تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے ماہی......؟ مجھے بتاؤ میں سب سے بدلہ لوں گا بتاؤ مجھے۔'' ماہین نے پھر دھیرے، دھیرے ساری باتیں ارحم کو بتا دیں، وہ روتی جاتی تھی اور بولتی جاتی تھی۔ ارحم کا ضبط جواب دینے لگا، اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

''اتنا بڑا دھوکا اور فراڈ......'' یہ سوچ کر ہی اس کے خون کے اندر ابال اٹھنے لگے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سب فراڈیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔

ارحم نے تھانے جا کر ان لوگوں کے خلاف زنا بالجبر اور فحاشی اور بدکاری کا اڈا چلانے کی ایف آئی آر کٹوائی۔

پولیس نے چھاپہ مارا، سب کو گرفتار کر لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں کام کرنے والی ورکرز کو سلطانی اور وعدہ معاف گواہ بنا کر چھوڑ دیا گیا اب حوالات میں شمع باجی، ابا جی اور مزمل صاحب بند تھے اور اپنے تمام اثر رسوخ استعمال کر رہے تھے۔ مگر ان کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت اور شواہد تھے کہ ضمانت پر بھی رہائی مشکل تھی۔ ماہین نے عدالت میں جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروایا اب وہ بالکل حواسوں میں تھی۔

☆☆☆

اس بات کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے، ایوانِ محمدی چلانے والے اب جیل میں ہیں، ماہین کی کوکھ میں پلنے والا گناہ خود بخود ختم ہو گیا اور اللہ نے ان پر کرم کرتے ہوئے انہیں ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا جس کا نام دونوں نے مل کر عطا محمد رکھا۔

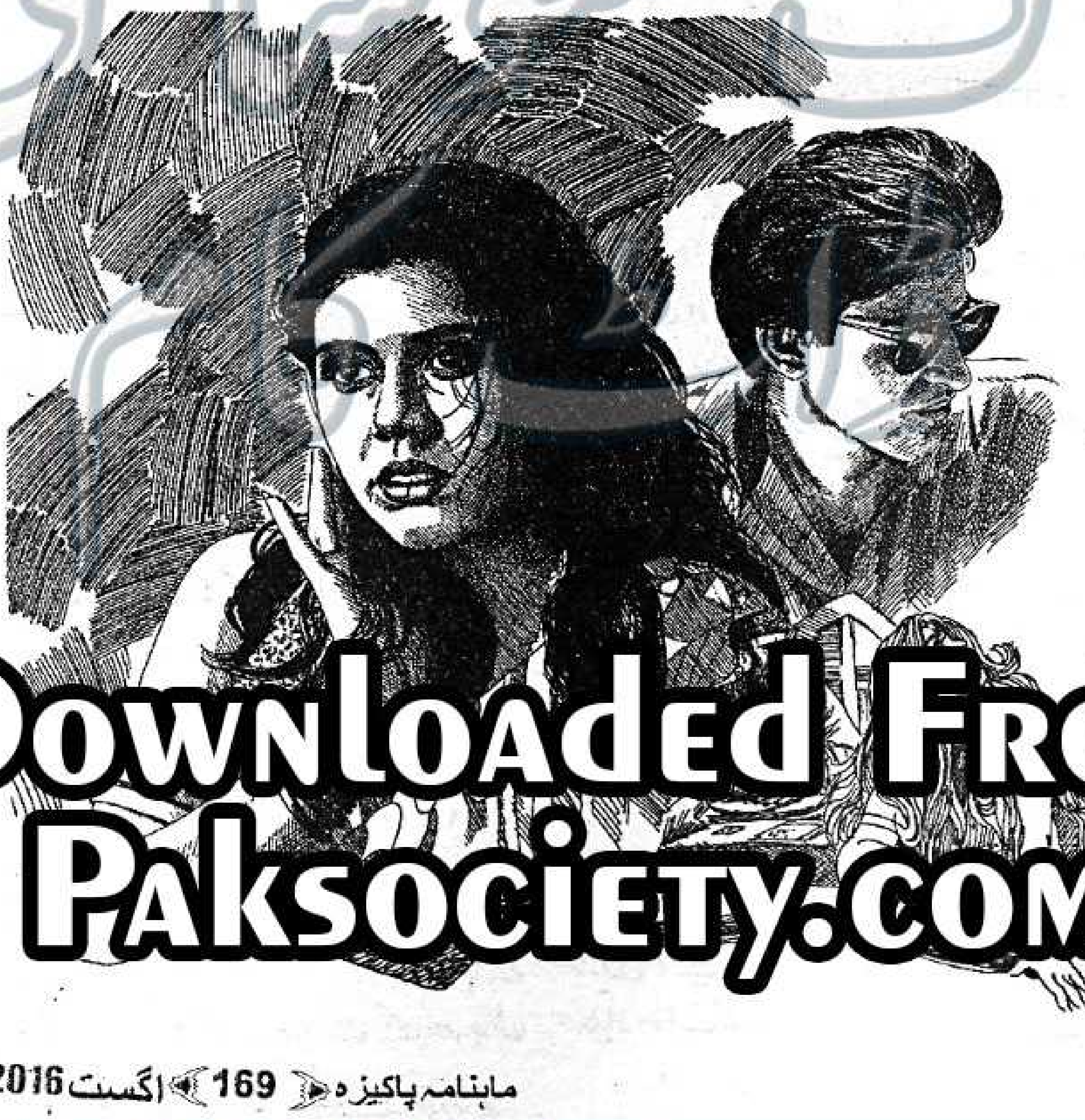
وہ دونوں اب مطمئن اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

ایوانِ محمدی کا دروازہ اب بھی سب پر دن رات کھلا رہتا ہے اب اس کو چلانے والے ارحم اور ماہین ہیں، وہاں اب بھی درس اور محافل ہوتی ہیں، مساج اور تھراپی بھی غریبوں کی مفت ہوتی ہے اور سلائی سینٹر میں کام کرنے والے چہرے بدل گئے ہیں مگر کام اصل میں سلائی کڑھائی کا ہو رہا ہے۔ ماہین اور ارحم دن رات نیک کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور سیکڑوں مستحق اور ضرورت مند افراد کی دعائیں سمیٹ رہے ہیں۔

مجھے آتا ہے

ہاجرہ ریحان

''ہم پر تو عمل کروادیا ہے اسی وجہ سے تو یہ سب ہو رہا ہے......'' ساس صاحبہ نے یہ کہتے ہوئے میری طرف امید سے دیکھا کہ میں بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملادوں۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گئی پر یک دم مجھے خیال آیا کہ کہیں میری خاموشی سے وہ مجھ پر ہی شک نہ کرنے لگیں ایسے لوگ جن کو ہر کسی پر دشمن کا گمان ہوتا ہے وہ آخر کار اپنے بال بچوں تک سے بیر رکھنے لگتے ہیں...... پھر میں تو نئی نویلی دلہن تھی۔ ابھی دو چار ہفتے



ہی تو ہوئے تھے اس گھر میں بہو کی حیثیت سے آئے ہوئے۔ ارینج میرج کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ ہونے والے جیون ساتھی کے بارے میں نہیں جان پاتے تو وہ بھی کچھ کم آپ سے انجان نہیں ہوتا لہٰذا بہت آسانی سے آپ چاہیں تو ایک نئی صورت و عادتوں کے ساتھ اس کی زندگی میں باقاعدہ شامل ہو سکتے ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ پہلے آپ پردہ کرتی تھی یا نہیں، ہنس مکھ تھیں یا سنجیدہ...... آپ کو میوزک سے لگاؤ تھا کہ نہیں وغیرہ...... اور یہ ایک بہت ہی خوش اور حیرت زدہ کر دینے والا تجربہ ہوتا ہے جہاں آپ بالکل کورے ہو کر کسی کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں اور کیا چاہیے، زندگی نے آپ کو بالکل فریش اسٹارٹ دے دیا ہے۔ اب جیسی بھی صورت آپ اپنی دکھانا چاہیں گی سسرال اور جیون ساتھی آپ کو ویسا ہی قبول کرلیں گے۔

پھر بھی کچھ باتیں کچھ انداز کچھ آپس کی بات چیت سے جیون ساتھی کا نہ سہی مگر کم از کم پورے خاندان کا ایک مجموعی اندازہ تو لگایا جاسکتا ہی ہے اور ایسا ہی کچھ میں نے اور ظاہر ہے میرے خاندان والوں نے شوہر صاحب کے خاندان کے بارے میں اندازہ لگایا تھا یہی کہ پڑھے لکھے ہیں...... پیسوں کی ریل پیل نہیں تو کمی بھی نہیں...... آسودگی سے اپنے مکان میں رہتے ہیں اور سب لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل رہتے ہیں...... اور اتنا ہی کافی بھی تھا۔ مگر پھر پہلی ہی رات میں نے اسی قسم کا کوئی جملہ سنا تو حیران رہ گئی۔

''یہ کیا؟ اتنے پڑھے لکھے لوگ بھی اس قسم کی سوچ رکھ سکتے ہیں؟''

کیا واقعی سفلی عمل...... جادو، ٹونا، ان سب کا کوئی وجود ہے ہاں مانا کہ جادو کا قرآن شریف میں تذکرہ ہے مگر قرآن شریف میں تو اور بھی تو بہت سی باتوں کا تذکرہ ہے بلکہ ہر خشک و تر کا تذکرہ...... ہم صرف اپنے مطلب کی ایسی ہی کسی بات کو کیوں پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں یہی تو بات ہے جو ہمارے پڑھے لکھے اور جاہل ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ بہر حال میرے خاندان میں اچھائیوں کے ساتھ، ساتھ برائیاں بھی ہوئیں۔ کامیابیوں کے ساتھ، ساتھ ناکامیاں بھی...... مگر کبھی امی یا ابو یہاں تک کہ گھر میں موجود چھوٹی پھوپی یا دادا ابا تک نے عمل، جادو، ٹونے کا تذکرہ نہ کیا نہ ہی کبھی کسی نے اس طرف دھیان دیا...... جب کسی امر میں ناکام ہو جاتے تو اللہ سے دعا مانگتے، جب کامیاب تو اللہ کا شکرانہ...... اللہ، اللہ خیر سلا...

جبکہ سسرال میں تو چھوٹی، چھوٹی ناکامی پر...... چھوٹے بچوں کے گر جانے پر...... یہاں تک کہ بجلی کے بے وقت چلے جانے پر بھی کسی کے عمل یا جادو کا دکھڑا رو دیا جاتا۔ شروع میں تو مجھے اکثر چڑ ہو جاتی تھی۔ اگر کبھی کچھ اس قسم کا اشارہ دینے کی کوشش کرتی جس سے میری ناپسندیدگی کا اظہار ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب کچھ بھی بدلتا نہ دیکھا تو میں نے خاموشی اختیار کرلی...... پھر ایک الگ ہی قسم کی فکر نے گھیر لیا کہ کہیں میری خاموشی اور بے پروائی پر مجھے ہی نہ قصوروار سمجھا جانے لگے...... کیونکہ جادو ٹونے کا کسی نہ کسی پر تو الزام جانا لازمی ہوتا ہے۔ یہ فکر مجھے خود بخود لاحق نہیں ہوئی...... ایک سے ڈیڑھ ہفتے میں ہی مجھ پر کڑی نظر رکھنے والی ساس صاحبہ نے میری دو، چار باتوں اور انداز پر تبصرہ کیا جس میں یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کو میرے نارمل نہ ہونے کا شک ہے۔

سرپرائز ٹیسٹ اور زندگی ہم سب سے وقتاً فوقتاً امتحان لیتی رہتی ہے...... چند ہی دنوں بعد میری ساس صاحبہ نے میرا دھیان اس طرف دلایا کہ میرے اپنے شوہر صاحب کے ساتھ وہ تعلقات نظر نہیں آتے جیسے ایک نئے شادی شدہ جوڑے میں نظر آنے چاہئیں......

ہم جب بھی کسی محفل میں بلائے جاتے شوہر صاحب... حتی الامکان کوشش کرتے کہ مجھ سے دور رہیں...... ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانے میں ہچکچاہٹ، ہم نے کبھی کہیں اکیلے سمندر یا سینما جانے کا پروگرام نہیں بنایا۔ وہ اب تک اپنے کپڑے خود منتخب کرتے ہیں، نہ

میرے ہی کپڑوں کے انتخاب پر کوئی مشورہ دیتے ہیں نہ مجھ پر اپنی پسند کے رنگ اور جوڑے کا کبھی اظہار کرتے ہیں...... ہم اگر کمرے میں تنہا بھی ہوں تو دور، دور تشریف رکھتے ہیں، ہاتھ پکڑنا تو درکنار وہ اتنے قریب بھی کھڑے نہیں ہوتے کہ چھوئے جانے کا ہلکا سا بھی امکان ہو جائے...... یہ چند چھوٹی، موٹی باتیں تو چلو پھر بھی برداشت ہو جائیں مگر حیران کن بات یہ تھی کہ میں میکے چلی جاتی تو پلٹ کر فون تک نہیں کرتے کہ کب واپس آؤ گی، دل اداس ہے، جلدی آجاؤ، وغیرہ، وغیرہ...... میں دل میں یہ سب باتیں نوٹ تو کر چکی تھی مگر ماننے سے انکار کر رہی تھی...... جب ساس صاحبہ نے باقاعدہ اعلانیہ ان سب باتوں پر غور و فکر کرنا اور کروانا شروع کر دیا تو میں بھی آخر کار ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے ایک ناکام سی آہ بھر کر پوچھا۔

''میں بتا رہی ہوں تم دونوں میاں، بیوی پر عمل کر دیا ہے، کسی دشمن نے کہ دونوں کا دل نہ ملے۔'' ساس صاحبہ نے راز داری سے مگر ٹھوس لہجے میں کہا جیسے عمل ٹونا کرنے والے نے ان کو آکر خود اطلاع دی ہو کہ وہ ہم پر یہ عمل کروانے جا رہا ہے۔ میری مرضی کے خلاف بات تھی میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی...... اس پر ساس صاحبہ پھر سے گویا ہوئیں۔

''میں کوشش کرتی ہوں اس سلسلے میں کسی سے مدد لوں۔'' مجھے امید ہوئی، میں نے خوش دلی سے بتایا۔ ''ان کے ایک دوست ہیں جنہوں نے شادی کے فوراً بعد ہماری دعوت کی تھی اور جن سے شوہر صاحب کو بہت انسیت ہے لہٰذا اگر ان سے مدد طلب کی جائے تو کچھ برائی نہیں وہ ہمارے حق میں ہیں۔ ساس صاحبہ کا منہ بن گیا۔

''بے وقوف لڑکی...... بھلا وہ کیا کریں گے کوئی عامل ہی عمل کی کاٹ کر سکتا ہے، وہ تو ایک وقت کی نماز نہیں پڑھتا بھلا عمل کا کیا توڑ نکالے گا۔'' میرا دل بجھ گیا اور کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں......

ایک دل تو ہوا کہ رات کی تنہائی میں شوہر صاحب سے بات کروں، ان سے پوچھوں کچھ حل نکالنے کی باتیں کروں...... مگر یہی سوچ کر رہ گئی کہ وہ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی کچھ دن اُن کو لگیں گے میری عادت ہوتے، ہوتے اور ایسی ہی کچھ بات تھی بھی...... ضروری تو نہیں کہ جیون ساتھی ملتے کے ساتھ ہی ذہن و دل پر چھا جائے، کچھ لوگ سست روی سے آگے بڑھتے ہیں، وہ ہر رشتے کو بڑی احتیاط سے اپناتے ہیں...... انہیں اپنا دل کھولنے اور کسی سے دل ملانے میں وقت لگتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال تھا شوہر صاحب اسی طرح کی عادت کے تھے اور سچ بات یہ کہ مجھے کوئی حرج بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ مجھے ایسے میاں بیوی زیادہ نہیں بھاتے تھے جو شادی کے فوراً بعد ہی دنیا جہاں کو بھول کر ایسا ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں کہ ہر وقت ایک دوسرے کے سروں پر سوار سے لگتے ہیں۔ اگر بیوی سے بات کرنی ہے تو میاں جی قریب ہی منڈلا رہے ہیں اور اگر میاں سے بات کرنی ہو تو بیگم صاحبہ پہلو میں بیٹھی سب سن رہی ہیں...... اس لحاظ سے میں بھی خود کو سنبھال رہی تھی کچھ نئے اصول بنا کر جو شوہر صاحب کی زندگی میں آئی تھی تو ان کو سنوار رہی تھی اور اپنی عادت میں شامل کر رہی تھی تا کہ پھر کبھی نہ بھول سکوں...... اور شوہر صاحب کو بھی وقت دے رہی تھی مگر ساس صاحبہ کی بار، بار کی تنبیہ پر بھی پریشان تھی کہ اگر میں خوب صورت، جوان اور من پسند بیوی ہوں تو آخر کار شوہر صاحب ایسی بے پروائی کیوں برتتے ہیں اور کیوں نہیں ہر وقت اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں...... میرے پاس ان سوالوں کے جواب تو نہیں تھے مگر میں کسی بھی طرح عمل اور ٹونے کے بھی حق میں نہیں تھی۔

ایک دن ساس صاحبہ خوش، خوش مجھے ایک کاغذ کا کئی بار تہہ کیا ہوا ٹکڑا دے گئیں۔

''اپنے تکیے کے نیچے رکھا کرو، خبردار کھول کر نہ

دیکھنا...... کسی کی نظر نہ پڑے، جب بستر پر نہ ہو تو اٹھا کر کہیں حفاظت سے رکھ دینا۔''

اور بھی بہت سی ہدایات ...... میں نے بھی ساس صاحبہ کا دل رکھنے کو تو رکھ لیا مگر اس تعویذ کا کیا کروں؟ اللہ جانے کیا ہے، میں اتنا تو جانتی ہی تھی کہ اللہ کا کلام جلالی بھی ہوتا ہے، ہر کلام کو ہر وقت اور ہر جگہ استعمال کرنا بھی ٹھیک نہیں ...... پھر پاک ناپاک کیسے میں اللہ کے کلام کو ہر وقت ہاتھ لگا سکتی ہوں مگر کیا دوسرا رستہ تھا اور پھر وہی ہوا...... تعویذ شوہر صاحب کو نظر آگیا۔ وہ حد سے زیادہ خفا ہوگئے...... ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے گھر والوں کی ایسی سوچ سے بھی حد سے زیادہ چڑ تھی...... اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہنوں اور ماں سے تھوڑا کھنچے کھنچے تھے اور یہ کہہ کر تو انہوں نے مجھے روہانسا ہی کر دیا کہ وہ مجھے مختلف سمجھے تھے مگر میرا بھی اس طرح جادو ٹونے پر یقین ان کو بھایا نہیں ...... کیا کہتی کہ آپ کی والدہ نے ہی لا کر دیا ہے، ہمارے ہاں تو ایسا کبھی نہیں سنا نہ دیکھا...... مگر شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ یہ سب باتیں مزید برائیاں لاتیں، میں خاموش ہوگئی...... شوہر صاحب نے صبح ناشتے کی میز پر اپنی والدہ کو تعویذ پیش کیا اور مجھ پر خوب طنز جھاڑ کر آفس چلے گئے...... مجھے اور بھی دکھ ہوا کہ ساس صاحبہ نے تعویذ کو کچھ یوں الٹ پلٹ کر بیٹے کے سامنے دیکھا جیسے پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔

اسی شام شوہر صاحب نے سامان پیک کیا اور چار دن کے لیے ایک میٹنگ میں دوسرے شہر جانے کا بتا کر چلے گئے...... ان کے جانے تک تو ساس صاحبہ سکون سے رہیں مگر جیسے ہی وہ گھر سے نکلے مجھ پر حملہ ہوگیا۔

''تم بے وقوف لڑکی' ایسے وقت میں شوہر کو کیسے چھوڑا...... جانے ہی کیوں دیا...... ضد کر کے روک لیتیں۔'' میں گم صم ہوگئی۔

''وہ نوکری کرتے ہیں اور نوکری میں یہ سب تو کرنا ہی ہوتا ہے ایسے کیسے منع کر سکتی تھی۔'' مگر ساس صاحبہ کو چین نہیں آیا...... اور دوسرے ہی دن انہوں نے میرا باقاعدہ اپائنٹمنٹ لے لیا...... مجھے بڑی ہنسی آئی، جادو ٹونے کرنے والوں سے بھی اپائنٹمنٹ لینی پڑتی ہے...... مجھے کچھ مزے بھی آرہے تھے کہ ذرا ملاحظہ تو کروں...... آخر یہ عامل صاحب کرتے کیا ہیں، ایک بندہ بیچارہ نوکری کے لیے گھر سے چند دن باہر کیا رہنے چلا گیا یہاں عامل صاحب نے اپنا کاروبار چمکا لیا۔

مگر سچ بات یہ تھی کہ اتنے دن بعد شوہر صاحب کے اچانک چلے جانے سے زندگی جیسے یک دم خالی سی لگ رہی تھی اور پہلی ہی رات اندازہ ہوا کہ شوہر صاحب کس طرح نرمی اور خاموشی سے میری زندگی میں شامل ہو چکے ہیں، ایک کسک سی جاگی، کاش ان کو بھی میری کمی کچھ اسی طرح محسوس ہوئی ہو۔ بہرحال دوسری شام میں اور ساس صاحبہ عامل صاحب کے دربار میں حاضر ہوگئے، عامل صاحب سے ملنے والوں کی تعداد دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

کیا ہمارے ملک میں اس حد تک ناامیدی جاگ چکی ہے کہ اب حلال، حرام جو بھی طریقہ ہاتھ لگے ہم قسمت چمکانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں...... ایسی دنیا کا کیا فائدہ جس کو حاصل کر کے آپ کی آخرت غارت ہو جائے۔

کئی سوال تھے مگر جواب ندارد...لوگوں کا رش ایک ٹھوس حقیقت تھی جبکہ میرے دلائل...... خدا، خدا کر کے ہماری باری بھی آگئی۔

عامل صاحب کا کمرا ہلکی سبز روشنی میں کچھ دھندلایا ہوا سا تھا، ایک کونے میں چھوٹی سی میز اور کرسی جیسی اکثر اسکول کی نرسری کلاس میں بچوں کے بیٹھنے کے لیے ہوتی ہیں رکھی تھی۔ اس کے بالکل مخالف سمت پر اعلیٰ قسم کا صوفہ سیٹ تھا جس کے ایک کونے میں عامل صاحب تسبیح لیے براجمان تھے...... عامل صاحب نے اپنے پیر لال مخمل کے کور والے دو

چار چھوٹے، چھوٹے گدوں پر دھرے ہوئے تھے۔ فرش پر شاید سبز رنگ کا ہی دبیز قالین بچھا تھا جس میں پاؤں دھنستے تھے، یقیناً ائر کنڈیشن بھی تھا جس کی وہ سے ماحول میں ایک سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ کمرے میں کسی تیز قسم کے عطر کا جا بجا چھڑکاؤ تھا جس کے باعث سانس لینی محال ہو رہی تھی۔ میں عامل صاحب کی آن بان دیکھ کر متاثر ہو گئی...... یعنی کاروبار خوب منافع کما رہا ہے۔

انہوں نے ساس صاحبہ کو اپنے برابر والے صوفے پر بیٹھ جانے کو کہا اور مجھے اشارے سے چھوٹی سی کرسی کی طرف ہڑکا دیا...... ساس صاحبہ جلدی، جلدی ان کے کان میں کچھ بتانے لگیں جو میں سمجھ رہی تھی کہ میرے بارے میں ہی بتا رہی ہیں، کبھی وہ دونوں خاموشی سے ایک ساتھ میری طرف دیکھنے لگتے، عامل صاحب نے چند ایک سوال کیے جو مجھے سنائی نہیں دے سکے۔ نہ ہی ساس صاحبہ کے جوابات سنائی دے رہے تھے۔ عامل صاحب نے بالآخر گلا کھنکھار کر تیز مگر پتلی آواز میں گویا اعلان کیا۔

''کل دو بجے دوپہر...... بس یہی حل ہے۔'' یہ سن کر ساس صاحبہ نے پھر اُن کے کان میں کھسر پھسر کی مگر وہ شاید اپنی بات پر بضد رہے...... اور پھر ساس صاحبہ باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

گھر پہنچ کر ساس صاحبہ نے بتایا کہ عامل صاحب میرے اوپر سے عمل کو خارج کرنے کے لیے کل میرا علاج کریں گے جس کے لیے مجھے ان کے آفس میں دوپہر دو بجے تک پہنچ جانا ہے...... یہ تو ایسے ہی لگ رہا ہے جیسے کوئی سرجن مریض کو سرجری کے لیے وقت دے...... خیر انکار یا واپسی کی میرے پاس کوئی بھی راہ نہیں تھی۔ ساس صاحبہ کچھ اس عزم اور اعتماد سے مجھے عامل صاحب کے پاس لے کر گئی تھیں کہ میں ان کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتی تھی، سوچا چلو کیا ہوا...... کر لینے دو عامل صاحب کو بھی۔ کم از کم ساس صاحبہ کا دل تو مطمئن ہو جائے گا۔ اور یوں پھر میں بھی آزاد ہو جاؤں گی۔

مجھے پتا ہوتا کہ یہ سرجری جیسا ہی کچھ عمل رونما ہوگا تو ہرگز، ہرگز ہامی نہ بھرتی مگر جب تک مجھے پتا چلا کہ میرے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے میں اپنے حواسوں میں کہاں رہی تھی۔

اب کی بار میں جو کمرے میں داخل ہوئی تو عامل صاحب کو اسی طرح صوفے پر براجمان پایا مگر میز اور کرسی کی جگہ ایک چھوٹے سائز کا لکڑی کا چوکی نما بستر پڑا تھا جو اکثر لوگ نماز پڑھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، کمرے میں عامل صاحب کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کی مضبوط جسموں والی خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک کے کپڑے سبز رنگ کے اور دوسری کے سرخ تھے۔

سبز کپڑوں والی نے مجھے بڑے آرام سے چوکی پر چت لٹا دیا...... میں تھوڑا شرمائی، ناسمجھی کی وجہ سے گھبرائی مگر جب تک کچھ سمجھ پاتی اس نے میرے دونوں پاؤں بستر کے پایوں سے جڑے لٹکے موٹے چمڑے کے پٹوں سے باندھ دیے...... اس کے بعد میرے ہاتھوں کی باری آئی، میرے دونوں ہاتھوں کے نیچے اسٹول نما بستر کی اونچائی جتنے لمبے، لمبے ٹیبل کچھ اس طرح سیٹ کیے گئے تھے جیسے آپریشن تھیٹر میں کیا جاتا ہے اور ہاتھوں کو بھی باندھ دیا گیا۔ اب میں بالکل بے بس تھی، ہلنا بھی چاہتی تو ہل نہیں سکتی تھی۔ میں نے گھبرا کر ساس صاحبہ کی طرف دیکھا جو نہایت سکون سے تمام کارروائی ملاحظہ کررہی تھیں، ان کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر میں بھی ذرا سکون میں آنے کی کوشش کرنے لگی کہ اچانک سرخ کپڑوں والی خاتون کا ایک ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور تڑاخ...... میں تڑپ کر رہ گئی...... سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ دوسری طرف سے ہرے رنگ نے دوسرے بازو پر حملہ کردیا...... دونوں خواتین بڑی نفاست اور چابکدستی سے میرے دونوں بازوؤں پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ اکثر فلموں میں دیکھتی تھی، نسیم حجازی کے ناولوں میں پڑھ چکی تھی۔ بادشاہ ناراض ہوجانے پر کوڑے مارنے کی سزا سناتا ہے۔ کبھی احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کوڑے پڑنے کی سزا کس حد تک جان لیوا ہوسکتی ہے۔ میری آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک بازو پر کوڑا برس کر جب تک ہوا میں دوبارہ بلند ہوتا دوسرے بازو پر برس چکا ہوتا...... میں بلبلاتی، کلبلاتی رہی مگر یہ بھی جان گئی تھی کہ راہِ فرار کوئی بھی نہیں...... دوسری طرف صوفے پر براجمان عامل صاحب اونچی آواز میں جیسے کسی کو للکار رہے تھے۔

”اب بتا نکلتا ہے کہ نہیں...... جاتا ہے کہ نہیں، بول...... کلمہ آتا ہے پڑھ کر سنا...... اور خاموشی سے راستے سے ہٹ جا۔“

میں نے دل میں سوچا...... کلمہ ہی سننا تھا تو آرام سے پوچھ لیتے...... ایسا مارنے اور زدوکوب کرنے کی کیا ضرورت تھی...... مگر اب اس وقت اس لمحے اس اذیت ناک صورتِ حال سے کس طرح بچا جائے۔

”کوئی نہیں آئے گا...... تجھے بچانے، اِدھر اُدھر نہ دیکھ...... جو کہتا ہوں وہ کر، کلمہ پڑھ، بول ہاں میں نکلتا ہوں اس جسم سے، بول دے ورنہ اس طرح پٹتا رہے گا۔“

عامل صاحب ایک ہی لب ولہجے میں مسلسل ایک جیسی باتیں دُہرائے چلے جارہے تھے...... ایک دم میرے ذہن میں خیال آیا کیوں نہ میں کلمہ پڑھ کر جو عامل صاحب کہہ رہے ہیں دُہرا دوں...... بس ان کو کیا پتا چلے گا کہ آیا یہ سب میں ہی کہہ رہی ہوں یا وہ جو اُن کے خیال میں میرے اندر موجود ہے۔ میں نے سانس بحال کرنے کے لیے خود کو دلاسا دیا کہ بس چند جملے کسی نہ کسی طرح منہ سے نکالو تا کہ جان چھوٹے۔

ابھی میں کچھ کہتی کہ دھڑ سے عامل صاحب کے آفس کا بند دروازہ کھلا اور کچھ اس طاقت سے کھولا یا دھکا دے کر توڑا گیا تھا کہ پشت پر دیوار سے زوردار آواز سے ٹکرا گیا...... دونوں خواتین کے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے اور عامل صاحب...... ساس صاحبہ گھبرا کر کھڑے ہوگئے...... میں نے بھی اپنی بچی کھچی

طاقت سمیٹ کر آنے والے کو دیکھا...... پہلے تو دو پولیس والے وردی میں بندوق تانے سامنے آئے، ان کے پیچھے سادہ لباس میں بھی تین چار لوگ گھس آئے اور ان ہی تین چار میں ایک میرے شوہر صاحب بھی تھے۔ سب نے پہلے تو ماحول کا جائزہ لیا میری غیر ہوتی ہوئی حالت، دونوں خواتین کے ہاتھ میں چمڑے کے کوڑے اور پھر دوسرے ہی لمحے شوہر صاحب عامل صاحب پر حملہ کر چکے تھے۔ فلموں کے ہیرو کی طرح عامل صاحب کو دو چار تھپڑ مارے ہی تھے کہ سادہ لباس والوں نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کر دیا اب عامل صاحب گھگھیا رہے تھے۔ ساس صاحب سہمی ہوئی تھیں اور پھر میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

ہوش آیا تو خود کو اپنے کمرے میں بستر پر دراز پایا...... دونوں ہاتھ پر کندھوں تک پٹی بندھی ہوئی تھی اور ان کے نیچے نرم گدے رکھے گئے تھے تاکہ ہاتھ پر زور نہ پڑے...... مجھے فوراً عامل صاحب کے پیر...... کے نیچے مخملی سرخ کور والے گدوں کا خیال آگیا اور ایک جھرجھری سی آگئی۔ کسی نے نرمی سے ہاتھ پیشانی پر رکھ دیا۔ آنکھ پوری کھول کر دیکھا کہ شوہر صاحب بستر کے قریب ہی کرسی ڈالے بیٹھے ہیں، مجھے متوجہ پا کر مسکرائے۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ شکر ہے کہ بخار اتر گیا ہے، چند ایک دن میں اچھی بھلی ہو جاؤ گی فکر نہیں کرو۔'' کچھ اسی قسم کی باتوں سے وہ مجھے بہلا رہے تھے کہ میں نے نقاہت سے صرف اتنا ہی کہا۔

''مجھے کلمہ آتا ہے۔''

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے...... ان کے چہرے پر سختی سی نمودار ہوئی۔

''میں اس خبیث کو دس پندرہ سال کی قید دلواؤں گا...... دیکھ لینا؟'' اس کے بعد شوہر صاحب ہر وقت میرے ارد گرد منڈلاتے رہتے۔ سوپ پلانا، دوائی دینا یہاں تک کہ کپڑے تبدیل کرنے میں بھی مدد دیتے رہے...... دو چار دن میں میری طبیعت واقعی سنبھل گئی تو اندازہ ہوا کہ ساس صاحبہ سے شوہر صاحب ناراض ہیں اور اس واقعے کے بعد سے بات بھی بند کر رکھی ہے، میرے اپنے گھر والے بھی ساس صاحبہ کو کافی سنا چکے تھے۔

خیر پہلی بار کمرے سے باہر نکلی تو جو بھی گھر میں موجود تھا سب نے خوش دلی سے میری خیریت دریافت کی اور کوئی چائے تو کوئی جوس کا پوچھنے لگا جیسے میں کوئی بہت پسندیدہ مہمان ہوں...... جبکہ شوہر صاحب مجھے سہارا دیے لاؤنج میں لے آئے...... انہوں نے ٹی وی پر کوئی ساڈراما چینل لگا دیا اور میرے برابر میں براجمان ہو گئے...... اتنے میں ساس صاحبہ بھی نمودار ہوئیں اور میری دوسری طرف سے مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے شوہر صاحب کو توجہ دلائی اور آہستہ سے یاد دلایا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اب اپنی والدہ سے ناراضی ختم کر دیں گے۔ وقفے وقفے سے میں کبھی شوہر صاحب سے تو کبھی ساس صاحبہ سے بات کرتی رہی اور تھوڑی ہی دیر میں ماں، بیٹا بھی ایک دوسرے سے گھل مل گئے...... مجھے کچھ اطمینان ہوا جیسے ایک بڑا بوجھ اترا ہو۔ خیر سے ساس صاحبہ کو اچھی خاصی سزا مل چکی تھی۔ اتنا ہی کافی تھا، ڈرامے کے دوران شوہر صاحب فون سننے کے لیے لاؤنج سے باہر گئے تو ساس صاحبہ نے جلدی سے مجھے گلے سے لگا لیا...... پھر ہلکی سی شرارت مسکراہٹ سے گویا ہوئیں۔

''دیکھا...... کیسا تم سے لگ، لگ کر بیٹھا ہے۔ کیسا خیال کر رہا ہے، پھولوں کے ہار کی طرح گلے سے لٹکا کر رکھا ہوا ہے، میں نہ کہتی تھی عمل کی وجہ سے دور، دور رہتا ہے، اب دیکھو عمل کا کاٹ کروایا تو ٹھیک ہو گیا۔''

میں دنگ رہ گئی...... اور میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

''خدا کی قسم مجھے کلمہ آتا ہے۔''

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

درِ ثمن بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دُور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار ...یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصّع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کُن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قسط 12





اسلام آباد میں سیمینار اٹینڈ کرنے کے لیے ڈاکٹر عمر اور ایشال صبح نو بجے ہی لاہور سے روانہ ہو گئے تھے، یہ پہلا سفر تھا جو ایشال، ڈاکٹر عمر کے ساتھ کر رہی تھی۔ راستے میں دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی...... کبھی وہ دونوں ہی خاموش ہو جاتے پھر جب خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگتا تو ان دونوں میں سے کوئی ایک بات کر کے پھر سے اس خاموشی کو توڑ دیتا۔

''آپ میوزک نہیں سنتے؟'' ایشال نے قدرے بور ہو کر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ڈاکٹر عمر سے پوچھا۔ (ڈرائیور چونکہ کچھ دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا سو آج کل وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے)

''سنتا ہوں مگر آئم شیور جس طرح کا میں میوزک سنتا ہوں، وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا۔''

''آپ کی پسند اتنی بری بھی نہیں، اس کا تو اندازہ ہے مجھے۔''

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا میری پسند کا؟'' انہوں نے گردن موڑ کر ایشال کو دیکھا۔

''سبرینہ کو دیکھ کر۔'' عجلت میں بولنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط کہہ گئی تھی۔ کیونکہ اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''کچھ چیزیں سوائے دھوکے کے اور کچھ نہیں ہوتیں، سبرینہ بھی ایک خوب صورت دھوکے کا نام تھا۔'' ان کے لہجے میں درشتگی تھی، تلخی اور سرزنش تھی۔ ڈاکٹر عمر کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ جب دونوں کے بیچ خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ آیا تو ڈاکٹر عمر نے اس کی بوریت مٹانے کے لیے میوزک پلیئر آن کر دیا...... گاڑی میں خوب صورت گیت گونجنے لگا۔

ہمیں اور جینے کی چاہت نہ ہوتی
اگر تم نہ ہوتے......

شاید یہ خوب صورت میوزک اور شاعری کا اثر ہی تھا جو ڈاکٹر عمر نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ایشال کی جانب دیکھا تھا۔ ہی لمحے چپس کھاتی ایشال کی نظریں بھی بے اختیار ان کی طرف اٹھی تھیں اور اگلے ہی لمحے اس نے ٹ گھبرا کر نظریں ہٹالی تھیں۔ پتا نہیں ان کی نظروں میں ایسا کیا تھا یا پھر اس کی یہ فیلنگز شاید یک طرفہ تھیں۔ اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے انہیں بھی چپس کی آفر کرتے ہوئے پیکٹ ان کے آگے کر دیا تھا۔

''ویسے میوزک کے معاملے میں بھی آپ کا ٹیسٹ بہت اچھا ہے۔''

''اچھا پہلے تو تمہیں میری ہر چیز بری لگتی تھی؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''مگر اب ایسا نہیں ہے۔'' ایشال مسکرائی۔

''کیوں، اب ایسا کیا ہے؟ جو پہلے نہیں تھا؟'' ڈاکٹر عمر کا انداز کریدنے والا تھا۔

''پہلے میں آپ کو جانتی تو تھی مگر سمجھتی نہیں تھی...... مگر اب جاننے کے ساتھ، ساتھ آپ کو سمجھتی بھی ہوں۔'' وہ بہت معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

''ہوں! ویری گڈ آنسر...... یہ بتاؤ میرے ساتھ رہ کر کتنا سمجھی ہو تم مجھے؟''

''آپ ایک چٹان کی طرح ہیں، دیکھنے میں سخت اور کھردرے...... مگر آپ کے وجود سے بھلائی کا چشمہ بہتا ہے جو دوسروں کو سیراب کرتا ہے۔ آپ باہر سے ایک اجڑے ہوئے شہر کی طرح دکھائی دیتے ہیں مگر آپ کے اندر زندگی کی رونقیں سانس لیتی ہیں...... آپ ایک گلیشیر کی طرح نظر آتے ہیں مگر آپ کا دل بہت نرم ہے، کسی کے بھی دکھ پر پسیج جانے والا دل......'' چپس ختم ہو گئے تھے اس دوران ایشال نے بڑی خوب صورتی سے ان کی شخصیت کو

بیان کیا تھا...... ڈاکٹر عمر بہت متاثر ہوئے تھے تب ہی دھیرے سے مسکرائے۔

''ہاں میرا دل بہت جلد پسیج جاتا ہے مگر اس بار میرا دل میرے خلاف محاذ کھول کر بیٹھ گیا ہے۔'' ڈاکٹر عمر نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

''کیا مطلب...... میں کچھ نہیں سمجھی۔'' وہ حیران ہوئی۔

''مطلب یہ کہ......'' وہ رکے تھوڑا اٹکے۔

''مطلب کیا......؟'' وہ الجھی اور اس نے جواب طلب نظروں سے ڈاکٹر عمر کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ جب دل میں کوئی بس جائے تو یہ دل کہاں سنتا ہے...... ایک بار جو نام اس پہ درج ہو جائے وہ آسانی سے کہاں مٹتا ہے؟ پھر دن رات صرف اسی نام کی گردان کرتا ہے۔'' ڈاکٹر عمر نے چند دن پہلے ہی مناب کے اسکرپٹ میں یہ جملے پڑھے تھے۔ جنہیں وہ نروس ہو کر بے ربط انداز میں کہہ گئے تھے۔

ایشال کا دل پریشان ہوا۔ ''کیا یہ ابھی تک سبرینہ کو نہیں بھولے؟ کیا آج ان کا دل سبرینہ کی گردان کرتا ہے؟'' یہ وہ سوال تھے جو اُن کی بات پر ایشال کے دل میں ابھرے تھے اور ساتھ ہی ایک تکلیف دہ غلط فہمی نے اس کے دل میں بسیرا کر لیا تھا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں آپ کے دل کی حالت......'' ایک عجیب سی اداسی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کے دل میں خوش فہمیوں کے گھروندے مسمار ہونے لگے۔

''دل کے معاملات کو جتنی جلدی سمجھ لیا جائے خوشیاں اتنی ہی جلدی دامن میں سمٹنے لگتی ہیں۔'' ڈاکٹر عمر کی آنکھوں میں کوئی بسا ہوا تھا اُن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''آئی ایگری، دل کے معاملات کو جلدی سمجھ لینا چاہیے......'' اس نے دھیرے سے ان کی بات دُہرائی تھی۔ ''آپ ابھی تک سبرینہ کی محبت کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں، مجھے بھی ارسل کی محبت کو دل میں بسا لینا چاہیے۔ مجھے بھی اس کی محبت کو اگنور نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے دل میں سوچا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ محبت میں یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ دل بہت جلدی بدگمان ہو جاتا ہے۔

''تھک گئی ہو؟'' ڈاکٹر عمر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''شاید۔'' وہ مختصر جواب دے پائی۔

''سو جاؤ۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرلو فریش ہو جاؤ گی۔'' انہوں نے بہت پیار سے.... ایشال کو دیکھا جو دوسری طرف رخ موڑے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی...... اس کے دل میں تھوڑی دیر پہلے جو خوشی تھی اب وہاں ایک اداسی نے ڈیرا جما لیا تھا۔

اس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح بس رخ موڑے باہر دیکھتی رہی اور پھر اپنے دل سے الجھتے اور لڑتے، لڑتے اس کی سچ مچ آنکھ لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر عمر نے سوئی ہوئی ایشال پر ایک نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے ونڈ اسکرین پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے سوچنے لگے۔

''تکمیل کے اس سفر میں

میں کتنا ادھورا تھا

تم کتنی ادھوری تھی

اور اب......

ہم کتنے مکمل ہیں......؟''

سچ ہی کہتے ہیں زندگی کے طویل سفر کو طے کرنے کے لیے کسی ہمدرد مخلص اور محبت کرنے والے ہم سفر کا ہونا ضروری ہوتا ہے یہ سفر کتنا ہی طویل اور دشوار کیوں نہ ہو...... سفر کی صعوبتوں کا احساس نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر عمر کو بھی آج کا سفر طویل نہیں لگا تھا اُن کے دل میں دھڑکنے والی دھڑکن ان کے ساتھ تھی مگر انجان......

اسلام آباد میں انٹر ہوتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی...... ایشال نے اپنے پرس سے مرر نکال کر اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے لپ اسٹک نکال کر لگائی، ہیر برش نکال کر بال سنوارے۔

''تھینکس گاڈ ہم مرد حضرات ان خرافات سے آزاد ہیں۔'' ڈاکٹر عمر مسکرائے۔

''اب میں اتنے رف حلیے میں یہ سیمینار اٹینڈ نہیں کر سکتی ناں......؟''

''تم رف حلیے میں بھی اچھی لگ رہی تھیں۔'' پُرسکون انداز میں جواب دیا گیا۔ ان کے تعریفی جملے پر یک لخت ایشال نے انہیں دیکھا۔ ان کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی اور ان کی آنکھوں میں ایشال کے لیے پسندیدگی تھی۔ ڈاکٹر عمر نے گاڑی اس فائیو اسٹار ہوٹل کی پارکنگ میں لگائی جہاں ڈاکٹرز کے لیے سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔

''میں زیادہ اوور تو نہیں لگ رہی ہوں ناں؟'' گاڑی سے نکلتے ہوئے ایشال نے کسی بچے کی طرح کانشس ہو کر ڈاکٹر عمر سے پوچھا۔

وائٹ خوب صورت اسٹائلش سے ونٹر ڈریس کے اوپر لانگ اسٹائلش سی بلیو جرسی اور گلے میں مفلر لپیٹے پرس کے ساتھ ہم رنگ کوٹ شوز پہنے وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ چند لمحے وہ اس سے نظریں ہی ہٹا نہیں پائے تھے۔

''سچ بتاؤں یا جھوٹ؟'' گاڑی لاک کرنے کے بعد وہ کوٹ کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالے اس کے پاس آکر شرارت سے بولے۔

''آف کورس سچ بتائیں۔''

''تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو...... اور مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ تمہیں یہاں کوئی پرپوز ہی نہ کر دے۔'' انہوں نے ایشال کو سر تا پاؤں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں اس کی تعریف کرتے ہوئے دل کا خدشہ ظاہر کیا تو وہ بلش ہو گئی...... دل میں چھائی کچھ دیر پہلے کی بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔

ہال میں اپنے بہت سے کولیگ اور دوست احباب ڈاکٹرز جن سے ملے کافی عرصہ بیت چکا تھا سے ملتے ہوئے ڈاکٹر عمر کو ازحد خوشی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ نے کن انکھیوں سے ان کے ساتھ ایشال کو دیکھ کر اُن کے درمیان رشتے کو جاننے کی کوشش کی تھی...... کچھ نے ایشال کو ان کی منگیتر سمجھا تھا اور ان کے ایک پرانے دوست نے تو حد کرتے ہوئے ایشال کو ان کی بیوی سمجھ لیا تھا۔ اس صورتِ حال میں ڈاکٹر عمر اور ایشال دونوں ہی کھسیا رہے تھے اس کے باوجود دونوں کے دل ایک انجانی سی خوشی محسوس کر رہے تھے...... اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر عمر کسی سے بھی اپنے اور ایشال کے رشتے کے متعلق کوئی وضاحت بھی نہیں کر رہے تھے...... نہ جانے یہ ایشال کی ہمراہی کا اثر تھا یا ایک مدت کے بعد اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات کی خوشی...... ایک مدت کے بعد ڈاکٹر عمر خوش گپیوں کے دوران قہقہے لگا رہے تھے۔

ایشال آج ایک نئے ڈاکٹر عمر سے ملی تھی۔ ایک نئے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

سیمینار اٹینڈ کرنے کے بعد جب وہ ہوٹل سے نکل کر پارکنگ میں آئے تو شام کے سائے گہرے ہو رہے

تھے، سیاہ اور گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔

"Monal ریسٹورنٹ چلتے ہیں سنا ہے پورے اسلام آباد کا ویو نظر آتا ہے وہاں سے۔" ڈاکٹر عمر نے اسے کو بتایا۔

"او کے شیور۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ دونوں مارگلا ہلز میں پیر سوہاوہ سے اوپر منال ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ خنکی اور تاریکی بڑھ رہی تھی...... اور ہلکی، ہلکی بوندا باندی نے موسم کو بے حد رومینٹک بنا دیا تھا...... ایشال نے ٹھنڈ سے اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑا۔

"زیادہ سردی لگ رہی ہے تو میرا کوٹ پہن لو۔" ڈاکٹر عمر نے آفر کی۔

"نہیں، آپ مروت میں اپنا کورٹ مجھے دے کر خود کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔" ایشال کی بات پہ انہیں گاؤں میں میڈیکل کیمپ میں گزری وہ رات یاد آئی جب انہوں نے اپنا لیدر کا کوٹ اتار کر ایشال کو پہنا دیا تھا اور خود بعد میں بیمار پڑ گئے تھے۔

ریسٹورنٹ میں لوگوں کا بہت رش تھا۔ "محبت بھی دور سے نظر آنے والے روشنیوں کے شہر کا نام ہے...... اس شہر کے اندر کتنے اندھیرے چھپے ہوتے ہیں یہ صرف اس شہر میں داخل ہونے والا ہی جانتا ہے۔" روشنیوں میں ڈوبے ہوئے اسلام آباد کا نظارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عمر دھیرے سے بولے تھے۔ ان کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی ہوئی تھیں۔ ان کے لہجے میں بیتے ہوئے کل کا دکھ بول رہا تھا۔

"محبت اندھیرے میں روشنی کی کرن کا نام بھی تو ہے شب غم کے اندھیروں میں جگنو بن کر دلوں کو روشنی کی آس بھی تو لاتی ہے یہ۔" ایشال کی بات پر انہوں نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی کہ ان کے پتھر دل کو پھر سے دھڑکنا بھی تو اسی لڑکی نے ہی تو سکھایا تھا...... ان کے دل کو شب غم کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی نوید بھی تو اسی لڑکی نے دی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتے تھے...... اپنے دل کی وہ ساری باتیں کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے خود سے بھی چھپا کر رکھی ہوئی تھیں...... نہ جانے یہ کیسا احساس تھا جس نے انہیں ایشال کے ہاتھ پکڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میری ڈانٹ کھاتے، کھاتے مجھے سمجھانا کب سیکھ لیا تم نے؟" ان کے ہاتھوں میں ایشال کے ہاتھ کانپنے لگے اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا وہ انہیں کیسے بتاتی؟ محبت جب دل میں بسیرا کرتی ہے تو عقل سے دوستی کر لیتی ہے پھر زبان خود بخود کسی فلاسفر کی زبان بن جاتی ہے۔

"آپ کے سوال میں ہی میرا جواب چھپا ہوا ہے۔" وہ مسکرائی اور اس نے دھیرے سے ان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کھینچنے چاہے۔

"یعنی میری ڈانٹ کھاتے، کھاتے۔" ڈاکٹر عمر نے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے وہ محبت بھرے انداز میں پوچھ رہے تھے اور وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

"تمہارے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں ایشال۔" انہوں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"جج...... جی...... آئی تھنک ہمیں کھانا کھا کر جلدی ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ موسم ٹھیک نہیں لگ رہا۔" ایشال نے اپنے ہاتھ لانگ جرسی کی پاکٹس میں ڈال لیے۔

اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا...... ایسا پہلی بار ہوا تھا جب انہوں نے بات کرتے، کرتے اتنی آسانی اور غیر متوقع انداز میں اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ ویٹر کھانا لگا رہا تھا...... وہ دونوں اپنی ٹیبل کی طرف

آ گئے...... ٹیبلو کے اوپر نصب ہٹس اور چھتریاں کھول دی گئی تھیں...... ٹھنڈی اور برفیلی ہواؤں کے ساتھ ہلکی، ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر عمر کی معیت میں سیڑھیاں اترتی ایشال کی ناک ٹھنڈ سے سرخ ہوگئی تھی۔ بوندا باندی اب ہلکی بارش میں بدل گئی تھی...... عجلت میں سیڑھیاں اترتے ایک جگہ اس کا پاؤں پھسلنے لگا تھا مگر ڈاکٹر عمر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا پھر سیڑھیاں اتر کر پارکنگ تک انہوں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دیے بس چلے جا رہی تھی...... پتا نہیں اس کے دل کو کیا ہو رہا تھا...... گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈاکٹر عمر نے ہیٹر آن کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اسے چھینکیں آنے لگیں۔

گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پر آتے ہی انہوں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ بارش تیز ہو رہی تھی اور سیاہ بادلوں نے رات کو مزید تاریک بنا دیا تھا۔

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے موسم کتنا خراب ہو رہا ہے؟'' ایشال نے تیز برستی بارش کو دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

''تم فکر مت کرو بارش کم ہوتے ہی میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دوں گا، انشاء اللہ ہم جلد لاہور پہنچ جائیں گے۔'' ڈاکٹر عمر نے گردن موڑ کر اسے تسلی دی مگر پریشانی اس کے چہرے پر واضح لکھی تھی۔ بارش کم نہیں ہوئی تھی بلکہ تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی...... ڈاکٹر عمر کو ہر طرف سے طوفانی بارش کی بوچھاڑوں میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ اسلام آباد کی حدود سے کافی آگے نکل آئے تھے۔ کلر کہار پہنچتے ہی موٹر وے پہ واقع TDCP ہوٹل کے سامنے ڈاکٹر عمر نے گاڑی روک لی تھی۔

''آئی تھنک ہمیں کچھ گھنٹے کے لیے جب تک بارش تھم نہیں جاتی یہاں اس ہوٹل میں رک جانا چاہیے، یہ نہ ہو کہ آگے جا کر گاڑی میں بھی مسئلہ ہو جائے اور ہمیں کہیں رکنے کے لیے جگہ بھی نہ ملے۔'' وہ ایشال سے کہہ رہے تھے۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' ایشال نے قدرے فکر مندی سے کندھے اچکائے۔ گاڑی پارکنگ میں لگا کر وہ دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے مین انٹرنس کی طرف آئے تھے...... ریسپشن کاؤنٹر پر آ کر انہوں نے دو کمروں کی بکنگ کروانی چاہی تو وہاں پہ موجود عملے نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے پاس ایک ہی روم خالی ہے۔

ڈاکٹر عمر پریشانی میں پلٹ کر ایشال کی طرف دیکھا...... اس کی حالت بھی ان سے کم نہیں تھی مگر اب مجبوری تھی...... انہیں چند گھنٹے یہاں گزارنے تھے۔

مجبوری اور کوئی دوسرا آپشن نہ ہونے کی صورت میں انہیں اس روم کی بکنگ کروانا ہی پڑی تھی...... ویٹر کی معیت میں وہ دونوں جب سیکنڈ فلور پر واقع اس روم میں آئے تو ایشال کے دل کی حالت خاصی عجیب ہو رہی تھی۔ ایک خفیف سی کیفیت تھی...... وہ صبح سے رات تک ڈاکٹر عمر کے ساتھ اپنی پروفیشنل ڈیوٹی نبھاتی تھی۔ آج پہلا طویل سفر اور اس سفر کی رات ایسی سنسنی خیز بھی ہو سکتی تھی کہ اسے ایک ہی روم میں رات کے چند گھنٹے ڈاکٹر عمر کے ساتھ تنہائی میں گزارنے تھے۔

ڈاکٹر عمر نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔ اور ویٹر ہیٹر چلا کر جا چکا تھا۔

''تم فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ...... میں عشا کی نماز پڑھ لوں۔'' وہ واش روم سے وضو کر کے آئے اور ٹیبل پر رکھی جانماز اٹھاتے ہوئے ایشال سے مخاطب ہوئے...... وہ اثبات میں سر ہلا کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

ڈاکٹر عمر کمرے میں ایک سائیڈ پر جانماز بچھا کر نماز پڑھنے لگے...... ایشال واش روم سے نکل کر روم میں آئی

اور کمرے میں آتش دان میں لگے ہیٹر کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اسے بہت سردی لگ رہی تھی وہ اپنے ہاتھ سینکنے لگی۔ ڈاکٹر عمر نماز پڑھنے کے بعد اٹھ کر وہیں اس کے قریب آ گئے تھے

''ایشو تم ٹھیک تو ہو ناں...... ؟ زیادہ سردی تو نہیں لگ رہی......؟'' اُن کے لہجے میں اس کے لیے فکر تھی۔

''میں ٹھیک ہوں مگر سردی بہت لگ رہی ہے۔'' ایشال نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے کہا......اس کے کپڑے بھی تھوڑے بھیگ گئے تھے اسی لیے وہ انہیں سکھانے ہیٹر کے پاس بیٹھی تھی۔

''او کے میں جا کر دیکھتا ہوں ویٹر ابھی تک کافی لے کر کیوں نہیں آیا......'' ڈاکٹر عمر اس کا کندھا تھپک کر باہر نکل گئے......اس دوران ایشال کا موبائل بج اٹھا تھا۔ علینہ اسے کال کر رہی تھی۔ ایشال کے کال ریسیو کرتے ہی اس نے عجلت میں پوچھا تھا۔

''ایشو کہاں ہو تم؟ اتنے میسج کیے میں نے تمہیں......تم جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں......آ گئی ہو ناں واپس؟''

''توبہ علینہ تم ہمیشہ نان اسٹاپ ہی بولتی ہو، نہیں آئی ہوں واپس بلکہ ہم راستے میں پھنس گئے ہیں، یہاں اتنی زیادہ بارش ہو رہی تھی کہ راستے میں ہمیں ایک ہوٹل میں stay کرنا پڑا ہے اور میں اتنی embarrass ہو رہی ہوں کہ ہوٹل میں صرف ایک ہی روم خالی تھا اور مجھے ڈاکٹر عمر کے ساتھ ایک ہی روم میں رات گزارنی ہے۔ آئی ڈونٹ نو...... یہ چند گھنٹے میں کیسے گزاروں گی؟'' وہ بہت پریشان تھی اور تقریباً رو دینے کو تھی۔

''اوے ہوئے......اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ قدرت تو تم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا موقع دے رہی ہے۔ اگر عمر بھائی ذرا سے بھی رومینٹک ہوئے ناں تو یقیناً وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔''

''شٹ اپ علینہ......تمہیں تو بس فضول بولنے کی عادت ہے۔ مجھے اتنی شرمندگی ہو رہی ہے اور میں بہت ان کمفرٹیبل فیل کر رہی ہوں۔'' ایشال کے انداز میں بیچارگی تھی۔

''لو جی......تمہیں تو اتنا اچھا فلمی سا موقع ملا ہے عمر بھائی کے قریب آنے کا اور تم ہو کہ خود کو عجیب وغریب سوچوں میں الجھا رہی ہو......؟ تمہاری جگہ میں ہوتی ناں تو انڈین موویز کے جیسے اس حسین موقع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔'' علینہ نے ہنستے ہوئے اسے چڑانے کے ساتھ، ساتھ جتایا تھا۔

''تم سے توقع بھی یہی کی جاسکتی ہے اسٹوپڈ، میں اتنی پریشان ہو رہی ہوں اور تم ہو کہ الٹی سیدھی بکواس کیے جا رہی ہو۔'' ایشال نے اسے ڈپٹا۔

''تو اور کیا کہوں تم سے؟ موسم بھی رومینٹک ہے، تنہائی ہے، جن کے لیے تمہارا دل دھڑکتا ہے وہ بھی تمہارے ساتھ ہیں......اور تم ہو کہ اس فلمی رومانس سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔'' وہ بے حد شوخ ہو رہی تھی۔

''جسٹ شٹ اپ علینہ......تم میرا ٹیمپر لوز کر رہی ہو۔ اپنی اس فضول بکواس سے۔'' ایشال نے کرسی سے اٹھتے ہوئے غصے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''کول ڈاؤن میری جان، آئی نو اندر سے تمہارے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔'' علینہ نے ہنستے ہوئے دعویٰ کیا۔

ایشال نے غصے میں بغیر خدا حافظ کہے فون بند کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

''میں نے مما اور ماموں جان کو کال کر کے بتا دیا ہے...... ہم ٹی، ڈی، سی، پی ہوٹل کلر کہار میں طوفانی بارش کی وجہ سے رک گئے ہیں...... جونہی بارش تھمے گی ہم یہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

''اچھا کیا آپ نے...... میرے موبائل کی بیٹری لو ہو رہی ہے ورنہ میں بتا دیتی انہیں......''

''اٹس او کے...... تم بتاؤ یا میں ایک ہی بات ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''تم صبح سے میرے ساتھ ہو...... تھک گئی ہوگی، ریسٹ کر لو بلکہ سو جاؤ۔''

''نن نہیں...... مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔'' ایشال نے جھجک کر جواب دیا۔

''او کے جیسے تمہاری مرضی۔'' اب وہ ٹی وی کا ریموٹ اٹھائے چینل سرچنگ میں مصروف تھے۔

ایشال وہیں آتش دان کے پاس بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی اور نیند بھی آنے لگی۔

''نیند آرہی ہے تو سو جاؤ۔'' ڈاکٹر عمر نے چینل چینج کرتے ہوئے اسے جمائی لیتے دیکھ کر مشورہ دیا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، نیند نہیں آرہی مجھے۔'' ایشال نے جھوٹ بولا۔

ڈاکٹر عمر اس کے صاف جھوٹ پر مسکرائے اور ٹی وی دیکھنے لگے۔ بارش اسی رفتار سے برس رہی تھی۔ مزید کچھ دیر کے بعد ایشال کی آنکھیں نیند سے سرخ ہونے لگیں۔ جمائیوں کے ساتھ، ساتھ اب وہ بار، بار اپنی آنکھیں بھی مل رہی تھی۔

''ایشال آئی نو...... تم بہت تھک گئی ہو اور تمہیں بہت نیند بھی آرہی ہے مگر تم شاید میری وجہ سے ان کمفرٹیبل فیل کر رہی ہو جبھی شدید نیند آنے کے باوجود کہہ رہی ہو کہ نیند نہیں آرہی۔'' وہ ریموٹ رکھ کر مسکراتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آئے۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ کھسیا کر بولی۔

''آئی نو ایسی ہی بات ہے۔ اٹھو شاباش بستر میں جاؤ...... تمہیں بہت سخت نیند آرہی ہے۔ یہ نہ ہو مروت اور لحاظ میں تم زبردستی جاگ کر صبح بیمار ہو جاؤ۔ ماموں جان اور مما تو مجھے چھوڑیں گے نہیں کہ ان کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی میرے ساتھ سیمینار اٹینڈ کرنے گئی تھی اور میں نے ان کی بیٹی کا خیال نہیں رکھا اور تا نو...... وہ الگ میری کلاس لیں گی۔'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر چیئر سے اٹھایا۔

''اچھا تو یہ جو صبح سے لے کر اب تک میرا خیال رکھ رہے تھے یہ سب ساجدہ پھپو اور بڑے پاپا کی وجہ سے رکھا جا رہا تھا۔ کتنی پاگل ہوں میں خوامخواہ ان کی محبت سمجھ کر دل کو خوشی دے رہی تھی۔'' ایشال نے ایک بار پھر بدگمانی سے دل میں سوچا۔

''آپ فکر مت کریں میں بیمار ہو بھی گئی تو کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا...... اس لیے آپ میری فکر مت کریں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی خفگی اس کے لہجے میں آگئی تھی۔ محبت میں یہ بڑی مصیبت ہے دل فوراً بدگمان ہو جاتا ہے۔ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں کیوں نہ فکر کروں تمہاری؟ تم اس وقت میرے ساتھ ہو اور میری ذمے داری ہو۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر لا بٹھایا۔ ایشال نے مسکرانے کی کوشش کی پر اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔

''میں اس وقت آپ کی ذمے داری ہوں۔ آپ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ تم میری محبت ہو۔'' اس نے دل میں

سوچا مگر لب خاموش تھے۔ ڈاکٹر عمر نے بیڈ پر طے ہوا کمبل کھول کر ایشال کی طرف بڑھایا جسے تھینکس کہہ کر اس نے بھینچ کر کندھوں تک لے لیا تھا۔ اس نے بیڈ کراؤن سے تکیے کے سہارے ٹیک ضرور لگالی تھی مگر وہ بستر میں مکمل دراز نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عمر ایک بار پھر آتش دان کے پاس جا بیٹھے۔ کچھ دیر بڑی مشکل سے نیند سے لڑتے، لڑتے ایشال کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر عمر نے گردن موڑ کر بیڈ سے ٹیک لگائے سوئی ہوئی ایشال کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیے۔ کتنی ہی دیر وہ یونہی اسے دیکھتے رہے تھے۔

میرے بے خبر تجھے کیا خبر؟
میری زندگی کا ہر ایک پل
تیری آرزو تیری جستجو
میری جیت تو میری ہار تو
میرے بے خبر تجھے کیا خبر؟
تیری ذات وہ نصاب ہے
جسے پڑھنا میرا خواب ہے
جو میرے لیے سراب ہے
میرے بے خبر میری بات سن
میری پلکوں سے میرے خواب چُن......

انہوں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ جس لڑکی کو وہ اس کی بچکانہ حرکتوں پہ ہر وقت ڈانٹا کرتے تھے، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن یوں اس کے سامنے بے بسی کی تصویر بن جائیں گے...... جس لڑکی پہ وہ ہمیشہ سے اپنی شخصیت کا رعب جھاڑتے آئے تھے ایک دن اسی کے سامنے چاروں شانے چت گر پڑیں گے۔ جس کو دومنٹ میں وہ کھری، کھری سنا دیا کرتے تھے اب اسی لڑکی سے اپنے دل کی بات کہنے کے لیے وہ یوں بے بس ہو جائیں گے...... ”یہ محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے، کبھی، کبھی ساتویں آسمان سے زمین پہ پٹخ دیتی ہے اور کبھی زمین سے اٹھا کر ساتویں پہ پہنچا دیتی ہے۔“ انہی سوچوں کو سوچتے ہوئے وہ چیئر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔ کبھی وہ کھڑکی میں آ کر کھڑے ہوتے تو کبھی صوفے پہ بیٹھ جاتے اور کبھی آتش دان کے پاس بیٹھ کر ہاتھ سینکتے اور کبھی اٹھ کر کمرے میں بے آواز ٹہلنے لگتے...... بیڈ پہ گہری نیند سوئی ہوئی ایشال نے ان کی نیند اڑا دی تھی۔ وہ ساری رات ڈاکٹر عمر نے اس بے خبر سی لڑکی کو سوچتے ہوئے گزار دی تھی۔ بالآخر وہ تھک کر صبح کے کسی پہر پھر سے آتش دان کے پاس رکھی چیئر پہ بیٹھ گئے تھے۔ دل میں اٹھنے والی خوب صورت خواہشوں کو نظر انداز کرتے، کرتے نہ جانے کب اُن کی آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح ایشال کی آنکھ کھلی تو گزری رات ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں گزرنے لگی اس نے بے اختیار اٹھ کر کمرے پہ نگاہ دوڑائی۔ ڈاکٹر عمر آتش دان کے قریب دونوں چیئرز کو جوڑ کر ایک چیئر پر دراز اور دوسری پہ ٹانگیں رکھے سکڑ کر سو رہے تھے۔ وہ جلدی سے بیڈ سے اتر آئی اور آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی اُن کے قریب آئی۔ اس کے آرام کی خاطر ڈاکٹر عمر خود کتنے بے آرام ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایشال کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے دل کو شرمندگی اور افسوس نے گھیر لیا۔ ایشال نے بیڈ سے کمبل اٹھا کر آرام سے ان کے اوپر پھیلا دیا تھا ان کا ایک ہاتھ چیئر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھے ایشال نے آہستگی سے اُن کا ہاتھ تھام کر ان کے سینے پہ رکھنا چاہا تھا مگر اگلے ہی

لمحے انہوں نے نیند میں بے اختیار اپنا دوسرا ہاتھ ایشال کے ہاتھ پہ رکھ لیا تھا وہ جو جھک کر ان کا ہاتھ ان کے سینے پہ رکھ رہی تھی ڈاکٹر عمر کی بے اختیاری پہ گڑ بڑا گئی۔ اس کا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ ایشال نے دھڑکتے دل سے گہری نیند سوئے ہوئے ڈاکٹر عمر کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ کتنا سکون تھا۔ ان کے بال اس نے ہمیشہ سنورے ہوئے دیکھے تھے مگر آج پہلی بار ان کے بالوں کو ایشال نے بکھرے دیکھا تھا۔ دل میں ایک انوکھی سی خواہش جاگ اٹھی، اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان کے بال سنوارے...... ایشال کے لبوں پہ ایک خوب صورت مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔ کہاں وہ ان کی آمد یا موجودگی سے دور بھاگتی تھی اور کہاں اب اسے ڈاکٹر عمر کی قربت میں رہنا اچھا لگنے لگا تھا۔ محبت نے اپنی بوندیں برسا کر اس کے دل کے کچے آنگن کی مٹی کو سوندھی، سوندھی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔

ایشال نے دھیرے سے ان کے بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ مگر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر عمر نے کسمسا کر ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایشال ان کے بے حد قریب ان پہ جھکی کھڑی تھی۔ اس کے کھلے بال جیسے ان کے وجود پر چھانے لگے تھے۔ ان کے اچانک یوں آنکھیں کھولنے پر ایشال ٹپٹا گئی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ جلدی سے ان کے ہاتھ تلے سے کھینچ لیا۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ کی جگہ ایک شرمندگی نے لے لی تھی۔

ڈاکٹر عمر اگلے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے اوپر پھیلے کمبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایشال سے ایک ہی وقت میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

''ایشال...... تم کیا کر رہی تھیں......؟ کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

''مم...... میں ٹھیک ہوں۔ ایکچوئیلی...... مم...... میں آپ کے اوپر یہ کمبل پھیلا رہی تھی۔ آئی نو آپ میرے آرام کی خاطر ساری رات بے آرام رہے۔'' اس کی بات پہ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''مجھے بے آرام ہونے اور رہنے کی عادت ہے۔ اینی ویز میں فریش ہو کر آتا ہوں...... کیا خیال ہے اس کے بعد چائے پی کر یہاں سے چیک آؤٹ کیا جائے یا بریک فاسٹ کرو گی تم......؟'' کمبل ہٹا کر چیئر سے اٹھتے ہوئے وہ ایشال سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے...... بس چائے لوں گی۔'' ایشال اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے کھڑکی کے قریب آئی اور وہ اثبات میں سر ہلا کر واش روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

زویا عرف دلنشیں کا ٹی وی پہ کمرشل چلتے ہی اس پہ مختلف کمرشلز کی آفرز کی بھرمار ہو رہی تھی۔ اس کے دلکش، خوب صورت اور معصوم سے حسن نے بہت سی ماڈلز کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں۔ بہت سے فیشن میگزینز میں اس کی تصویروں اور فوٹو شوٹس نے ان رسالوں کی مانگ بڑھا دی تھی۔ شوبز میں اس کا دلکش سراپا مرکزِ نگاہ تھا اور ہوشربا حسن کے چرچے پھیل چکے تھے۔ وہ جتنا پیسہ کما رہی تھی فرقان اس کے ذریعے اس سے ڈبل کما رہا تھا۔ وہ اس کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ دلنشیں کی بدولت اس کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی شہرت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ فرقان ایک مشہور اسٹائلسٹ سے اس کی گرومنگ کروا رہا تھا۔ جس کا اثر اس کی شخصیت پہ واضح نظر آنے لگا تھا۔ اب وہ لمبی، لمبی ہیلز پہن کر آسانی سے کیٹ واک کرنے لگی تھی۔ گلو کو اس نے دبئی بھجوا دیا تھا۔ خالد نے پلٹ کر ان کے گھر میں نہ جھانکا۔ زارا ان کو فون کر لیا کرتی تھی۔ گھر میں ایک بار پھر بہت خوشحالی آگئی تھی۔ اب

وہ آج کل ڈرائیونگ بھی سیکھ رہی تھی۔ اسے سارہ اور اماں کے ساتھ وقت گزارنے کا بہت کم ٹائم ملتا، اب بھی وہ فرقان کے ساتھ ایک کاک ٹیل پارٹی میں آئی ہوئی تھی۔

بلیک سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز اور ساڑی میں اس کا نازک سا سڈول سراپا غضب ڈھا رہا تھا ہر شخص اس سے بات کرنے اس کے ساتھ وقت گزارنے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا اور وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے سب سے ہیلو ہائے کر رہی تھی۔ فرقان اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے مختلف لوگوں سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ صوفے پہ بیٹھا ایک شخص مسلسل اسے نہایت واہیات نظروں سے دیکھ رہا تھا جبھی فرقان نے دور سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ جو سامنے براؤن کوٹ پہنے صوفے پہ بیٹھا شخص ہے ناں...... اسے اپنی جان لیوا مسکراہٹ سے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرو...... کوئی منسٹر ہے پر نہایت حسن پرست اور عیاش قسم کا آدمی ہے...... تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی...... بہت بڑی مچھلی ہے...... اپنی اداؤں کا جال پھینکو اور پھنسا لو اسے...... فائدے میں رہو گی۔'' فرقان نے اسے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

اس کی غلیظ نظریں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں اور وہ بھی کسی روبوٹ کی طرح سب کچھ ویسے ہی کر رہی تھی جیسے فرقان اسے کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ زمان قریشی کے ساتھ اس کے برابر صوفے پہ بیٹھی تھی۔

جس شخص نے کبھی اپنی اولاد کو حرام کا ایک نوالہ تک نہ کھلایا تھا آج اس کی اولاد کیسے، کیسے حرام کام کر رہی تھی۔ اس میں قصور کس کا تھا، تقدیر کا؟ حالات کا یا پھر اس نااہل عورت کا جو شاکر حسین کی شریک حیات بن کر ان کی زندگی میں آئی اور رفتہ، رفتہ ان کی زندگی سے سکون رخصت ہوتا گیا۔ غلط اور ناجائز خواہشات بھی، کبھی انسان کو ایسے غلط راستے پہ ڈالتی ہیں کہ پھر گناہ اور ثواب کا احساس مٹ جاتا ہے۔ دل مردہ ہو جاتا ہے آنکھیں نفس کی پسندیدہ چیزیں دیکھ، دیکھ کر دل و دماغ کو انجام سے اندھا کر دیتی ہیں...... زویا عرف دلنشیں نے ایسی زندگی کا کبھی تصور تک نہ کیا تھا مگر حالات نے اسے اس مقام پہ لاکھڑا کیا تھا جہاں اسے خود کو مارنا تھا اپنی عزت، انا، نفس، شرافت سب کو زندہ در گور کرنا تھا فرقان نے سچ ہی کہا تھا اس شخص پہ اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ نشے میں دُھت اب دلنشیں کے کندھے پہ بازو پھیلائے اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت بتانے کی درخواست کر رہا تھا۔ وہ اس بڑی مچھلی پر جال پھینکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ عنقریب کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے برانڈ کے لیے بطور ماڈل اس کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اس نے اسی شہرت و دولت کی بدولت اس راشی ایس ایچ او کو معطل بھی تو کروانا تھا جس کی شرائط پوری کرنے کے لیے وہ شرافت کی زندگی چھوڑ کر برائیوں کے اس مقام پہ آگئی تھی۔ اب زویا عرف دلنشیں کو ہر اس چیز کو، ہر اس شخص کو اپنے انتقام کی آگ سے بھسم کرنا تھا جنہوں نے اس کے گھرانے کی شرافت کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ اس رات وہ گھر نہیں آئی تھی۔ سیما بیگم پریشانی سے گھر کے صحن میں چکر پہ چکر کاٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

''اماں زندگی میں انسان سے جانے انجانے میں بہت سی غلطیاں اور ایسے گناہ ہو جاتے ہیں جن کی معافی نہیں ملا کرتی، اماں آپ...... آپ مجھے معاف کر دینا اماں......'' سارہ ماں کے پاس بیٹھی اُن کے آگے ہاتھ جوڑے رونے لگی۔

''سارہ...... میری بچی یہ، یہ کیا کر رہی ہو؟'' سیما بیگم نے پریشانی میں اس کے ہاتھ تھام لیے مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

لمحے انہوں نے نیند میں بے اختیار اپنا دوسرا ہاتھ ایشال کے ہاتھ پہ رکھ لیا تھا وہ جو جھک کر اُن کا ہاتھ ان کے سینے پہ رکھ رہی تھی ڈاکٹر عمر کی بے اختیاری پہ گڑبڑا گئی۔ اس کا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ ایشال نے دھڑکتے دل سے گہری نیند سوئے ہوئے ڈاکٹر عمر کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ کتنا سکون تھا۔ ان کے بال اس نے ہمیشہ سنورے ہوئے دیکھے تھے مگر آج پہلی بار ان کے بالوں کو ایشال نے بکھرے دیکھا تھا۔ دل میں ایک انوکھی سی خواہش جاگ اٹھی، اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان کے بال سنوارے...... ایشال کے لبوں پہ ایک خوب صورت مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔ کہاں وہ ان کی آمد یا موجودگی سے دور بھاگتی تھی اور کہاں اب اسے ڈاکٹر عمر کی قربت میں رہنا اچھا لگنے لگا تھا۔ محبت نے اپنی بوندیں برسا کر اس کے دل کے کچے آنگن کی مٹی کو سوندھی، سوندھی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔

ایشال نے دھیرے سے ان کے بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ مگر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر عمر نے کسمسا کر ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایشال ان کے بے حد قریب ان پہ جھکی کھڑی تھی۔ اس کے کھلے بال جیسے ان کے وجود پر چھانے لگے تھے۔ ان کے اچانک یوں آنکھیں کھولنے پر ایشال ٹپٹا گئی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ جلدی سے ان کے ہاتھ تلے سے کھینچ لیا۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ کی جگہ ایک شرمندگی نے لے لی تھی۔

ڈاکٹر عمر اگلے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے اوپر پھیلے کمبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایشال سے ایک ہی وقت میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

”ایشال...... تم کیا کر رہی تھیں...... ؟ کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہوناں؟“

”مم...... میں ٹھیک ہوں۔ ایکچوئیلی...... مم...... میں آپ کے اوپر یہ کمبل پھیلا رہی تھی۔ آئی نو آپ میرے آرام کی خاطر ساری رات بے آرام رہے۔“ اس کی بات پہ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

”مجھے بے آرام ہونے اور رہنے کی عادت ہے۔ اینی ویز میں فریش ہو کر آتا ہوں...... کیا خیال ہے اس کے بعد چائے پی کر یہاں سے چیک آؤٹ کیا جائے یا بریک فاسٹ کرو گی تم......؟“ کمبل ہٹا کر چیئر سے اٹھتے ہوئے وہ ایشال سے مخاطب ہوئے۔

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے...... بس چائے لوں گی۔“ ایشال اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے کھڑکی کے قریب آئی اور وہ اثبات میں سر ہلا کر واش روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

زویا عرف دلنشیں کا ٹی وی پہ کمرشل چلتے ہی اس پہ مختلف کمرشلز کی آفرز کی بھرمار ہو رہی تھی۔ اس کے دلکش، خوب صورت اور معصوم سے حسن نے بہت سی ماڈلز کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں۔ بہت سے فیشن میگزینز میں اس کی تصویروں اور فوٹو شوٹس نے ان رسالوں کی مانگ بڑھا دی تھی۔ شوبز میں اس کا دلکش سراپا مرکزِ نگاہ تھا اور ہوشربا حسن کے چرچے پھیل چکے تھے۔ وہ جتنا پیسہ کما رہی تھی فرقان اس کے ذریعے اس سے ڈبل کما رہا تھا۔ وہ اس کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ دلنشیں کی بدولت اس کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی شہرت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ فرقان ایک مشہور اسٹائلسٹ سے اس کی گرومنگ کروا رہا تھا۔ جس کا اثر اس کی شخصیت پہ واضح نظر آنے لگا تھا۔ اب وہ لمبی، لمبی ہیلز پہن کر آسانی سے کیٹ واک کرنے لگی تھی۔ گلو کو اس نے دبئی بھجوا دیا تھا۔ خالد نے پلٹ کر اُن کے گھر میں نہ جھانکا۔ زارا ان کو فون کر لیا کرتی تھی۔ گھر میں ایک بار پھر بہت خوشحالی آ گئی تھی۔ اب

وہ آج کل ڈرائیونگ بھی سیکھ رہی تھی۔ اسے سارہ اور اماں کے ساتھ وقت گزارنے کا بہت کم ٹائم ملتا، اب بھی وہ فرقان کے ساتھ ایک کاک ٹیل پارٹی میں آئی ہوئی تھی۔

بلیک سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز اور ساڑی میں اس کا نازک سا سڈول سراپا غضب ڈھا رہا تھا ہر شخص اس سے بات کرنے اس کے ساتھ وقت گزارنے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا اور وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے سب سے ہیلو ہائے کر رہی تھی۔ فرقان اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے مختلف لوگوں سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ صوفے پہ بیٹھا ایک شخص مسلسل اسے نہایت واہیات نظروں سے دیکھ رہا تھا جبھی فرقان نے دور سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ جو سامنے براؤن کوٹ پہنے صوفے پہ بیٹھا شخص ہے ناں...... اسے اپنی جان لیوا مسکراہٹ سے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرو...... کوئی منسٹر ہے پر نہایت حسن پرست اور عیاش قسم کا آدمی ہے...... تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی...... بہت بڑی مچھلی ہے...... اپنی اداؤں کا جال پھینکو اور پھنسا لو اسے...... فائدے میں رہو گی۔'' فرقان نے اسے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

اس کی غلیظ نظریں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں اور وہ بھی کسی روبوٹ کی طرح سب کچھ ویسے ہی کر رہی تھی جیسے فرقان اسے کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ زمان قریشی کے ساتھ اس کے برابر صوفے پہ بیٹھی تھی۔

جس شخص نے کبھی اپنی اولاد کو حرام کا ایک نوالہ تک نہ کھلایا تھا آج اس کی اولاد کیسے، کیسے حرام کام کر رہی تھی۔ اس میں قصور کس کا تھا، تقدیر کا؟ حالات کا یا پھر اس نااہل عورت کا جو شاکر حسین کی شریک حیات بن کر ان کی زندگی میں آئی اور رفتہ رفتہ ان کی زندگی سے سکون رخصت ہوتا گیا۔ غلط اور ناجائز خواہشات بھی، کبھی انسان کو ایسے غلط راستے پہ ڈالتی ہیں کہ پھر گناہ اور ثواب کا احساس مٹ جاتا ہے۔ دل مردہ ہو جاتا ہے آنکھیں نفس کی پسندیدہ چیزیں دیکھ، دیکھ کر دل و دماغ کو انجام سے اندھا کر دیتی ہیں...... زویا عرف دلنشیں نے ایسی زندگی کا کبھی تصور تک نہ کیا تھا مگر حالات نے اسے اس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں اسے خود کو مارنا تھا اپنی عزت، انا، نفس، شرافت سب کو زندہ درگور کرنا تھا فرقان نے سچ ہی کہا تھا اس شخص پہ اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ نشے میں دُھت اب دلنشیں کے کندھے پہ بازو پھیلائے اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت بتانے کی درخواست کر رہا تھا۔ وہ اس بڑی مچھلی پر جال پھینکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ عنقریب کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے برانڈ کے لیے بطور ماڈل اس کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اس نے اسی شہرت و دولت کی بدولت اس راشی ایس ایچ او کو معطل بھی تو کروانا تھا جس کی شرائط پوری کرنے کے لیے وہ شرافت کی زندگی چھوڑ کر برائیوں کے اس مقام پہ آ گئی تھی۔ اب زویا عرف دلنشیں کو ہر اس چیز کو، ہر اس شخص کو اپنے انتقام کی آگ سے بھسم کرنا تھا جنہوں نے اس کے گھرانے کی شرافت کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ اس رات وہ گھر نہیں آئی تھی۔ سیما بیگم پریشانی سے گھر کے صحن میں چکر پہ چکر کاٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

''اماں زندگی میں انسان سے جانے انجانے میں بہت سی غلطیاں اور ایسے گناہ ہو جاتے ہیں جن کی معافی نہیں ملا کرتی، اماں آپ...... آپ مجھے معاف کر دینا اماں......'' سارہ ماں کے پاس بیٹھی اُن کے آگے ہاتھ جوڑے رونے لگی۔

''سارہ...... میری بچی یہ، یہ کیا کر رہی ہو؟'' سیما بیگم نے پریشانی میں اس کے ہاتھ تھام لیے مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں بیٹی تو نے اپنے ابا کی موت کا دل پہ بہت گہرا غم لیا ہے تو ہر وقت اُن کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ سارہ میری بچی...... تم تو انہیں یاد کر کے آنسو بہا لیتی ہو مگر میرے آنسو تو ہر وقت میری آنکھوں کے بجائے دل پہ گرتے ہیں۔ میرا ضمیر مجھے سونے نہیں دیتا۔ میں ساری زندگی تمہارے باپ سے لڑتی جھگڑتی رہی، ان سے شکوے کرتی رہی۔ ان کی حق حلال کی تھوڑی کمائی پہ انہیں طعنے دیتی رہی اور ہمیشہ ان سے کہتی رہی کہ شاکر حسین تمہاری شرافت نے ہمیں کون سا سکھ عطا کیا ہے اور تیرے ابا ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔

''حلال میں سکون ہوتا ہے راحت ملتی ہے...... ضرورتیں تو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ ہاتھ تنگ ہو جائے کوئی بات نہیں...... دل مطمئن ہونا چاہیے، سیما بیگم دل کی راحت دل کا سکون بڑا ضروری ہوتا ہے دل میں سکون اور اطمینان نہ ہو تو دولت کے ڈھیر بھی خوشیاں نہیں دے سکتے۔'' تمہارے ابا یہ باتیں کرتے تھے تو میں اپنی کم عقلی اور آسائشوں کی لالچ کرنے والی...... دولت کی پجاری عورت ان کی اس درویشی پہ بھڑک جایا کرتی تھی۔ وقتی آزمائشوں اور رزق کی کمی پر بجائے اپنے اس رب کے آگے گڑگڑانے کے اپنے فرشتہ صفت مجازی خدا سے لڑتی جھگڑتی...... آخر اپنی آخرت خراب کر لی۔ آج میری آخرت کے ساتھ زندگی بھی خراب ہو چکی ہے۔ اجڑ گیا میرا وہ چھوٹا سا گھر...... جس میں میرا شوہر رزقِ حلال کما کر لاتا تھا، میں نے اپنے بیٹے کی حرام کی کمائی کھائی اور منہ کے بل جا گری۔ اب بیٹی کی حرام اور برائیوں سے کمائی دولت نے میرا سکون چھین لیا ہے۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آتی سارہ...... مجھے بھوک نہیں لگتی۔ مجھے یہ سجا سجایا گھر ڈستا ہے، مجھے تیرے ابا کا وہ چھوٹا سا گھر یاد آتا ہے جو تیرے ابا نے اپنی شرافت، ایمانداری اور رزقِ حلال سے بنایا تھا۔'' اب وہ بلک رہی تھیں۔

''تو سچ کہتی ہے انسان جانے انجانے میں کچھ غلطیاں اور کچھ ایسے گناہ کر بیٹھتا ہے جن کی معافی نہیں ملتی۔ مجھے بھی معافی نہیں ملے گی۔ روز یہ زندگی ایک سزا بن کر مجھے سزا دیتی ہے...... میں خدا اور رسول کی گناہ گار ہوں۔ اپنے شوہر کی گناہ گار ہوں۔ اپنے بچوں کی بھی مجرم ہوں۔ تیرے ابا کی خشمگیں نگاہیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔ زویا جب غیر مردوں کے لیے سج دھج کر نکلتی تو کئی بار زندہ درگور ہوتی ہوں میں، یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میں گناہ گار ہوں...... معافی تو مجھے مانگنی ہے۔'' سیما بیگم، سارہ کے ہاتھ تھامے زار و قطار رو رہی تھیں۔ سارہ بھی رو رہی تھی دنیا کی ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان وہ چیز ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے، سنورتا ہے۔ سیما بیگم نے جب زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ معاملات میں دیر نہیں کرنی چاہیے، دیر ہو جائے تو پھر بہت ہی دیر ہو جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ رات دونوں ماں بیٹی نے روتے ہوئے گزاری تھی۔ زویا صبح چار بجے گھر آئی تھی اور جس طرح وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوئی تھی سیما بیگم کی بچی کھچی سانسیں بھی سینے میں اٹک گئی تھیں۔ اُن کے بیٹے کی زندگی بچاتے، بچاتے ان کی بیٹی نے اپنی زندگی برباد کر لی تھی۔

سارہ کے پاس تو ویسے بھی کوئی دوسرا راستہ نہ تھا سو اس رات سارہ نے بھی ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

زارون اور عنایہ اپنا ہنی مون ٹرپ انجوائے کر کے واپس آ چکے تھے، ایک دوسرے کو پا کر جیسے ان کی زندگی حسین اور مکمل ہو گئی تھی۔ خوشیوں نے جیسے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اقصم کے گائے ہوئے گانے کو ملک گیر شہرت ملنے کے بعد اس کی شہرت کی بازگشت پڑوسی ملک میں بھی سنائی دینے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ پڑوسی ملک کے ایک مشہور فلم ہدایت کار نے اس کے گانے کو نہ صرف اپنی فلم میں شامل کیا تھا بلکہ اقصم سے اس فلم میں مزید گانے گوانے

کا فیصلہ کر لیا تھا یہی وجہ تھی کہ اقصم آج کل وہاں گیا ہوا تھا جہاں اسے مختلف فلموں میں گانے کی آفرز ہو رہی تھیں۔ اخبارات میں اس کی تصویریں شائع ہو رہی تھیں...... اس کی گائیکی پر تبصرے ہو رہے تھے۔ لڑکیاں اس کی گائیکی کے ساتھ، ساتھ اس کی ڈیشنگ پرسنالٹی پر بھی فدا تھیں۔ اپنے پہلے ہی گانے سے وہ لائم لائٹ پر آ گیا تھا۔ ایک مشہور سیلبریٹی بن گیا تھا۔ دوسری طرف ارسل نے ہمت نہ ہارتے ہوئے اب بھی ایشال سے یہ امید لگا رکھی تھی کہ وہ اس کا پرپوزل قبول کر لے گی مگر ایشال کے دل میں ڈاکٹر عمر کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا وہ ان کی محبت کو چاہ کر بھی اپنے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ ایشال کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اہم ہو گئے تھے۔

دوسری طرف ولی بھی اپنا اسپشلائزیشن مکمل کر کے واپس آ گیا تھا۔ اب کے ولی کے ساتھ ان کی بڑی بہن زری آپا بھی اپنے بچوں کے ساتھ پاکستان آئی تھیں اور وہ اپنی موجودگی میں ولی کی شادی کا فرض ادا کر کے واپس جانا چاہتی تھیں سو ولی اور زری آپا کی طرف سے شادی کی تاریخ جلدی طے کرنے پر اصرار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ عرصے سے ڈاکٹر عمر ہی ایشال کو اسپتال سے گھر اور گھر سے اسپتال پک اینڈ ڈراپ دیا کرتے تھے۔ آج صبح جب وہ نور منزل اسے پک کرنے آئے تو وہ ابھی سو رہی تھی، نور منزل سے اسپتال جاتے ہوئے ڈاکٹر عمر کو اس کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا...... وہ خود بھی اس کی ہمراہی کے عادی ہو گئے تھے، اسپتال آ کر انہوں نے وارڈ کا راؤنڈ لگایا تھا...... اور آفس آ کر انہوں نے ایشال کو کال کی تھی جو دوسری طرف سے فوراً پک کر لی گئی تھی۔

''السلام علیکم! کہاں ہو؟ میں گھر آیا تھا، تھوڑی دیر نانو کے پاس بیٹھا تو پینو نے بتایا کہ تم ابھی سو رہی ہو...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری......؟'' ان کے انداز میں اس کے لیے فکر تھی۔ بالوں میں ہیئر برش پھیرتے ہوئے موبائل کان سے لگائے وہ ان کی فکر اور تشویش پہ مسکرائی۔

''جی، رات ارسل مجھے زبردستی اپنے ساتھ ڈنر پر لے گیا تھا...... گھر آتے، آتے بارہ بج گئے تھے، اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلی...... مگر میں ٹھیک ہوں، بس پانچ منٹ تک اسپتال کے لیے نکل رہی ہوں۔'' ایشال نے بالوں میں برش کرنے کے بعد لپ اسٹک اٹھا کر ہونٹوں پر لگائی۔

''او کے، میں فون رکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر کو نہ جانے کیوں ارسل کے ساتھ اس کے ڈنر والی بات سن کر اچھا نہیں لگا تھا اس کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں ان کے دروازے پر دستک دے کر اُن کا اسسٹنٹ اندر آیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ سے کوئی خاتون ملنا چاہتی ہیں۔''

''کون خاتون؟ کیا نام ہے اُن کا؟'' ڈاکٹر عمر نے حیرت سے استفسار کیا۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے ان سے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' اسسٹنٹ نے مایوسی سے اطلاع دی۔

''حیرت ہے، آخر کون ہیں وہ محترمہ...... اینی وے تم انہیں اندر بھیجو۔'' ڈاکٹر عمر کے حکم پہ اسسٹنٹ باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے جو شخصیت اُن کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے ڈاکٹر عمر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھے تھے حیرت سے گنگ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ کتابِ ماضی کے اوراق پھر سے پھڑ پھڑانے لگے۔ سبرینہ ان کے سامنے کھڑی تھی، آٹھ سال انہوں نے سبرینہ جیسی عورت سے محبت کرنے پر خود کو ملامت کی تھی۔ آج وہ غلطی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''اتنے بے مروت ہو گئے ہو...... بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟'' تیس بتیس سالہ خوب صورت سی سبرینہ پچ کلر کی خوب صورت اور نفیس سی شیفون کی ساڑی میں ملبوس...... وہ آٹھ سال کے بعد بھی اتنی ہی حسین لگ رہی تھی جتنی وہ آٹھ سال پہلے ہوا کرتی تھی۔

ڈاکٹر عمر نے اسے اپنی ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میرے لیے کافی منگواؤ...... عرصہ ہوا تمہارے ساتھ بیٹھ کر کافی پیئے ہوئے۔'' سبرینہ بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ڈاکٹر عمر کا چہرہ سپاٹ تھا۔ انہوں نے میز پر رکھا فون اٹھا کر کافی بھجوانے کی ہدایت کی۔

''کیسے ہو عمر؟'' اُن کے فون رکھتے ہی سبرینہ نے مسکراتے ہوئے ان کا حال پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' مختصر جواب۔

''ناراض ہو ابھی تک؟''

''نہیں، میں نے آٹھ سال پہلے یہ حق کھو دیا تھا۔ خیر تم کیسی ہو؟'' انہوں نے سبرینہ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پیپر ویٹ گھمایا۔

''سچ بتاؤں تو تمہیں کھو کر آج تک سکون نہیں ملا...... تمہاری محبت ٹھکرائی تو میری محبت کو بھی جوتے کی نوک پر رکھا گیا۔ میں نے محبت تو تم سے کی مگر تمہارے ہی دوست کی بے شمار دولت دیکھ کر لالچ میں آ گئی۔ تم جیسے ہیرے کو گنوا کر میں نے تمہارے ڈائمنڈ مرچنٹ دوست فیصل سے دولت کی لالچ میں شادی کر لی...... تمہاری انمول محبت کو ٹھکرا دیا۔ تمہیں چیٹ (دھوکا) کیا...... پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جواباً مجھے اس کی انمول محبت ملتی؟ میرے دیے ہوئے دھوکے نے ایک دن مجھے بھی تو دھوکا دینا ہی تھا۔ سو فیصل کے ساتھ بہت مشکل سے میں نے پانچ سال گزارے...... اولاد ہو جاتی تو اس کے اور میرے درمیان فاصلے مٹ جاتے۔ اس کی کئی گرل فرینڈ تھیں جن پر وہ اندھا دھند پیسہ نچھاور کرتا تھا میں اسے ان کاموں سے روکتی تو وہ نشے میں مجھے بری طرح سے مارتا پیٹتا...... پھر ایک دن میری برداشت کی حد ختم ہو گئی...... اور میں نے اس سے طلاق لے لی۔'' ڈاکٹر عمر نے اس کی طویل داستان سننے کے بعد ایک طویل سانس لی۔ آفس بوائے کافی لے آیا تھا۔

''مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ تمہاری لائف اتنی ڈسٹرب رہی۔'' انہوں نے سبرینہ کو کافی کا مگ اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

''حالانکہ تمہیں خوش ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ اتنا برا کیا اور...... تم اپنی سوفٹ فطرت کے تحت آج بھی یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں دکھ ہوا؟ میرے یوں دکھی ہونے پر۔'' سبرینہ نے کافی کا مگ اٹھایا اور اپنے سامنے بیٹھے اس مرد کو دیکھا جس کے دل پر کبھی اس نے راج کیا تھا۔

''آج کل کس ملک میں پڑاؤ ہے تمہارا؟'' ڈاکٹر عمر نے کافی کا مگ اٹھایا اور لبوں سے لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''پچھلے تین سال سے کینیڈا میں ہوں، وہاں ایک ساٹھ سالہ بزنس مین مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔ فیصل کے بعد مجھے بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ سرفراز ہمدانی نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے اس سے نکاح کر لیا۔ تین سال میں اپنے باپ کی عمر کے مرد کے نکاح میں رہی۔ سرفراز ہمدانی کے ساتھ میری زندگی کے تین سال ایسے گزرے جیسے میں نے کسی جیل میں گزارے ہوں۔ مجھ سے ڈبل عمر تھی اس کی۔ بہت پابندیاں لگا تا تھا سرفراز مجھ پر...... اس کی پہلی بیوی اور بیٹوں نے مجھے ڈرا دھمکا کر اتنا خوفزدہ رکھا کہ وہ تین سال میرے لیے ہر روز ایک نئی آزمائش بن کر میری

زندگی سے سکون نام کی ہر چیز مٹاتے رہے۔ چھ مہینے پہلے سرفراز ہارٹ اٹیک سے وفات پا گیا۔ اس کی وفات کے بعد کچھ جائیداد کے معاملات تھے انہیں حل کرنے میں چار پانچ ماہ مجھے کینیڈا میں گزارنے پڑے۔ پچھلے مہینے میں کینیڈا سے پاکستان آئی ہوں...... ماں کی طبیعت آج کل بہت خراب رہتی ہے۔ ان کے لیے پاکستان آنا پڑا...... ورنہ یہاں آنے کو دل نہیں کرتا تھا میرا۔''

سبرینہ کافی پیتے ہوئے انہیں اپنے بیتے ہوئے آٹھ سالوں کی روداد سنا رہی تھی۔ اور ڈاکٹر عمر کو حقیقتاً اس کی کہانی سن کر ازحد افسوس ہوا تھا۔

''مجھ سے وجہ نہیں پوچھو گے یہاں نہ آنے کی؟'' سبرینہ نے عمر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نے تم سے کچھ بھی پوچھنے کے تمام حقوق آٹھ سال پہلے کھو دیے تھے۔'' وہ ایک بار پھر پیپر ویٹ گھمانے لگے تھے۔

''بیوی کیسی ہے تمہاری؟ بچے کتنے ہیں؟ یقیناً پانچ چھ تو ضرور ہوں گے۔ بچے تمہیں بہت پسند تھے ناں؟'' سبرینہ مسکرائی۔

''میں نے شادی نہیں کی۔''

''مگر کیوں......؟'' اب کے سبرینہ کے لہجے میں افسوس کے ساتھ بے پناہ حیرت پوشیدہ تھی۔

''کم از کم تمہیں تو اس سوال کا جواب نہیں مانگنا چاہیے تھا۔'' ڈاکٹر عمر نے لحظہ بھر اسے دیکھا۔

''عمر...... کیا اتنی محبت بھی کوئی اس دور میں کسی سے کر سکتا ہے، جتنی تم نے مجھ سے کی۔'' سبرینہ نے میز پر جھک کر اُن کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

مخلص شخص کی محبت کی قدر نہیں کی۔ جواباً مجھے بھی ٹھکرایا ہی
''میں کتنی بدنصیب ہوں...... میں نے تم جیسے
گیا۔'' سبرینہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے لہجے میں پچھتاوا بولنے لگا...... معاً ان کے آفس کا دروازہ کھلا تھا،
ایشال ہاتھ میں اسٹیتھواسکوپ پکڑے گہرے نیلے رنگ کے خوب صورت لباس پر سفید اوورآل پہنے کمرے میں
داخل ہوئی مگر اندر کے منظر نے اسے وہیں ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
سبرینہ نے ڈاکٹر عمر کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ان کی بیتی ہوئی محبت کو دیکھ کر ایشال کا دل بند ہونے لگا۔
''سوری، شاید میں غلط وقت پر اندر آ گئی۔'' ایشال نے دھیرے سے جیسے خود سے کہا اور واپس جانے کے لیے پلٹی۔
''ایشال......'' ڈاکٹر عمر نے اسے آواز دی...... مگر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور عجلت میں وہ دروازہ کھول کر
باہر نکل گئی تھی۔
''کون تھی یہ لڑکی؟'' سبرینہ نے حیرت سے سوال کیا اس نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھ سے ہٹائے۔
''میری ہونے والی بیوی......'' اُن کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
"wow great news"
سبرینہ مسکرائی۔ ''پھر کب کر رہے ہو شادی؟''
''اسی سال......'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے ریوالونگ چیئر گھمائی۔
"ok,best of luck"
سبرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو اپنی شادی پر مجھے ضرور بلانا۔''
''ہاں ضرور......'' ڈاکٹر عمر کے چہرے پر ایک خوب صورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
سبرینہ نے ایک نظر اُن کے چہرے کو دیکھا۔
''تم سے ملاقات کی سب سے بڑی وجہ وہ گلٹ تھا جس نے آٹھ سال مجھے بے سکون رکھا۔ اپنی نئی زندگی
شروع کرنے سے پہلے پلیز...... مجھے معاف کر دینا۔ میں پچھلے آٹھ سال سے رات کو ٹرینکولائزر (سکون کی گولی)
لے کر سوتی ہوں مگر پھر بھی مجھے یہ گلٹ بے چین رکھتا ہے کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ تمہاری محبت کو ہرٹ
کیا۔'' سبرینہ کے انداز میں، اس کے لہجے میں بے پناہ شرمندگی تھی، دکھ تھا۔
''میں نے تمہیں اسی وقت معاف کر دیا تھا جب ایشال کی محبت نے میرے دل میں بسیرا کیا۔'' اُن کے لہجے
میں ایشال کے لیے بے پایاں محبت تھی۔
''اچھا ہے نئی محبت کو اپنانے کے لیے پرانی محبتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' سبرینہ ساڑی کا پلو سنبھالتی
ہوئی چیئر سے اٹھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی مگر ڈاکٹر عمر نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''چلتی ہوں...... تم نے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اس کے لیے شکریہ......''
''او کے، اپنا خیال رکھنا۔'' ڈاکٹر عمر نے رسمی جملہ بولا...... تو وہ تلخی سے مسکرائی۔
''اب زندگی میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے لیے اپنا خیال رکھوں...... مگر تم ایشال کے لیے اپنا بہت خیال
رکھنا......'' اپنا پرس اٹھاتے ہوئے سبرینہ نے آخری بار اس شخص کو دیکھا جو کبھی اس کا تھا اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔
اس سے محبت کرتا تھا...... مگر آج وہ شخص اس کے لیے صرف ایک اجنبی تھا...... اس کے حسن سے بے نیاز...... اس کی
محبت سے خالی......

☆☆☆

اس رات دلنشیں نشے میں تھی...... سو بے سدھ ہو کر بستر پر گری تو صبح تک سوتی رہی، اچانک سیما بیگم کی چیخ و پکار پہ اس کی آنکھ کھلی تھی...... سیما بیگم کی چیخیں اتنی ہولناک تھیں کہ اس نے ایک سیکنڈ لگایا تھا بستر سے اٹھنے میں۔

''زویا، زویا، میری سارہ...... میری سارہ...... مر گئی سارہ...... مر گئی۔ میری سارہ مر گئی۔ سارہ...... سارہ......'' سیما بیگم کانوں پر ہاتھ رکھے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں۔

زویا کے جسم سے جیسے کسی نے جان نکال لی تھی...... اس کے ہاتھ کانپنے لگے، ٹانگیں بے جان ہونے لگیں، اس کی نظریں، بستر پر پڑی سارہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ پیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔ بیڈ کے قریب فرش پر خون گرا ہوا تھا، مرنے سے پہلے یقیناً اسے خون کی الٹی آئی تھی...... زویا کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ اس کے اندر حیرت، بے یقینی اور غم کی ایک ایسی ہوک سی اٹھی کہ وہ دیوانہ وار سارہ کی جانب لپکی تھی۔

''سارہ، سارہ اٹھو سارہ......'' وہ اسے دیوانہ وار جھنجوڑ رہی تھی ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اسے پورا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نہ اس کے پیروں تلے زمین تھی نہ سر پر آسمان، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ زمین و آسمان کے بیچ میں معلق ہو۔

☆☆☆

کبھی اترو یوں میرے دل کے کچے آنگن میں\
کسی اداس موسم میں\
کسی ویران لمحے میں چپکے سے\
میری آنکھوں پر رکھ دو ہاتھ اپنے\
اور ہنستے ہوئے کہہ دو\
بوجھ لو تو ہم تمہارے\
نہ بوجھو تو تم ہمارے......

اسپتال سے گھر آتے تمام راستے اس کے آنسو نہیں رکے تھے۔ وہ منظر جب سبرینہ نے اپنے ہاتھوں میں ڈاکٹر عمر کا ہاتھ تھام رکھا تھا بار، بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اُن کی پرانی محبت پھر سے ان کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ اب اس کی جگہ تو ڈاکٹر عمر کی زندگی میں کہیں تھی ہی نہیں...... ایشال کے ذہن میں منفی سوچوں کا ایک انبار لگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بچے سے اچانک اس کا پسندیدہ کھلونا چھین لیا جائے...... وہ بہت فاسٹ ڈرائیو کر کے گھر آئی تھی اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی...... اس دوران ڈاکٹر عمر نے اسے موبائل پر کئی بار کال کیں...... مگر اس نے پک نہیں کی...... کمرے میں آ کر وہ اپنے ٹیڈی بیئر کو خود سے لپٹائے جی بھر کے رو رہی تھی۔ نہ جانے یہ کم بخت محبت اسے کب اس موڑ پر لے گئی تھی جہاں سے واپسی ایشال کو ناممکن نظر آ رہی تھی۔ جانے ڈاکٹر عمر کب اس کی زندگی میں اس حد تک اہمیت اختیار کر گئے تھے کہ دل نے اُن کی ہمراہی کے سپنے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ سپنے جو اس کے اپنے نہیں تھے۔ اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا...... مگر وہ رو رہی تھی۔

شام تک وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی...... اس دوران پینو نے کئی بار آ کر اس سے کھانے کا پوچھا تھا مگر ہر بار اس نے ، بھوک نہیں ہے ، کا جملہ بول کر کمرا بند کر لیا تھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ شام ہوئی تو پھر سے اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر عمر نے شاید اسے پچاسویں بار کال کی تھی مگر اس بار ایشال نے موبائل اٹھا

کر پھینک دیا تھا۔
ٹھیک دس منٹ کے بعد کسی نے اس کے روم کا دروازہ بری طرح پیٹا تھا۔ ایشال نے حیرت سے دروازے کو دیکھا۔ یہ دستک تو اس کے گھر کے کسی بھی فرد کی نہیں تھی پھر یہ کون تھا جو دھڑ، دھڑ اس کا دروازہ پیٹ رہا تھا...... ایشال نے اپنے آنسو صاف کیے اور دروازے کا لاک کھولا...... اگلے ہی لمحے ڈاکٹر عمر نہایت غصے میں تن فن کرتے اس کے روم میں داخل ہوئے۔ اور اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔
''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں تم؟ بولو، جواب دو؟ میں کیا پاگل ہوں جو صبح سے تمہیں مسلسل فون کر رہا ہوں اور تم مجھے مسلسل اگنور کر رہی ہو؟ اس طرح بی ہیو کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟ جانتی ہو کتنے فون کیے ہیں میں نے۔'' ایشال کو دونوں بازوؤں سے پکڑے وہ نہایت غصے میں اس پر دھاڑے۔
''پاگل آپ نہیں، پاگل تو میں تھی جو آپ کی ہمدردی اور خلوص کو آپ کی محبت سمجھ کر اپنا نادان اور ناسمجھ دل آپ کو سونپ بیٹھی۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ جس دل میں پہلے سے کسی کا نام لکھا ہو، وہ دل میرے لیے کیسے دھڑک سکتا ہے۔'' ایشال نے روتے ہوئے اُن کے ہاتھ جھٹک دیے اور خود رخ موڑ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زور، زور سے رونے لگی۔ ڈاکٹر عمر جہاں کھڑے تھے حیرت سے وہیں کھڑے ایشال کو تکنے لگے...... ایک ناقابلِ یقین خوشی نے انہیں اندر تک سرشار کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو وہ غصے سے تن فن کرتے اس کے کمرے میں آئے تھے وہ غصہ اب ہوا ہو گیا تھا۔ اس غصے کے بجائے ایک بے یقینی نے لے لی تھی، بے پایاں خوشی نے لے لی تھی، بے اختیاری نے لے لی تھی۔ وہ خوشی اور بے یقینی سے ایشال کے قریب آئے اور بے اختیار انہوں نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔
''ہوں، تو یہ بات تھی؟'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ ایشال نے خفگی سے اُن کے ہاتھ جھٹکنے چاہے مگر اس بار ان کی گرفت اور بھی مضبوط تھی۔
''چھوڑیں میرے ہاتھ...... اور جائیں اپنی اس بھولی بسری محبت کے پاس...... جو دوسری بار پھر سے آپ کو دھوکا دینے آ گئی ہے۔'' ایشال نے غصے سے اپنے ہاتھ چھڑانے چاہے اس کے لہجے میں جیلسی تھی۔ ڈاکٹر عمر.... بے اختیار مسکرائے۔
''یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ تم بہت اسٹوپڈ ہو مگر اتنی اسٹوپڈ بھی ہو سکتی...... میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔''
''محبت کرنے والے اسٹوپڈ ہی ہوتے ہیں۔'' ایشال کی خفگی اب بھی اسی طرح تھی۔
''اور اس اسٹوپڈ لڑکی نے مجھے اپنی محبت میں مبتلا کر کے مجھ جیسے اچھے خاصے ڈیسنٹ بندے کو بھی.... بے وقوفوں کی صف میں شامل کر دیا، ہے ناں۔'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا...... ایشال کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا...... اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
''سبرینہ نے میرا ہاتھ کیا پکڑ لیا تم نے غلط فہمیوں کا محل بنا کر خود کو اس میں بند کر لیا؟ سبرینہ میرا ماضی تھی، میری کم عمری کی نادان اور بے وقوف محبت...... جس پہ میں آٹھ سال پچھتایا...... پھر نہ جانے کب تم نے میری زندگی سے سبرینہ کا چیپٹر پھاڑ کر میری زندگی کی کتاب پر اپنا نام تحریر کر لیا...... آئی سوئیر ایشال آئی لو یو سو مچ......'' ڈاکٹر عمر اسے شانوں سے تھامے اس کی نظروں میں جھانکتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولے تو وہ بلش ہو گئی۔ چند لمحے وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔
''مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔'' ایشال شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
''مگر میں اس خوب صورت خواب کو اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے مسکراتے ہوئے

وارفتگی سے ایشال کو دیکھا۔

''سوری، میں نے آپ کو غلط سمجھا۔'' اسے شرمندگی ہوئی۔

''اب معافی تو تمہیں ایک ہی صورت میں ملے گی مجھ سے۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے خود سے قریب کیا...... ایشال حیران ہوئی۔

''میں کل مما کو بھیج رہا ہوں یہاں...... مجھے بہت جلد تم سے شادی کرنی ہے۔'' انہوں نے فیصلہ سنایا...... ''بس دو مہینے کے اندر، اندر......''

''اتنی جلدی؟ ابھی تو مجھے اور سلم ہونا ہے، اچھی سی کوکنگ سیکھنی ہے اور...... اس کے لیے مجھے کم از کم چھ ماہ چاہئیں۔''

''بس اور کچھ نہیں......'' انہوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا...... ''اب جو بھی سیکھنا ہے میرے گھر میں، میرے پاس آ کر سیکھنا...... اب اس دل کے اور امتحان نہیں سہہ سکتا۔''

آج وہ ان کے روبرو تھی اور وہ اپنے دل کی تمام باتیں اس سے کہہ رہے تھے جو کئی دنوں سے اُن کے دل پر بوجھ بن کر انہیں ستاتی رہتی تھیں۔

''آپ کو دیکھ کر بالکل بھی یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا سنجیدہ مزاج شخص اتنا رومینٹک بھی ہو سکتا ہے۔'' ایشال نے مسکراتے ہوئے انہیں چھیڑا۔

''ایسے ہی کسی موقع کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں اُس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا''

انہوں نے محبت پاش نظروں سے ایشال کو دیکھا۔ ''جب تم میرے پاس آؤ گی تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں کتنا رومینٹک ہوں۔'' اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ایشال جلدی سے اُن کی گرفت سے نکل گئی۔

''یس کم آن......'' ڈاکٹر عمر کی آواز پہ پینو اندر داخل ہوئی۔

''وہ جی عمر صاحب جی...... آپ کو جی وڈی اماں بلا رہی ہیں تھلے۔''

''او کے، تم میرے لیے چائے بنواؤ میں آ رہا ہوں۔''

''اچھا عمر صاحب...... تسی تھلے آ جاؤ، میں پانچ منٹ میں آپ کے لیے چائے بنواتی ہوں......'' پینو مسکراتے ہوئے جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی تھی۔

''او کے، میں چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس کا دل بدگمانی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا وہاں اب ایک ناقابلِ یقین خوشی نے لے لی تھی۔ بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ محبت بھرا راستہ اس کی زندگی کو بہت سی خوشیوں کی نوید سنا رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ کے خودکشی کرنے کے بعد سیما بیگم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔ زارا دس دن اُن کے پاس آ کر رہی تھی پھر گیارھویں دن خالد آ کر اسے لے گیا تھا۔ پولیس کی چھتر ول نے اسے سیدھا کر دیا تھا...... گلو بھی ایک ہفتے کے لیے آیا تھا اور وہ بھی واپس دبئی چلا گیا تھا۔ اب زویا اپنے فلیٹ میں بالکل اکیلی زندگی گزار رہی تھی...... خود سے بیگانہ زندگی...... فرقان نے چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازمہ رکھ دی

تھی۔ مگر اسے نہ گھر کا ہوش تھا نہ خود کی فکر..... اس کا دماغ ڈیڈ ہو چکا تھا۔ دس دن میں اس نے اتنی پی لی تھی کہ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ فرقان نے اس کی حالت دیکھی تو وہ بھی پریشان ہوا تھا اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ کملا گیا تھا..... اسے دلنشین کو لے کر ایک مشہور ملٹی نیشنل کمپنی کے لیے ایڈ تیار کرنا تھا..... اسی ویک اینڈ پر اسے کراچی میں ہونے والے انٹرنیشنل فیشن فیسٹول میں بطور ماڈل کیٹ واک کرنی تھی۔ ایک مشہور فیشن میگزین کے لیے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈیزائنرز کے ملبوسات پہن کر اسے فوٹو شوٹ کروانا تھا..... مگر اس کی حالت ایسی بدتر تھی کہ فرقان اسے دیکھ کر بے حد فکر مند ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ، ساتھ اس کی ساکھ بھی تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ فرقان کے لیے کامیابیوں اور دولت حاصل کرنے کی ایک سیڑھی تھی جسے وہ آسانی سے یوں گنوا نہیں سکتا تھا، اسے یوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ فرقان اسے اپنے ساتھ زبردستی گاڑی میں بٹھا کر باہر لے آیا تھا۔

''تم خود کو تباہ کر رہی ہو، پلیز میری محنت پہ یوں پانی مت پھیرو اور دلنشیں پلیز خود کو یوں برباد مت کرو۔'' وہ اسے لانگ ڈرائیو پر لے آیا تھا۔ ایک جگہ اس نے راستے میں گاڑی روک کر بے حس و حرکت بیٹھی دلنشیں کو دیکھ کر کہا۔

''میں برباد ہو چکی ہوں، مجھے اب اور زندہ نہیں رہنا۔'' اس کی نظریں ونڈ اسکرین پر مرکوز تھیں۔ لہجے میں بلا کی سختی تھی۔

''خود کو برباد کر کے مر جاؤ گی تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا..... تمہیں اُن سب کو برباد کرنا ہے جنہوں نے تمہاری خوشیوں کو، تمہارے رشتوں کو اور تمہاری زندگی کو ان غموں سے دوچار کیا.....'' فرقان نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

وہ چند لمحے خالی نظروں سے فرقان کو دیکھتی رہی..... اس کے لفظوں پر غور کرتی رہی۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، میرے مرنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے اس شخص سے انتقام لینا ہے جو میرے باپ کو سڑک کے بیچ مرتا ہوا چھوڑ کر اپنی دولت کے گھمنڈ میں میری منت سماجت کو اپنی قیمتی گاڑی تلے روند کر آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے اس شخص سے بدلہ لینا ہے جس نے مجھے برائیوں کی اس دلدل میں دھکیل کر میرے سامنے ایسی شرائط رکھیں کہ مجھے جیتے جی زہر کا یہ پیالہ پینا پڑا..... مجھے اس شخص کو برباد کرنا ہے جس نے میری معصوم سارہ کی زندگی برباد کی۔ فرقان مجھے ان سب کو برباد کرنا ہے۔ مجھے ان سب کو ذلیل و خوار کرنا ہے۔'' وہ فرقان کے ہاتھ پکڑ کر فیصلہ سنا رہی تھی۔ اس کا انداز ہذیانی تھا، اس کی کیفیت میں انتقام لینے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کے لفظوں میں بدلہ لینے کی تڑپ تھی..... اس کی حالت ایک زخمی سانپ جیسی تھی..... جسے خود تو مرنا ہی تھا مگر مرنے سے قبل اسے خود کو مارنے والوں کو بھی ڈسنا تھا۔

''اسی لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں، نکلو اس ڈپریشن سے..... اپنے کام پہ فوکس کرو، بڑے لوگوں سے تعلقات بناؤ، تمہارے پاس پاور ہو گی تو ان سب کی ایسی کی تیسی پھیر سکو گی ..... نواز لغاری تو ویسے بھی تمہارے حسن اور دلکشی پہ فدا ہو چکا تھا..... اور تمہیں کیا چاہیے۔''

فرقان اسے سمجھا رہا تھا۔ اسے زندگی کی طرف واپس آنے کی وجوہات بتا رہا تھا..... اسے اداکاری کی آفرز بھی ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

زارون اپنے بیڈ پہ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا...... اس نے لیپ ٹاپ گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں، عنایہ اس کے بے حد قریب اس کے کندھے پر سر رکھے تقریباً نیم دراز تھی۔ وہ ٹی وی پہ کوئی ٹاک شو دیکھ رہی تھی۔ اب ٹاک شو کے دوران کمرشل بریک آگئی تھی۔

''اس بار ہمارے ٹیکسٹائل کے ایڈ نے دھوم مچادی ہے...... فرقان نے اس بار ہمارے ایڈ کے لیے ہیرا چنا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس دلنشیں نامی ماڈل سے دو سال کا کانٹریکٹ کرلیا جائے...... کیا خیال ہے تمہارا؟'' زارون نے ٹی وی پر چلنے والا اپنی ٹیکسٹائل کا ایڈ دیکھتے ہوئے عنایہ سے کہا۔

''ہاں خیال تو اچھا ہے، اس بار واقعی اس ایڈ نے دھوم مچادی ہے۔ بڑے پاپا بتا رہے تھے کہ اس بار ونٹر کلیکشن کی ریکارڈ سیل ہوئی ہے۔''

''بہت خوب صورت اور ٹیلنٹڈ ہے یہ ماڈل...... اس کا فیوچر بہت برائٹ نظر آرہا ہے مجھے......'' زارون نے ٹی وی پر دلنشیں کے ایڈ کو دیکھتے ہوئے ایک عام سے لہجے میں قیاس ظاہر کیا۔

''اب اتنی بھی خوب صورت نہیں ہے جتنا تم اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہو۔'' عنایہ کے انداز میں خفگی تھی۔

''ایک تو تم لڑکیوں میں جیلسی کوٹ، کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔'' زارون مسکرایا۔

''ہاں تو کیوں نہ ہوں میں جیلس......؟ اپنی خوب صورت بیوی کی موجودگی میں تم کسی اور کی تعریف کرو گے تو مجھے اچھا تو نہیں لگے گا ناں......''

''کم آن میری خوب صورت بیوی...... یہ سچ ہے، تم جیسی حسین اور خوب صورت کوئی لڑکی نہیں ہے اس دنیا میں میرے لیے۔'' زارون نے لیپ ٹاپ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

''بس تم ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا۔'' عنایہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنا سر زارون کے سینے سے ٹکالیا۔

''بھئی میں تمہارے معاملے میں پاگل ہوں، احمق ہوں، جنونی ہوں اور دیوانہ بھی...... ویسے یار میں کتنا اسٹوپڈ اور گھامڑ سا نہیں ہوگیا؟ روز تقریباً دن میں دس بار تم سے اظہارِ محبت کرتا ہوں۔ روز دن میں بیسوں بار تم سے کہتا ہوں کہ تم میری زندگی ہو...... میرے دل کی دھڑکن ہو، اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو، مجھے تم سے عشق ہے وغیرہ، وغیرہ...... اور میری اتنی تعریفوں اور محبتوں کے باوجود تمہارا دل نہیں بھرتا......؟ تم لڑکیوں کو اپنی تعریفیں کروانے کا کتنا کریز ہوتا ہے، مرد بیچارہ جھوٹی تعریفیں کر، کر کے تھک جاتا ہے۔ مگر تم لڑکیاں، اُف......'' زارون نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا...... اس کا ایک بازو عنایہ کی کمر کے گرد پھیلا تھا اور دوسرا ہاتھ عنایہ کے بالوں میں گردش کر رہا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے ناں شوہر کی تعریفیں صرف بیوی کے لیے ہونی چاہیے۔'' عنایہ اس کے سینے سے سر ٹکائے مسکرائی...... ''اور تم کیا میری جھوٹی تعریفیں کرتے ہو؟''

''سچ بتاؤں تو ہنڈرڈ پرسنٹ سچ تعریف کرتا ہوں، بی لیوی تم نے میری زندگی کو مکمل کر دیا ہے، تم میرے لیے دیوانی ہو تو میں بھی تمہاری محبت میں پاگل ہی تو ہوں۔'' زارون نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے اپنے لبوں سے لگایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس محبت کا کوئی جواب دیتی...... اسے اتنی زور سے ابکائی آئی تھی کہ وہ بے اختیار اٹھ کر واش روم کی طرف بھاگی تھی...... زارون بھی پریشانی سے بستر سے اٹھ کر واش روم تک اس کے

پیچھے گیا تھا۔

''عینی تم، تم ٹھیک تو ہو..... کیا ہوا؟'' عنایہ وامٹ کے بعد واش روم سے باہر نکلی تو زارون نے فکرمندی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ دنوں سے مجھے اپنی طبیعت میں چینج سا فیل ہو رہا ہے۔ کل بھی دن میں کئی بار میرا دل متلایا اور آج صبح تو اٹھتے ہی میرا سر چکرا رہا تھا۔'' زارون اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر لے آیا۔

''میرے خیال میں ہمیں آج ہی کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس جانا چاہیے۔'' زارون نے اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد سائڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے لبوں سے لگایا۔ عنایہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا جی اب بھی متلا رہا تھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔''

اور پھر اسی شام زارون، عنایہ کو شہر کی سب سے بہترین لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ جہاں عنایہ کا چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے انہیں خوشخبری سنائی تھی کہ عنایہ ماں بننے والی ہے۔

زارون کی خوشی کی تو کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا..... گھر واپس آ کر جب ان دونوں یہ خوشخبری نور منزل کے مکینوں کو سنائی تھی تو ان سب کی خوشی بھی دیدنی تھی..... ایک ننھا مہمان نور منزل میں اپنی رونقیں بکھیرنے والا تھا سب گھر والوں نے اس گڈ نیوز پہ ازحد خوشی و مسرت کا اظہار کیا تھا..... نور بیگم..... سمیرا بیگم اس کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ داؤد چوہدری بھی بہت مسرور تھے۔ نور بیگم نے فوری عنایہ کا صدقہ اتارا تھا۔

داؤد چوہدری اور سمیرا بیگم نے گھر کے تمام ملازمین کو خوشی میں ان کی مبارک باد کے بدلے مٹھائی کے نام پر انہیں کیش سے نوازا تھا..... ساجدہ بیگم کو اطلاع ملی تو دوسرے ہی دن وہ بھی مبارک باد دینے خوشی سے دوڑی چلی آئیں۔

عنایہ کو مکمل طور پر بیڈ ریسٹ کروایا جا رہا تھا..... پینو کو عنایہ کا خاص خیال رکھنے کا ہدایت نامہ جاری کر دیا گیا تھا۔

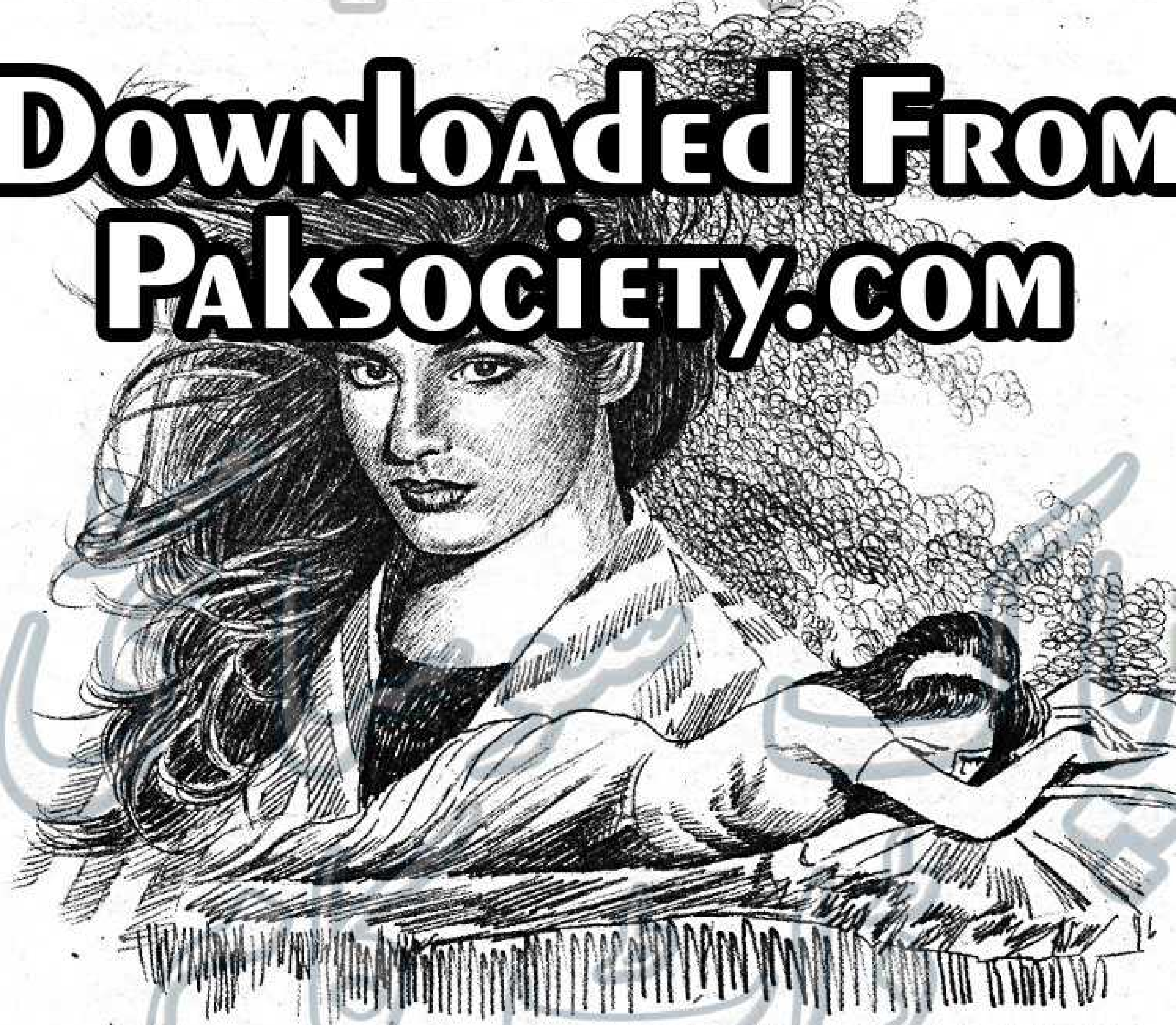
☆☆☆

نور بیگم اور داؤد چوہدری کی باہمی رضامندی سے مناب کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ ولی کی بڑی بہن کو اپنے بچوں کے ساتھ واپس امریکا جاتا تھا سو اُن کی مجبوری کا خاص خیال رکھتے ہوئے پندرہ دن کے اندر، اندر ولی اور مناب کو شادی کے بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

مناب نے انڈیا میں اقصم کی بے پناہ مصروفیت کے باعث اپنی شادی طے ہو جانے کی خبر کو اس سے چھپانے کی نور منزل میں سب کو ہدایت کر رکھی تھی، وہ اس کی ریکارڈنگز مکمل ہو جانے کے بعد اقصم کو یہ خبر سرپرائز کے طور پر سنانا چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا تھا..... شادی سے کچھ دن پہلے جب مناب کو مایوں بٹھایا جانا تھا اس دن صبح مناب نے اپنی شادی طے ہو جانے کی بریکنگ نیوز اقصم کو سنا کر سرپرائز دیا تھا..... اور اقصم یہ بدترین خبر سن کر واقعی سرپرائز ڈ ہو گیا تھا۔

مناب نہایت خوشی سے اسے یہ خبر سنا رہی تھی۔ مگر اقصم سے جواباً ایک لفظ تک نہ بولا گیا تھا..... اس سے جیسے کسی نے الفاظ ہی چھین لیے تھے۔

(جاری ہے)



ترکِ آرزو

عاصمہ عزیز

"وانیہ ! میرے خلاف میرے ہی گھر میں بہت بڑی تحریک چل رہی ہے۔" وہ بالوں کے جوڑے میں پینٹ برش پھنسائے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ کمرے میں ٹہلتے ہوئے فون پر بات کر رہی تھی۔ بالوں کی کچھ شریر لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

"کون سی تحریک......؟ تحریکِ خلافت یا......"

"وانی......!" اس نے وانیہ کی بات کاٹتے ہوئے دانت کچکچائے۔ "بھیا نے مجھے پڑھانے کے لیے اپنے کسی دوست کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ تم بتاؤ میں کیسے جان چھڑاؤں اس مصیبت سے؟" اس نے اپنے لہجے میں تمام تر مظلومیت سموتے ہوئے کہا۔

"اوہ......تو اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے......نہیں بلکہ اب آئی انوشے کتابوں کے نیچے......" وانیہ نے اپنے

ہی جملے کی تصحیح کرتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔

’’شٹ اپ......‘‘ انوشے نے غصے سے اسے ٹوکا۔

’’اوکے کول ڈاؤن سوچتے ہیں کچھ......‘‘ پھر کچھ دیر وانیہ سے بات کرنے کے بعد وہ خود کو پُرسکون کرنے کے لیے گہری سانس لے کر اٹھی اور اپنے بالوں میں اڑسے پینٹ برش کو نکال کر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے، وہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کو ایک طرف کر کے انگڑائی لے کر اٹھی وضو کر کے ابھی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اس نے مما کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اسے جائے نماز تہہ کرتے دیکھ کر وہ مسکرادی تھیں۔

’’نیند پوری ہوگئی؟‘‘ مما نے پوچھا۔

’’جی مما......‘‘ اس نے اپنی نیند سے سرخ پڑتی آنکھوں کو ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔ وہ سونے کی شیدائی تھی، دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد دو گھنٹے سونے کے باوجود مزید دو تین گھنٹے سونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

’’چلو بیٹا شاباش! اپنی بکس لے کر ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ تمہارے نئے ٹیچر آنے ہی والے ہوں گے۔‘‘

’’کون سے ٹیچر......؟‘‘ ٹیچر لفظ سنتے ہی اس نے برا سا منہ بنایا۔ گو کہ اسے پتا تھا کہ عاکف بھائی کے دوست اسے ٹیوشن پڑھانے والے ہیں لیکن اندازہ نہیں تھا کہ یہ مصیبت آج ہی وارد ہونے والی ہے۔ ’’مجھے کوئی ٹیوشن وِیشن نہیں پڑھنی۔‘‘ وہ منمنائی تھی۔

’’خبردار کوئی بہانہ نہیں چلے گا ......شرافت کے ساتھ باہر آؤ۔‘‘ مما نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

’’لو شرافت انکل کے ساتھ کیوں، عاکف بھائی کے دوست ہٹلر ہیں کیا؟‘‘ اس نے اُن کی بات کو مذاق میں اڑایا اور پھر ان کے جانے کے بعد پڑھنے کا ارادہ نہ ہونے کی وجہ سے دروازہ لاک کر کے بیڈ پر آکے لیٹ گئی۔ سامنے ایزل پر اپنی کل ہی مکمل کی ہوئی پینٹنگ کو دیکھ کر ستائشی انداز میں مسکرائی۔ نیلے آسمان پر روئی کے گالوں کی طرح چھائے بادل، تنتنے کے ساتھ کھڑے پہاڑ جن کی چوٹیاں آسمانوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور ان پہاڑوں سے بہتے جھرنے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا منظر پیش کر رہے تھے۔ بلاشبہ یہ پینٹنگ کسی ماہر مصور کا شاہکار لگ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو داد دیتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

اس سے پہلے اسے پڑھائی سے اس قدر بیزاریت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے اسکول کی نہایت ہونہار طالبہ تھی۔ اپنے خاندان کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے میٹرک میں بھی اس نے 88 فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ اپنی اس کامیابی پر گھر والوں سمیت وہ بھی بہت خوش تھی لیکن اس کی ساری خوشی اس وقت بھک سے اڑ گئی جب مما نے انٹرمیڈیٹ میں اسے زبردستی فائن آرٹس کے بجائے پری میڈیکل رکھوادیا۔ انوشے نے لاکھ غصے اور جھنجلاہٹ کا اظہار کیا اور احتجاج کے طور پر سب کو دکھانے کے لیے بھوک ہڑتال بھی کی جس کا کسی پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ انوشے کو فائن آرٹس کا راگ الاپتے دیکھ کر مما نے خاندان کے سارے اگلے پچھلے بچوں کی ذہانت و فطانت کی مثالیں دے کر اسے کھری کھری سنائیں تو اس کا دل پڑھائی سے مزید اچاٹ ہوگیا۔ فرسٹ ائیر کے اختتام تک اس کے نہ پڑھنے والے ارادوں کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے گھر میں ہی کئی ٹیچر لگوائے گئے جنہیں وہ ضد میں آکر اتنا زچ کرتی کہ وہ ایک ہفتے میں ہی اپنی برداشت کو آزما کر بھاگ جاتے۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی اسے پتا تھا کہ عاکف بھائی کے دوست انتظار کر کے جاچکے ہوں گے۔ مما اور بھائی نے اس کو جگانے کے لیے لاکھ دروازہ بجایا لیکن جاگتے رہنے کے باوجود اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی اور اب خطرے کے ٹلتے ہی وہ ڈائننگ روم میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ مما نے اس کو سکون سے بیٹھتے دیکھ کے قہمائشی نگاہوں سے گھورا۔

''یہ کیا بدتمیزی تھی ......وہ بچہ بیچارہ انتظار کر کر کے چلا گیا۔'' مما کے بچہ بیچارہ کہنے پہ اس نے دانت پیسے اور پھر اس نے مما کی انتہائی سخت سست باتیں خاموشی سے سر جھکا کے سنی تھیں۔

''وانیہ کو دیکھو تم سے دو سال ہی بڑی ہے لیکن اس کے باوجود میڈیکل کی ٹف پڑھائی کے ساتھ، ساتھ گھریلو کاموں میں بھی طاق ہے اور اِدھر یہ ماہ رانی صاحبہ ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح مما کا اس کو اس کی کزن وانیہ کے ساتھ کمپیئر کرنا کسی چابک کی طرح لگا تھا۔ اس نے اپنے سامنے پڑی پلیٹ غصے سے پٹخی اور جھٹکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں بند ہو کر رونے دھونے کا شغل جاری کر دیا۔

ذہن کی رو منفی خیالات کی طرف بھٹک رہی تھی۔

''مما مجھ سے نہیں وانیہ سے محبت کرتی ہیں۔ اسی لیے وہ ......وہ مجھے کسی قابل ہی نہیں سمجھتیں۔ آئی ہیٹ وانیہ!'' اس نے قنوطیت سے سوچتے ہوئے بیڈ پر پڑے موبائل کو دیوار پر دے مارا۔ یہ سچ ہے کہ کسی انسان کا دوسرے انسان سے موازنہ کرنا اس کی اپنی ذات کو... بے قعت کر دیتا ہے۔ اللہ نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انسان ہونے کا مطلب ہی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ کوئی بھی انسان کاملیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔

☆☆☆

اونچے فانوس، بھاری فان کلر کے پردوں اور ان کے ہم رنگ صوفوں اور درمیان میں پڑے کرسٹل ٹیبل سے سجے ڈرائنگ روم میں وہ اس وقت منہ پھلائے بھیا کے دوست سر ارسلان کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے غصے کی وجہ سے غبارے کی طرح پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

''دو دن ہم فزکس اور کیمسٹری کو ٹائم دیں گے۔'' سر نے کتاب کے صفحے الٹتے ہوئے کہا۔ وہ سر کی باتوں کو غیر دلچسپی سے سنتے ہوئے وانیہ کے چائے لانے کا انتظار کر رہی تھی ......اسی وقت ......دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اٹھی اور نوکر کے ہاتھ سے ٹرے لے کے ٹیبل پر رکھ دی۔ سر ارسلان کی نظر کرسٹل پلیٹ میں سموسوں پر پڑی تو اُن کی بھوک چمک اٹھی۔ انوشے نے سر کو بری نظروں سے سموسوں کو دیکھتے پایا تو اس نے غصے اور ضد سے تلملاتے ہوئے پلیٹ کو اٹھا کر دوبارہ ایسے رکھا کہ وہ چھناکے کی آواز کے ساتھ کرچی، کرچی ہو گئی اور تمام سموسے بھی زمیں بوس ہو گئے۔ سر ارسلان نے ایک دکھ بھری نظر زمیں بوس ہوئے سموسوں پر ڈال کر انوشے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے ٹوکا۔

''بی سیریس ...... پڑھائی پر توجہ دیں ...... نیوٹن نے موشن کے تین قانون دیے تھے اس نے کہا تھا کہ......''

کچھ دیر سر کا لیکچر خاموشی سے سننے کے بعد اس کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی

''سر جہنم میں بھیجیں نیوٹن کو جس نے کئی معصوموں کی زندگی عذاب بنا دی ......آپ یہ چائے لیں ناں سر......'' اس نے ایسے کہا جیسے چائے پینا دنیا کا ضروری ترین کام ہو۔ سر ارسلان نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا لیکچر جاری رکھا اور پھر کچھ دیر بعد انہوں نے گرم پانی میں پتی اور نمک ملے اس چائے نما مشروب کا گھونٹ بھرا تو حلق تک کڑوا ہو گیا۔ انہوں نے انوشے کی شرارت سمجھتے ہوئے بہ مشکل اپنا غصہ دبایا۔

اور پھر انوشے کے ہاتھوں خوب زچ ہونے کے بعد اگلے دن وہ پھر اس کے ڈرائنگ روم میں حاضر تھے۔ انھوں نے آتے ہی کل کا لیکچر سننے کی غرض سے سوال کیا جس کا انوشے نے اُن کی توقع کے مطابق جواب دیا تھا۔

''نیوٹن کا تھرڈ لا سنائیں......؟''

''سر نیوٹن نے کہا تھا اگر کوئی آپ کو تھپڑ لگائے تو آپ رکھ کے اسے بھی لگائیں۔'' انوشے نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ اور سر ارسلان نے اسے جواباً زبردست گھوری سے نوازا تھا۔ ''سر میں نے کیا، کیا ہے......نیوٹن تھا ہی منتقم مزاج۔'' وہ سر کے گھورنے پہ منمنائی تھی۔

''بہت خوب تو آپ نے گویا نیوٹن صاحب کے مزاج میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔'' سر ارسلان نے.. مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

سیکنڈ ائیر کے امتحانات میں صرف ایک ماہ باقی تھا اور انوشے کے پچھلے دو ہفتوں سے نہ پڑھنے والے ارادوں کو بھانپتے ہوئے سرارسلان نے اسے سنجیدگی سے سمجھانے کا ارادہ کیا تھا۔

''انوشے آپ کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کتنا وقت ضائع کر چکی ہیں اپنا۔ وقت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ضائع کرنا کفرانِ نعمت کہلاتا ہے۔'' وہ اسے نرم اور دھیمے لہجے میں سمجھا رہے تھے۔ انوشے اپنے رجسٹر پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔

''ماں باپ کی اولاد سے بہت سی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ان پہ بہت مان ہوتا ہے انہیں۔ کیا آپ اپنی مما کے مان کو توڑنا چاہیں گی؟'' وہ اسے خاموش دیکھ کر پھر گویا ہوئے۔

''ماں باپ کو گلہ ہوتا ہے کہ اولاد اُن کی بات نہیں سمجھتی جبکہ اولاد کو بھی ان سے یہی شکایت ہوتی ہے۔ میں نے مما اور بھیا سے بہت کہا کہ مجھے میڈیکل سے نفرت ہے۔ مجھے فائن آرٹس میں انٹرسٹ تھا لیکن سب نے اپنی مرضی مسلط کردی۔ کسی کو میری خواہشات کی پروا ہوتی تب ناں!'' سیاہ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے تھے اور صبیح چہرے پر بچی چھوٹی سی ناک رگڑنے سے سرخ ہو چکی تھی۔

''سرارسلان سمیت سب اسے کسی کٹھ پتلی کی طرح اپنے من پسند راستوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی اس کی خواہشات کی پروا نہیں ہے۔'' وہ سوں سوں کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

انسان بھی کتنا نا سمجھ واقع ہوا ہے لمحوں میں اپنے خوب صورت رشتوں سے بدگمان ہو کر ان کے خلوص اور محبت پر شک کی مہر لگا دیتا ہے۔

''اوں ہوں ...... رونا نہیں۔'' انہوں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''چلیں آپ ایگزیمز میں اے گریڈ لے کر دکھائیں۔ آپ کے این سی اے میں ایڈمیشن کے لیے میں آنٹی سے خود بات کروں گا لیکن اے گریڈ آنا شرط ہے۔'' انہوں نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہ جانے پھر ان کے سمجھانے کا اثر تھا یا اُن کی رکھی جانے والی شرط کا کہ اس نے پورا ماہ خوب دل لگا کر محنت کی تھی۔ اب اس کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔

☆☆☆

''بیٹا! آپ نے تو کمال کر دیا......'' مما نے مسکراتے ہوئے سرارسلان سے کہا۔ آج صبح ہی انوشے کا انٹر کا رزلٹ نکلا تھا۔ اس نے مما کی توقعات کے برعکس تمام سبجیکٹس میں اے گریڈ لیا تھا اور اس وقت مما، عاکف بھائی اور سرارسلان، انوشے کے شاندار نمبروں سے پاس ہونے کی خوشی میں لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لاؤنج سے ملحقہ کچن میں وہ اپنی کامیابی پر مسرور سی سب کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی۔

ارسلان نے مما کی بات پر مسکراتے ہوئے فخریہ انداز میں فرضی کالر جھاڑا تھا۔

''زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے...... یہ سب میری بہن کی ذہانت کا نتیجہ ہے۔'' عاکف نے اسے اتراتے دیکھ کر جل کر کہا اور ارسلان اس کے انداز پہ ہنس دیا تھا۔

''اب میری بچی بھی انشاء اللہ قابل ڈاکٹر بنے گی۔'' مما نے مسکراتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن آنٹی ڈاکٹر بننا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ایک اچھا اور نیک انسان بننا۔ ہم اکثر اپنی زندگی کی ساری توانائیاں اور جمع پونجی ایک کامیاب ڈاکٹر، انجینئر یا دنیا کا کوئی قابل انسان بننے میں صرف کر دیتے ہیں لیکن ایک صالح اور نیک انسان بننے کے لیے ہماری کوششیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔''

''آپ کی بات درست ہے۔ صالح انسان بننے میں چند دن یا مہینے نہیں درکار ہوتے۔ اس کے لیے ہمیں ساری زندگی کوشش کرتے رہنا پڑتی ہے۔ انسان تو خطا کا

پتلا ہے لمحے بھر کو وہ اپنی ذات سے مطمئن ہوا اور خطا کر بیٹھا جبکہ دنیا کا کامیاب انسان بننے کے لیے بھی دنیا کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ کائنات میں بکھرے رنگوں پر غور وفکر کرنے کا تو اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا ہے۔'' ارسلان نے ان کی بات پہ تائیدی انداز میں سر ہلایا اور سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھا کے چائے کے سپ لینے لگے۔ جو انوشے کچھ دیر پہلے میز پر سجا کے جا چکی تھی۔

''میرے خیال سے اس بات کا فیصلہ انوشے کو کرنا چاہیے کہ وہ آگے کیا پڑھنا چاہتی ہے۔'' عاکف بھائی نے کہا۔ انوشے کا گزشتہ رویہ انہیں باور کروا چکا تھا کہ پڑھائی میں زبردستی بچے کی شخصیت پر کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

''انوشے ابھی بچی ہے اسے کیا پتا کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے اور برا......'' مما نے ناگواری سے کہا۔

''آنٹی ...... کچھ والدین اپنی ناآسودہ خواہشات اور توقعات کو اپنے بچوں سے اس قدر وابستہ کر لیتے ہیں کہ بچے بھی تناؤ کی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ والدین بچوں کی صلاحیت اور انٹرسٹ جانے بغیر انہیں ایک ہدف دے دیتے ہیں اور اگر بچہ ان کی خواہشات پر پورا نہ اتر سکے تو بعض اوقات ان پر بے جا سختی اور تنقید کی جاتی ہے جس سے وہ ذہنی دباؤ اور پڑھائی سے بیزاری کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔'' ارسلان نے عاکف کی بات پہ مما کی ناگواری دیکھ کر کہا۔

''تو بیٹا ماں، باپ اپنے بچوں سے توقعات وابستہ نہیں کریں گے تو کیا غیروں سے کریں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آنٹی، والدین کا بچوں پر حق ہوتا ہے لیکن بعض اوقات حد سے زیادہ سختی بچے کی شخصیت کو بھی مسخ کر دیتی ہے اور وہ ضد میں آ کے اپنا ہی نقصان کر جاتے ہیں۔ والدین کو بچوں کی رائے بھی سننی چاہیے۔ ان کی تعلیم کے بارے میں جنونی ہونے اور مقابلے کی فضا قائم کرنے کے بجائے اگر ان سے دوستانہ رویہ اختیار کیا جائے تو بچے ذہنی سکون کے ساتھ آؤٹ اسٹینڈنگ پرفارمنس نہیں بھی دیتے تو بھی زندگی میں بہت سی کامیابیاں ضرور حاصل کر لیں گے۔'' ارسلان نے احترام بھرے لہجے کے ساتھ مما کو کہا۔

''آپ کا خیال ہے کہ انوشے کو اس کی خواہش کے مطابق فائن آرٹس پڑھنے کی اجازت دے دینی چاہیے؟'' مما نے گہری سانس ہوا کے سپرد کرتے ہوئے کہا اور عاکف بھائی جو خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہے تھے انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''جی مما، ہمارا یہی خیال ہے۔''

''ٹھیک ہے بچے، مجھے تو اس کی خوشی عزیز ہے۔''

اور کچن میں بیٹھی انوشے جو لاؤنج میں ہونے والی گفتگو سن رہی تھی مما کی بات پہ اس کی کانچ سی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ماں باپ بھی کتنی آسانی سے اولاد کی خوشی کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اولاد کے لیے اپنی خوشی اور خواہش کو ترک کرنے کا ظرف صرف والدین میں ہی ہوتا ہے جبکہ اولاد یہ کام اتنی آسانی سے نہیں کر سکتی۔ وہ بھی تو مما کی چھوٹی سی خواہش کے آگے سر نہیں جھکا سکی تھی اور ان کے زبردستی کرنے پہ اس نے ضد میں آ کر دو سال سے انہیں زچ کرنے کا کوئی بھی موقع نہیں چھوڑا تھا اور ایک مما تھیں کہ اس کی خوشی کے لیے انہوں نے اپنی شدید خواہش کو بھی ترک کر دیا تھا۔

وہ انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ دو سال سے خود پہ چڑھایا ہوا غصے اور ضد کا غلاف مما کے مان جانے سے اتر چکا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی فائن آرٹس پڑھنے کی خواہش کو ترک کر کے مما کی خواہش کا احترام کرے گی، آخر اتنی محنت کر کے اے گریڈ تو حاصل کر لیا ناں سو آئندہ بھی محنت کر لے گی اور یہ سوچ کے ہی اس کے اندر سکون سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ اپنی خواہش کے پورا ہونے سے انسان کو خوشی ضرور ملتی ہے لیکن اپنی خواہش کو ترک کر کے ماں، باپ کی خوشی کا احترام اسے زندگی میں سکون فراہم کرتا ہے اور زندگی میں اس سکون سے بڑھ کر بھی کیا کوئی نعمت ہو سکتی ہے۔

محبت منتظر ٹھہری

کائنات غزل

حبس زدہ موسم سے بے نیاز وہ اپنی ہی دُھن میں چل رہی تھی۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ رکشا ہی روک لیتی۔ تھک کر فٹ پاتھ پہ بیٹھ گئی......اور گہری، گہری سانس لینے لگی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کی سرمئی آنکھوں سے جاری تھے۔ مزید کتنی دیر بیٹھ سکتی تھی۔ اٹھ کر پھر چل پڑی۔ دماغ کچھ حاضر ہوا تو ایک رکشا کو ہاتھ دیا۔

''کہاں جانا ہے باجی......'' رکشے کی گھر رگھرر اور آس پاس کی گاڑیوں کے شور میں اسے لگا رکشے والے کی آواز کہیں دور سے آئی ہے۔

''اسٹیشن......'' ہمیشہ وہی کیوں ہوتا ہے جو کچھ ہم سوچنا نہیں چاہتے۔ مگر شاید اس سب کے ذمے دار خود ہوتے ہیں۔ اور پھر انسان کو وہ سب سہنا پڑتا ہے جو اس نے کبھی سوچا نہیں ہوتا۔ اس نے تھک کر رکشے کی بیک سے سر ٹکا دیا۔

ابھی چند دن پہلے ہی کی تو بات ہے جب سب کچھ ٹھیک تھا۔

''فرزان......اٹھو کب تک سوتے رہو گے۔ چلو جلدی اٹھو شاباش......'' ممانی نے اسے اٹھانے بھیجا تھا۔ دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا اسے فرزان کو اٹھانا۔

''سوہنی یار سونے دو پلیز......تمہیں تو پیار سے اٹھانے کا ڈھنگ بھی نہیں۔'' اس نے تکیہ بانہوں میں لے کر کروٹ بدلی۔

''اُف خدایا......تم کوئی شہنشاہِ اعظم نہیں ہو جو تمہارے گرد پہلے کنیزیں سُریلے گیت سنائیں......پھر محترم اٹھیں۔ چلو شرافت سے اٹھ جاؤ۔'' اس نے اس کے منہ سے کمبل کھینچا اور نیچے کارپٹ پر ڈال دیا۔

''یار اتنی سردی میں ظلم تو نہ کرو......'' اس نے احتجاجاً اسے کشن کھینچ مارا، وہ جو دور کھڑی کمبل طے کر رہی تھی۔ کمبل چھوڑ کر کشن کیچ کیا اور واپس اسے مارتی باتھ روم کی جانب چلی گئی۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے فرزان نے بیڈ سے جمپ لگائی اسے کمرے میں دھکیل کر واش روم میں گھس گیا۔

سنینا کا حربہ کامیاب رہا سو وہ مسکراتے ہوئے اس کے کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

''گڈ مارننگ ماما......گڈ مارننگ چڑیل......'' حیان اس کی پونی ٹیل کھینچ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

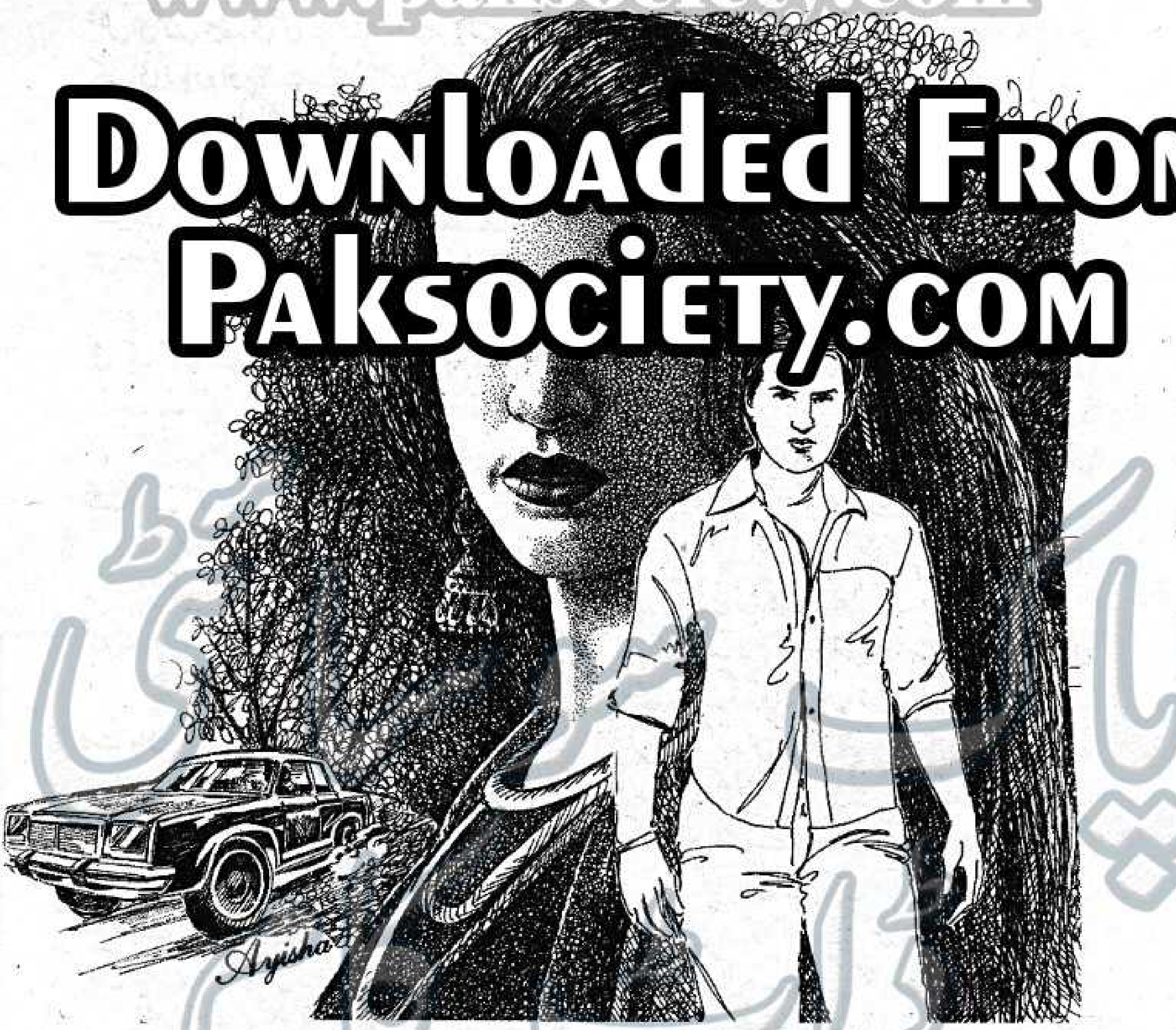
''آہ......ممانی دیکھیں اسے۔'' ممانی کو آواز لگانے کے ساتھ اس نے اپنے سے سال بڑے حیان کی کمر پر مکے جڑے اور خود ہی سی کر کے رہ گئی۔ کہاں وہ فولادی جسم کا باڈی بلڈر کہاں اس کے نازک سے ہاتھ۔ حیان نے اس کی گدی پکڑلی۔

اسی لمحے فرزان کمرے سے نکل آیا۔ یہ منظر اس نے ناگواری سے دیکھا۔

''بڑی ہو جاؤ سونی، کیا بچوں کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی ہو۔'' اس نے حتی المقدور اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی ورنہ ایسے سین پر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

''یہ فارم فل کر لو، فارغ گھر میں بیٹھے، بیٹھے میری ماں کا سر کھاتی رہتی ہو۔''

''اُف ڈرا ہی دیا فرزان کے بچے۔'' وہ ممانی کہ کہنے پر کچن میں آٹا گوندھنے کی کوشش کر رہی تھی



فرزان کے سپنوں میں گم چہرے پر مسکراہٹ لیے کر فرزان کچن کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

وہ چند ثانیے کو پلٹی پھر واپس اپنے کام میں مگن......

فرزان شاکڈ رہ گیا اسے دیکھ کر، جا بجا چہرے پر چپکا ہوا آٹا، بالوں کی لٹوں میں آٹا، کلائیاں چوڑیوں سمیت آٹے میں، وہ گہری سانس لیتا آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ آٹے کے تھال سے نکالے۔

''ارے، ارے کیا کر رہے ہو، مجھے کام کرنے دو......'' اس کی دہائیوں کی پروا کیے بنا اس کا ہاتھ کھینچتا وہ کچن سے باہر لاؤنج میں لگے آئینے کے سامنے لے آیا۔

چند ثانیے کو تو وہ بھی دنگ رہ گئی اور پھر جو اس نے ہنسنا شروع کیا تو لوٹ پوٹ ہو گئی پورا گھر اس کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ فرزان کے روکے ہوئے قہقہے بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

ممانی جو اسے گھر کے ہر کام میں طاق دیکھنا چاہتی تھیں کہ کوکنگ کے علاوہ وہ ہر کام سیکھ چکی تھی اور لمحوں میں سارا کام کر لیتی پھر سارا دن بولائی، بولائی پھرتی۔ اسی لیے آج قریبی مارکیٹ تک جاتے اسے آٹا گوندھنے کا کام دے گئیں۔ ساری زندگی اس نے انہیں آٹا گوندھتے دیکھا تھا۔ اس نے بھی کانفیڈنٹ ہو کر ہامی بھر لی۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ آٹے کی کوئی

شکل ہی نہیں بیٹھ رہی تھی۔ آخر تک اسے یہ نہ پتا چلا سکا کہ پانی زیادہ ہو چکا ہے۔ ہنس ہنس کے جب تھک گئی تو آنکھوں سے پانی نکل آیا۔

''تم کیا کہہ رہے تھے فرزان......'' آنکھوں سے پانی پونچھتی بولی تو آنکھیں بھی چمک گئیں ''ٹھہرو میں دھو کر آئی۔''

خوب رگڑ، رگڑ کر اس نے آٹا دھو لیا لیکن بالوں کی ایک لٹ سے نہیں نکل رہا تھا شاید جم گیا تھا۔ اس نے مدد کے لیے فرزان کو بلایا۔

''نہیں نکل رہا یار......'' وہ اسے جان بوجھ کر تنگ کرنے لگا۔

''کچھ بھی کرو پلیز اسے نکالو......'' وہ جھنجلائی۔

''پکی بات ہے کچھ بھی کرلوں تم کچھ کہو گی تو نہیں'' وہ اس پر جھکا۔

''فرزان کے بچے......'' وہ بلش ہو گئی...... پیچھے ہٹ جاتی لیکن اس کے بال اس کے ہاتھ میں تھے۔ اسے لال ہوتا دیکھ کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔

''کہاں ہیں فرزان کے بچے...... صبح شام یاد کرتی رہتی ہو۔ کب آئیں گے یہ بچے......'' وہ مصنوعی آہ بھرتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سنینا نے موقع غنیمت جانا اور اس سے دور جا کھڑی ہوئی۔

''ممانی گھر پر نہیں ہوتیں تو تم پھیلنے لگ جاتے ہو......'' وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

''جا کہاں رہی ہو، آٹا تو صاف کرالو۔''

''رہنے دو ابھی ممانی یا حیان آئیں گے میں ان سے صاف کرالوں گی۔ کم از کم تمہاری طرح لوفرانہ انداز تو نہ ہوں گے ان کے۔''

''یعنی میں لوفر ہوں۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں ...... تم شوہر ہو۔'' اور جھپاک سے کمرے کے اندر۔ فرزان کا قہقہہ نکل گیا۔

''یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ غلط کہاں سے ہوا......'' اس نے رکشے والے کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔

''باجی اسٹیشن آ گیا۔'' کرایہ دے کر کاؤنٹر کی جانب چلی آئی۔

''سکھر ایکسپریس...... نو بجے چلے گی...... گاڑی'' ٹکٹ لے کر وہ ویٹنگ روم میں چلی آئی۔

فرزان نے اس کا ایڈمیشن قریبی مدرسے میں کرادیا تھا وہ بھی فارغ بیٹھے، بیٹھے اکتا گئی تھی۔ خوشی، خوشی جانے لگی شارٹ کورسز کی کلاس لینے۔

شروع، شروع میں جب اس نے گھر میں نماز کی طرح دوپٹا لینا شروع کیا تو ممانی بہت خوش ہوئیں۔ حیان نے مذاق اڑایا۔ فرزان خاموش تھا۔ جو نماز کبھی، کبھی پڑھتی تھی، نماز کی فضیلت معلوم ہوئی تو پنجگانہ نمازی بن گئی۔ صرف دو گھنٹے کلاس لینے جاتی لیکن چوبیس گھنٹے کی زندگی بدل گئی۔

وہ ایک عام سا دن تھا۔ موسم میں تبدیلی آ رہی تھی، گرمی بڑھنے لگی تھی۔ حیان ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ ٹیبل سیٹ کر رہی تھی کہ اچانک حیان نے اس کے دوپٹے کا پلو کھینچا...... وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پورا دوپٹا ہی اس کے ہاتھ میں آگیا۔

''کیا ملانی بنی رہتی ہو ہر وقت۔'' اسے تو احساس بھی نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ لیکن سنینا کی روح کانپ گئی، بے پردگی کا سوچ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور جھپٹ کر دوپٹا لیا۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں حیان اپنی بھابی کا دوپٹا کھینچتے ہوئے۔'' وہ اسے کہتی واپس کچن کی جانب چلی گئی اور ٹیبل پر سر رکھ کر رونے لگی۔ کل ہی تو باجی نے بتایا تھا کہ دیور بھی نامحرم ہوتا ہے، وہ اپنے پچھلے پہ نادم تھی اور آج...... دیور سے پردہ ہے اور وہ کیا کرتی آ رہی تھی...... اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ باہر حیان سن ہو گیا ہے اس کے ردِعمل سے اس دن کے بعد اس نے حیان سے بات انتہائی کم کردی۔ باہر جاتے ہوئے تو پہلے ہی عبایا لینا شروع کر دیا تھا۔ چاروں طرف سے اسے باتیں سننے کو مل رہی تھیں ملانی بن گئی ہے۔ ممانی بھی کھنچی، کھنچی سی رہنے لگیں۔ فرزان اور

ماموں کا سہارا تھا جو صحیح سے بات کر لیتے...... لوگ کہتے ماڈرن دور ہے...... اس میں یہ حرکتیں عجیب لگتی ہیں۔ وہ سوچتی ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضورؐ کے عمل ہیں یہ تو...... آج کا دور تو کچھ بھی نہیں...... جیسا حضورؐ کا دور تھا۔ عرب کے لوگ کیسے سخت لوگ تھے، بیٹیوں کو زندہ دفنا دیتے تھے، قتل کرنے میں لمحہ نہ لگاتے، اس وقت جب حضورؐ آئے تو سب بدل گیا۔ اور آج ہم حضورؐ کے نام لیوا ہیں، قرآن موجود ہے پھر بھی احکامات سے منہ موڑے بیٹھے ہیں۔'' کچھ دنوں سے فرزان بھی کھنچنے لگا تھا۔ جب سے اس نے حیان سے باقاعدہ پردہ کیا تھا۔

رمضان شروع ہو گئے تھے...... آئے دن ممانی یا فرزان کی طرف سے کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا رہتا۔ فرزان نے تو خود اس کا ایڈمیشن کرایا تھا پھر کیوں وہ اس طرح کرتا تھا۔ شاید ہمارے علم اور عمل میں بہت فرق آ گیا ہے۔

آج تو حد ہی ہو گئی...... فرزان اپنے بھائی کی محبت میں اس پر بری طرح چیخ پڑا...... وہ سحری کچن میں ہی کرتی، پہلے بھی اس کا یہی معمول تھا لیکن اب اس کا یہ عمل سب کو کھٹکتا۔

''آج آخری روزہ ہے یہیں سحری کر لو......''

اسے فرزان کی آواز... کچن میں آئی تو وہ اپنی چادر صحیح کرتی دودھ کا گلاس اٹھائے باہر آ گئی۔ حیان اور ممانی کے درمیانی سیٹ خالی تھی۔ حیان کی دوسری جانب والی سیٹ پر فرزان تھا۔ ممانی کے برابر میں ماموں۔ اس کا حیان سے اتنا کہنا غضب ہو گیا کہ آپ اس سیٹ پر آ جائیں۔ اپنے بھائی کے چہرے پر ناگواری دیکھ کر فرزان اس پر چیخ پڑا۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ وہاں بیٹھتے ہوئے۔ کیا کرے گا وہ تمہارے ساتھ۔ اتنی اعلیٰ و ارفع چیز نہیں ہو تم......'' تذلیل کے احساس سے اس کے آنسو نکل آئے۔

''کیا ہو گیا فرزان...... آرام سے بات کرو۔'' ماموں نے اسے خاموش کرایا۔

''آپ کو نہیں معلوم پاپا کس قدر عجیب ہوتی جا رہی ہے یہ......'' وہ لب کاٹتی وہاں سے پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

نماز کے بعد وہ کمرے میں آیا۔

''اسلام میں شوہر کا حکم ماننا بھی تو فرض ہے۔ تمہارا شوہر تمہیں پردہ کرنے سے منع کرتا ہے اور تم کرتی ہو۔'' وہ قرآن پڑھ رہی تھی بند کر کے رکھا اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو فرزان، شوہر کا حکم سر آنکھوں پر...... لیکن جہاں اللہ کا حکم اور شوہر کا حکم دونوں آ جائیں وہاں چوائس نہیں ہوتی۔''

''اوہ...... اچھا......'' وہ طنزیہ مسکرایا۔ ''لیکن میں

تمہیں چوائس دیتا ہوں کہ تم اللہ کی مان لو یا میری......'' وہ اسے پور، پور زخمی کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ روتی رہی، اللہ سے مدد مانگتی رہی اس نے استخارہ کیا اور گھر سے اپنا بیگ لے کر نکل آئی۔

اسے یک دم ہی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ آس پاس ہلچل مچ گئی تھی۔ موسم بھی بدل گیا تھا۔ ہلکی پھلکی بوندیں زمین پر گریں تو کئی دن سے روزے کی حالت میں زمین نے بارش کے قطروں سے افطار کیا...... وہ ویٹنگ روم کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

واپس پلٹ کر بینچ پر بیٹھ گئی تو بادل زور سے گرجا، وہ دل میں دعائیں پڑھنے لگی۔ روزہ بس کھلنے ہی والا تھا۔ وہ پانی کی بوتل نکال کر وہیں بیٹھ گئی۔ بہت سارے لوگ دودھ کے ڈبے، کھجوریں پانی، جوس بانٹ رہے تھے کسی نے ایک شاپر اسے بھی پکڑا دیا۔

روزہ کھول کر اس نے وہیں کپڑا بچھا کر نماز پڑھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن رب سے سوال نہ کر سکی۔ کچھ دیر ایسے ہی بیٹھی رہی پھر اسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے، اسٹیشن پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید کوئی گاڑی آئی تھی۔

وہ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر باہر ایک کینٹین کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ مسافر چھتریاں لیے اپنا سامان بچاتے جلدی، جلدی جا رہے تھے۔ کوئی رک کے اس بیگانہ سی لڑکی کو دیکھتا پھر آگے بڑھ جاتا۔

''سکھر ایکسپریس سے جانے والے تمام مسافر پلیٹ فارم نمبر دو پر آجائیں۔'' وقفے، وقفے سے اناؤنسمنٹ شروع ہو چکی تھی۔ دور سے کہیں ٹرین کے ہارن کی آواز آنے لگی لوگ جلدی، جلدی آگے بڑھ رہے تھے۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی۔ زمین میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔

ٹرین اس کے سامنے اپنی پٹری پر لگ گئی۔ وہ ٹھس بیٹھی رہی، ٹرین کا ہارن ایک بار پھر سنائی دیا۔ آہستہ، آہستہ ٹرین چل پڑی، وہ تیزی سے اٹھی ویٹنگ روم سے سامان اٹھایا اور ہلکے، ہلکے چلتی ٹرین میں چڑھ گئی۔

☆☆☆

سارا دن اس کا بہت برا گزرا آفس میں...... آخری روزہ وہ آفس میں ہی کھولتا تھا۔ لیکن دماغ کچھ کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

منیجر کو بلا کر کام سمجھایا اور گھر آ گیا۔ روزہ کھلنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ حریم بیگم افطاری کی تیاری میں مگن تھیں۔

''مما، سونی کہاں ہے؟'' اس نے پورے گھر میں ڈھونڈ لیا پھر آ کر پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہے صبح سے باہر نہیں نکلی جاؤ بلا لو...... روزہ بس کھلنے ہی والا ہے۔'' انہوں نے کہہ کر واپس اپنا کام شروع کر دیا۔

اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ واش روم کا کھلا دروازہ بتا رہا تھا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہے اس کی مخصوص خوشبو کمرے میں پھیلی تھی۔ فرزان نے سانس لے کر اس کی مہک کو اپنے اندر اتارا اور چاروں جانب نظر دوڑائی۔

''کہاں چلی گئی۔'' خود کلامی کرتا پلٹنے لگا۔ دل میں آئے خیال کے تحت اس کی رائٹنگ ٹیبل کے قریب آ گیا۔

رائٹنگ پیڈ پر ایک پرچہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس نے پیڈ اٹھا کر اپنے سامنے کیا۔

''جان سے پیارے عزیز فرزان......! امید ہے کہ جب آپ کے ہاتھ یہ خط لگے گا میں بہت دور جا چکی ہوں گی۔ آپ سب کی محبتوں کا قرض لفظوں میں نہیں چکا سکتی۔ میری پیدائش پر گود لینے والی ممانی نے جب منہ پھیرا تو میں تڑپ کر رہ گئی۔ گو انہوں نے مجھے پیدا نہ کیا لیکن ان کی گود میں آنکھیں تو کھولی تھیں ناں میں نے...... انہیں لڑکیاں اچھی لگتی تھیں ان کی میں بیٹی بن گئی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی آپ

کے نکاح میں آ گئی۔ گو ابھی رخصتی باقی تھی۔ خیر جانے دیں...... میں نے کسی سے شکوہ نہیں کیا...... بات صرف اتنی ہے کہ عورت کے لیے جب اس کا شوہر اسے سمجھنے میں ناکام ہو جائے تو وہ خود کو کیا ساری دنیا کو بے توقیر نظر آنے لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔

پہلے تراشا کانچ سے اس نے میرا وجود
پھر شہر بھر کے ہاتھ میں پتھر تھما دیے

تم نے ہی تو مجھے اس راہ پر ڈالا تھا فرزان...... پھر میں کیسے علم حاصل کر کے بے عمل رہتی......؟ میں نے تو کبھی تمہاری نافرمانی نہیں کی...... آمنہ باجی کی شادی پہ یاد ہے تمہیں...... اسرار بھائی (کزن کے شوہر) جو ماموں سے کچھ کم عمر ہوں گے انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا کتنی بڑی ہو گئی گڑیا...... اور اپنے سے لگا لیا...... تمہیں وہ برا لگا تھا۔ تم نے مجھے کہا کہ شادیوں میں سب کے سامنے نہ آیا کروں...... بتاؤ میں آئی پھر کسی کے سامنے؟ تمہیں میری حیان سے بے تکلفی بری لگی، تم نے مجھے ٹوکا...... اس کے بعد کبھی دیکھا ایسے......؟ تم نے مجھے مدرسے میں ایڈمیشن دلوایا فرزان، اپنے دل کی خوشی سے...... بولو میں نے انکار کیا......؟ باجی بتاتی ہیں زندگی میں اگر کسی کو خدا کے بعد سجدہ ہوتا وہ عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے...... لیکن فرزان غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں لفظ شوہر خدا کے بعد استعمال ہوا ہے۔ اور تم نے مجھے چوائس دی ناں تم میں سے یا خدا میں سے کسی کو چن لوں...... تو میں نے خدا کو چن لیا اور تمہاری زندگی سے نکل آئی۔ میں وہیں جا رہی ہوں جہاں سے آئی تھی۔ اب میں وہاں بہ آسانی ایڈجسٹ ہو جاؤں گی۔ ویسے تو ہر حال میں، میں نے خدا کو ہی چننا تھا لیکن اگر تمہیں چن لیتی اور خدا کو ناراض کر دیتی اور پھر آئندہ زندگی میں تم پھر میرے لیے کسی معاملے میں ایسے ہو جاتے تو میں کہاں جاتی فرزان...... میں نے اسے چنا ہے جو کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ لیکن پھر بھی تمہاری منتظر رہوں

اپنی بیٹی ایمان کے لیے

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صورت!

مرسلہ: نیر فہیم عطاری، کراچی

گی۔ زندگی کے کسی لمحے میں تمہیں میں صحیح لگوں تو آواز دے لینا لوٹ آؤں گی...... میری پوری کوشش ہو گی اور دلی خواہش بھی کہ میرے نام کے ساتھ تمہارا نام جڑا رہے...... لیکن یہ بات صرف میرے لیے ہے، تم اس معاملے میں آزاد ہو۔"

فقط تمہاری اور صرف تمہاری سینا......

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ خط پڑھنے کے دوران اذان ہو چکی تھی اس نے وہیں رائٹنگ ٹیبل پر پڑی بوتل سے منہ لگا کر پانی پیا۔ بھوک پیاس سب مٹ چکی تھی۔

اسے لگا وہ اسے کھو چکا ہے، اس کا ذہن کام کرنے سے انکاری تھی۔ یکلخت ایک خیال کا کوندا لپکا...... اس نے جیب سے موبائل نکالا اور اسٹیشن فون ملایا۔ بیل جا رہی تھی ضبط کرنا محال تھا۔ سکھر ایکسپریس کے ٹائمنگ معلوم کیے تو نو بجے گاڑی روانہ ہونی تھی آٹھ بج رہے تھے...... وہ اگر ٹائم پر اسٹیشن پہنچ بھی جاتا تو وہ نہیں مل سکتی تھی۔ پھر وہ اٹھا اور تیزی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔

وہ بہت رش ڈرائیونگ کر رہا تھا...... ہلکی ہلکی بارش اور چاند رات...... کوئی اور وقت ہوتا تو موسم کو...

بھرپور انجوائے کرتا......لیکن ابھی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے جسم آرے سے چیر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنی غلطی پر ندامت تو اسے صبح ہی ہو گئی تھی۔ اس کا خط پڑھ کر تو جیسے پانی، پانی ہو گیا۔ دل چاہا اپنے آپ کو شوٹ کر لے۔ وہ کیسے اسے سنبھال، سنبھال کر رکھتا تھا اور آج......اس نے لب بھینچ لیے۔

پلیٹ فارم کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اناؤنسمنٹ برابر جاری تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ ٹرین آ چکی تھی مسافر تیزی سے چڑھ اور اتر رہے تھے، وہ کہیں نظر نہ آئی۔ پلیٹ فارم پر رش چھٹ گیا......ٹرین نے چل پڑنے کا ہارن بجا دیا۔ پھر ایک جگہ اسے گمان ہوا جیسے وہ بیٹھی ہے وہ اس طرف دوڑا اتنی دیر میں وہ اٹھی اور چند پل کے لیے غائب ہو گئی اور تیزی سے ٹرین کی طرف بڑھی۔ ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا......سنینا نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا وہ پہنچ چکا تھا۔ فرزان نے سنینا کو تیزی سے اپنی طرف کھینچا جھٹکے سے دونوں پلیٹ فارم پر آ گرے، ٹرین تیز ہوئی اور ان کے قریب سے گزرتی چلی گئی زمین میں صرف... گڑگڑاہٹ باقی تھی۔ سنینا نے اطمینان سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کی خوشبو اس کے لمس سے واقف جو تھی۔ آتے جاتے لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ دونوں کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ فرزان اٹھا اور خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اٹھایا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ فرزان نے گاڑی فل اسپیڈ سے چھوڑ دی آگے رش تھا۔ اس نے راستہ تبدیل کیا اور جوس کارنر پر روک دی آرڈر دے کر شیشہ اوپر کیا۔ اس کا سیل فون بج رہا تھا۔

''مما کالنگ......''

''کہاں چلے گئے ہو، فرزان سونی کو لے کر مجھے اپنا بھی کچھ سامان منگوانا تھا سونی سے......عجیب لڑکی ہے نہ کہا نہ سنا، ایسے ہی چلی گئی۔'' وہ گرجیں۔

''آپ کہیں تو واپس لے آؤں؟'' وہ مسکرایا۔

''کیا فائدہ اب واپس آنے کا۔''

''شکر کریں واپس لا تو رہا ہوں......'' وہ مسکرایا۔

''کیا مطلب......؟'' انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''کچھ نہیں آپ لسٹ واٹس اپ کر دیں، ہم لے آئیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے اللہ حافظ......'' وہ سارا دن کمرے سے نہ نکلی تو انہیں بھی احساس ہوا کہ ساری رونق اسی کے دم سے تو ہے۔ انہوں نے اس کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا۔

فرزان نے فون بند کر کے اس کی جانب دیکھا۔

''کیوں آ گئے مجھے لینے؟'' رو، رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

''تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے من کے دریچوں میں عید ہو جائے
میرے افق پہ اگر چاند بن کے آئے وہ''

فرزان دھیرے سے گنگنایا۔

''تم چھوڑ کر کیوں آ گئی تھیں مجھے...... تمہیں معلوم ہے جسم کے دو حصے ہو جائیں تو کیا کوئی بھی حصہ زندہ رہے گا......؟''

''تم نے بھی تو حد کر دی۔'' کتنی تھکن تھی اس کے لہجے میں...... فرزان نے پاکٹ سے ایک کیس نکالا......جو اسے منانے کے لیے لے کر آیا تھا۔ ڈائمنڈز سے مزین نازک سا جگمگ کرتا بریسلیٹ......

''میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن، روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے موتی لاکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن، دھڑکن''

سنینا نے کیس ہاتھ سے لینے کے بجائے فرزان کے ماتھے سے سر ٹیک دیا اس حسین ملن پر باہر عید کا چاند بھی مسکرا دیا۔



پرکھ

بشریٰ گوندل

"غضب خدا کا، عجیب زمانہ آیا ہے۔ ہم نے بھی پوری زندگی گزار دی۔ یہ بال دھوپ میں بیٹھ کر تو سفید نہیں کرلیے۔ لیکن ایسا پہلے کبھی دیکھا نہ سنا۔ چلو فیشن اور رواج وقت کے ساتھ، ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی پتلونیں تنگ پہن لیں تو کبھی قمیصیں اونچی کرلیں۔ اگر دل آمادہ نہ بھی ہو نظر کو بھلا نہ بھی لگ رہا ہو مگر قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اور آدمی رفتہ، رفتہ عادی ہوجاتا ہے کہ چلو وقت کا تقاضا ہی سہی۔ فیشن اور رواج کی تقلید

ہی سہی۔ مگر یہ کاہلی اور سستی کو جو لوگ فیشن کا نام دے رہے ہیں، لاحول ولا۔ ایسا بھی اب کیا فیشن کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر پلنگ سنبھال لیا جائے توبہ، توبہ......'' نفیسہ بیگم صبح سے حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھیں۔ ان کی حیرانی تھی کہ کسی صورت کم ہی نہیں ہو رہی تھی افسوس تھا کہ جا ہی نہیں پا رہا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے استغفار پڑھ رہی تھیں کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

''امی، اب چھوڑیں بھی ...... ہر گھرانے کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہر گھر کا ماحول ہماری سوچ کے عین مطابق ہو۔'' آصفہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں آپ کو زیادہ دھچکا اس لیے بھی لگا ہے کہ آپ نے لڑکی کے حوالے سے جو آئیڈیل تراش رکھا تھا وہ اس آئیڈیل کے مطابق نہیں تھی۔''

''کون سا آئیڈیل......؟'' امی نے نا سمجھی سے پوچھا۔

''یعنی تصوراتی خاکہ......اور ظاہر ہے وہ آپ کے معیار پر پوری نہیں اتری جبھی آپ کو زیادہ صدمہ ہوا۔'' آصفہ نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

''ویسے لڑکی تو پیاری تھی۔'' نمرہ نے رائے کا اظہار کیا۔

''اے ہے، کیا صورتوں کے اچار ڈالتے ہوتے ہیں جب گن ایک بھی نہ ہو۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھی رہے اور گھر کو کچرا بنا دے...... نہ بابا ہم ایسی صورتوں پر نہیں مرتے۔ ایسے ہی کوئی پیارا سا ڈیکوریشن پیس گھر میں لاکر رکھ دو۔'' امی کی طرف سے انکار ہی انکار تھا۔

☆☆☆

نفیسہ بیگم کی چار اولادیں تھیں، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دونوں اپنے، اپنے گھروں میں خوشحال و خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں۔ دونوں بہنیں اپنی ذہانت، پھرتی، سلیقہ شعاری اور ماں کی بہترین تربیت کے باعث پوری سسرال پر راج کر رہی تھیں اور بہترین اور ہر دلعزیز بہوؤں کا خطاب پا چکی تھیں۔

نفیسہ بیگم خود اپنے نام کی طرح پیاری اور نفیس طبیعت کی حامل خاتون تھیں۔ سسرال اور میکے سمیت پورے خاندان میں ان کے سلیقے اور نفاست کے چرچے تھے۔ خوش اخلاقی، ملنساری اور مہمان نوازی میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ انہیں صفائی ستھرائی کا بھی ایسا خبط تھا کہ گھر کا کونا، کونا چمکتا ہوا ملتا اور وہ خود بھی ہر وقت نہائی دھوئی 'فریش' نکھری، نکھری رہتیں۔ پھر ان کا پہناوا، ان کا رکھ رکھاؤ، ان کا حسنِ اخلاق...ان کے تمام وصف ان کی بیٹیوں نے چرائے تھے۔ ویسی ہی مہمان نواز اور ملنسار کہ دور و نزدیک کے تمام رشتے دار ان کے گھر میں آکر راحت و خوشی محسوس کرتے۔ پورے خاندان میں نفیسہ بیگم کے سگھڑاپے اور نیک فطرت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اور بھری پُری سسرال میں ان کے بہت عمدہ گزارے ہوئے وقت کا اور قربانیوں کا چرچا رہتا۔

بلڈ کمپوزیشن انسان کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جبھی تو ماں کی ساری خوبیاں بدرجہ اتم بیٹیوں میں موجود تھیں...... ماں جیسا سگھڑاپا، نفاست اور ذہانت انہیں ورثے میں ملی تھی اور لوگ صد فیصد ٹھیک کہتے ہیں کہ بیٹی، ماں کا پرتو ہوتی ہے۔ بیٹیاں زیادہ ماؤں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ماں سے مل لو تو آپ کو خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ بیٹی کیسی ہوگی۔

نفیسہ بیگم کی تینوں بیٹیوں کی پورا خاندان مثالیں پیش کرتا۔ سگھڑ، ہنر مند، کھانے پکانے میں ماہر، دیسی بدیسی ہر قسم کے کھانے پکاتیں کہ کھانے والے شیدا ہو جاتے۔ سلائی کڑھائی ایسی صفائی اور ہنر مندی سے کرتیں کہ مثال نہ ملتی۔ پھر بول بھی ایسا میٹھا۔ زبان کی ایسی شائستہ کہ باتوں سے پھول جھڑنے والی مثال صادق آتی۔ اسی لیے تو خاندان کے ہر گھر کی آرزو تھی نفیسہ بیگم کی بیٹیوں کو بہوئیں بنانے کی اور ہر گھر سے ہی رشتے آئے قابل اور برسرِ روزگار لڑکوں کی لائنیں لگ گئیں اور وہ عاجزی اور انکساری سے خدا کے حضور جھک، جھک گئیں۔

حرص اور ہوس کے بدنما پردے نے نظر کو میلا نہ ہونے دیا اور دولت و آسائشات کی وقتی چکا چوند نے لالچ

اور طمع میں مبتلا نہ ہونے دیا اور پہلا حق اپنوں کا سمجھا اور اپنوں کو ہی سونپا۔ بہت قریبی رشتے داروں کو اہمیت اور اولیت دی۔ بڑی بیٹی آصفہ اپنی پھپو کی بہو بن گئی اور چھوٹی نمرہ خالہ کے گھر بیاہی گئی اور کچھ ہی عرصے میں۔ دونوں بہنیں اپنے سلیقے، اخلاق اور ہنر مندی سے اپنے گھروں میں راج کرنے لگیں اور نپولین کے اس قول کو سچ ثابت کرنے لگیں کہ تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔

اور ماں کی تربیت زندگی کے سفر کے لے زادِ راہ ہوتی ہے۔ جیسے اندھیری رات میں چراغ، جیسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن۔

اچھی مائیں، اچھی قوم، اچھا معاشرہ، اچھے انسان اور اگر ایسا نہ ہو تو نتیجہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور جنت کوئی یونہی نہیں قدموں تلے آجاتی کہ ماں کے رتبے پر فائز ہوئے اور جنت کے حقدار قرار پائے۔ بلکہ جنت کو پانے کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے اور اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ معاشرے کو کار آمد، ہنر مند، محنتی اور ایماندار افراد دینا پڑتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام نفیسہ بیگم کے ہی اسباق تھے جو انہوں نے پوری زندگی نہ صرف خود پر لاگو رکھے بلکہ بچوں کے ذہنوں پر بھی نقش کردیے تھے۔

وہ اگرچہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ خاتون نہیں تھیں لیکن اس مشہور مقولے کے مطابق کہ علم ڈگری کا محتاج نہیں۔ چنانچہ وہ بھی سمجھ بوجھ کی دولت سے مالا مال تھیں۔ ظاہر ہے وہ بھی ایک ایسی ہی ماں کی تربیت یافتہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے پوری ذمّے داری کے ساتھ یہ تمام اوصاف اگلی نسل میں منتقل کیے۔ بے شک ...عورت ہی کئی نسلوں کی امین ہوتی ہے اور آئندہ آنے والی کئی نسلوں کے بگاڑ اور سنوار کی ذمّے دار بھی۔

بڑی دونوں بیٹیوں آصفہ اور نمرہ نے عین ماں کے ہی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، ماں کے پڑھائے ہوئے بہترین اسباق کی لاج رکھتے ہوئے سسرال میں سلیقے اور ہنر مندی سے اپنی ماں کا ہی نام بلند کیا کہ لوگ یہی کہتے .... نفیسہ بیگم کی بیٹیاں سو فیصد ماں کا عکس ہیں اور یہی وجہ تھی کہ چھوٹی سارہ ابھی میٹرک کا امتحان پاس بھی نہ کرپائی تھی کہ رشتوں کی لائنیں لگ گئیں اور نفسا نفسی کے اس مصنوعی دور میں فیشن اور دکھاوے کے ظاہری اور بناوٹی چکا چوند کے زمانے میں بھی یہ بات مان لینی پڑی کہ موروثی اقدار بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ جوہر شناس آنکھیں آج بھی ہیروں کی پرکھ رکھتی ہیں۔ خاندان کی بنیادوں میں آج بھی محنت، ہنر، سلیقہ اور دیانتداری کی مانگ اور ضرورت ہوتی ہے۔ حوصلہ مندی، صبر اور قربانی اعلیٰ ترین وصف قرار پائے جاتے ہیں۔ ورنہ بنیادیں کمزور ہوکر رشتوں کی بلند و بالا عمارتوں کو زمیں بوس کردینے کا سبب بنتی ہیں اور خاندان کے شیرازے بکھرنے میں پھر زیادہ دیر نہیں لگتی۔

چچی نے سارہ کا رشتہ اپنے کیپٹن بیٹے کے لیے مانگ لیا۔

فرحت چچی نفیسہ بیگم کے ہر عمل کی گرویدہ تھیں۔ اور پل، پل کی گواہ بھی دیورانی، جیٹھانی میں روایتی چپقلش اور حاسدانہ جذبات نہیں تھے۔ بلکہ احترام اور محبت کی فضا قائم تھی اس لیے چچی نے اپنے بیٹے کا رشتہ ڈال دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان ماں، بیٹیوں میں گھروں کو جوڑنے اور رشتوں کو پائیدار رکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور پھر کون چاہتا ہے کہ گھر ٹوٹنے کا رسک لیا جائے۔

دوسری طرف بھی بصد احترام چچی کی خواہش کو اہمیت دی گئی اور یوں گھر کی بات گھر میں ہی رہ گئی اور لوگوں کے پھیرے ختم ہوگئے۔ تینوں بیٹیاں خاندان میں بیاہی گئیں۔ اب بیٹے کی شادی کے حوالے سے سوچا جانے لگا کہ دانش کی شادی کے بعد سارہ کی شادی ہو تاکہ گھر کی رونق نہ ٹوٹے۔ دانش نے فیصلہ ماں بہنوں پر چھوڑ دیا اور ماں بہنیں تمام کام چھوڑ چھاڑ کر لڑکی ڈھونڈنے میں لگ گئیں۔ تب معلوم ہوا کہ یہ کتنا وقت طلب کام تھا۔ ہر فنکشن، تقریب میں، میلاد کی محفلوں

میں، دوستوں کی قطاروں میں اس گوہرِ مقصود کو تلاش کرنے لگیں جو ان کے گھر کو منور کر دے۔ جو گھر میں ایسی روشنی بن کر اترے کہ زمانہ مثال دے جو گھر کو گھر سمجھے، گھر بنائے اور گھر بنائے رکھنے میں زندگی کی ساری توانائیاں صرف کر دے۔

عارف صاحب ایسے مطمئن اور مگن تھے۔ سب کچھ شریکِ حیات پر چھوڑ کر کسی معاملے میں مداخلت کم ہی کرتے۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا کہ جو ہوگا صحیح ہوگا۔ لیکن اب پہلی بار عارف صاحب نے مداخلت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ جب خاندان میں لڑکیاں موجود ہیں تو پھر باہر ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔

''خاندان کی لڑکیاں......؟'' تینوں بہنیں شش و پنج کا شکار ہوگئیں۔ خاندان میں اگرچہ لڑکیاں موجود تھیں لیکن ان کی آئیڈیل لڑکی...... ہر بہن کی طرح ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ بھابی چاند ستاروں کو ماند کرتی ہوئی ملے۔ جبکہ خاندان کی سب دیکھی بھالی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ قبول صورت، واجبی سی، عام سی لڑکیاں۔ جبکہ وہ چاہتی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہونی چاہیے کہ لوگ دیکھیں اور دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہمارا ایک ہی تو بھائی ہے چنانچہ ایک ہی بھابی... پھر رسک کیوں لیا جائے۔ دو تین بھائی اگر ہوتے تو کسی بھائی کی دفعہ کمپرومائز کر لیا جاتا۔ لیکن اب نو کمپرومائز۔ یہ تینوں بہنوں کی مشترکہ رائے تھی۔ نفیسہ بیگم اگرچہ بیٹیوں کی سو فیصد حامی نہیں تھیں لیکن اختلافِ رائے بھی نہیں کر سکتی تھیں اور دل کے کسی کونے میں یہ خواہش بھی چھپی تھی کہ بے شک ایک ہی تو بہو آنی ہے پھر تو ایسی ہو کہ روشنی ہو جائے۔

پھر بڑے منظم اور غیر محسوس طریقے سے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ روز لڑکی دیکھنے کے بہانے لوگوں کو لوٹا جائے، کھایا پیا جائے، خاطر مدارت اور تواضع کرا کے لڑکی کو بالآخر ناپسند کر کے چل دیا جائے۔ یہ شریفوں کے طور طریقے نہیں ہوتے کہ بیٹی والوں کا غرور اور بھرم توڑا جائے اور لڑکی کا دل۔ مکمل چھان بین کرا کے ... ہی جائیں گے اور بہت سادہ سی چائے کی شرط رکھیں گے۔ اگر لڑکی پسند نہ بھی آئی تو چہرے اور رویے سے ظاہر نہیں ہونے دیں گے اور اولین کوشش یہی ہوگی کہ کسی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور نہ ہی دل آزاری ہو۔

جس روز رشتہ دیکھنے جانا تھا نفیسہ بیگم صبح سے ہی یاد دہانی کرا رہی تھیں۔ انہوں نے لائٹ گرین بریزے کا سوٹ پہن کر شیفون دوپٹا اوڑھنے سے گریز کیا اور سیاہ سوسی کی شال اوڑھ لی۔ تیاری میں سادگی کا عنصر نمایاں رکھا اور بیٹیوں کو بھی سادہ سا تیار ہونے کی ہدایت کی۔

''زیادہ نمود و نمائش اور زیورات چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ دیکھنے جا رہے ہیں کوئی دکھانے نہیں، پسند کرنے جانا ہے کوئی پسند ہونے نہیں کہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے۔'' اور بیٹیاں بھی آخر انہی کی بیٹیاں تھیں سادہ سا تیار ہو کر چادریں اوڑھ لیں۔

بوا حلیمہ یہ رشتہ لائی تھیں اور ان کو پختہ یقین تھا کہ رشتہ ہر صورت ہی پسند آئے گا کیونکہ ناپسند کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اور بوا حلیمہ نے یہ سچ کہا تھا کہ باہر سے ہی لڑکی والوں کا گھر دیکھ کر یہ لوگ ریجھ جائیں گی اور پھر لڑکی دیکھ کر مزید گرویدہ ہو جائیں گے اور یہ بات سچ ثابت ہوئی گیٹ کھلنے تک اس گھر کی حیثیت سے ہی انتہائی متاثر ہوگئیں۔ بلاشبہ یہ اس کالونی کا سب سے خوب صورت گھر تھا۔ جدید نقشے پر تیار کیا گیا خوب صورت گھر...... گھر یقیناً ان کو بہت پسند آیا تھا لیکن صرف گھر دیکھ کر تو رشتے طے نہیں کیے جاتے ناں!

نفیسہ بیگم کا بہو کے حوالے سے تیار کیا گیا خاکہ خاک ہوا۔ بت پاش، پاش ہوگیا اور وہ بد دل سی ہوگئیں۔ جبکہ لڑکیوں کو صحیح بھابی کے روپ میں پسند آئی تھی۔ بلاشبہ وہ ایسی ہی تھی چاند کو شرما دینے والی۔ بے انتہا سفید، دودھیا مکھن ملائی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ ایسا ملیح اور خوب صورت چہرہ کہ چہرے سے نظر ہی نہیں ہٹتی تھی۔ لیکن نفیسہ بیگم جیسی جہاندیدہ خاتون کی نظر ہٹ گئی تھی۔ بلکہ انہوں نے ہٹالی تھی۔ وہ بہت عمیق اور گہری نظروں سے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک،

ایک چیز پر نظر تھی۔ ایک، ایک بات نوٹ کر رہی تھیں، ہونے والی سمدھن کی باتوں سے نتائج اخذ کر رہی تھیں اور ان تمام باتوں کی روشنی میں اپنے گھر کے ساتھ اس گھر کا موازنہ کر رہی تھیں اور انہیں اس گھر میں اور اپنے گھر میں وہ فرق واضح نظر آ رہا تھا جو دوسروں کی نظر میں معمولی اور حقیر ہوگا۔ مگر ان کو وہ جھری واضح نظر آئی تھی جو بعد میں بڑے شگاف میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

رہن سہن، پہناوا، سوچ، عادتیں، فطرت...... اس گھر کے رسم و رواج ان کے گھر سے قطعی مختلف تھے۔ طور طریقے بالکل جدا جدا۔

متوقع سمدھن بیگم، اپنے بیڈ کے سائز جتنے جسمانی حجم کے ساتھ بیڈ پر یوں براجمان تھیں جیسے ابھی ابھی کوئی شادی بھگتا کے آئی ہوں۔ اتنی تیاری، سمجھ سے بالاتر تھی۔ دو بہوئیں اور دو بیاہی بیٹیاں بھی ایسے ہی تیار تھیں زیورات سمیت جو کچھ اُن کے پاس سب کچھ۔ یقیناً زیب تن کر لیا ہوگا۔

دردانہ بیگم کے دونوں بیٹے ملک سے باہر ہوتے تھے اور خواتین کے پہناوے سے لے کر گھر کی ظاہری حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر کا پیسہ لگا ہوا ہے۔ نمود و نمائش، دکھلاوا، بناوٹ، مصنوعی بناوٹی، لب و لہجہ، مغرور انداز، جیسے نو دولتیے ہوں۔ جیسے نیا، نیا پیسہ دیکھا ہو۔ جسم پر پہنی ہوئی اور گھر میں استعمال کی ہر، ہر چیز کی قیمت یوں منہ زبانی بتائی جا رہی تھی جیسے مہمان ان چیزوں کے خریدار ہوں۔ گھر کی خواتین خود اتنی لش، لش کر رہی تھیں مگر گھر کی دیواروں پر جالے لٹک رہے تھے۔ صوفوں کی بیک پر، بیڈ کے کراؤن پر، کونے میں الگنی پر فالتو کپڑوں کے ڈھیر لٹک رہے تھے۔ دھول سب چیزوں پر نمایاں نظر آ رہی تھی۔ جو فرش کارپٹڈ تھے وہ تو ڈھک گئے اور جو نظر آ رہے تھے وہ انتہائی غلیظ اور کائی زدہ۔ حالانکہ مہمانوں نے کوئی اچانک چھاپہ نہیں مارا تھا بلکہ اپنے آنے کی اطلاع تین دن پہلے دے چکے تھے۔ انہوں نے بھی مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں تیاری کی تھی اور خوب کی تھی۔ گھر کی تمام خواتین لگتا تھا پورا دن پارلر میں لگا کر آئی ہیں۔ لشکارے مارتی ان خواتین کو دیکھ کر نفیسہ بیگم ایک عجیب سے آہ بھر کر رہ گئیں۔

''اُف...... اتنا خرچہ کیا ہوگا۔'' نفیسہ بیگم کو افسوس ہوا۔

پھر چائے کے ساتھ بیکری کے ہی تمام آئٹمز...... میز اگرچہ لبالب تھی انواع و اقسام سے لیکن گھر کی بنی ہوئی صرف...... چائے تھی۔

''ارے...... آپ لوگوں نے اتنا تکلف کیوں کیا۔ اتنا کچھ جمع کر لیا جبکہ ہم نے منع کیا تھا بوا کو کہ ہم صرف سادہ سی چائے پئیں گے۔'' نفیسہ بیگم کو شرمندگی ہو رہی تھی۔

''ارے کوئی نہیں، ہم مہمانوں کی اسی طرح تواضع کرتے ہیں کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں اور پیسہ ہاتھ کا میل ہے اور پھر خرچ کرنے کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔'' دردانہ بیگم نے سوال گندم جواب چنا کے مصداق کہا۔

''اور بہن جی ہم تو دل کے بہت کھلے لوگ ہیں پیسہ خرچ کرتے ہوئے قطعاً نہیں سوچتے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں دے رکھا ہے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں پیسہ اگرچہ آ بھی جاتا ہے لیکن دل سے بخل نہیں جاتا۔ خرچ کرتے ہوئے جیسے موت پڑتی ہے۔'' اتنے چھوٹے سوال کا اتنا طویل جواب۔ نفیسہ بیگم کو نئے سرے سے شرمندگی نے آن گھیرا۔

''آپ کیا کرتی ہیں بیٹا......؟'' شرمندگی کے احساس میں گھرے، گھرے انہیں اور تو کچھ نہ سوجھا چنانچہ لڑکی سے سوال ہی پوچھ لیا۔

''کچھ بھی نہیں آنٹی۔'' انتہائی نخوت اور پورے اعتماد کے ساتھ جواب آیا تو وہ حیران رہ گئیں۔

''کیا مطلب......'' آصفہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ کچھ نہیں کرتی تو سارا دن فارغ ہوتی ہیں کیا......؟''

''نہیں، فارغ تو نہیں ہوتی، ٹی وی دیکھتی ہوں، فون پہ دوستوں سے گپ شپ ہو جاتی ہے۔ پھر ویب سائٹس، انٹرنیٹ، فیس بک...... اب فارغ سے فارغ بندہ بھی مصروف ہی سمجھیں اور بوریت کا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے اپنے دن رات کی مصروفیات کی وضاحت کی تو تینوں بہنوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ البتہ ماں کے چہرے کے طرف دیکھنے سے گریز کیا جہاں کوئی سایہ سا آ کر گزر رہا تھا۔

’’آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے......؟‘‘ نمرہ نے سوال کیا تو وہ اچھا خاصا جز بز ہوئی اور اعتماد ڈانواں ڈول ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں بیٹی کی آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

’’وہ...... میٹرک تک پڑھا ہے ضحیٰ بیٹی نے۔ پھر گھر بھر کی لاڈلی تھی اس کا کہنا تو کوئی ٹال ہی نہیں سکتا اس نے کہا کہ میرا دل نہیں لگتا پڑھائی میں تو ہم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ویسے بھی، ہم نے کون سا نوکری کرانی تھی کہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لیتی رہے۔ نرا دماغ اور نظر کا گھاٹا۔‘‘ ان کے اس تبصرے پر سارہ کا ہاتھ فوراً اپنے گلاسز پر چلا گیا۔ وہ ایم سی ایس کر چکی تھی جبکہ آصفہ اور نمرہ نے بی اے آنرز کیا تھا کہ شادیاں ہو گئیں۔

’’ویسے بھی بہن جی...... زیادہ تعلیم میں تو کہتی ہوں لڑکیوں کو بگاڑتی ہی ہے کہ پھر وہ کسی کے کہنے سننے میں نہیں آتیں، من مرضی کی مالک ہو جاتی ہیں۔‘‘

تعلیم کے حوالے سے ان کے ارشادات اور ناقدری پہ نفیسہ بیگم سمیت لڑکیوں کو بھی کچھ دیر تک سانپ سونگھ گیا مگر اختلاف رائے سے گریز کیا۔

کافی دیر تک کمرے میں ناگوار سی خاموشی پھیلی رہی جسے بالآخر نفیسہ بیگم کی آواز نے توڑا۔

’’پھر گھر داری سیکھ لی ہو گی سلائی، کڑھائی کوکنگ وغیرہ۔‘‘

’’کھی کھی کھی......‘‘ کمرے کی فضا میں لڑکی کی ہنسی بکھری جسے ماں کی ایک گھوری نے دبا دیا۔

’’ارے بہن جی...... یہ ہمارے تمہارے زمانے تو رہے نہیں۔ یہ آج کل کی لڑکیاں کہاں گھر داری سیکھتی ہیں اور کہاں اس طرح کہ جھمیلوں اور بکھیڑوں میں پڑتی ہیں۔ آج کل بچیوں کو ہر چیز ریڈی میڈ چاہیے ہوتی ہے۔ جس میں نہ مشقت کرنی پڑے اور نہ وقت ضائع ہو۔ ویسے بھی اب زندگی سہل ہو گئی ہے۔ وہ پہلے زمانے والی مشقت بھری زندگی تو رہی نہیں آج کل کی لڑکیوں کی اور ترجیحات ہیں اور مشاغل ہیں۔ اور پھر سچ بات کہوں بہن جی، میں نے خود ساری زندگی گھر داری نہیں کی نہ سلائی کڑھائی آتی تھی اور نہ ہی کھانا پکانا، میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا بس عیش ہی کیا ہے۔ میاں نے بھی عیش کرائے اور اب بیٹے بھی عیش کرا رہے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ میرے نصیب میں کام کرنا نہیں لکھا تھا اور دیکھ لیں اب بیٹیاں اور بہوئیں بھی عیش کر رہی ہیں۔ کبھی تنکا تک نہیں توڑا...... بیٹیوں کو قسمت سے میاں اچھے ملے ہیں اور بہوؤں کو بھی کوئی خاص کام کاج نہیں کرنا پڑتا۔ اب گھر داری کر کے نام کمانے کا فیشن ہی نہیں رہا۔ پھر کیا ضرورت ہے لڑکیوں کو کچن میں چولہے کے آگے صبح سے شام تک کھڑا کر کے کالا سیاہ کرو۔‘‘ انہوں نے گھر داری کی مخالفت میں اچھی خاصی تقریر کر دی اور نفیسہ بیگم کی وہ کیفیت تھی کہ بس کانوں کو ہاتھ لگانے کی ہی کسر رہ گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں توبہ استغفار کرتی رہیں۔ گھر آ کر بھی بڑی تک دیر مسلسل صدمے کی کیفیت میں رہیں۔

’’اے ہے، تم نے یہ کون سے دشمنی نکالی حلیمہ بوا......؟‘‘ انہوں نے خفگی سے بوا کو لتاڑا۔

’’کیوں آپا بیگم رشتہ پسند نہیں آیا کیا؟......‘‘ اب کے حلیمہ بوا کو جیسے صدمہ لگا۔ ’’نہ تو کیا کمی تھی اس رشتے میں...... گھر دیکھا ہے آپ نے ان کا......؟‘‘

’’ہاں دیکھا ہے، اللہ ان کو رہنا نصیب کرے۔ ہم نے کوئی ان کا گھر نہیں اٹھا لینا۔‘‘ نفیسہ بیگم سرد لہجے میں بولیں۔

’’دولت بھی بے حساب ہے آپا، روپے پیسے کی ریل پیل ہے کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔‘‘

’’اللہ ان کے روپے پیسے میں برکت ڈالے اور خیر کے کاموں میں خرچ ہوں۔‘‘ اب کے بھی نفیسہ بیگم نے گول مول سا جواب دیا۔

’’اور لڑکی بھی کتنی پیاری اور فیشنی ہے گوری اتنی جیسے

دودھ کی بنی ہوئی ہو، ہاتھ لگانے سے جیسے میلی ہو جائے۔ ایسی لڑکیاں تو نصیب والوں کو ملتی ہیں جی......''

''ہاں بوا...... نصیب والوں کو ہی۔''

''اور آپ کا گھر بھر دیں گے وہ لوگ اتنا جہیز دیں گے۔ لوگ دیکھیں گے تو مثالیں دیں گے۔'' بوا حلیمہ نفیسہ بیگم کی ہوں ہاں کو رضامندی سمجھ رہی تھیں۔ تبھی جہیز کا لالچ دینے لگیں۔

''گھر بھر جائے گا آپ کا۔''

وہ سرد آہ بھر کے چپ کی چپ بیٹھی رہ گئیں اور بوا کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ گھر تو پہلے ہی بھرا ہوا ہے لبالب حلال کمائی سے۔ دل تو پہلے ہی مالا مال ہے صبر واستقامت کی دولت سے، شکر و ایمان کی جاگیر سے...... طمع، لالچ، حرص، ہوس اور حسد کی آلودگی سے پاک گھر بھی، دل بھی اور نیت بھی...... مادی چیزوں کی بھی چاہ ہوئی نہ آرزو...... اور شکر ہوا کہ اولاد بھی انہی رستوں کی مسافر بنی ماں باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے۔

''لوگوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ یہ فیشن کی خدا جانے کون سی ہوا چلی ہے۔ لوگوں نے بھی چکر الٹا چلا دیا ہے۔ نقل کو اصل اور غلط کو صحیح کہتے ہیں، لڑکیاں راتوں کو جاگتی ہیں۔ فون، انٹرنیٹ، فیس بک کا جائز و ناجائز استعمال اور دن کو پورا دن سوئی رہتی ہیں۔ پہلے تو گھر داری، سلیقہ شعاری، خدمت گزاری اور ہنرمندی جیسے اوصاف کو اہمیت دی جاتی تھی اور آج کل فیشن کی سمجھ بوجھ رکھنے والی لڑکیوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ گھر داری یا کوئی اور ہنر سیکھنا گویا بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ گھر بسانے کی صلاحیت رکھنے والی گھریلو لڑکی کو بے وقوف تصور کیا جاتا ہے اور گھر کے کام کاج کرنا باعثِ شرم اور ذلت آمیز سمجھا جاتا ہے۔ عجیب زمانہ آ گیا ہے۔''

''امی...... ویسے لڑکی تو اچھی تھی ناں اور اس کے ہاتھ کتنے پیارے تھے ناں!'' سارہ کے تصور میں دودھ جیسے گورے، گورے ہاتھ چلے آئے تھے لڑکی کے...... امی نے سارہ کو ٹوک دیا۔

''یہی تو خرابی ہے بیٹا کہ ہم نے خود سے ہی اچھائی کے پیمانے بنا لیے ہیں۔ ظاہری خدوخال دیکھ کر ہم لوگوں کو ''اچھا'' یا ''برا'' ہونے کی کیٹیگری میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ باطنی اچھائی، کردار کی خوبی، فطرت، عادت ان اوصاف کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ جبکہ سیانے کہتے ہیں کہ کسی کی بیٹی دیکھنی ہو تو پہلے اس کی ماں سے ملو۔ ماں کی فطرت کا عکس بیٹی کے عمل میں ضرور نظر آئے گا...... اور جو ماں اپنے نکمے اور پھوہڑپن کو خوش نصیبی قرار دے۔ جس کا سلیقے، قرینے اور نفاست سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہ پڑا ہو۔ جس کو گھر کی بدنظمی، پھیلاوا، غلاظت اور گندگی نظر ہی نہ آئے تو وہ ماں تربیت میں اپنی بیٹی کو کیا دے گی اور اس کی بیٹی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ کیا وہ ایک بہترین گھر گرہستن ثابت ہو گی؟ اور پھر آئندہ آنے والی نسلوں کی تربیت و پرورش کس پیمانے پر کرے گی۔ نہیں بیٹا! یہ تو خود کو دھوکا دینے والی بات ہے۔''

''پھر امی......؟'' سارہ نے سوچ کی لکیروں سے پُر امی کے چہرے کو بغور دیکھا لیکن ماں کی سوچ کے تعاقب میں وہاں تک رسائی نہ حاصل کر سکی۔ جہاں نفیسہ بیگم کی سوچ آنکھ بنی ہوئی تھی...... چھوٹے بھائی کا چھوٹا سا آنگن...... سجا سنورا، چمکتا دمکتا اور کونے تک لشکتا ہوا بہت عام سا گھر اور اس گھر میں پھرتی اور سمجھداری سے کام کرتی، گھر کو ہر لمحہ اپنے ہاتھوں سے سنوارتی، کئی اوصاف اور کئی پوشیدہ خوبیوں کی مالک ان کی بھتیجی۔ جو نہ حسن میں یکتا تھی کہ چاند سورج کو شرما دے...... نہ فیشن کی دوڑ میں لگی بھاگم بھاگ کہ سب کو پیچھے چھوڑ دے۔ ہاں مگر اس کے کردار و عمل میں ایسی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں کہ وہ گھر کو سکھ چین کا گہوارہ بنا دے اور نسلوں کو سنوارے اور اس وقت نفیسہ بیگم کی آنکھ اس جوہری کی آنکھ بن گئی جو اصل ہیرے کی پرکھ رکھتی ہے۔ جو وقتی اور عارضی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوتی۔ لڑکی ڈھونڈنے کا ایک تجربہ ہی اُن کے لیے کافی تھا۔



مکمل ناول

محبت ہے سمندر سی

فاخرہ گل

"پتا ہے مجھے بچپن سے ہی شادی کرنے کا بہت شوق ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں پیدا ہی ایک شادی کے دوران ہوئی تھی۔" کوکو نے اسمارا کی شادی تیاریوں کے دوران اس کے جہیز کے کپڑے ٹانکتے ہوئے اپنے تئیں رازداری سے انکشاف کیا۔ جسے نہ صرف اسمارا بلکہ اس کے ساتھ بیٹھی بڑی بہن عاصمہ نے بھی سنا اور مسکرادیں۔

"ہائیں...... کیا واقعی؟ پہلے تو تم نے کبھی نہیں



بتایا کہ تم کسی شادی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہو۔'' اسمارا نے حیرت سے کہا اور پھر اپنے ہی جملے کو سمجھ کر فوراً درستگی بھی کر دی۔

''میرا مطلب کہ کس کی شادی میں پیدا ہوئی تھیں تم؟''

''اپنی سب سے پیاری خالہ کی شادی میں......'' سوٹ کے ساتھ دوپٹا ٹانک کر دھاگا کاٹتے ہوئے وہ مسکرائی۔

''بس یہ سمجھ لو کہ آنکھ کھولنے سے لے کر اب تک شادیاں ہوتے دیکھ رہی ہوں بلکہ میں تو اپنی شادی بھی کئی دفعہ ہوتی دیکھ چکی ہوں خواب میں۔'' سوٹ کو پلاسٹک کے پیکٹ میں ڈال کر اوپر عاصمہ باجی کی دی گئی رشتے داروں کے نام کی چٹ لگا کر اس نے پیکٹ دائیں طرف رکھا اور دوسرے سوٹ کے ساتھ کے دوپٹے کو سلیقے سے یوں سیٹ کرنے لگی کہ اس کے پلوؤں پر لگی لیس نمایاں نظر آئے۔

''واہ کوکو، تم تو اس کا مطلب ہے بڑی فاسٹ فارورڈ ہو......سب کچھ خواب میں بھی دیکھ لیتی ہو....'' اسمارا نے شرارت سے اسے اپنے کندھے کا ٹہوکا دیا تو وہ شرما کر مسکرانے لگی۔

''کہاں یار، دولہا نہ دیکھا تو کیا دیکھا......جب بھی دولہا میرے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنے لگتا ہے امی فوراً سے آکر مجھے جگا دیتی ہیں۔'' کوکو نے بات کرتے ہوئے ایسے منہ بنایا جیسے حلیم کھانے کے دوران اچانک سے منہ میں ہڈی آ گئی ہو۔

''کتنی دفعہ امی نے میری شادی ہوتے ہوئے رکوائی ہے قسم سے۔ اب انہیں کون بتائے کہ خواب میں دولہا ساتھ آکر بیٹھے اور دلہن اسے دیکھ بھی نہ پائے تو یہ دکھ اس دکھ سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے کہ بندہ سارا دن کام کاج کر کے گھر پر آنے کے بعد بریانی کی امید لیے دیگچا کھولے تو سامنے سے ٹنڈا آپ کو ''آداب عرض ہے'' کہہ کر شوخی سے گول مول ہوتا دکھائی دے۔''

کوکو کی اس دکھ بھری مثال پر اسمارا کے ساتھ، ساتھ عاصمہ باجی بھی برداشت کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود ہنسنے لگی تھیں۔

''ہاہ......عاصمہ باجی آپ نے بھی سن لیا کیا؟'' دوپٹے کو سیٹ کر کے چاروں طرف دو، دو ٹانکے لگانے کے ساتھ، ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ ان کے ہنسنے کی آواز پر چونکی تھی۔

''نہیں، میں تو اپنے کام میں لگی ہوئی ہوں لیکن پھر بھی ایک بات ضرور کہوں گی۔'' اسمارا کے سسرالی رشتے داروں کے نام مختلف رنگین پرچیوں پر خوش خط لکھنے کے دوران انہوں نے مارکر روکا اور اس پر ڈھکن چڑھا کر بولیں۔

''شادی تو ایک ایسا لڈو ہے جسے کھانے والے بھی پچھتاتے ہیں اور نہ کھانے والے بھی۔''

''اگر یہ طے ہے عاصمہ باجی کہ پچھتانا ہی ہے تو کیوں نہ بندہ کھا کر ہی پچھتائے......کم از کم کوئی حسرت، کوئی خواہش، کوئی ارمان تو نہ رہے دل کا......کیوں اسمارا......؟''

''پچھتانے کا تو نہیں باجی، میں نے تو نہ کھانے والوں کے للچانے کے بارے میں ضرور سنا ہے۔''

''پچھتانا ہے یا للچانا......جو کچھ بھی ہے لیکن یہ لڈو تو بس کھانا ہی کھانا ہے۔'' کوکو نے قینچی کے بجائے دانتوں سے دھاگا کاٹا اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اسی دوران اسمارا کے کزن نے آکر بتایا کہ ارمغان بھائی اسے لینے آ چکے ہیں۔ سو وہ الوداعی کلمات لکھنے کے بعد دوبارہ ملنے کی یقین دہانی کر کے اٹھ گئی۔

☆☆☆

نام تو اس کا کوکب تھا لیکن اب شاید اس کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے تھے کیونکہ چھوٹے، بڑے سبھی اسے کوکو ہی کہہ کر بلاتے۔ تین چچا، تایا اپنی فیملیز کے ساتھ اسی بڑے سے گھر میں رہائش پزیر تھے۔ جس میں کوکو اپنے امی، ابو کے ساتھ رہتی تھی۔ اکلوتی تو تھی مگر گھر میں موجود دوسرے کزنز کی وجہ سے کبھی اکلوتا ہونے کا خیال تک نہ آتا۔ اور پھر گو کہ سب کے بچے

اب جوان ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود اس قدر اتفاق تھا کہ باہر سے آنے والے کسی اجنبی کو اندازہ ہی نہ ہو پاتا کہ کون سا پورشن کس کا ہے اور کون سا بچہ کس پورشن میں رہتا ہے۔

کوکو کی امی جس طرح گھر میں ہونے والے ہر شادی بیاہ میں پیش، پیش رہتیں...... اسی طرح کوکو بھی ہر کام بڑھ چڑھ کر کرنے کی کوشش کرتی...... ویسے بھی کوکو کا چونکہ اپنا تو بہن، بھائی کوئی تھا نہیں، اس لیے ہمیشہ ہی اس کا شمار ان بچوں میں ہوتا جو بڑوں کے درمیان صرف اور صرف باتیں سننے کی غرض سے بیٹھا کرتے ہیں۔ اور سب بڑوں کے ساتھ بیٹھ کر اسے خود کو بڑا سمجھنے میں جو لطف آتا وہ ہی اس کی ریاضت کا حاصل ہوتا۔ اپنے سے بڑی کزنز کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کے تمام کیے گئے چھوٹے بڑے کام یوں نبٹاتی کہ اس کی پھرتی کی تعریف اس کا حق ٹھہرتی۔

صورت شکل بھی خوب تھی، عادات و اطوار بھی بہترین تھے اور بات چیت کا ڈھنگ بھی خوب تھا سو جیسے ہی ماں کے قد برابر پہنچی ہر ایک کی زبان پر اسی کا تذکرہ...... سب کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش نظر آنے لگی۔ چڑیا کی طرح یہاں وہاں اڑتی پھرتی، اپنی موہنی صورت اور خوب صورت باتوں سے سبھی کے دل میں گھر کر لیتی اور پھر آہستہ، آہستہ اس کی ہم عمر تمام کزنز کی بھی ایک، ایک کر کے شادیاں ہونے لگیں۔ جھلملاتے ملبوسات، جدید طرز کے جوتے، چمکتے کانچ، بیش قیمت جیولری اور سب سے بڑھ کر شادی کے بعد کی ملاقاتوں میں کی گئی اُن کی باتیں......

''اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے کہ اگر کچھ دیر زیادہ سولوں ناں تو گھبرا جاتے ہیں...... آس پاس ٹہلتے رہتے ہیں کہ میں کب اٹھوں گی...... شام کو آفس سے واپسی پر میرے لیے موتیے کے گجرے لا کر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیتے ہیں اور جب میں کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آتی ہوں تو خود پہناتے ہیں......'' سندس بڑی ادا سے کھی، کھی کرتے ہوئے بتاتی تو کوکو اپنی آنکھیں پھیلا کر پوچھتی۔

''تمہاری ساس نندیں کچھ نہیں کہتیں انہیں کہ تمہیں جگائیں...... یا یہ کہ روز ہی کیوں لے آتے ہو گجرے......''

''بھئی میں نے...... نہ تو خود ساس، نندوں کو کبھی اتنی لفٹ کروائی ہے اور نہ انہیں کروانے دی ہے۔ پتا ہے کوکو، شادی کے شروع، شروع میں ہی سسرالیوں کو جیسا ٹریٹ کرو ناں وہ اسی کے عادی ہو جاتے ہیں...... اور جہاں تک رہی بات گجروں کی تو وہ اُن کے سامنے تھوڑی ہی لاتے ہیں۔''

''سامنے نہیں لاتے؟'' کیا گھر والوں سے چھپا کر بھی کچھ لایا جا سکتا تھا، یہ انکشاف کوکو کے لیے بالکل ہی منفرد اور نیا تھا۔

''تو اور کیا...... سامنے لائیں تو پھر تو سب کے لیے لانا پڑتا ہے ناں۔''

''لیکن سندس، ہمارے گھر میں تو کبھی کسی نے یہ سب نہیں کیا جو تم بتا رہی ہو...... پھر تم نے کہاں سے سیکھا؟''

''ہمارے گھر کی چچی، تائیاں پچھلے زمانوں کی ہیں جو ہر وقت گھر میں اتفاق قائم رکھنے میں ہلکان رہیں۔ ہمیشہ سے مل کر کھانے کو فوقیت دی...... لیکن آج کل یہ سب ممکن نہیں ہے بھئی، اپنا میاں اور اپنا گھر بس......'' بات ختم کر کے وہ اپنے جوتے کے ساتھ میچ کرتا سبز رنگ کا پرس اٹھائے کمرے میں چلی گئی۔ مگر کوکو سوچ رہی تھی کہ سسرال اور سسرالی رشتے دار تو پچھلے زمانوں میں بھی تھے۔ پھر سندس نے ایسا کیوں کہا۔

کومل شادی کے بعد شروع، شروع میں میکے آتی تو شوہر کی بات کرنے سے پہلے ہی شرم سے دہری ہوئی جاتی۔ اس کے سامنے صرف ان کا ذکر چھیڑنے کی ضرورت ہوتی۔ بس پھر تو جو پھلجھڑیاں اس کے چہرے پر پھوٹتیں تو رخسار تک سرخ ہو کر دہکنے لگتے۔ سسرال میں گو کہ نندیں اور دیور بھی تھے مگر اس کے شوہر نامدار کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے بیچ محفل میں ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں جو گفتگو کیا کرتے تو

کھسکا کر بھی یا تو خود وہاں سے اٹھ جاتے اور یا کسی بہانے سے ان دونوں کو وہاں سے اٹھا دیتے۔

"سچی کیا بتاؤں، ان چند دنوں میں ہی مجھ پر جان چھڑکنے لگے ہیں، خواہ مخواہ سب نے ڈرا دیا تھا کہ شادی کے بعد زندگی مشکل ہو گی، یہ ہو گا وہ ہو گا...... قسم سے اگر شادی کے بعد اتنی محبت کرنے والا شوہر مل جائے ناں تو زندگی میں اس سے خوب صورت کوئی چیز ہی نہیں۔" وہ سر جھکا کر مسکراتی تو عروسہ اس کی پسلیوں میں عقب سے گدگدی کرتے ہوئے چھیڑتی۔

"اوئے ہوئے کومل...... یعنی تمہاری تو اتنی زندگی جو شادی کے بغیر گزری ضائع ہی ہو گئی ناں......" عروسہ کی بات پر کومل کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی ساری کزنز بے ساختہ ہنسنے لگتیں...... اور وہ خود جھینپ کر اپنے لمبے ناخنوں (جو اس نے خاص طور پر شادی کے لیے بڑھائے تھے) پر نظریں گاڑ دیتی...... اور پھر یہی نہیں بلکہ ہنی مون کی غرض سے اس کے دولھا نے کومل کو کاغان، سوات اور خاص طور پر جھیل سیف الملوک دکھانے کی تیاریاں شروع کیں تو کوکو کے ذہن میں شادی کے بعد کی زندگی کے کچے پکے بنتے اسکیچ میں کچھ سطریں اور حاشیے واضح طور پر ابھرنے لگے۔

وہ دونوں میاں، بیوی اکثر شام میں باہر گزارتے، کسی اچھی سی جگہ پر کھانا کھاتے، سینما جا کر فلم کا لیٹ نائٹ شو دیکھنے اور واپسی پر آئس کریم کھاتے ہوئے گھر آتے تو اس وقت تک سب سو چکے ہوتے۔ پتا نہیں شادی کے اوائل روز کی وجہ سے ذرا رعایت برتی جا رہی تھی یا ویسے ہی سسرال میں کوئی روک ٹوک کرنے والے مزاج کا نہیں تھا۔ خیر جو بھی تھا فی الحال اس کی زندگی کا جو دور گزر رہا تھا وہ مکمل طور پر افسانوی تھا۔

پھر کوکو، لائبہ کے ولیمے پر اس کی سسرال پہنچی تو نظارہ ہی خیرہ کن تھا۔

لائبہ نے اپنے شوہر صاحب کی فرمائش پر ولیمے کے روز آنے والی بیوٹیشن کو انکار کروا دیا تھا اور خود اپنا چھ ماہ کا کیا گیا میک اپ کا ڈپلومہ استعمال میں لاتے ہوئے آئینے کے سامنے اسٹول پر بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔ دروازہ معمولی سا کھلا دیکھ کر کوکو ہلکی سی دستک دے کر اجازت ملنے پر اندر داخل ہوئی تو دولھا بھائی خود ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے کبھی جوڑے کے لیے پنیں پکڑاتے تو کبھی آئی مسکارے اور آئی لائنر وغیرہ کے ڈھکن کھول کر دیتے۔

دونوں نے بڑی خوش دلی سے اسے ویلکم کہا اور پھر اسے مخاطب کر کے ایک دوسرے پر شوخ جملے اچھالنے لگے۔ کوکو، کو لائبہ کا شوہر بہت پسند آیا تھا۔ زندہ دل، خوش مزاج اور دوست جیسا...... کبھی وہ دونوں کمرے میں اکیلے بیٹھنے یا کمرے کو لاک کرنے کو پسند نہ کرتے...... وہ دونوں ہی شاید کھلی فضاؤں کے پرندے تھے جو ایسی جگہ بیٹھتے جہاں محفل ہو یہی وجہ تھی کہ سبھی ان کی سنگت میں خوشی محسوس کرتے۔ ان دونوں کے لیے جلوت میں بھی خلوت کا سماں ہوتا۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں بھی ہر طرف عشق ہی عشق کی حکومت ہوتی، ایسا عشق جو نہ لمس کا محتاج ہوتا ہے نہ بوسے کا...... دونوں ایک دوسرے کے دلوں پر راج کرنے لگے تھے مگر انداز ایسا تھا کہ گھر میں موجود تمام لوگوں کو بھی محبت کی اس راجدھانی میں مکمل شراکت دی گئی تھی۔

اور پھر باری باری عروسہ، مریم، سلویٰ وغیرہ سب اپنے، اپنے پیا کو پیاری ہوئیں، گھر میں بہوؤں کا بھی اضافہ ہوا۔ ان کے سامنے تو کوکو ظاہر ہے کہ ان معاملات میں جھجک محسوس کرتی لیکن تمام کزنز جن کی شادیاں ہوتیں وہ اپنے نئے نویلے تجربات اور سسرالیوں کے محبت بھرے رویوں اور چاؤ چونچلوں کو ضرور اس طریقے سے بیان کرتیں کہ کوکو کی آنکھوں میں بھی خواب سجنے لگتے۔ بیٹیوں کے معاملے میں اب تک اس گھر کے نصیب بہت اعلیٰ ثابت ہوئے تھے اور وہ بھی یوں کہ سبھی اپنی شادی شدہ زندگی سے مکمل طور پر مطمئن نظر آتیں۔

اور آخر کار کوکو کے والدین نے بھی اس کی شادی

کے بارے میں سوچنا شروع کیا...... تو سب سے پہلے بڑے تایا ہی اپنے بیٹے ارمغان کا رشتہ لیے اپنے پورشن سے ان کے پورشن میں جا پہنچے...... ویسے بھی اس کی ارمغان سے بے حد دوستی بھی تھی۔ وہ بھی یونیورسٹی سے تھکا ہوا آتا تو اپنی بہنوں کے بجائے کوکو، کو ہی پکارتا، اس کا ماننا تھا کہ صرف کوکو کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے ہی اس کی تھکن دور کرسکتی ہے۔ گرمیوں میں جب شام کے وقت مل کر آم چوسے جا رہے ہوتے تو پھر وہ آم جو کوکو کی نظر میں میٹھا ہوتا وہ فوراً ارمغان کو دے دیتی، اسی طرح ارمغان بھی کسی آم کو بہت میٹھا خیال کرتا تو فوراً اس کی طرف اچھال دیتا۔ جسے وہ بڑے فخر سے کیچ کرتی اور آم کھا کر ہاتھ دھونے کے بعد دودھ اور پانی ایک مقررہ مقدار میں ملا کر کچی لسی بناتی اس میں برف ڈالتی اور سب سے پہلے گلاس اور جگ لے جا کر ارمغان کے پاس جا کھڑی ہوتی۔ اس کی فیورٹ چیزیں بناتی، ساری باتیں شیئر کرتی، وہ بھی ہر عید تہوار پر اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب سب کزنز رات کو ایک ساتھ بیٹھ کر گپیں مارتے تو ہمیشہ آخر میں بچ جانے والے وہی دو ہوا کرتے تھے۔ کوکو کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ اپنے کالج کی باتیں، گھر کی باتیں، کچھ کر گزرنے کے خواب اور مستقبل کی منصوبہ بندی...... وہ ایک، ایک بات ارمغان سے ڈسکس کیا کرتی تھی...... اور یہی تمام وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر سبھی انہیں مستقبل کے ایک خوب صورت کپل کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ ان سب چیزوں اور تمام گھر والوں کے خیالات سے اگر کوئی ناواقف تھا تو وہ صرف اور صرف کوکو ہی تھی۔ اسی لیے جب اس رات اس کے سامنے ارمغان کے گھر والوں کی طرف سے رشتہ مانگنے کی بات امی نے اپنی طرف سے گرین سگنل ظاہر کرنے کے ساتھ رکھی تو کوکو کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ میں آج تک انہیں ارمغان بھائی کہتی آئی ہوں۔“

”ہاں تو کیا ہوا، خاندان کے لڑکوں کو تو شادی سے پہلے سب لڑکیاں بھائی ہی کہتی ہیں۔“ امی نے مسکراتے ہوئے اس کا عذر رد کیا۔

”لیکن وہ میرے بھائی جیسے ہیں۔“

”بھائی جیسے ہونے اور بھائی ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے بیٹا اور بھائی صرف اور صرف وہی ہوتا ہے جو ماں نے جنم دیا ہو...... اس کے علاوہ بننے والے تمام بھائیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔“

”ارے واہ، کیسے نہیں ہوتی حیثیت......؟ پھر شروع سے خاندان کی لڑکیوں کو اس بات کا کیوں عادی بنایا جاتا ہے کہ سب کزنز کو بھائی ہی کہنا ہے؟ کیا صرف نام لینے سے عزت نہیں کی جاسکتی؟ فاصلہ نہیں رکھا جاسکتا...... بتائیں ذرا مذہب کی کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ لڑکیوں کے ذہن میں محرم، نامحرم کا تصور واضح کرنے کے بجائے ان کی زبان پر بھائی کا ورد پکا کردو اور پھر جب چاہے کہو کہ وہ تمہارا بھائی نہیں ہے...... اس سے تو اب تمہاری شادی ہونے والی ہے۔“ کوکو تلخ ہو چکی تھی۔

”اس کا تو صاف مطلب یہ ہوا ناں کہ ہمارے بڑے اولاد کے معاملے میں بے یقینی یا بداعتمادی بلکہ کسی انجانے خوف کے زیرِ اثر خاندان کے ہر لڑکے کو بھائی کہلوا کر نفس کو سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دیتے رہتے ہیں۔“ وہ عجب انداز سے سوچ رہی تھی۔

”پاگل مت بنو کوکو، یہ سب ایک فضول بحث ہے۔“ انہیں کوکو کے اس قدر سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

”تم پاکستان میں رہتی ہو جہاں ہر رشتے کی ایک اہمیت اور عمر کے لحاظ سے ہر شخص کی عزت ہوتی ہے اور اسے انہی پیمانوں میں رکھ کر مخاطب کیا جاتا ہے...... جو باتیں تم کر رہی ہو ناں...... وہ سب یورپ میں ہوتا ہوگا کہ جب دل چاہا ماں، باپ کو بھی ان کے ہی نام سے ہیری میری کہہ کر پکار لیا۔“

”جو کچھ بھی ہے اور جیسے بھی ہے...... لیکن ارمغان بھائی میرے لیے نہ صرف بھائی جیسے بلکہ بھائی

ہیں اور اگر آپ نے اس معاملے میں زبردستی کی تو میں پھر بھی آپ کی بات نہیں مانوں گی۔'' اس کی موٹی، موٹی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ امی کا دل بھی پسیجا اور قریب تھا کہ آگے بڑھ کر اسے ممتا بھری آغوش میں لے لیتیں۔ دل کے کسی کونے سے یہ خیال ابھرا کہ ایسا کرنے سے کوکو کے موقف کو تقویت مل جائے گی، اس لیے چہرے پر ناراضی کے تاثرات لیے وہاں سے چلی گئیں۔

کوکو کے لیے وہ وقت بہت مشکل تھا۔ جب بھی ارمغان کا تصور ذہن میں اترتا ساتھ ہی اس کے ساتھ اپنی والہانہ محبت دل میں سر اٹھاتی محسوس ہوتی۔ لیکن یہ وہ محبت نہیں تھی جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو پانے اور ایک ہونے کی خواہش کی جاتی بلکہ یہ تو وہ جذبات تھے جو ایک بہن کے دل میں اپنے بھائی کے لیے ہوسکتے ہیں۔ باہر حسب معمول چہل پہل تھی بچوں، بڑوں کی ملی جلی آوازیں اس کے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب وہ اپنے دل کے علاوہ اور کسی کی آواز نہیں سننا چاہتی تھی۔ باہر سے آتی یہ چیاؤں پیاؤں اسے ایک اذیت کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں اس سے پہلے کہ وہ چھت پر جاتی، ابا کمرے میں داخل ہوئے۔

جھکی ہوئی نظریں، سمٹے کندھے اور ٹھہری ہوئی چال......

''کہیں جارہی ہو؟'' مختصر سا سوال کر کے انہوں نے کوکو کی اسٹڈی ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی اپنی طرف سرکائی اور اس پر بیٹھ گئے۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ کوکو سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔

''جی وہ بس ذرا چھت پر جارہی تھی۔'' وہ بھی واپس پلٹ کر اُن کے سامنے ہی بیڈ پر ٹک گئی اور سر جھکا کر انگلیاں مسلنے لگی۔

''تم ہماری اکلوتی اولاد ہو بیٹا...... اور ہمیں تم سے بے حد امیدیں وابستہ ہیں۔'' وہ سمجھ تو گئی تھی کہ ابا اسی معاملے پر اس سے بات کرنے آئے ہیں مگر تمہید نے مزید یقین پختہ کردیا۔

''تمہاری ماں کے ہوتے ہوئے مجھے تم سے اس موضوع پر بات کرنا ذرا معیوب تو محسوس ہو رہا ہے لیکن اس سے پہلے بھی ہم باپ بیٹی ہر طرح کے معاملات ایک دوسرے سے ڈسکس کرتے آئے ہیں اور اسی لیے میں تمہیں سمجھانا بھی چاہتا ہوں۔''

''جی ابا......''

''بیٹا والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے لیکن بیٹوں کا تو پھر ممکن ہوسکتا ہے لیکن بیٹیوں کو ایک روز ضرور والدین کو چھوڑ کر نیا گھر آباد کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر کسی طور پر ممکن ہو کہ بیٹی شادی کے بعد بھی اسی گھر میں اسی طرح نظروں کے سامنے رہے تو بتاؤ کہ کیا اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہے؟'' انہوں نے کوکو کے چہرے پر پھیلے اضطراب کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ سورج باہر غروب نہیں ہوا بلکہ یہ منظر تو کوکو کے چہرے پر ہے۔

''نہیں ابا، اس میں کوئی بھی غلط بات نہیں ہے۔''

''تو پھر میری جان، ارمغان جیسے آئیڈیل رشتے کے لیے ہاں نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟''

''ابا......'' کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ حتمی انداز میں بولی۔

''ایک ایسا برتن جس میں آپ بڑے شوق، محبت اور عقیدت سے کئی برسوں سے اپنی مرغوب اشیا کھاتے آئے ہوں، کیا دل چاہے گا کہ اسی میں کسی جانور کی تواضع کریں یا اپنے ساتھ شامل کریں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کھل کر اور ایک دوست سمجھ کر بات کرو بیٹا۔'' ابا نے اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں کہا کیونکہ وہ یقینی طور پر اس کی بات نہیں سمجھ پائے تھے۔

''میرا اور ارمغان بھائی کا آج تک کا تعلق کسی بھی قسم کے جذبات سے ہٹ کر محبت اور عقیدت کا ہے۔ وہ محبت جو بہن، بھائیوں میں ہوتی ہے ابا...... اور یہ میرے لیے کس طرح ممکن ہے کہ میں ان پاکیزہ خیالات......'' وہ کچھ دیر چپ رہی۔

''ان خالص اور معصوم رشتوں میں ازدواجی زندگی کی ملاوٹ کر کے مجھے اپنے نفس اور جانور میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔'' اس نے بہ مشکل جملہ پورا کیا۔

''ہوں......'' ابا نے ایک نئے رخ پر سوچنا شروع کیا۔

''اور پھر آپ سوچیں ناں، ارمغان بھائی بھی تو مجھے اپنی بہنوں کی جگہ دیتے ہیں، میرے اسکول جانے کے زمانے میں جب امی کو ٹائیفائڈ ہوگیا تھا تو کتنا عرصہ مجھے تیار کر کے اسکول بھیجا کرتے تھے، میرے جوتوں کے تسمے باندھنا، بالوں کی چوٹی بنانا اور بیگ میں لنچ بکس رکھنا انہی کی تو ڈیوٹی تھی جو وہ امی کی موجودگی میں بڑی باقاعدگی سے انجام دیا کرتے تھے۔ سرخ ربن، بلیک شوز اور وائٹ یونیفارم میں دونوں شولڈرز پر جب تک امی مجھے بیگ نہ پہنا دیا کرتیں وہ خود تیار ہونے کے لیے نہ جاتے......ایسے میں آپ بتائیں کہ کیا میں غلط ہوں؟''

''اگر......تمہیں کوئی اور پسند......؟''

''نہیں بابا، ایسا ہرگز نہیں ہے اور اگر ہوا بھی تو آپ نے اور امی نے مجھے اتنا اعتماد دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کی ہر بات آپ سے شیئر کرسکوں۔'' ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ کر کوکو نے انہیں مکمل طور پر مطمئن کرنا چاہا......مگر اپنے بھائی کو انکار کرنا ابا کے لیے ایک مشکل کام تھا اور انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کون سی بات کو جواز بنا کر ان سے معذرت کریں کیونکہ ایک بات تو طے تھی کہ انہیں اپنی بیٹی کی پسند اور رائے کا بہر حال احترام تھا۔ مگر اب مشکل یہ تھی کہ ارمغان کے والد ذرا سخت طبیعت کے مالک تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف اولاد تھی تو دوسری طرف بھائی اور یہ وقت کسی بھی انسان کے لیے مشکل ترین ہوتا ہے جب ان کے ایک طرف اپنا خون اور دوسری طرف ماں، باپ کا خون موجود ہو اور اکثر اوقات بہن، بھائیوں میں اختلافات شدت ہی تب پکڑتے ہیں جب ان کی اپنی اولادیں جوان ہونے لگیں۔ کچھ دیر وہیں بیٹھ کر سلیپر میں سے نظر آتے پاؤں کی آدھی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے جیسے وہ کسی کشمکش کا شکار رہے اور پھر بغیر کچھ کہے بڑی خاموشی سے اٹھے اور باہر جاتے، جاتے چونک کر ایک پلٹے۔

''کیا ارمغان کے بھی تمہارے لیے یہی جذبات ہیں جو تمہارے ہیں؟'' ان کے سوال پر خود کوکو بھی بری طرح یوں چونکی کہ دفعتاً کھڑی ہوگئی۔

''بھائی صاحب نے رشتہ مانگنے سے پہلے ارمغان سے بھی تو رائے لی ہوگی ناں......اور یقینی طور پر اس کی رضامندی کے بعد ہی یہ بات کی ہوگی۔''

اور تب کوکو، کو بالکل بھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اب وہ کیا کہے کیونکہ اس کے پاس یقینی طور پر اس بات کا کوئی جواب بچا ہی نہیں تھا۔

وسیع و عریض خالی چھت، جسم کو اپنی نرم آغوش میں سمیٹ لینے والی پُرکیف ہوا بظاہر پُرسکون اور ہر حالت میں ساتھ دینے والا آسمان اور ایک دوست کی طرح حالِ دل سننے کا منتظر چاند......کوکو، کو آج بھی کچھ اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہو رہا تھا......مگر اس دل کا کیا کرتی جو آج پہلی مرتبہ ہی اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ جوانی کی چڑھتی فصیل میں پڑنے والی اس دراڑ کے باعث وہ بے حد بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ ارمغان کے تصور کے ساتھ ہی کسی باطل نقش کی تکرار اسے تھکائے دے رہی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ گزرا وقت خیالوں میں یوں اِدھر سے اُدھر اڑتا پھر رہا تھا۔ جیسے بھرپور آندھی میں گندم کے دانے کا ایک آوارہ بیج......

یہی وجہ تھی کہ اسے لگتا کہ اب ان دونوں کے درمیان قائم خوب صورت اور بے لوث رشتے میں بالکل اس طرح کیڑے نمودار ہونے لگے ہیں جیسے ایک پکے ہوئے خوب صورت امرود میں پیدا ہو جاتے ہیں باوجود اس کے کہ اس میں قصوروار نہ تو امرود ہوتا ہے نہ اس کی نشوونما کرنے والا......لیکن زندگی میں

رونما ہونے والا ہر واقعہ کسی دلیل، منطق یا جواب دہی کی فکر سے آزاد بس ہونے کا ہی بتا رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ مستقبل کے انجانے خوف سے اندر ہی اندر یوں دہک رہی تھی جیسے فاسفورس ٹھنڈی آگ میں روشن رہتا ہے۔

رہ، رہ کر اسے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ اگر نوجوان ہونے کے بعد یونہی سارے رشتے گڈ مڈ کرنے تھے تو پھر شروع سے ہی ارمغان بھائی کا تصور ایک بھائی کی حیثیت سے اس کے دماغ میں کیوں بٹھایا گیا؟ کیا کزنز کو صرف کزنز ہی کی حیثیت اور اہمیت دینا کافی نہیں ہوتا جو خاندانوں میں اور خاص طور پر جوائنٹ فیملیز میں، میل، فی میلز کزنز کو نوجوانی کی سرحد کے عین اس پار اس قدر اپنائیت بھرا رشتہ بنا دیا جاتا ہے کہ محرم اور نامحرم رشتوں کی پہچان باقی ہی نہیں رہتی۔ کوکو نے تو پھر ارمغان کو ایک بھائی کے روپ میں دیکھا اور سمجھا تھا تو یہ بات الگ تھی لیکن اگر آج کل کے ماحول، میڈیا کے منفی اثرات اور کسی بھی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر احساسات بدل جائیں ایک نقطے کے فرق سے محرم، مجرم اور مجرم، محرم قرار پائے تو ذمے دار کون ہوگا؟

''تو کیا یہ میرے امی، ابا کا فرض نہیں تھا کہ ہم میں ایک مناسب فاصلہ رکھا جاتا تاکہ میں انہیں اپنے عزیز از جان بھائی کا درجہ دے کر ان سے اس قدر عقیدت نہ رکھتی اور خاموشی بلکہ ہنسی، خوشی ان کی رضا کے سامنے سر جھکا دیتی۔'' کوکو نے عجیب جھنجلاہٹ کے عالم میں سوچتے ہوئے رخ موڑا تو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ارمغان بھائی کا سر نظر آنے لگا اور پھر وہ خود بھی چھت پر آموجود ہوئے اور بڑے تشویش بھرے انداز میں اس کی طرف بڑھے۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خود لپک کر اُن کے پاس جاتی اور ایک، ایک بات مکمل تفصیل سے بتاتی، ڈسکس کرتی لیکن آج معاملہ انہی کی ذات سے متعلق تھا سو جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ نظریں البتہ ان کے چہرے سے ہٹ کر اب نیچے کی طرف مرکوز تھیں...... وہ چلتے، چلتے اس کی طرف آئے اور ایک مناسب فاصلہ رکھ کر رک گئے۔ چند لمحے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولے۔

''کیا بات ہے کوکو؟ اتنی اجنبی تو تم پہلے کبھی نہیں لگیں؟''

ارمغان بھائی کا لہجہ اس قدر اپنائیت لیے ہوئے تھا کہ اس کا دل چاہا ان کے سامنے رو دے۔ وہ کچھ بھی نہ کہے اور بہتے ہوئے آنسو اس کی ایک، ایک الجھن، پریشانی اور وہم مکمل تفصیل سے بیان کردیں...... لیکن وہ روئی نہیں بلکہ چپ چاپ اپنی سابقہ حالت میں جہاں تھی وہیں اور ویسے ہی کھڑی رہی۔

''کیا ہوا ہے جذباتی لڑکی؟ کچھ بولوگی بھی کہ نہیں۔'' انہوں نے اس کی ناک پکڑ کر شرارت سے پوچھا لیکن نہ تو پہلے کی طرح کوکو نے شوخی سے ہنستے ہوئے کوئی جواب دیا نہ پیچھے ہٹی...... بس خاموش، خاموش آنکھوں سے ارمغان کو دیکھتی رہی۔ تبھی انہیں بھی معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ انہیں لگا کہ کوکو کا چنبیلی جیسا رنگ اب ایسا ہوگیا تھا۔ جیسے چینی کے برتن کو مسلسل دھوئیں میں رکھ دیا گیا ہو...... یا ٹھنڈے جھٹ پٹے میں کوئلوں کی کوک دھیرے، دھیرے مدھم پڑتی جاتی ہو۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟'' نہ تمہید نہ سوچ بچار...... کوکو نے براہِ راست سوال کر ڈالا تو ارمغان بھائی نے لمحہ بھر چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر سر پر تنے گہرے سیاہ آسمان پر موجود درانتی کی شکل کے چاند کو دیکھنے لگے...... لیکن کوکو انہیں مزید وقت دینے پر اس لیے بھی تیار نہیں تھی کہ لمحہ بہ لمحہ اس کے اندر موجود خلفشار بڑھنے لگا تھا جبھی اپنے سے لمبے ارمغان بھائی کا کندھا جھنجھوڑ دیا۔

''بتائیں ناں...... کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے ارمغان بھائی؟''

''ہاں کوکو...... اس میں بھلا شک کی کیا گنجائش

ہے؟ اور تمہیں پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟''

''میں اس محبت کا پوچھ رہی ہوں، جس میں ایک دوسرے کو پالینے کی خواہش بھی ہوتی ہے، جس میں ایک دوسرے کی یاد میں آہیں بھری جاتی ہیں اور جو...... اور جو بہن، بھائی کی محبت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔''

سمجھ تو وہ بھی گئے تھے کہ آخر وہ پوچھنا کیا چاہ رہی ہے لیکن پہلو بچانے کی جو دانستہ کوشش کی تو وہ کوکو نے کامیاب نہ ہونے دی اور بات کو مزید واضح کر دیا۔

''تایا ابو میرے لیے آپ کا رشتہ لائے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے لیکن آپ خود سوچیں ناں ہم بہن، بھائی نہ سہی لیکن...... لیکن ہم دونوں اچھے دوست تو ہیں ناں، ایسے دوست جن سے ایک دوسرے کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہیں ہے۔ جو خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ جاتے ہیں اور جو دنیا کے تمام تر موضوعات پر آپس میں گھنٹوں باتیں کر سکتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میاں، بیوی میں دوستی نہیں ہوتی؟ آئی مین کیا میاں، بیوی دوست یا دوست میاں، بیوی نہیں بن سکتے کوکو؟'' ان کی بات پر کوکو نے بری طرح چونکتے ہوئے انہیں دیکھا۔ یعنی ابا کی بات درست تھی اور اگر تایا ابو اُن کے گھر رشتہ لے کر باضابطہ طور پر آنا چاہ رہے تھے تو یہ سب ارمغان کی مرضی سے ہو رہا تھا۔

''یعنی آپ بھی......؟''

''دیکھو کوکو بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں اور تم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پھر خاندان میں شادی ہونے کا سب سے بڑا فائدہ ہی یہ ہوتا ہے کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے مزاج کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں، گھر والوں کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، انہیں ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے میں بھی مسئلہ نہیں ہوتا اور پھر خاندان کے بڑے بھی مزید قریب ہو جاتے ہیں۔'' ارمغان نے اپنے حق میں دلائل دینے کی ابتدا کی۔

''بالکل ٹھیک کہا...... اور پھر یہی لڑکا اور لڑکی جب آپس میں کسی وجہ سے نباہ نہیں کر پاتے تو خاندان کے بڑے اس حد تک دور ہو جاتے ہیں کہ پھر زندگی میں ایک دوسرے سے ملنا تو دور کی بات مرنے کے بعد ایک دوسرے کا منہ بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔'' کوکو بولی تو اس قدر سخت لہجے میں کہ خود ارمغان حیران رہ گئے کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان یوں تلخی آئی ہو۔ ورنہ وہ تو اس کوکو، کو جانتے تھے جو باتیں کرنے پر آتی تو مسلسل کچے آموں کی طرح، چھوٹی، چھوٹی کچی کیریوں جیسی کچی، کچی مگر مزیدار باتیں کرتی ہی چلی جاتی۔ مگر اب جس سوالیہ انداز میں وہ ارمغان کی طرف دیکھ رہی تھی انہیں لگتا گویا چھتنارے درخت تلے پرانے ٹھنڈے کنویں کی منڈیر پر بیٹھی مجسم اداسی کی آنکھیں ان کے چہرے پر جمی ہوں وہ کیا کہتے اور کیسے سمجھاتے؟ کیونکہ کوکو کا ردِعمل اس قدر شدید ہونے کی توقع تو انہوں نے کی ہی نہیں تھی۔

انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ جو کوکو، کو دوسری تمام لڑکیوں کی طرح سمجھ بیٹھے تھے یہ ان کی بہت بڑی بھول تھی...... اور وہ جو اتنے تمام برس ایک گھر میں رہتے ہوئے اپنے تئیں اسے مکمل سمجھنے کا دعویٰ رکھتے تھے، وہ اپنے دعوے میں کس قدر خام تھے۔ وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ صنفِ نازک کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہوتا جو چاہے تو صرف محبت کے ایک لمحے کی قیدی بن کر اپنی تمام عمر من مندر میں موجود اسی دیوتا کو پوجتے ہوئے داسی بن کر گزار دے اور نہ چاہے تو تمام عمر کسی کی داسی بنی رہنے کے باوجود بھی اسے ایک لمحہ بھی محبت کا نہ دے۔

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو کوکو...... میری جان سب ٹھیک ہو جائے گا...... سب کچھ۔'' انہوں نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔ خیال تھا کہ کوکو ان سے متفق ہو جائے گی اور اپنی تمام عمر کو اس بچپنے کی نذر نہیں کرے گی۔ لیکن کوکو نے اسی لمحے انہیں خود سے

دور کر دیا...... اور جن نظروں سے اسے دیکھا ارمغان کو لگا جیسے اس لمحے اگر کوکو کا مان ٹوٹ گیا تو شاید وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر پائیں گے۔ وہ لمحہ خود اپنے جذبات کی قید سے بھاگ نکلنے کا تھا۔ وہ لمحہ شاید ہجرت کا تھا جب ارمغان کو اپنی محبت کے سامنے سچے جذبات پر جھوٹا خول چڑھانا تھا۔

اس بوجھل اور اداس ماحول سے آزادی کے لیے آسمان کھلا تھا اور پر مضبوط...... اور تب انہوں نے کوکو کی محبت نہ ملنے کی سزا کے طور پر اس کی دوستی سے بھی ہاتھ دھونا گوارا نہیں کیے اور چاہا کہ اگر اُن کی محبت کی شدت جان کر وہ ہمیشہ ، ہمیشہ کے لیے اُن سے دور ہو جائے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اس پر اپنی محبت ظاہر نہ کر کے کم از کم ایک دوست کی حیثیت سے تو اس کے ساتھ رہیں۔

''پگلی میڈم...... تم بھی ناں سدا پاگل ہی رہو گی رئیلی؟'' لمحہ بھر پہلے کے گمبھیر ماحول کے بعد یوں ارمغان کا دوستانہ انداز اور یوں بے تکلفی سے اس کے سر پر چپت رسید کرنا جیسے اُن کی زندگی میں یہ پچھلا آدھا گھنٹا تو آیا ہی نہیں تھا۔ کوکو نے بڑی ناسمجھی سے دیکھا تو وہ پھر بولے۔

''کمال ہے...... یعنی میں تمہیں تنگ کر رہا تھا، پاگل بنا رہا تھا اور تم ہو کہ بات سمجھ ہی نہیں رہی تھیں ملکہ جذبات۔''

''کیا مطلب......؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا اور آج سے پہلے تو کبھی آپ نے ایسا مذاق نہیں کیا؟'' وہ مکمل طور پر حیران تھی۔

''اس لیے کہ آج سے پہلے تم بھی تو کبھی اس طرح رات کو روتا بسورتا منہ لے کر اکیلی چھت پر نہیں کھڑی ہوئیں...... سوچا آج تم تنگ کر رہی ہو تو ظاہر ہے میں تمہیں کیسے اکیلا چھوڑتا، میں بھی تمہیں تنگ کرنے لگ گیا، ورنہ ٹائم دیکھو محترمہ...... اس وقت تم اپنی کتابیں لے کر میرا سر کھا رہی ہوتی ہو روز۔''

کوکو کے لیے ارمغان کا وہی سابقہ رویہ لوٹ آنا ایسا ہی تھا جیسے سخت حبس میں ایک دم ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگیں۔ ورنہ سہ پہر سے لے کر اب تک وہ جتنا ٹینس رہی تھی اسے لگتا تھا کہ اگر رات بھر مزید یہی کیفیت رہتی تو ضرور اس کے اوسان خطا ہو چکے ہوتے۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں؟''

''پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے تم سے؟'' کوکو کے سامنے زندگی میں پہلی مرتبہ جھوٹ بولنے کے بعد ارمغان نے پوچھا اور ویسے بھی آج تو ابتدا ہوئی تھی ابھی تو جانے کتنے ہی جھوٹ اس ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے بولے جانے تھے۔

''نہیں...... آج سے پہلے تو کبھی نہیں بولا، اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ آپ سب سے اچھے ہیں اور آپ جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''اچھا اب زیادہ مکھن بازی نہ کرو اور نیچے چلو...... پہلے ہی تم سے سر کھپا کر سر میں اتنا درد ہو رہا ہے۔'' سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے ارمغان نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

''سر میں درد؟ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''نہیں، اب تم ہمارے پورشن میں نہ آنا فی الحال...... میں سونا چاہتا ہوں۔'' ان دونوں کو ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے دیکھ کر ابا، اماں اور تایا ابو نے امید بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کو سب بہتر ہونے کا کہہ کر اپنے، اپنے پورشن میں چلے آئے۔

☆☆☆

کوکو، ارمغان کے لیے چائے لے کر جا رہی تھی جب اماں نے اسے روکا۔

''ارمغان بھائی کے سر میں درد ہو رہا ہے، انہیں چائے دینے جا رہی ہوں۔''

''چائے دے کر جلدی آؤ، میں تمہارے کمرے میں انتظار کر رہی ہوں۔'' بات کر کے پلٹتے ہوئے وہ اس کے کمرے کی طرف مڑ گئیں جبکہ وہ خود ارمغان کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر داخل ہوگئی سامنے ہی ارمغان صوفے کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھے تھے۔

بند آنکھوں سے نمی صاف ظاہر تھی وہ حیران ہوئی۔
''آپ رو رہے ہیں؟'' اس کی آواز پر وہ ایک دم چونکے اور آنکھیں کھول دیں۔ سرخ آنکھیں بھیگ کر عجیب سحر انگیز ہو رہی تھیں۔
''بس...... ذرا امی یاد آ رہی تھیں۔'' دونوں آنکھوں کو ہتھیلی سے خشک کرتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ دیکھا تو ناراضی کا اظہار کیا۔
''تمہیں کہا تھا ناں کہ چائے مت لانا۔''
''جی ہاں کہا تو تھا...... لیکن مجھے پتا ہے کہ آپ رات سونے سے پہلے چائے پیتے ہیں، شام کو پینی ہو تو آدھا چمچ چینی کے ساتھ اور اگر رات کو پئیں تو پھیکی......'' چائے کا کپ اس نے سائڈ پر رکھا تو ارمغان سوچنے لگا۔
''یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لڑکی مجھ سے متعلق ہر بات جانتی ہو، میری پسند ناپسند اور مزاج کے بارے میں جسے مجھ سے بھی زیادہ علم ہو...... وہ یہ نہ جان سکی کہ میرے لیے وہ کیا اہمیت رکھتی ہے...... اور میں اسے کس حد تک چاہتا ہوں...... یا میرے ہی جذبات میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کے دل تک پہنچ پاتے اور اپنا آپ منوا لیتے...... کون کہتا ہے کہ صنفِ نازک اپنے اوپر پڑنے والی ہر نظر کا تاثر پہچانتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اب تک کوکو میری آنکھوں میں موجود محبت اور اس محبت کی سچائی کو کیوں نہیں سمجھ سکی؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو......''
''میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔'' کوکو کی آواز نے ارمغان کی سوچ کا تسلسل توڑا...... اس کی آنکھیں مسلسل ارمغان کے چہرے پر موجود تاثرات نوٹ کر رہی تھیں۔
''آنکھیں بھیگ جانے میں اور رونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' شام کی اداسی میں طلوع ہوتے نئے چاند کی طرح مسکراتے ہوئے ارمغان نے چائے کا کپ اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔
کوکو بڑی خاموشی سے سامنے کھڑی اُن کے تاثرات اور الفاظ کا جائزہ لے رہی تھی۔
''کیا لڑکیاں اپنے اوپر پڑنے والی ہر نظر کو سمجھ سکتی ہیں کہ ان پر پڑنے والی کون سی نظر محبت کی اور کون سی ہوس کی؟ یا یوں کہوں کہ کس نظر میں محبت ہے اور کس میں نہیں؟''
''کہتے تو ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔''
''مجھے لگتا ہے کہ یہ مفروضہ کسی صنفِ نازک ہی کی طرف سے مردوں کو ہوشیار کرنے کے لیے مقبولِ عام کیا گیا کہ خبردار...... ہم پر بری نظر نہ ڈالنا ہمیں سب پتا ہے چل جاتا ہے کہ تم ہمیں کس نظر سے دیکھ رہے ہو؟''
''کیا مطلب......؟ میں سمجھی نہیں؟'' کوکو نے اپنے تیکھے کمان سے ابرو سکیڑے تو ارمغان کچھ کہنے کے بجائے شاید الفاظ کا چناؤ کرنے لگے۔ کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ اب ان دونوں کے درمیان لامحدود فاصلے تھے اور سب سے بڑا حجاب وہ تھا جو آج رات چھت پر لاشعوری طور پر کوکو، کو گلے لگانے اور لمحہ بھر سے بھی پہلے اس کا خود کو الگ کر دینے سے پیدا ہو گیا تھا۔ سو اب بھی وہ چپ چاپ دم سادھے اسے دیکھتے رہے اور منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔ یعنی وہ بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھے تو تھے لیکن بندوق داغنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ یوں بھی کچھ دیر پہلے اچانک ہی لبلبی پر بوجھ پڑ جانے سے پیدا ہونے والے ردِعمل کی ایک جھلک تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔ ہاتھ میں موجود کپ کا احساس ہوا تو ایک اور گھونٹ لے کر بولے۔
''میرا مطلب سادہ سا ہے اگر لڑکیاں اپنے اوپر پڑنے والی ہر نظر کے احساس سے واقف ہوتی ہیں تو پھر محبت میں دھوکا کیسے کھا جاتی ہیں، اس وقت انہیں کیسے پتا نہیں چلتا کہ سامنے والا واقعی اُن سے محبت کر رہا ہے یا بس محبت جتا رہا ہے۔''
''وہ اس لیے کہ اس وقت ان کی آنکھوں پر بھی محبت کی پٹی بندھی ہوتی ہے اور انہیں اپنے چاروں طرف محبت ہی محبت دکھائی دیتی ہے...... اور جب کسی کو محبت ہو جائے تو پھر بھلا کیا دوش، وہ تو کسی سے بھی

ہو سکتی ہے۔''

''تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے آج تک......؟'' چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ دل کسی بھی طرح کی رقابت جھیلنے کو مکمل طور پر تیار ہوا اور دماغ نے بھی کسی طرح کا ردِ عمل ظاہر نہیں ہونے کی یقین دہانی کروائی۔

''اوں ہوں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''شادی سے پہلے کی محبت آٹے میں موجود خمیر کی طرح ہوتی ہے جسے اگر مناسب وقت پر اس کا درست مقام نہ ملے تو پھر وہ کسی کام کی نہیں رہتی، خمیر زدہ آٹے کی طرح بُو چھوڑنے لگتی ہے اور آخر کار اسے اپنے دل سے پھینکنا پڑتا ہے...... جبکہ میں شادی کے بعد اپنے ''ان'' سے محبت کروں گی اور ایسی محبت کروں گی کہ ''وہ دنیا بھلا دیں گے میری چاہت میں......''

گانے کے بول میں اپنی ہی مرضی کا ردو بدل کر کے گنگناتے ہوئے وہ ہنستے، ہنستے شرمانے لگی تھی۔ یہ انداز ارمغان کے لیے بالکل منفرد اور انوکھا تھا کیونکہ آج سے پہلے انہوں نے اسے کبھی شرماتے نہیں دیکھا تھا یا اُن کے درمیان آج تک اس بارے میں کبھی کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی تھی، کوئی ایسا موضوع نکلا ہی نہیں تھا کہ جس پر شرمایا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تو عین بارش کے دوران نظر آنے والی دھنک میں کھو سے گئے تھے اور اگر وہ ان کے سامنے تالی بجا کر سکتہ نہ توڑتی تو جانے کب تک وہ یونہی اسی طرح گم صم ہو کر اسے دیکھتے رہتے۔

''اوکے، میں اب چلتی ہوں، آج سارا دن اتنی ٹینشن جھیلی ہے کہ سر عجیب بھاری، بھاری ہو رہا ہے۔''

''کس چیز کی ٹینشن تھی تمہیں؟'' جانتے بوجھتے ہوئے انہوں نے پوچھا شاید ان کی خواہش تھی کہ وہ کوکو کے منہ سے ایک بار یہ سنیں کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں...... کیونکہ خود تو اب شاید وہ یہ سب عمر بھر بھی نہ کہہ پاتے کہ اب ان کا عشق ہر تجزیے سے بالاتر تھا، چھت پر ملے قرب اور کرب کی کہانی اب شاید عمر بھر چلنا تھی۔

آپس میں میل جول
ایک صحت مند رجحان

انسان کے لیے سماجی ربط نہایت ہی اہم ہے۔ کوشش کریں کہ ملنے جلنے کے مواقع نظر انداز نہ ہوں۔ ملاقاتوں کے لیے وقت نکالیں۔ عام حالات میں یکساں حیثیتوں کے افراد میں وقت پر کام آنے کا تصور مادی وسائل سے زیادہ ضرورت کے وقت دستیاب ہونا بھی ہے، خاص طور پر دکھ اور تکلیف میں۔ عام زندگی میں ایسے بہت سے مواقع اور تقریبات ہوتی ہیں جن میں بلا تکلف شرکت کی جاسکتی ہے۔ اس طرح زندگی کے عام معمول سے مختلف ماحول میں وقت گزارنے کا موقع ملتا ہے اس موقع کو نہ گنوائیں۔

شہروں میں ایسے بہت سے مواقع مل سکتے ہیں، ادبی اور سماجی تقریبات کا ایک سلسلہ ہے جو تقریباً سالہا سال جاری رہتا ہے۔ ایسی تقریبات کے منتظمین شرکا کے منتظر رہتے ہیں اور ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ شام کی چائے کسی ایسی تقریب میں کیوں نہ پی جائے یا کسی آرٹ گیلری میں ہونے والی نمائش، کتاب میلے یا آئی ٹی نمائش میں شریک کیوں نہ ہوں۔ کچھ تقریبات کے لیے دعوت نامہ ملنا ضروری ہوسکتا ہے جو عام طور پر بلا قیمت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بس ایک بار اس سلسلے کو سمجھ لیں، اچھے ماحول میں وقت گزارنے کا طریقہ خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ ضروری نہیں کہ آپ اکیلے ہی جائیں۔ اپنے شریکِ حیات اور بچوں کو ساتھ لے جائیں وہ بھی لطف اندوز ہوں گے۔ بچے خاص طور پر مل جل کر یا دیکھ کر بہت کچھ سیکھیں گے، ان کی سماجی نبھاؤ اور برتاؤ کی صلاحیتیں فروغ پائیں گی۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

نٹ کھٹ سی شوخ و چنچل مگر بے حد بے ضرر سی کوکو سے جانے کیسے آج رات وہ اس قدر مرعوب ہو گئے تھے گویا سیاہ مفتوح کسی سفید حاکم کے سامنے موجود ہو۔

''کسی چیز کی نہیں......'' وہ مسکرائی۔ ''اور جو غلط فہمی ابا میرے دل میں ڈال گئے تھے ناں وہ آپ نے ایسے واضح کی ہے کہ بس دل ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ تو پونی ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی لیکن اس کی باتیں، اس کا انداز، اس کی خوشبو پرانے کوٹ میں رہ جانے والی فینائل کی گولی کی طرح باقی رہ گئی۔ ارمغان نے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

بعض اوقات خواب اتنی خاموشی سے ٹوٹتے ہیں کہ خود آنکھوں تک کو پتا نہیں چلتا، ہاں احساس ہوتا ہے تب جب ان خوابوں کی کرچیاں بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے آنکھوں میں یوں چبھتی ہیں کہ آنکھوں کے نم ہونے کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ اور یہی کچھ اس وقت ارمغان کے ساتھ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''امی، مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ میرے ساتھ اتنے اہم معاملے میں زبردستی کیوں کر رہی ہیں۔ جبکہ خود ارمغان بھائی کی طرف سے بھی کوئی دباؤ نہیں۔'' کوکو، امی کی طرف سے مسلسل سمجھائے جانے پر زچ ہو گئی تھی سو آخر کار بول ہی پڑی۔

''میری جان، صرف اور صرف تمہاری خوشی کے لیے کر رہی ہوں...... اب دیکھو ناں اگر تم اس گھر میں رہو گی تو تمہارے ناز نخرے اور چونچلے ہمیشہ اسی طرح اٹھائے جائیں گے، تم سارے گھر کے لیے بہو کے بجائے بیٹی ہی رہو گی...... بدلے گا تو صرف اور صرف تمہارا کمرا۔'' ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ سمجھ جائے۔

''اس کے برعکس دوسری جگہ شادی ہوئی تو تمہارا مقام بھی بہو کا ہو گا اور ذمے داریاں بھی...... اور پھر یہ خود ارمغان کی بھی شدید خواہش ہے...... بہت محبت کرتا ہے وہ تم سے...... اور یہ بات وہ خود اپنے بابا کو بتا چکا ہے۔''

''آپ ٹھیک تو ہیں؟ کیا کہہ رہی ہیں یہ سب؟'' اس کے نزدیک یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔

''سچ کہہ رہی ہوں میری بیٹی، ارمغان تم سے بہت محبت کرتا ہے، بہت چاہتا ہے تمہیں اور اس نے خود تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا...... میں بھی اس کے بچپن سے اسے دیکھتی چلی آ رہی ہوں عادت و اطوار بھی میں بہترین ہے اور صورت شکل میں بھی...... کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے اور...... اور تم دونوں کی نیچر بھی تو کتنی ملتی ہے۔''

''ارمغان بھائی مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ بہت چاہتے ہیں مجھے؟'' وہ ایسے بولی کہ لگتا آواز ہونٹوں میں ہی کہیں رہ گئی ہے۔

''ہاں، وہ تو کب سے تمہیں پسند کرتا ہے اور حیرت ہے کہ سب گھر والوں کو اندازہ تھا کہ تم دونوں ہی ایک دن شادی کے بندھن میں بندھو گے مگر تمہیں احساس نہیں ہوا......''

''لیکن بعض اوقات اندازے غلط بھی ثابت ہوتے ہیں ناں امی......!'' اس نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ''اور آپ سمجھ لیجیے کہ سب گھر والوں کا یہ اندازہ مکمل طور پر غلط تھا۔ آج کے بعد میں انہیں ارمغان بھائی ہی کہوں گی اور آج تک اگر انہیں ایسا کہا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں انہیں دل سے بھائی مان چکی تھی لیکن ہاں یہ احساس ضرور تھا کہ ہم اتنے اچھے دوست ہیں کہ زندگی بھر اس دوستی میں کسی اور رشتے کی ملاوٹ نہیں ہو گی......'' وہ لمحہ بھر رکی۔

''مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی میں اُن سے شادی نہیں کر سکتی امی...... وہ بالکل میرے جیسے ہیں ناں؟ لیکن مجھے تو اپنے جیسا نہیں، اپنے سے کہیں بہتر انسان چاہیے جسے میں شوہر سمجھوں، اس کی عزت کروں۔ بعض اوقات کسی بات پر مجھے اس سے ڈر لگے، اس کی ڈانٹ سنوں، اسے مناؤں، اس کا رعب دیکھوں امی میٹھا کھاتے، کھاتے بھی تو بندہ اوب جاتا

ہے ناں۔'' عجیب قسم کی بیچارگی تھی کوکو کی باتوں میں۔

''مجھے کیسے ایک نئی زندگی کا احساس ہوگا جب گھر وہی، لوگ وہی، دوست وہی اور روپ شوہر کا...... میرا تو دل چاہتا ہے کہ کوئی مسٹر اپوزٹ ہو جس کے ساتھ زندگی، زندگی لگے۔ کبھی خوش ہو کبھی ناراضی، کبھی غصہ کرے تو کبھی پیار......''

باہر اچانک سے ہوتی کسی آہٹ پر دونوں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اماں نے اس پر کسی بھی بات کا اثر نہ ہوتا دیکھ کر گہری سانس لی۔

''ہم تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کریں گے۔ ہماری خواہش ضرور تھی کہ ارمغان کے نام کے ساتھ تمہارا نام جڑتا لیکن اگر تم ہماری اس تجویز پر خوش نہیں ہو تو ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی......'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے کمرے سے نکل گئیں۔ مگر کوکو کے ذہن سے اماں کی باتیں چپک کر رہ گئی تھیں اور خصوصاً یہ کہ ارمغان بھائی اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

سوچ، سوچ کر دل و دماغ میں تھکاوٹ کا احساس اترنے لگا، جس میں ارمغان بھائی کے دل کو توڑنے کا احساس بھی بے حد نمایاں تھا...... اور ساتھ شکایت بھی تھی کہ اس نے تو آج تک ایسا کوئی عمل کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھلا وہ کیوں یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ بھی ان سے محبت کرتی ہوگی۔

اور کیا واقعی یہ سچ ہے یا صرف اماں اسے جذباتی کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں کیونکہ خود ارمغان بھائی نے ایسی تو کسی بھی بات کی تردید کی تھی۔ ایک تو سارا دن ایسا بوجھل گزرا تھا اب رات بھی پریشان کر رہی تھی۔ سو ایک، ایک پل نہایت ہی بے چینی میں گزرا۔

☆☆☆

حسبِ معمول اماں نے اسے اس کی مرضی کے وقت تک سونے کا موقع دیتے ہوئے نہیں جگایا تھا مگر آج وہ وقت سے پہلے جاگ گئی۔ سر میں ایسا درد تھا گویا پانی کی بوتل ہو کہ جدھر کو سر کرتی درد لڑھک کر اس طرف کو چلا جاتا۔

''اماں کہاں ہیں بڑی بھابی؟'' کچن میں آکر... بہ مشکل اس نے بڑے تایا کی بہو سے پوچھا تو اس کا خیال تھا کہ یہیں، کہیں کسی کے پورشن میں بیٹھی ہوں گی جبھی وہیں پر کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گئی۔

''کوکو وہ تو گھر پر نہیں ہیں...... کہاں گئی ہیں یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن تائی امی اور وہ دونوں ابھی، ابھی نکلی ہیں...... تم نے ناشتا کرنا ہے تو بتاؤ، میں بنا دیتی ہوں۔'' دوپہر کے کھانے کی تیاری سے ہاتھ روک کر انہوں نے پھرتی سے لائٹر لیا اور بات کرتے، کرتے چولھا بھی جلا لیا۔

''نہیں بڑی بھابی کچھ نہیں کھانا بس میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔''

سر درد کے متعلق وہ مکمل چھپا گئی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ وہ تیل کی بوتل لے کر اس کے منع کرنے کے باوجود مالش شروع کر دیں گی۔ اور وہی نہیں سب کی محبت کا یہی عالم تھا۔ سو وہاں سے اٹھ کر سیدھی ارمغان کے کمرے تک پہنچی، خیال تھا کہ ان کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جائے گی مگر وہ خلافِ توقع اس وقت کرسی پر نیم دراز حالت میں آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ دروازے سے سیدھی اندر کو آتی دھوپ سے ان کی پلکیں نم آلود لگ رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی۔

سامنے میز پر بہت سے کاغذات درزی کی کترنوں کی طرح بے ترتیبی سے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اماں کی بات ایک بار پھر یاد آئی ساتھ ہی ارمغان کی تردید بھی...... بھلا کس کا یقین کرتی۔

''آپ رو رہے ہیں کیا؟'' بات کرتے ہوئے کوکو کی آواز کپکپا گئی تھی...... مگر ارمغان نے آنکھیں نہیں کھولیں، لگتا تھا کہ سو رہے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی بغیر کچھ کہے اپنی دانست میں بلی کی سی خاموش چاپ کے ساتھ واپس چلی آئی اور آتے ہی بیڈ پر ڈھے گئی۔

چچی نے اسے یوں سست دیکھا تو فوراً ایک کراس کے کمرے تک آئیں۔ زبردستی معمولی سا ناشتا کروا کر

دوا دی اور پاس بیٹھ کر ہلکے ہاتھ سے اس کا سر دبانے لگیں۔ اور وہ جو رات بھر کی جاگی ہوئی تھی آہستہ، آہستہ سوگئی۔

جبکہ ارمغان نے کوکو کے کمرے سے جاتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ سو نہیں رہے تھے بلکہ وہ کوکو کا بھرم پال رہے تھے اور اب شاید یہی اداکاری انہیں کوکو کے سامنے ساری عمر کرنا تھی کیونکہ اپنی دانست میں وہ کوکو، کو اپنی زندگی سے نکال رہے تھے...... جب تک کہ اسے اس کا مسٹر اپوزٹ نہ ملتا جو مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں...... اور وہ خود یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس کے سامنے وہ سر جھکا کر کھڑے ہوں اور وہ ان پر برس پڑے کہ آپ تو دوست بن کر عاشق بننے چلے آئے، کیا یہی دستورِ دنیا ہے؟ اور یقیناً اس لیے اکثر لوگ لڑکے، لڑکیوں کے میل جول میں فاصلہ ہی رکھتے ہیں جو رکھنا بھی چاہیے۔ لیکن محبت ہو جائے تو اس کا اکیلے بوجھ اٹھانا ناممکن ہو جاتا ہے، جسے دار کو اس کا حصہ دینا ہی پڑتا ہے، نہ دیا جائے تو اکیلا انسان شل ہو جاتا ہے...... پانی میں بھیگی روئی کی طرح زندگی معمول سے کہیں زیادہ بوجھ ڈالتی محسوس ہوتی ہے اور بالآخر وہ اکیلا...... تنہا اور بے بس انسان بری طرح ٹوٹ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے اور سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے ٹیبل پر بائیں طرف رکھے رائٹنگ پیڈ پر مختصر سی تحریر لکھی۔

''کوکو......!

اگر تمہارا مسٹر اپوزٹ نہ ملا تو لوٹ آنا پھر میں تمہیں اپنی آنکھیں بھیگ جانے کی مکمل وجہ بتاؤں گا۔

ارمغان''

انہیں معلوم تھا کہ وہ شاعری کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتی ہے، اسی لیے ایک خوب صورت نظموں اور غزلوں کے مجموعے میں یہ چھوٹا سا رقعہ رکھا اور یونہی خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے تو وہ سوئی ہوئی تھی۔ پل بھر کے لیے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بڑی خاموشی سے وہ کتاب اس کے تکیے کے پاس رکھ کر لوٹ آئے۔ کتاب کے اوپری صفحے پر انہوں نے بڑے دل سے کوکو کا نام اپنے نام کے ساتھ لکھ کر اسے کاٹا تھا، کبھی سوچتے کہ شاید اس طرح وہ سمجھ جائے کہ ان کے کیا جذبات ہیں...... لیکن بہرحال اتنا تو طے تھا کہ روبرو اظہار ناممکن تھا۔

ان کے کمرے میں واپس آتے ہی اماں بھی واپس آگئی تھیں۔ بڑی ہی خوش اور مطمئن...... آتے ہی کوکو، کو سوتے ہوئے دیکھا اور چچی کے بتانے پر کہ اس کے سر میں درد تھا اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ اردگرد موجود دوسری چیزیں ہٹائیں تو ارمغان کی رکھی ہوئی شاعری کی کتاب بھی اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اٹھا کر الماری میں رکھ دی۔ ساتھ ہی ہلکی آواز میں بات چیت بھی جاری تھی۔ وہ چچی کو بتا رہی تھیں کہ وہ کوکو کے لیے ایک رشتہ دیکھنے گئی تھیں اور چونکہ ارمغان سے شادی کرنے پر کوکو خوش نہیں ہے اس لیے اس کے ابا کی ہدایت پر وہ کہیں گئی تھیں اور وہ لوگ انہیں بہت پسند آئے ہیں اب کسی روز وہ بھی کوکو، کو دیکھنے آئیں گے۔

چچی یا گھر میں کسی بھی دوسرے فرد کے لیے یہ اطلاع ہرگز اچنبھے کی نہ تھی سوائے ارمغان کے...... کیونکہ بھی جانتے تھے کہ کوکو کی خوشی اس کے اماں، ابا کے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ البتہ ایک ارمغان کے دل کو نہ جانے کیوں یہ امید تھی کہ کوکو اس کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کرے گی۔ اور اب آر یا پار کا وقت قریب آنے کو تھا اور وہ یہ طے کر چکے تھے کہ آج اگر کوکو، کو ان کے جذبات کا احساس ہو گیا تو ٹھیک ورنہ وہ اس سے کچھ بھی نہیں کہیں گے...... کچھ بھی نہیں۔

ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے
اشک بن کر بہہ جائے
تم سے کچھ نہیں کہنا

☆☆☆

''ارمغان بھائی!'' آج سارا دن گھر سے باہر

گزارنے کے بعد وہ ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کوکو ان کے پیچھے، پیچھے ان کے کمرے میں چلی آئی جیسے ان کی ہی منتظر ہو۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

صبح والی سستی، تھکان، بے دلی کچھ بھی تو اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا...... وہی پہلے والی کوکو اپنی شوخی، شرارت اور چلبلے انداز میں ان کے سامنے موجود تھی۔

''کہاں تھے آپ صبح سے؟ پہلے میں آئی تو آپ سو رہے تھے۔ پھر آئی تو کمرے کیا گھر سے ہی غائب، اتنی دیر کہاں رہے؟'' یہی حاکمانہ انداز تھا اس کا، ارمغان کے ایک، ایک پل کی خبر رکھنے والی کوکو اتنے بڑے واقعے سے بے خبر ہو یہی بات تو ان کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

''تم سناؤ کیسی طبیعت ہے؟ صبح سر میں درد تھا کیا؟ چچی نے بتایا مجھے۔'' پنکھے کا بٹن آن کر کے وہ کرسی پر بیٹھے جوتے اتار رہے تھے۔

''بس کچھ نہ ہی پوچھیں...... یہ مائیں بھی ناں ایموشنل بلیک میلنگ پر اتر آئیں ناں تو بندے کا دماغ گھما کر رکھ دیتی ہیں اور جب بات نہ بنے تو اپنی ہی باتوں پر خود مٹی ڈال بھی دیتی ہیں۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اماں نے کل آپ کے حوالے سے کچھ باتیں ایسی کیں کہ طبیعت اپ سیٹ سی ہوگئی اور باوجود اس کے کہ میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ آپ کی باتوں پر یقین کرتی ہوں لیکن پھر بھی بس ذہن کے کسی کونے میں وہ بات ایسی اٹکی کہ سوچ، سوچ کر سر میں درد ہو گیا۔''

''ایسا کیا کہہ دیا تھا انہوں نے؟'' جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے سوال کیا گیا۔

''وہ جو بھی کہیں ارمغان بھائی...... لیکن میرا دل صرف اس بات پر یقین کرتا ہے جو آپ کہیں......'' اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح پھوٹتی روشنیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی وہ اپنی ماں سے زیادہ ان کی بات پر یقین کر چکی ہے اور اب پُرسکون ہے۔

وہ چپ چاپ سلیپرز پہن کر اب واش روم جانے لگے تھے جب انہیں احساس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، خاموشی سے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اماں نے میرے لیے ایک رشتہ دیکھا ہے...... انہیں تو پسند ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ پہلے آپ بھی ان سے مل لیں۔''

پھر وہی شرمانا...... ارمغان تو اس کی اس ادا پر حیران ہوئے جا رہے تھے کہ ہر وقت پٹر، پٹر بولنے والی لڑکی کیا آج سے بیس پچیس سال پہلے کی لڑکیوں کی طرح شادی اور ہونے والے شوہر کے ذکر پر شرمائے گی۔

''آپ ملیں گے ناں اُن سے؟'' وہ چونکے۔

''ایک ہی دن میں رشتہ؟ میرا مطلب ہے کہ رات تک تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا پھر......؟''

''دراصل انہوں نے کافی دنوں سے اماں کو کہہ رکھا تھا پہلے اماں، ابا کا خیال کچھ اور تھا لیکن اب ان کا خیال ہے کہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین ہے، وہ لوگ کہیں پر مجھے دیکھ بھی چکے ہیں۔ اب بس ہاں ہی ہونی ہے۔'' اس نے مکمل تفصیل بتائی۔

اور ارمغان جانتے تھے کہ پہلے اماں، ابا کا جو خیال تھا وہ کچھ اور ''کیا'' تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ پہلے آپ اُن سے ایک بار مل لیں کیونکہ میری پسند ناپسند کو آپ اماں، ابا سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔'' بات کرتے، کرتے وہ ایک دم نظریں جھکا گئی تھی۔

''آپ اُن سے ملیں گے ناں ارمغان بھائی؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

انہوں نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا کہ امید کی باریک سی ڈوریوں ایک دم اچانک ٹوٹ گئی تھی کہ انہیں تو رو، رو کر گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کا بھی وقت نہیں ملا تھا۔ کل ٹھیک اس وقت تک سب کچھ نارمل تھا اور آج کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹوں سے بھی کم کے دورانیے میں انہیں کوکو اور اپنے درمیان فاصلہ محسوس

ہونے لگا تھا۔

''میں نے آج سے پہلے بھی تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ اپنے فیصلے خود کیا کرو۔''

''آپ سے پوچھے اور مشورہ کیے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتی، کبھی نہیں...... ہرگز نہیں۔'' اور تب ایک لمحے کے لیے ارمغان کو اپنی آنکھوں میں تیرتی نمی پلکوں سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تو انہوں نے منہ پرے کر لیا۔

''اچھا ابھی آپ فریش ہو جائیں پھر میں آپ کو ساری تفصیل بتاؤں گی۔'' ارمغان اگر چاہتے تو اسی لمحے اسے روک کر اپنی محبت کی حقیقت بتا سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اس طرح یا تو وہ ان سے دور ہو جائے گی اور یا پھر نزدیک رہ کر بھی اجنبی اور پھر محبت تو جواب میں محبت چاہتی ہے، مہربانی کی بھیک یا احسان کی نذر نیاز نہیں اور ان ہی چند لمحوں میں جو فیصلہ ہوا، اب انہیں اس پر قائم بھی رہنا تھا۔

☆☆☆

''اماں، وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن......'' اپنی کپڑوں کی الماری ٹھیک کرتے ہوئے وہ بولی تو ضرور لیکن شاید اس دفعہ اس کی کوئی بات سنی جانے کی امید نہیں تھی اسی لیے اماں نے کاٹ دی۔

''ارمغان کے آنے تک ہم کچھ بھی نہیں روک سکتے کوکو، تو قیر کے گھر والوں کو بہت جلدی ہے اور پھر آج سے تھوڑی کتنے ہی عرصے سے وہ لوگ کبھی میری تو کبھی تمہارے ابا کی منتیں کر رہے تھے لیکن ہمارا جھکاؤ کیونکہ ارمغان کی طرف تھا اس لیے کبھی کوئی مثبت رویہ نہیں دکھایا...... اب جو ذرا ان میں دلچسپی ظاہر کی تو وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''پتا نہیں، ارمغان بھائی کو بھی ایسا کیا کام پڑا کہ اس دن سے غائب ہیں، اب ذرا آئیں ناں میرے سامنے...... میں بالکل بات نہیں کروں گی۔'' وہ بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی تھی...... اماں نے اسے کپڑے ہینگر میں ڈال کر دیتے ہوئے دیکھا۔

''پوری دنیا میں میرے سب سے اچھے دوست، میری زندگی کے سب سے بڑے اور اہم موقع پر یوں غائب...... ہونہہ۔'' جھنجلاہٹ میں وہ کپڑے وہیں پھینک کر کمرے سے نکل گئی تھی...... وہ لاعلم سہی لیکن اماں، ارمغان بھائی کے جذبات سے اچھی طرح واقف تھیں اور ان کا اندازہ تھا کہ دوست کے بیرون ملک جانے کا تو بہانہ ہے، درحقیقت وہ خود اس تمام صورتِ حال سے فرار چاہتے تھے۔ اور پھر وہی ہوا جو کچھ کوکو نے چاہا۔ اپنی ایک، ایک رسم کے موقع پر اس نے ارمغان کو یاد کیا تھا، دن میں کئی، کئی مرتبہ فون پر بات کرنے کی کوشش میں یہاں سے وہاں بولائی، بولائی پھرا کرتی...... اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا کہ یوں ایک دم اچانک جو ارمغان گھر سے گئے تو ایسے گئے کہ اب تک اس سے بات بھی نہیں کی۔

دوسروں کے ذریعے ان کے فون کی اطلاع ضرور ملتی رہی لیکن ہمیشہ ہی کچھ ایسا ہوا کہ اس کی بات نہ ہو پاتی اور جس دن اس کی اپنے اماں، ابا کے گھر میں آخری رات تھی اور سب اسے سو جانے کی تاکید کرتے ہوئے ابھی کمرے سے نکلے ہی تھے کہ ارمغان کا فون آ گیا...... اور تب وہ بے ساختہ بہت روئی، اتنی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

''آپ کہاں چلے گئے؟ کیوں گئے؟ کب آئیں گے؟ مجھے آپ کی ضرورت ہے، پلیز آ جائیں ناں، آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گی، قسم کھاتی ہوں صرف ایک بار آ جائیں...... کل کے بعد آنے کا کیا فائدہ کل تو میں چلی جاؤں گی۔''

یہ اور اس طرح کے بے شمار شکوے، قسمیں اور وعدے انہی آنسوؤں کے درمیان مسلسل ہوتے رہے...... ارمغان نے بتایا کہ انہیں بہت مجبوری میں رکنا پڑا ہے ورنہ وہ اب تک ضرور آ جاتے۔ وہ اسے زندگی کے اس نئے سفر پر وش کرنا چاہتے تھے، دعائیں دینا چاہتے تھے لیکن اس کے آنسوؤں نے تو جیسے ان تمام لفظوں کے سامنے باڑ لگا دی تھی، انہیں لگتا گویا سارے

الفاظ پانی میں سوراخ والی کشتی کی طرح ڈوب گئے تھے اور وہ اس زخمی کشتی کے بچ جانے والے مسافر کی طرح خود اپنے زندہ رہ جانے کے معجزے پر حیران تھے۔

اور خود بقول کوکو جیسے، جیسے شادی کے دن قریب آتے گئے... اسے لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑی انہونی ہونے والی ہو۔ جس کسی کو بھی اپنی اس کیفیت کا بتاتی سبھی کہتے کہ لڑکیوں کو شادی سے پہلے اسی طرح کی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ نہ جانے اب آگے زندگی کا سفر اور ہم سفر کیسا ہو، اس لیے اسے نارمل ہی سمجھو۔

لیکن کوکو کے لیے یہ سب نارمل نہ تھا، اسے یقین تھا کہ اگر کوئی اس کی بات سمجھنے والا ہے تو وہ صرف اور صرف ارمغان بھائی ہیں اور ان سے بات کیے بغیر سینے پر رکھی سل نما بوجھ کسی صورت اترنے والا نہیں۔

اور اب جیسے ہی ارمغان کی آواز سنی تو جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، وہ بات کم اور رو زیادہ رہی تھی۔ اور اب پتا نہیں کیوں اسے احساس ہو رہا تھا جیسے ارمغان کے بغیر زندگی بڑی نامکمل سی ہوگی۔ اس کی باتیں بن کہے سمجھنے والا کیا ارمغان کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ اور بس ارمغان کو ہر وقت اس کی باتیں سننے کے لیے موجود ہونا چاہیے کیونکہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر بہترین سامع تو اور کوئی تھا ہی نہیں۔

”بس مجھے کچھ نہیں پتا...... آپ کل یہاں آ رہے ہیں اور بس!“ کوکو نے فیصلہ سنایا۔

”مجھے آپ نے اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا ہے...... ورنہ میں تو اپنی جگہ سے ہلوں گی بھی نہیں۔ بتائیں آئیں گے ناں؟ اور فوٹوز بھی تو بنوانی ہیں ناں۔“

اور کوکو کی باتوں سے کئی دنوں کا منہ بند عشق جسے ارمغان نے بڑی ہی احتیاط سے کئی قسم کے قفلِ ابجد لگا رکھے تھے کھل گیا اور ان کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”نہ جانے کیوں میں نے کوکو کی محبت میں اسے ہمیشہ صرف آنسو ہی پیش کیے، اس کے علاوہ میری طرف سے نہ تو کوئی جذبہ اس تک پہنچ پایا اور نہ ہی کوئی احساس۔“ ارمغان نے سوچا۔

”میں کوشش کروں گا کہ ضرور آؤں اور تمہارے بیسٹ ڈے پر تمہارے ساتھ فوٹو بنواؤں۔“ وہ بڑی گہری سوچ سے چونک کر بولے۔

کوکو، اس ”کوشش“ کرنے کے وعدے کے سہارے آنسو پونچھ کر خاموش ہوگئی تھی...... لیکن یہ وعدہ بس کوشش تک ہی محدود رہا۔ اور بیوٹی پارلر سے ہال اور پھر ہال سے رخصتی شروع ہونے تک اس کی آنکھیں انہیں تلاش ہی کرتی رہ گئیں اور وہ نہ آئے۔

کئی مرتبہ، امی کو بلوا کر فون کرنے کا بھی کہا لیکن

آگے سے فون بند پایا گیا اور یوں وہ اپنی واحد سہیلی، اپنے استاد، اپنے کزن، اپنے ہمراز اور اپنے ون اینڈ اونلی ارمغان بھائی کو دیکھے اور ان سے ملے بغیر ہی جب رخصتی کے وقت صوفے سے اٹھی تو یوں بلک، بلک کے اماں سے چمٹ کر روئی کہ دیکھنے والی کوئی بھی آنکھ خشک نہ رہی۔ وہ جو ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ ”کتنا برا لگے گا اگر میں اپنی رخصتی پر نہ روئی تو...... اس لیے خدارا مجھے کوئی سوئی چبھو دینا کہ بھرم رہ جائے ورنہ میں تو ہنستی کھیلتی میاں کی انگلی پکڑے نکل جاؤں گی۔“

ماں، باپ کا گھر چھوڑنے کا دکھ تو اپنی جگہ لیکن ارمغان کے بغیر، ان کی موجودگی کے بِنا یوں نئے گھر جانا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور اس کا بس چلتا تو سب کو ارمغان کے آنے تک انتظار کرواتی لیکن...... اب وہ کوکو نہیں بلکہ مسز توقیر بن چکی تھی اور یہی اس کی نئی زندگی کا پہلا سمجھوتا تھا۔

☆☆☆

سسرال پہنچنے کے بعد جب اسے حجلۂ عروسی میں داخل کیا گیا تو تقریباً صبح سے بیٹھ، بیٹھ کر اس کی کمر میں شدید قسم کا درد ہو رہا تھا۔ بیوٹی پارلر میں چار گھنٹے کمر اکڑا کر بیٹھنے سے لے کر اب تک کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کچھ دیر کے لیے اسے لیٹنے کا کہہ دیں اور پھر اتنے کام والے کپڑوں کے ساتھ اس قدر ہیوی میک اپ اور اتنا ہی وزنی زیور جو اسے پہنا ہوا کم اور خود پر لدا ہوا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے میں موجود تازہ پھولوں کی بھرمار نے البتہ اس پر بے حد خوشگوار تاثر چھوڑا تھا۔ بیڈ پر موجود گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھی تو میکے کی اداس یاد، سسرال میں والہانہ استقبال کے ساتھ پچھلی کئی یادیں اور باتیں ذہن میں گھومنے لگیں۔ ارمغان کی یاد بھی اُن میں سے ایک تھی لیکن اب ارمغان کے خیال کے ساتھ ہی ذہن میں ناراضی اور خوف نے بھی جنم لے لیا تھا۔ سواُن کی طرف سے اپنا دھیان مکمل طور ہٹا کر تمام تر توجہ اس دروازے کی طرف مرکوز رکھی جہاں سے نہ جانے کون سے لمحے توقیر نے اندر آنا تھا۔ اور جب کافی دیر کے بعد توقیر کمرے میں آیا تب تک وہ بیٹھے، بیٹھے دو تین مرتبہ اونگھ چکی تھی۔

توقیر اپنی فوٹو سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ نکاح کے بعد ایک ساتھ بٹھائے جانے کے وقت تو وہ کن انکھیوں سے بھی اسے نہیں دیکھ پائی تھی کہ اس وقت تو وہ ارمغان کی منتظر تھی اور پھر نہ ہی وہ دونوں زیادہ دیر بیٹھے، بارات چونکہ دور سے آئی تھی اس لیے انہوں نے جلدی اجازت لی اور انہیں گاڑی میں بٹھا دیا گیا، جہاں اس نے اماں کی ہدایت کے عین مطابق آنکھیں اوپر تک نہ کیں جیسے سر جھکا کر بیٹھی ویسے ہی باہر نکل آئی اور یہ ہدایت اماں نے کئی مرتبہ دہرائی تھی کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ فوراً ہی اپنی عادت کے مطابق باتیں نہ شروع کر دے۔ توقیر کے اندر آتے ہی کوکو نے ایک نظر میں جانچ لیا تھا کہ اس کا دولہا اس سے کہیں زیادہ خوش شکل اور وجیہہ ہے۔

”توبہ ہے، یہ ہمارے ملک کی شادیاں اور رسمیں کس قدر احمقانہ اور فضول ہوتی ہیں۔“ اس نے شیروانی اتارنے سے پہلے ہار اتار کر بددلی سے صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا مصنوعی پن ہوتا ہے کہ دل اوب جاتا ہے بندے کا...... اب ظاہر ہے تم مجھے ہال میں دیکھ تو چکی ہو اس گیٹ اپ میں، اس پر یہ تاکید کہ کمرے میں جانے سے پہلے اسی طرح ہار پھول پہنے رہنا۔“

”آپ پہلے پاکستان سے باہر ہوتے تھے؟“ نظریں جھکائے کوکو نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”ہوتا تو یہیں تھا لیکن پھر بھی یہ سب کچھ مجھے پسند نہیں، عجیب ریموٹ کنٹرول سے چلنے والا روبوٹ بنا دیتے ہیں شادی کے دن...... اور تم......“ وہ اچانک ہی ایسے چونکا جیسے دلہن کے لباس میں کسی اور کو بیٹھے دیکھا ہو۔

”اوہ مائی گاڈ...... تم نے بھی اب تک ڈریس چینج نہیں کیا، پاگل لڑکی اس وقت سے یہ تمام زیور خود پر

کیوں ٹانگے بیٹھی ہو۔ اٹھو، اٹھ کے کوئی نائٹ ڈریس پہنو، میں بھی چینج کر کے آتا ہوں۔'' وارڈ روب کھول کر اس نے اپنے لیے کپڑے نکالے اور واش روم کی طرف بڑھتے، بڑھتے ایک بار پھر مڑا۔

''اٹھ بھی جاؤ، ویسے ہی صبح ہونے والی ہے۔ یار کمال کی بدھو ہو تم تو۔'' توقیر جو کچھ کہہ رہا تھا بڑے ہی بے تکلفانہ انداز میں کہہ رہا تھا نہ بدتمیزی تھی نہ... بے عزتی...... لیکن اس کی آواز میں جو لاتعلقی، اکتاہٹ اور احساسِ برتری کوکو، کو محسوس ہوا تھا اس سے ایک دم ہی اسے خوف آیا تھا۔ واش روم میں جلتا ہلکے نیلے رنگ کا بلب دروازہ کھلنے پر اپنی روشنی اس تک بھی مہیا کر رہا تھا۔ بڑے آرام وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس توقیر نے دروازہ بند کیا تو وہ روشنی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

''تم اٹھیں نہیں اب تک......؟'' واش روم سے باہر نکل کر اسے اب تک یوں بیٹھا دیکھ کر حیران، حیران سا توقیر اس کے پاس آ بیٹھا۔

''دیکھو میں ایک پریکٹیکل قسم کا انسان ہوں، یہ ناز نخرے اٹھانا میری فیلڈ نہیں ہے اور اگر تم اس امید پر بیٹھی ہو کہ میں تمہارا ٹکا وغیرہ اتارنے میں ہیلپ کروں گا تو بلیومی یو آر ٹوٹلی رونگ......''

گرم، گرم آنسو جانے کہاں سے فرار ہوتے آنکھوں کے راستے سے باہر نکلے۔

''میں ذرا مختلف قسم کا بندہ ہوں، دو آنسو دکھا کر باتیں منوانے کا تو کبھی سوچنا بھی مت...... بہتر ہو گا کہ تم زندگی کو میرے ساتھ میرے طریقے سے جیو...... کیونکہ آج کل لڑکیوں کی اکثریت یا تو ٹی وی اور فلموں کے ہیروز کو آئیڈیل بنا کر اُن میں اپنے شوہر کا روپ ڈھونڈتی ہیں اور یا پھر مختلف قسم کے رومانوی ناولز میں ہیرو کے کردار کو آنکھوں میں سموئے دن رات ان کے نام کی مالا جپتی، آہیں بھرتی بھول جاتی ہیں کہ زندگی کی حقیقتیں اُن سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔''

''وہ کردار بھی تو اسی دنیا کے ہوتے ہیں ناں، ہم سب میں ہی ہوتے ہیں، کوئی کسی کے لیے بھی اپنا پیار محسوس کروا کے اور اس کے لیے اپنے دل میں موجود عزت ظاہر کروا کے اس کا ہیرو بن سکتا ہے ناں۔'' کوکو نے نوز رنگ کو ہلکا سا پرے کر کے دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھے۔

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر کوئی چاہے تو......'' توقیر نے کندھے اچکائے۔ ''لیکن میں اپنی ذات میں مطمئن اور اسی طرح خوش ہوں، ہاں اگر زندگی بہترین گزارنی ہے تو یقیناً تمہیں خود کو تبدیل کرنا ہو گا جیسے تمہارے ناولز کی ہیروئن خود کرتی ہیں۔''

''لیکن وہ تو خود کو ہیرو کے لیے تبدیل کرتی ہیں ناں...... کیا آپ بھی بنیں گے میرے ہیرو؟''

''مجھ میں کوئی کمی ہو تو خود کو بدلوں ناں......'' وہ اٹھ گیا تھا۔

''ویسے بہت بولتی ہو تم، ترکی بہ ترکی جواب دینا آتے ہیں تمہیں، ہے ناں۔'' اب وہ کیا کہتی، چپ چاپ سر جھکا لیا۔

توقیر نے لیٹتے ہوئے ٹیوب لائٹ آف کی اور زیرو کے بلب کی سبز روشنی میں اسے گیشا گرل کی طرح بیٹھے دیکھا۔

''تمہارا تو لگتا ہے چینج کرنے کا کوئی موڈ نہیں ہے، میں تو تھکا ہوا ہوں۔'' کوکو نے اسے گردن موڑ کر دیکھا وہ اے سی کا ٹمپریچر سیٹ کر رہا تھا۔

''میں تو تمہیں بالکل ہی اپوزٹ محسوس ہوا ہوں گا...... لیکن نو پرابلم...... کچھ دنوں میں تمہیں عادت ہو جائے گی۔''

''تو کیا مجھے میرا مسٹر اپوزٹ مل گیا ہے جس کی خواہش کا اظہار میں نے اماں سے کیا تھا؟ کیا وہ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی؟'' اپنے خدشات پر خود ہی اسے جھرجھری آ گئی تھی، توقیر کروٹ بدل کر اچانک اٹھا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''میں اپنا موبائل نیچے بھول آیا ہوں...... تم ایزی ہو جاؤ میں بس دو منٹ میں لے کر آیا۔'' کوکو نے کچھ عجیب قسم کے رنج سے ایک، ایک زیور اتار کر اپنے

سامنے ڈھیر کردیا تھا۔ گلو بند، کڑے، ٹیکا، جھومر، نتھ، ست لڑا ہار، جھکے ایسی کون سی چیز تھی جو اسے نہیں پہنائی گئی تھی۔

اس کے اماں، ابا نے بھی اپنی تمام تر پونجی اس پر ہی لگادی تھی مگر اب وہی زیور خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے معنی ہوگیا تھا کہ جسے دیکھنے والے نے جی بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے زیور کی ایک، ایک چیز کے ڈیزائن میں خاص خیال رکھا گیا تھا کہ اس جیسا ڈیزائن پہلے کبھی خاندان میں کسی کا نہ بنا ہو، بالوں میں فرنٹ کی بیک کومنگ کر کے پیچھے بڑی احتیاط سے نقلی جوڑا لگادیا گیا تھا تاکہ دوپٹا سیٹ کرنے میں آسانی رہے، ساتھ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ دوپٹے اور جوڑے کی پنیں دولھا بھائی سے کھلوانا تاکہ انہیں شروع سے ہی تمہارے نخرے اٹھانے کی عادت پڑے...... لیکن...... اس نے غصے میں آکر اپنا جوڑا اور دوپٹا سب کھینچ کر ایسے اتارے کہ خود اس کے بال ہی کھنچ گئے، تکلیف تو ہوئی لیکن یہ تکلیف اس وقت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

کڑوی دوائی لینے کے انداز میں ڈریس چینج کیا اور سارا زیور سنبھالنے کے بجائے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کر پلٹی ہی تھی کہ توقیر بھی موبائل ہاتھ میں لیے داخل ہوا۔ وہ ایک بار پھر بیٹھ گئی۔

''ای میل پر آٹو ریپلائی سیٹ کردیا تھا پہلے ہی لیکن یاد نہیں رہا...... یہ شادی بھی ناں اول روز سے انسان کی عقل ختم کردیتی ہے شاید۔''

کوکو، کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ شادی نہیں بلکہ احسان کیا گیا تھا اس پر...... یا شاید اس کا انداز ہی ایسا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا نئی زندگی کی شروعات اس کی توقعات کے بالکل برعکس ہی ہوئی تھی...... کچھ دیر بعد پتا نہیں کیسے اس کی آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ شاید ابھی اماں ناشتے کے لیے بلانے آنے والی ہیں...... لیکن کروٹ بدلنے پر توقیر کو سامنے پایا تو جیسے لمحہ بھر میں مکمل جاگ گئی...... اور اسے دیکھتے ہی دل پر ایک عجیب سا بوجھ محسوس ہونے لگا، ایسا لگتا جیسے اسے اس کی مرضی کے خلاف اس کمرے میں قید کردیا ہو...... بس میں ہوتا تو فوراً اٹھ کر دروازہ کھولتی اور باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لے کر اپنے زندہ ہونے کی یقین دہانی کرتی لیکن ابھی شاید مکمل طور پر صبح نہیں ہوئی تھی کیونکہ باہر کسی بھی قسم کی آوازیں یا چہل پہل سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دل چاہا کہ اٹھ کر واش روم جائے اور فریش ہوجائے لیکن تھکاوٹ ایسی تھی کہ کروٹ تک بدلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ جسمانی تھکاوٹ تو بندہ برداشت کرلیتا ہے لیکن جب تھکن دل و دماغ سے ہوتی روح میں اترنے لگے تو خود کو کسی بھی کام کے لیے قائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسے ایک بار پھر یاد آنے لگا تھا کہ کس طرح اس کی ساری کزنز اتنے عرصے بعد صرف اس کی شادی کے لیے اکٹھا ہوئی تھیں۔ خوب ہلا گلا ہوا تھا۔ ساری کزنز نے ایک، ایک لمحہ، ایک، ایک پل یادگار بنادیا تھا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کہ سنو اپنے میاں کی تعریفوں میں ہمیں بھلا نہ دینا۔

اور بھلا وہ کیسے بھول سکتی تھی ان سب کو، ان لمحات کو...... کہ ایسا کچھ تو ہوا ہی نہیں تھا۔ تعریفوں کے پل باندھنا تو دور اسے تو جی بھر کر کسی نے دیکھنے کی بھی چاہ نہیں کی تھی۔ جس طرح شرعی حق مہر ادا کر کے خود کو بری الذمہ سمجھا جاتا ہے بالکل اسی طرح صرف شرعی حق ادا کیا گیا تھا اور بس...... توقیر کو دیکھتے ہوئے اس کا حلق تک کڑوا ہونے لگا تھا۔ اور وہ جو رات کو اسے دیکھنے کے بعد یہ سوچ رہی تھی کہ توقیر کا سویا ہوا چہرہ بھی کس قدر پیارا لگے گا اب اسے دیکھتے ہوئے اوب رہی تھی۔

ایک رات کی نئی نویلی دلہن کو صبح ہونے سے پہلے شاید ہی کبھی اپنے شوہر سے اتنی بد دلی محسوس ہوئی ہو جتنی اس وقت کوکو، کو محسوس ہو رہی تھی سو اس نے فوراً سے اٹھ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے اترتی توقیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اتنی صبح کہاں جارہی ہو؟ ابھی تو گھر کے نوکر

بھی سو رہے ہوں گے۔"

"نہیں، میں باہر تو نہیں جا رہی...... اِدھر واش روم میں ہی......" وہ ایک دم ہڑبڑا کر چونکی تھی۔

"اچھا، واش روم سے ہو کر آؤ تو لیٹ جانا...... یہ کھٹ پٹ نہ کرنے لگنا اِدھر سے اُدھر...... مجھے بہت ڈسٹربنس ہوتی ہے اس طرح......" لہجے میں وہی رات والی اکتاہٹ تھی، کوکو نے فوراً ہی سرِ تسلیم خم کر دیا اور واش روم جانے کے بجائے وہیں بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ توقیر اس سے باتیں کرے، اپنے بارے میں، فیملی کے بارے میں، عادات و اطوار کے بارے میں...... پھر اس سے پوچھے اور وہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتائے، پسند ناپسند سے لے کر اپنی تمام تر خواہشات کے بارے میں...... اور ساتھ میں اسے یقین دہانی بھی کروائے کہ وہ اسے خوش رکھنے کے لیے خود کو ہر ممکن حد تک بدل سکتی ہے اور یوں دونوں میں دوستی ہو جائے اور ان کا میاں، بیوی والا رشتہ اس کے آئیڈیل سانچے میں ایسے ڈھل جائے کہ وہ آپس میں میاں، بیوی سے زیادہ دوست لگنے لگیں...... بس اتنی سی ہی تو خواہش تھی۔

لیکن بعض اوقات ہماری بہت چھوٹی، چھوٹی خواہشات ہی ادھوری رہ کر ہمیں ہمارے نامکمل ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں، ذہن پر حاوی ہونے لگتی ہیں اور ایک کسک کا روپ دھار لیتی ہیں...... یہی کچھ کوکو، کو بھی محسوس ہو رہا تھا، توقیر نے اسے یوں بیٹھا دیکھا تو خاموشی سے اپنا تکیہ اس کے قریب لے آیا...... کوکو کے اندر آوازوں کا شور مزید بڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

ولیمہ اگلے دن تھا کہ توقیر کے لیے اپنے کاروبار سے زیادہ دن دور رہنا ممکن نہیں تھا لہٰذا شادی کے اگلے ہی روز ولیمے کا ڈنر ارینج کیا گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ہی دن میں مرجھا سی گئی ہے اور یہ سب محض رسمی کارروائیاں کی جا رہی ہیں...... کبھی سوچتی کہ اماں سے توقیر کے رویّے کی شکایت کرے گی...... پھر سوچتی کہ شکایت تو کرے گی لیکن آخر کس چیز کی؟ کیا کہے گی؟ ایسے کون سے حقوق تھے جو اس نے ادا نہیں کیے تھے؟ ایسی کون سی بات تھی جو اسے غلط کہی گئی؟ توقیر نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا تھا جس کی بنا پر وہ کوئی شکایت کرتی...... کیا وہ یہ کہتی کہ توقیر نے میری تعریفیں نہیں کیں؟ یا تعریفوں کو چھوڑ دیں، مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں؟ مجھ سے باتیں نہیں کیں؟ مجھ سے دوستی نہیں کی؟ ایسا کیا تھا جس کی وہ شکایت کرتی اس کا کیس تو بہت ہی کمزور تھا جو بھی سنتا اس کی باتوں پر محض ہنستا اور اس کا بچپنا قرار دیتا لیکن وہ کیسے بتاتی کہ یہ ایک رات اس کے لیے کس قدر بوجھل تھی، دل تو چاہ رہا تھا کہ چیخ، چیخ کر سب کو کہتی کہ توقیر نے تو مجھ سے دوستی ہی نہیں کی، اب میں کیسے رہوں گی اس کے ساتھ۔ صرف اور صرف بیوی بن کر؟

ایسے میں اسے ارمغان بھائی کا خیال آیا تھا صرف اور صرف وہی سمجھ سکتے تھے کہ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہی ہے لیکن وہ آج بھی نہیں آئے تھے...... اور سب کا خیال تھا کہ شادی ہوتے ہی کوکو بڑی سنجیدہ اور سمجھدار لگنے لگی ہے۔

ولیمے کے بعد اماں کی طرف آئی تو سبھی کزنز نے گھیر لیا۔ لیکن وہ کیا کہتی...... لائبہ، عروسہ، مریم، وغیرہ کی طرح اس کے پاس بتانے کو ایک تعریفی جملے کی تو کیا ہی بات خود محسوس کرنے کے لیے ایک تعریفی نظر بھی نہیں تھی۔ اور تب اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ باقاعدہ سوچ کر اور ارادتاً جھوٹ بولا۔ اپنے منہ سے اپنی ہی اتنی تعریفیں کیں کہ وہ سب باقاعدہ حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگیں کہ واقعی کوکو یہ سب سننا ڈیزرو کرتی تھی کیونکہ وہ ہے ہی اتنی اچھی...... غرضیکہ وہ تمام باتیں جو وہ توقیر کے منہ سے سننا چاہتی تھی اس نے خود کیں اور اتنی کیں کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ برداشت کرنے کی کوشش میں ہنستے، ہنستے رونے لگی۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں سب کے خیال میں یہ خوشی کے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں میں توقیر کی محبت بن کر جگمگا رہے تھے جبکہ وہ جانتی تھی

کہ یہ اس کے اپنے ہی پالے گئے دکھ کے آنسو ہیں جو توقیر کی طرف سے ملنے والی بے قدری کا احوال سنا رہے تھے۔ چچی نے بتایا کہ آج شام ارمغان بھائی آرہے ہیں...... اس کا بہت دل چاہا کہ وہ صرف اور صرف آج کی رات میکے میں رک جائے لیکن توقیر اس سے پوچھے بغیر ہی لینے چلے آئے...... اور بے شک اس نے اماں کو بہت کہا کہ وہ کل چلی جائے لیکن اُن کا خیال تھا کہ توقیر کو اکیلے واپس بھیجنا معیوب لگے گا۔ لہٰذا اسے سمجھا بجھا کر واپسی کے لیے تیار کرلیا گیا۔

وہ ریڈی ہوکر ڈرائنگ روم میں آئی تو سبھی کزنز توقیر کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔

''ہماری بھی شادی ہوئی ہے توقیر بھائی لیکن تعریفوں میں تو آپ سب سے نمبر لے گئے۔'' لائبہ نے کہا۔

''اور بے تابی ایسی کہ جب سے وہ آئی ہے میسج پر میسج...... بھئی صبر کریں صبر......'' کومل نے بھی چٹکلا چھوڑا، توقیر نے حیرت سے کوکو دیکھا صاف لگتا تھا کہ یہ تمام باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

''ویسے ہمارے سامنے تو آپ بڑے سیریس بن رہے ہیں ناں...... لیکن کوکو نے ہمیں ساری اندر کی باتیں بتادی ہیں۔'' ہنسی کی جو آبشاریں بات، بات پر جاری تھیں اُن سب سے بڑھ کر قہقہہ عروسہ کی بات پر لگا۔ توقیر ان سب کے درمیان جز بز ہورہا تھا۔

''کوکب یہ سب کیا ہورہا ہے؟''

''کوکب......؟ واؤ......'' اسکول، کالج کے علاوہ آج پہلی مرتبہ کسی نے اس کا نام لیا تھا، سبھی لڑکیاں حیران رہ گئی تھیں۔

''یعنی اب تم کوکب بن گئی ہو؟ مسز کوکب توقیر......'' شمائلہ کو بڑی خوشی ہورہی تھی۔

''اُف اس نام سے تو تم کتنی سیریس، سمجھدار اور سگھڑ لگوگی ناں...... ہمارے لیے تو کوکو ہی ٹھیک ہے بھئی۔'' لائبہ نے فیصلہ سنایا اور سب نے اس کی تائید بھی کردی۔

''دراصل ان کو اچھا لگتا ہے مجھے اس طرح بلانا۔'' کوکو، توقیر کے ساتھ آکر بیٹھی۔

''دراصل مجھے اچھا نہیں لگتا اس طرح بلانا......''

دونوں نے لفظوں کے معمولی فرق سے ایک سا ہی جملہ ادا کیا تو پھر سے سب لڑکیوں کے ہونٹ سکڑ گئے اور آنکھیں مسکراتے ہوئے پھیل سی گئیں۔

''اوئے ہوئے کوکو بڑا ان کا، اُن کا کرنے لگی ہو۔''

''اور تم دونوں نے ایک ساتھ جملہ بولا ناں، بس اب دیکھنا کیسی زبردست نبھے گی۔'' افشی نے بھی مثال پیش کی۔

''کیا خیال ہے بڑوں سے اجازت لیں چلنے کی؟'' توقیر نے کوکو کی طرف دیکھا تو اس نے اتفاق سے سر ہلا دیا۔

''بڑوں سے بعد میں، پہلے چھوٹوں سے تو اجازت لے لیں دولھا بھائی......'' سمیرا شوخ ہوئی۔

''ضرورت تو بڑوں سے بھی اجازت لینے کی نہیں ہے...... یہ تو صرف ایک رسمی کارروائی ہے اور بس......'' جب سے وہ آیا ہوا تھا یہ اس کا پہلا طویل ترین جملہ تھا...... ورنہ اس سے پہلے بڑوں کے سامنے تو شاید کچھ بولا ہی ہو لیکن ان کے اٹھ جانے کے بعد تو بس وہ بے دلی سے انہیں سن ہی رہا تھا۔ سبھی نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ کوکو، کو لگا جیسے کسی نے اس کے روپ کی بیزاریت محسوس کرلی ہے۔

''واہ بھئی، اسے کہتے ہیں میاں، بیوی کا ایک دوسرے پر حق...... مان گئے بھئی، بڑے پوزیسو ہیں آپ کوکو کے معاملے میں۔ لکی کوکو۔''

اس گھر کے سب ہی لوگ مثبت سوچنے کے عادی تھے ورنہ توقیر کے اب تک کے رویے کو سو معانی پہنا چکے ہوتے...... اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ توقیر کو بھی آج رکنے کے لیے کسی بھی طرح راضی کرلے گی تاکہ ارمغان سے ملاقات ہوجائے...... اپنے ارادے پر خود ہی خاموش ہوکر وہ توقیر کے ساتھ ہی اٹھ گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

تکبر...... غضبِ الٰہی

اے میرے معبود! تیرے ہی لیے تمام تعریف ہے اس بات پر کہ تو نے گناہوں کے جاننے کے بعد پردہ پوشی کی اور حالات کے اطلاع کے بعد عافیت و سلامتی بخشی یوں تو ہم میں سے ہر ایک ہی عیوب و نقائص کے درپے ہوا مگر تو نے اسے مشتہر نہ کیا اور افعالِ بد کا مرتکب ہوا مگر تو نے اس کو رسوا نہیں ہونے دیا۔ کتنے ہی تیرے احکام تھے جن پر تو نے کاربند رہنے کا حکم دیا تھا مگر ہم نے ان سے تجاوز کیا اور کتنی ہی برائیاں تھیں جو ہم سے سرزد ہوئیں اور کتنی ہی خطائیں تھیں جن کا ہم نے ارتکاب کیا۔

اے اللہ! ہمیں گناہوں سے توبہ اختیار کرنے والی راہ پر گامزن کر دے...... اور ہمارے لیے ایسے اسباب مہیا نہ کر جو تجھ سے ہمیں غافل کر دیں۔ اے اللہ! تو کرم و بخشش کرنے والا اور ہر عیب سے پاک ہے تو جود وسخا کرنے والا اور بزرگ و برتر ہے تو سخی و کریم ہے۔

درود و سلام ہو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آل پر...

☆☆☆

برائیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

1۔ قولی و فعلی برائیاں

2۔ قلبی برائیاں۔

1 قولی و فعلی: یہ وہ برائیاں ہیں جو قول و فعل کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ اور یہ گرم گناہ بھی کہلاتے ہیں۔ مثلاً چوری، قتل و غارت گری...... زنا و بدکاری......

قلبی برائیاں: یہ وہ برائیاں ہیں جو قلب کے اندر ہر وقت موجزن رہتی ہیں۔ ان قلبی برائیوں کے اثرات دھیمی چال سے ایسے باہر آتے ہیں کہ جو عام طور پر معلوم نہیں ہوتے لیکن ان کے نتائج زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان برائیوں پر عملاً کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی اور قانون کے تحت ان پر گرفت بھی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً جھوٹ، غیبت، بخل، حرص و طمع...... خوشامد، حسد، اور تکبر...... یہاں اگر محاسبہ ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کا وہی ان پر گرفت فرما سکتا ہے اور یہی وہ ٹھنڈے گناہ ہیں جو معاشرے میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔

گرم گناہوں کے ارتکاب کے بعد ان کی سزا ہوتی ہے اور ختم ہو جاتے ہیں لیکن ٹھنڈے گناہ سزا کی زد میں آتے ہی نہیں کیونکہ یہ قلبی گناہ ہیں اور یہ بہت مہلک امراض ہیں جن کا علاج نہایت ضروری ہے ورنہ معاشرے کی زندگی برباد ہے کیونکہ اصل معاشرے کی اصلاح ان قلبی گناہوں سے بچنے پر ہی ہے۔

آج ہم انہی قلبی برائیوں میں سے ایک برائی تکبر کا ذکر کریں گے۔ تکبر کے لغوی معنی ہیں بڑائی کا اظہار، غرور، گھمنڈ، از خود بڑا بننا...... اترانا، اکڑنا دوسروں پر اپنی برتری جتلانا اور دوسروں کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھنا۔

اسلامی نظامِ اخلاق میں تکبر مخلوق کی ایک مذموم صفت ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

مخلوق میں سب سے پہلے جس نے تکبر کیا وہ ابلیس لعین تھا۔ اسی تکبر کے باعث اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا حکم الٰہی کے مقابلے میں اپنی عقل استعمال کی اور کہا۔ اے اللہ! تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے (آدم) کو مٹی سے...... یعنی اس تکبر نے شیطان کو مردود ٹھہرایا اللہ کی بارگاہ سے اور پھر رسوا و ذلیل و خوار کردیا...... اب وہ ہمیشہ کے لیے ملعون ہے۔

''المتکبر......'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بڑائی اور کبریائی اسی کے شایانِ شان ہے اور یہ وصف صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔

ایک حدیث قدسی کا مفہوم یہ ہے کہ کبر (بڑائی) لباس الوہیت ہے یعنی وصفِ خداوندی ہے تو جو شخص اسے اختیار کرے گا وہ غیرتِ خداوندی کو چیلنج کرے گا۔

قرآن پاک میں کئی مقامات پر تکبر کی مذمت کی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر و مغرور دل پر مہر لگا دیتا ہے۔'' (سورۂ مومن)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اترانے والے مغرور کو پسند نہیں فرماتا......'' (سورۂ نسا)

''(دوزخ) تکبر کرنے والوں کا بدترین ٹھکانا ہے۔'' (سورۂ زمر)

''اور زمین پر اکڑ کر اور اترا کر نہ چل کیونکہ اس (متکبرانہ ادا) سے نہ تو، تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندیوں کو چھولے گا۔''

(سورۂ بنی اسرائیل)

غرور و تکبر کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، جاہ و منصب اور قوتِ اقتدار وغیرہ...... یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان جاہلیت کے بتوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا۔ اللہ نے غرورِ جاہلیت اور آباؤ اجداد پر فخر کے طریقوں کو مٹا دیا ہے۔ قرآن و حدیث میں بار بار انسان کو اس کی حقیقت اور اصلیت بتائی گئی ہے تاکہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس رہے اور اللہ نے واضح طور پر فرما دیا کہ اللہ کے نزدیک عزت و عظمت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔

(سورۂ حجرات)

☆☆☆

جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا...... ''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اور جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔'' حضور اقدسؐ نے فرمایا...... کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تکبر میری چادر ہے اور عظمت میری چادر ہے۔ جس نے ان دونوں میں سے کسی معاملے میں مجھ سے نزاع (فساد، جھگڑا) کیا میں اس کو جہنم میں ڈال دوں گا اور مجھے پروا نہیں۔''

سرور کائناتؐ سے کہا گیا کہ فلاں شخص بہت متکبر ہے تو آپ نے فرمایا۔ ''کیا اسے موت یاد نہیں؟''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت نوحؑ نے وقتِ آخر اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں دو باتیں کرنے کے لیے اور دو سے باز رہنے کے لیے کہتا ہوں۔ اور تمہیں لا الہ الا اللہ کو کثرت سے پڑھنے کی تاکید کرتا ہوں کیونکہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو کچھ ہے اگر اسے ترازو کے ایک پلڑے میں اور دوسرے میں لا الہ الا اللہ رکھ دیا جائے تو یہ پلڑا بھاری ہوگا...... اگر اسے آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اس کے حلقے کے اوپر رکھ دیا جائے تو یہ توڑ دے گا...... اور میں تمہیں سبحان اللہ وبحمدہ پڑھنے کا حکم دیتا ہوں کیونکہ یہ کلمہ ہر ایک کی عبادت اور اسی سے روزی ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا...... ''اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب کا علم عطا کیا اور وہ متکبر ہو کر نہ مرا۔''

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ ''ہر سنگدل اکڑ کر چلنے والے...... متکبر مال جمع کرنے والے اور لوگوں کو دین سے روکنے والے کے لیے جہنم ہے...... اور ہر مفلس، ضعیف کے لیے جنت ہے۔''

آقائے دو جہاںؐ نے فرمایا...... ''قیامت

میں ہمارا مقرب اور محبوب وہ شخص ہوگا جو بلند اخلاق ہوگا...... قیامت میں ہمیں سب سے زیادہ ناپسند اور ہم سے دور وہ شخص ہوگا جو بے ہودہ گو اور متکبر ہوگا...... یہ مغضوب ہوگا۔“

آپؐ کا ارشاد ہے کہ ”قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح متکبر لوگ اٹھائے جائیں گے لوگ روندتے ہوئے انہیں درماندہ کردیں گے پھر انہیں جہنم میں لے جایا جائے گا اور انہیں سپردِ آگ کردیا جائے گا یہ جہنمیوں کی پیپ پئیں گے۔“

آقاؐ نے فرمایا۔ ”دوزخ میں ایک محل ہے جس میں متکبرین کو داخل کرکے اسے بند کردیا جائے گا۔“

حضورؐ نے دعا فرمائی...... ”اے اللہ! تکبر کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“ مزید فرمایا...... ”جو دنیا میں تین حالتوں سے پاک اور صاف جائے وہ جنت میں جائے گا۔ قرض، تکبر اور خیانت۔“

حضرت وہبؒ کا ارشاد ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرما کر کہا کہ تو ہر متکبر شخص پر حرام ہے۔“

حضرت حسنؓ نے فرمایا...... ”انسان روزانہ اپنے ہاتھ سے اپنا بول صاف کرتا ہے پھر بھی مالکِ حقیقی سے مقابلہ کرتا ہے۔“

حضرت محمدؒ بن حسینؓ بن علیؓ کا قول ہے کہ انسان کے اندر جس قدر تکبر ہوتا ہے اتنی ہی اس کی عقل کم ہوتی ہے۔“

حضرت سلیمانؑ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سا گناہ ہے جس کی موجودگی میں کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی؟ تو آپؑ نے فرمایا۔ ”تکبر......“ ایک بزرگ نے ایک متکبر سے فرمایا...... ”تمہاری ابتدا نطفۂ ناپاک سے ہے اور تمہارا انجام ایک گندی لاش ہے اور تم ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی کو اٹھائے ہوئے ہو۔ جب قلب میں کبر و غرور قائم ہوجائے تو اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں اور جو دل میں ہوتا ہے وہی ظرف میں سے ٹپکتا ہے تبھی اس کے اثر سے گردن مڑ جاتی ہے۔

☆☆☆

حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ ”ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کے نیک اعمال پہاڑ جیسے تھے۔ مگر پھر بھی وہ لوگ مغرور نہ تھے اور تم ایسے ہو کہ تمہارے پاس اعمال بھی نہیں اور اس کے باوجود تم مغرور ہو۔“

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا...... ”شیطان کے جال میں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کی نعمتوں پر فخر کرنا...... اس کی عطاؤں پر غرور کرنا، اللہ کے بندوں سے تکبر کرنا اور اللہ کی ناپسندیدہ خواہشات کی پیروی کرنا۔“

حضور اقدسؐ نے فرمایا۔ ”جو شخص فخر و تکبر سے اپنے تہمند کو گھسیٹتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا......“ مزید فرمایا۔ ”ایک شخص اپنی چادر پر فخر کرتے ہوئے اپنے نفس سے اتراتا تھا اللہ نے اسے ایسا زمین میں دھنسایا کہ وہ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا......“

آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو ”تکبر سے اپنے کپڑے گھسیٹ کر چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر رحمت کی نظر نہ فرمائے گا۔“ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ”اگرچہ اہلِ فارس اور روم کے ماتحت کیوں نہ ہوں۔ وہ بھی ان سے فساد کریں گے اللہ تعالیٰ اہلِ تکبر پر دوسروں کو مسلط کردیتا ہے۔“

حضرت ابوبکر الہندلیؒ سے روایت ہے کہ ہم سیدنا حسنؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ابن الہشیم کا گزر ہوا جو گھر جارہا تھا اس نے ریشم جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو پنڈلیوں سے نیچے تک تھے وہ نہایت متکبرانہ انداز میں قدم نکال رہا تھا...... حضرت حسنؓ نے اس پر نگاہ ڈال کر فرمایا۔ ”اے ناک چڑھانے والے افسوس تو اترا کر منہ پھیلائے اپنے دونوں پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے جارہا ہے...... اے بے وقوف! تیرے پہلوؤں میں ایسی نعمتیں بھی ہیں جن کا تو شکر ادا نہیں کرتا جو اللہ کے حکم سے بنائی گئی ہیں تیرا ہر عضو اللہ کی نعمت ہے مگر شیطان کی اس پر نگاہ ہے کہ قبضہ جمالے...... واللہ اگر فطرت کے مطابق تو چلتا تو اس دیوانگی کی چال سے بہتر

تھا اس نے سنا تو آ کر معذرت خواہ ہوا...... آپؒ نے فرمایا...... مجھ سے معذرت نہ چاہو بلکہ اپنے اللہ کے حضور توبہ کرو کیا تو نے یہ حکم ربانی نہیں سنا......اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو بلاشبہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں جیسا بلند ہو سکتا ہے۔''

حضرت حسنؓ کے قریب سے ایک نوجوان خوب صورت لباس پہنے ہوئے گزرا۔ آپؓ نے اسے بلوا کر کہا۔ ''اے نوجوان! مجھے تیری جوانی پر حیرانی ہے۔ تیری عادات بھی ناپسندیدہ ہیں؟ قبر نے تیرے بدن کو چھپالیا ہے؟ کیا تو نے اپنے اعمال سے ملاقات کرلی ہے تیرے دل کی بیماری نے تیرا ستیاناس کر دیا ہے۔ اپنے دل کا علاج کر...... اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے پاک صاف دل کی ضرورت ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص کسی دوزخی کو دیکھنا چاہے وہ اس آدمی کو دیکھے جو خود تو بیٹھا ہو اور دوسرے اس کے سامنے کھڑے ہوں۔''

☆☆☆

روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا شخص گزرا ہے جس نے اپنے گناہوں سے بنی اسرائیل کو عاجز کر رکھا تھا۔ یہ ایک ایسے عابد کے قریب سے گزرا جس کی عبادت کے سبب اس کے سر پر ابر سایہ کیے رہتا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ بنی اسرائیل کا عابد ہے میں گناہ گار ہوں اگر اس کے پاس بیٹھ جاؤں تو شاید اللہ تعالیٰ رحم فرمادے...... عابد کو خیال گزرا کہ یہ شخص اگر یہاں بیٹھا تو میری بدنامی ہوگی خواہ مخواہ شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے گا اس نے اس شخص سے نفرت کرتے ہوئے کہا...... مجھ سے دور ہو جا...... اس پر اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے نبی پر وحی فرمائی...... کہ ان دونوں سے کہو کہ دوبارہ عمل کرنا شروع کریں کیونکہ میں نے اوباش کو صاف کر دیا اور اس عابد کی عبادت ختم کر دی اس کے اعمال برباد کر دیے۔

دوسری روایت ہے کہ عابد کے سر سے ابر ہٹ گیا اور اس توبہ کرنے والے کے سر پر آ گیا۔ حضرت وہبؒ کا کہنا ہے کہ علم آسمان سے نازل ہونے والے صاف منہ کے پانی کی طرح ہے۔ جسے درخت خوب رگیں بھر کر پیتے ہیں...... بعد ازاں اپنے ذائقے کے مطابق اسے بدل دیتے ہیں۔ کڑوا درخت ہو تو اس کی کڑواہٹ میں اضافہ ہوتا ہے میٹھا ہو تو اس کی مٹھاس میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح علم بھی ہے...... متکبر اسے سیکھ کر متکبر بن جاتا ہے...... عاجزی کرنے والا علم سیکھ کر متواضع بن جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس کا مقصود ہی تکبر ہو اور وہ جاہل ہو جب علم حاصل کرے گا تو اس کے مل جانے پر خوب تکبر کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والا اگرچہ جاہل ہی کیوں نہ ہو جب علم حاصل کرے گا تو جان لے گا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہوگئی ہے لہٰذا مجھے اللہ سے ڈرنا ہے لہٰذا اس میں اللہ کا خوف زیادہ ہوگا۔ وہ پہلے سے زیادہ تواضع کرنے لگے گا۔''

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے نبی کریمؐ کے سامنے ایک آدمی سے تلخ کلامی کرتے ہوئے کہا...... اے کالی کے بیٹے......! آپؐ نے فرمایا۔ ''اے ابوذر بہت کچھ ہوگیا...... کسی سفید کو سیاہ پر فضیلت نہیں ہے۔'' یہ بات سن کر میں لیٹ گیا اور اس شخص سے کہا ''اٹھو میرے رخسار پر پاؤں رکھو۔'' حضور اقدسؐ نے ایک شخص کو فرمایا۔ ''دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔'' اس نے کہا ''مجھ سے یہ نہیں ہوتا......'' آپؐ نے فرمایا۔ ''تجھ سے یہ نہ ہو۔'' اس نے دائیں ہاتھ سے محض تکبر کی وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا تھا...... راوی بتاتے ہیں کہ اس کے بعد اس کا دایاں ہاتھ کبھی نہیں اٹھا یعنی مفلوج ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

حضرت وہب بن منبہؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب فرعون سے کہا...... تم ایمان لے آؤ اور حکومت تیری ہی رہے گی تو اس نے کہا کہ ہامان سے مشورہ کرلوں پھر اس نے ہامان سے مشورہ کیا تو ہامان کہنے لگا...... اب تک تو، تو رب بنا بیٹھا تھا لوگ تیری

عبادت کرتے تھے اور اب بندہ بنے گا تو تُو عبادت کرے گا..... چنانچہ اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نفرت ہوئی اور حضرت موسیٰ کے تابعداروں سے نفرت کرنے لگا..... تب اللہ تعالیٰ نے اسے غرق کر دیا..... اور دنیا کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا۔

حضرت انسؓ کا فرمان ہے کہ صحابہ کرامؓ کو نبی اکرمؐ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا..... جب وہ حضورؐ کو دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے کیونکہ انہیں علم تھا کہ آپؐ اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ حضور اکرمؐ بعض اوقات اپنے اصحاب کے ہمراہ چلتے تو انہیں آگے چلنے کا حکم فرما دیتے اور خود ان کے درمیان چلتے تا کہ انہیں تعلیم ہو..... آپ یہ عمل نفس کو وسوسوں سے پاک رکھنے کے لیے کرتے..... حضرت عبداللہ بن سلامؓ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے بازار سے گزرے کسی نے کہا کہ آپ نے کیوں بوجھ اٹھا رکھا ہے..... کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے نیاز کر رکھا ہے آپؓ نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ متکبر نہ بن جاؤں۔''

☆☆☆

شہر بسطام میں ایک بڑے رتبے کا آدمی بہت پابندی سے حضرت بایزید بسطامیؒ کی مجلس میں جایا کرتا تھا اس نے ایک دن ان سے فرمایا۔ ''اے ابو یزیدؒ! میں تیس سال سے ہمیشہ روزہ رکھ رہا ہوں کبھی ناغہ نہیں کرتا اور رات میں قیام کرتا ہوں۔ سوتا نہیں..... لیکن اس کے باوجود آپؒ جس علم کی باتیں کرتے ہیں اس میں سے کوئی بھی بات میرے دل میں نہیں آئی۔ حالانکہ میں ان باتوں کی تصدیق کرتا ہوں اور انہیں پسند کرتا ہوں..... ''حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا.....'' اگر تم تین سو سال تک بھی روزہ رکھو اور رات کو قیام کرو پھر بھی تم اس کا ذرہ نہیں پا سکو گے..... ''پوچھا کیوں؟ آپؒ نے فرمایا۔'' وہ اس لیے کہ تم اپنے نفس کی وجہ سے حجاب میں ہو..... ''اس نے کہا کہ'' اس کی کوئی دوا ہے؟ آپؒ نے فرمایا'' دوا تو ہے مگر تم اسے قبول نہیں کرو گے.....'' اس نے کہا کہ آپؒ بیان تو کیجیے.....'' تب حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا..... ''تم ابھی حجام کے پاس جاؤ اپنا سر اور داڑھی منڈواؤ..... یہ لباس اتارو چوغہ کو تہبند کی طرح باندھو اور اپنے گلے میں اخروٹ سے بھرا تھیلا لٹکاؤ اور اپنے ارد گرد بچوں کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ جو بھی مجھے ایک تھپڑ لگائے گا میں اسے ایک اخروٹ دوں گا..... اسی طرح تمام بازاروں میں لوگوں کے سامنے اور اپنے جاننے والوں کے سامنے جاؤ'' اس شخص نے کہا۔ ''سبحان اللہ..... آپؒ مجھے ایسا کہہ رہے ہیں؟'' آپؒ نے فرمایا کہ ''تیرا سبحان اللہ کہنا شرک ہے.....'' اس نے کہا'' وہ کیسے؟'' آپؒ نے فرمایا'' وہ اس لیے کہ تو نے اپنے نفس کو بڑا سمجھا اور اس کی پاکی بیان کی.....'' اس شخص نے کہا کہ ''میں یہ کام تو نہیں کر سکتا آپ مجھے کوئی دوسرا طریقہ بتائیں؟''

آپؒ نے کہا۔ ''سب سے پہلے یہی کام کرو.....'' اس نے کہا کہ'' میں اس کی طاقت نہیں رکھتا..... '' آپؒ نے فرمایا..... کہ'' میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم قبول نہیں کرو گے.....'' کیونکہ در حقیقت اس شخص نے اپنے نفس کو افضل سمجھ لیا تھا۔

☆☆☆

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ ''عمدہ گناہ وہی ہے جس سے توبہ کی توفیق نصیب ہو..... اور بدترین ہے وہ عبادت جس میں خود بینی (غرور) نمایاں ہو جائے۔''

ایک بار حضرت بایزید بسطامیؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ'' آپؒ بھوک کی اس قدر تعریف کیوں کرتے ہیں؟'' آپؒ نے فرمایا..... ''اگر فرعون بھوکا ہوتا تو خدائی کا دعویٰ نہ کرتا..... متکبر کو کبھی معرفتِ الٰہی میسر نہیں ہوتی.....'' آپؒ سے پھر سوال کیا گیا کہ'' متکبر کون ہوتے ہیں؟'' آپؒ نے فرمایا۔'' جن لوگوں کو تمام کائنات میں اپنا نفس زیادہ اچھا نظر آئے۔''

حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ'' اگر اس زمانے کے عالموں اور زاہدوں کے غرور کا وزن کیا جائے تو امرا اور بادشاہوں کے تکبر سے بہت زیادہ

ہوگا۔" فرماتے ہیں کہ "آراستہ مکانوں پر غرور نہ کرو...... بہشت سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے، کثرتِ عمل پر غرور نہ کرو باوجود اس قدر عبادت کے ابلیس کا کیا حشر ہوا...... عبادت میں بھی گھمنڈ نہ کرو۔"

آپؒ فرماتے ہیں۔ "دل پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔ 1۔ مردہ۔ 2۔ بیمار 3۔ غافل۔ 4۔ وہ جس پر پردہ پڑا ہوا ہو۔ (یہود کا) 5۔ ہوشیار دل (سچے عبادت گزار اور متقین کا)"

تفسیر قرطبی میں لکھا ہے کہ جس طرح عورتوں کے لیے زیور کا چھنکانا اور اس کو غیر مردوں پر ظاہر کرنا حرام ہے اسی طرح مردوں کے لیے عجب خود پسندی سے جوتیوں کا پھٹکارنا اور زمین پر دبا کر چلنا بھی حرام ہے کیونکہ تکبر و خود پسندی گناہِ کبیرہ ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ "خدا کا خوف ہی علم ہے اور مغرور ہونا ہی جہالت ہے۔" حضور نبی کریمؐ نے فرمایا۔ "وہ بہت برا ہے جس نے سرکشی کی تکبر کیا اور اپنے خالق کو بھول گیا وہ شخص بھی بہت برا ہے جس نے تکبر کیا اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا لیکن بلند و برتر اللہ کو بھول گیا اور وہ نہایت ہی برا ہے جو زندگی کے مقصد، مصائب اور موت کو بھول گیا۔ سب سے برا وہ ہے جس نے دین سے بغاوت کی اور اپنی ابتدا اور انتہا کو بھول گیا۔" حضرت ثابتؓ سے روایت ہے کہ سرور کائناتؐ سے کہا گیا کہ فلاں شخص بہت متکبر ہے آپؐ نے فرمایا۔ "کیا اسے موت یاد نہیں؟"

تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تکبر ایک مسلمان کے لیے کس قدر ہلاکت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ آپ کا کلام، آپ کا لباس، آپ کا علم اور آپ کا مکان ان تمام چیزوں کی بدولت ہم تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں...... اور سامنے والے کو اپنے سے کمتر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ شاید تو نہیں بلکہ یقیناً آج اسٹیٹس کی دوڑ بھی اسی کا حصہ ہے۔ اسی لیے اپنے سامنے والے کو بے حد تحقیر آمیز انداز میں ملتے ہیں۔ اس کے کپڑے، اس کی گاڑی، اس کا گھر ہر چیز پر ہماری ایک غرور آمیز کیفیت ہوتی ہے...... ہم اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اس پر جملے کستے ہیں...... اس حقیقت کو جانے بنا کہ ہم اپنے سے سامنے والے کو چھوٹا سمجھ رہے ہیں تو اس لمحے ہم خود کس قدر چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں...... یہ شاید ہم نے کبھی نہیں سوچا...... بہر حال تکبر جیسی برائی سے جو کہ فی زمانہ ہمارے نفوس میں بری طرح حلول کر گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو اپنے نفس کی تربیت کرتے ہوئے اپنے سے تکبر کو دور کرنا ہے...... کہ تکبر اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ہمارا رب عاجزی اور انکساری پسند کرتا ہے۔

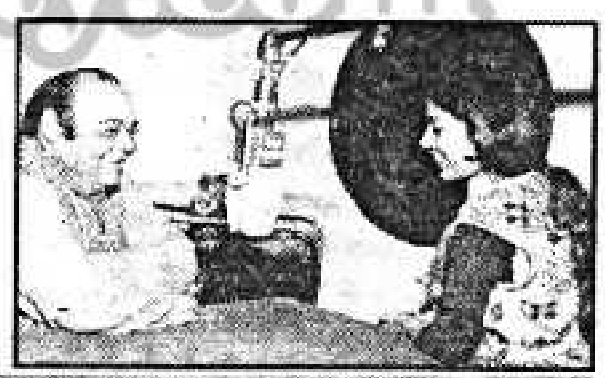
ہم کہتے ہیں کہ رب اپنی ذات میں یکتا ہے...... سارے خزانے اسی کے ہیں، اس جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ وہ مالکِ کُل ہے تکبر اور فخر اسی کو سزاوار ہے۔ کیونکہ صرف وہ اس لائق ہے کہ اپنی ذات پر فخر اور تکبر کر سکے...... انسان پر لازم ہے عاجز ہونا...... کیونکہ اس کی اصلیت ناپاک قطرے کی ہی ہے اس لیے عاجز شخص دنیا و آخرت میں پھل پاتا ہے۔ آخرت میں اپنے رب کو پیش کرنے کے لیے جو سب سے بہترین تحفہ ہے۔ وہ "عاجزی" ہے۔ بس یہی نکتہ سمجھ میں آ گیا تو ہم سنور گئے۔

پروردگار ہم سب کو تکبر جیسی برائی سے بچائے اور ہمیں عاجزی اور انکساری عطا کرے۔ (آمین)

حرفِ آخر:

اپنے عظیم الشان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اے میرے رب اس مضمون کی تیاری میں کہیں کوئی غلطی، کوئی کوتاہی، کوئی کمی دانستہ ہو گئی ہو تو اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف فرما دے کہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے...... آمین۔ اس مضمون کی تیاری میں میں نے جن بے حد قابلِ قدر عظیم ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور اس مضمون میں تعاون کرنے والوں کو مطالعہ کرنے والوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔






فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ

عالمگیر شہرت کی حامل صداکارہ اور فن کارہ

نیلوفر عباسی سے دلپذیر باتیں

رضوانہ پرنس

ڈیئر قارئین اس بار فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ میں آپ جس ہیروئن کی کہانی پڑھنے جارہے ہیں ان کے لیے بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ

پھول کو شور مچاتے کبھی دیکھا ہے قمر

تم ہو خوشبو تو بتانے کی ضرورت کیا ہے

1970ء کی دہائی کی نیلوفر علیم کو لوگ ان کے اصل نام کے بجائے شہروری کے نام سے زیادہ جانتے ہیں اور یہ خوش نصیبی بہت کم آرٹسٹوں کو نصیب ہوئی ہے

کہ لوگ انہیں ان کے اصل نام کے بجائے کردار کے نام سے پکارنے لگیں۔ شہزوری سیریل میں ان کے کردار نے اتنی زیادہ دھوم مچائی تھی کہ اس کی شہرت کی خوشبو پاکستان کے ہر گھر میں مہکتی تھی اور اس کی ہر قسط کا انتظار لوگ اتنی شدت سے کرتے تھے کہ ان کے لیے ہفتہ گزارنا مشکل ہو جاتا تھا اور اس کے علاوہ بھی وہ جس ڈرامے میں جلوہ گر ہوتی تھیں وہ ناظرین کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ عید پر ان کا ڈراما لازمی ہوتا تھا اور لوگوں کی واحد تفریح ان کا ڈراما ہوتا تھا۔ دوستو! یہ تو تھی اپنے دور کی مقبول ترین ہیروئن کی شہرت کی ایک چھوٹی سی جھلک...... اور آج وہی ہیروئن ہم سب کی خوش قسمتی سے ہمارے مقبول ترین سلسلے میں اپنی یادوں کی خوب صورت مالا پرو رہی ہیں اور اس مالا کی جگمگاہٹ میں جیسے باقی سارے منظر دُھندلاتے جا رہے ہیں۔

نیلوفر امریکا سے پاکستان آئی ہوئی تھیں اور ان کے اعزاز میں تقاریب اور دعوتوں کا سلسلہ ایک تسلسل سے جاری تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اب بھی وہ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہی ہیں اور شہزوری نے اب تک لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ نیلو جی ہمارے ناول کی تقریب رونمائی کی بھی مہمان خصوصی تھیں اور وہیں پر انہوں نے ہم سے اس انٹرویو کا وعدہ کیا تھا۔ سو ایک روز وعدے کے مطابق ہم اور عذرا رسول ان کی دوست شمیم تھانوی کے خوب صورت بنگلے پر ان سے ملاقات کے لیے جب پہنچے تو سانولی سلونی بے حد پُرکشش سی نیلو نے گیٹ پر ہمارا بہت پُرتپاک استقبال کیا۔ سادہ سے شلوار شوٹ میں ملبوس نیلو کی گود میں ان کا منا سا نواسہ بھی تھا جو اپنی نانی کی ممتا بھری آغوش میں بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''اصل میں رات کو اس نے ماریہ کو خوب جگایا تھا، میں نے سوچا وہ تھوڑی دیر سو لے بس اس لیے یہ موصوف اس وقت میرے پاس ہیں۔'' وہ محبت سے ننھے محمد فیض کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتا رہی تھیں اور ہمیں وہ اس روپ میں اور بھی پیاری لگ رہی تھیں۔ کچھ دیر ہم اور عذرا، نیلو جی سے اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرتے رہے۔ ہنسی کی جلترنگ سے ماحول مزید خوشگوار ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ، ساتھ ٹرالی پر سجے مزے دار لوازمات سے انصاف بھی کیا جا رہا تھا۔ نیلو جی کی بیٹی بھی کچھ دیر کے لیے ہماری اس ہنستی مسکراتی محفل میں آ کر بیٹھیں اور جب ہم نے اپنے انٹرویو کا آغاز کرنا چاہا تو وہ ڈسٹربنس کے خیال سے اپنے ننھے منے گڈے کو لے کر وہاں سے اٹھ گئیں جبکہ عذرا اپنی آنکھوں میں دلچسپی سموئے ہمہ تن گوش تھیں۔

✧......نیلو جی آپ کے خوب صورت افسانے کا آغاز اگر آپ کے بچپن سے کیا جائے تو یقیناً قارئین کو زیادہ مزہ آئے گا۔ ہماری بات پر اُن کی آنکھوں میں جیسے یادوں کے بے شمار چراغ جھلملا اٹھے۔

نیلوفر عباسی ✧...... ''تم نے بالکل ٹھیک کہا میری زندگی کے اس اہم ترین خوب صورت اور معصوم دور میں جائے بغیر تو یہ افسانہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔'' انہوں نے اپنی دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ ہماری بات کی تائید کی۔

✧......اور قارئین نیلو نے جب اپنے ماضی کے اوراق الٹنے شروع کیے تو ان کی یادوں کا ہر صفحہ ہمیں اپنے سحر میں جکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

نیلوفر عباسی ✧...... ''میری ممی اقبال جہاں بے حد حسین اور گوری چٹی تھیں جبکہ میرے ڈیڈی Tall اور سانولے تھے، میں نے اپنی رنگت ڈیڈی سے لی ہے۔'' نیلو نے اپنی کہانی کی ابتدا اپنے والدین کے ذکر سے شروع کی تو بے اختیار ہم نے ان کے جملے کی جیسے تصیح کی۔

✧......آپ یوں کہیے ناں کہ آپ کے چہرے پر جو اتنی کشش ہے وہ آپ کے ڈیڈی کی مرہونِ منت ہے۔ ہماری بات پر نیلو جی کے ساتھ عذرا بھی ہنس دیں...... آپ کے ممی، ڈیڈی نے یقیناً آپ کے بہت لاڈ اٹھائے ہوں گے...... ہم نے

ان کی یادوں کے تسلسل کو پھر سے جوڑتے ہوئے سوال کیا تو اُن کی آنکھوں میں بچپن کے دن اپنی پوری جزئیات کے ساتھ جگمگا اٹھے۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"جب میں اپنے بچپن میں جھانکتی ہوں تو بے اختیار میری آنکھوں میں پاکستان چوک کا وہ چھوٹا سا فلیٹ گھوم جاتا ہے جس میں میرے بچپن کا بہت خوب صورت حصہ گزرا ہے۔ ہم لوگ اپنی نانی کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔ اتنے چھوٹے سے فلیٹ میں نانی کے علاوہ میری خالائیں اور ماموں تو رہتے ہی تھے اس پر مستزاد یہ کہ میں، ممی اور ڈیڈی بھی وہیں، ان کے ساتھ قیام پزیر تھے۔ اتنے چھوٹے سے فلیٹ میں اتنے زیادہ لوگ تھے لیکن یقین جانو محبت اور یگانگت کی خوشبو سے ہر دم مہکتا رہتا تھا وہ فلیٹ۔ میرے ذہن میں ذرا سی بھی کوئی تلخ یاد اس حوالے سے موجود نہیں ہے۔ دلوں میں ذرا سی بھی تنگی نہیں تھی۔ کھانے کے وقت لمبا سا دستر خوان بچھتا تھا اور سارا خاندان مل جل کر بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتا تھا۔" نیلو جیسے اسی دور میں لوٹ گئی تھیں اور سچ پوچھیے تو تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے ہمیں بھی وہ سب... بے حد اچھا لگ رہا تھا ورنہ آج کل تو ساتھ مل جل کر کھانے کے بجائے ٹی وی یا موبائل کے ساتھ کھانے کا لطف لیا جاتا ہے۔ نیلو ہنوز اپنے بچپن کی وادیوں میں گھوم رہی تھیں۔

"میں اپنے ننھیال کی بے حد لاڈلی بچی تھی۔ سب مجھے بے پناہ چاہتے تھے۔ میرے خوب ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ نانی ہر روز حاجی کی دکان سے میرے لیے برفی لایا کرتی تھیں۔ خالہ میرے لیے کپڑے کی گڑیا بناتیں اور میں خوب دھوم دھام سے اس کی شادی کرتی۔ اس کے لیے نت نئے کپڑے بنایا کرتی۔"

نیلو جی بڑے جذب سے ہمیں بتا رہی تھیں اور ہمارے ساتھ، ساتھ شاید عذرا بھی اس خوب صورت ماحول میں کھوئی ہوئی تھیں۔ کتنا سادہ اور خوب صورت دور تھا وہ۔ اب چھوٹے سے فلیٹ میں کیا بڑے، بڑے بنگلوں میں رہنے والوں کے دلوں میں بھی وہ گنجائش نہیں رہی۔

✧......نیلو جی آپ کے بچپن کا حسین دور ننھیال والوں کے ساتھ گزرا۔ ددھیال کے بارے میں بھی ہمیں بتائیں؟ ہمارے سوال پر انہوں نے مسکراتی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ کافی پیچھے جانا ہوگا۔ میرا سارا ددھیال انڈیا میں تھا۔ میرے ڈیڈی علیم الدین خان اپنے والد شفاعت الدین خان کے سب سے بڑے بیٹے تھے جنہیں میرے دادا نے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی جو انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ میرے دادا کی خواہش تھی کہ وہ بزنس میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ دادا کا رنگون میں ریس کے گھوڑوں کا بزنس تھا لیکن میرے ڈیڈی کا فیصلہ تھا کہ وہ تعلیم کو پھیلانے میں اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ تبھی بنا کسی سفارش صرف اپنی تعلیمی قابلیت کی بدولت انہیں فتح گڑھ چھاؤنی کے آرمی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی جاب مل گئی اور اتنی دولت اور آسائش ہونے کے باوجود انہوں نے یہ جاب کر کے ثابت کر دیا کہ انہیں علم کی روشنی پھیلانے میں کتنی دلچسپی تھی۔"

✧......اچھا یہ تو بتائیں پھر آپ کی ممی اور ڈیڈی کیسے ایک دوسرے کی زندگی میں آئے۔ ہمارا مطلب ہے کہ آپ کے ننھیال اور ددھیال کا ملاپ کیسے ہوا؟ ہمارا ذہن ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"میرے ڈیڈی کو ادبی نشستوں سے بہت دلچسپی تھی اور میرے سب سے بڑے ماموں اسلم فرخی جنہیں ادب سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور وہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے کافی مشہور ہونے کے ساتھ، ساتھ شہر میں قائم ہونے والی ادبی انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ وہیں کسی ادبی نشست میں ان کی ملاقات ڈیڈی سے ہوئی جو ہم خیال ہونے کے باعث دوستی میں بدل گئی۔ میری ممی اقبال جہاں کی جب شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اسلم ماموں کی

پاکیزہ کی ایک تقریب میں قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی سے عذرا رسول اور انجم انصار کا خوبصورت اظہارِ دوستی



نظرِ انتخاب میرے ڈیڈی پر گئی وہ اپنی بہن کے خیالات جانتے تھے جو بے حد روشن خیال، پڑھی لکھی اور علم و ادب کی دلدادہ تھیں اور ڈیڈی بھی ایک صاحبِ علم اور وسیع النظر نوجوان تھے سو باہمی رضامندی سے وہ دونوں شادی کے خوب صورت بندھن میں بندھ گئے۔''

✧ ......اچھا پھر کیا ہوا؟ ہیرو ہیروئن کی شادی کے بعد عموماً کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن یہاں تو ابتدا ہو رہی تھی۔ ہمارے تجسس پر نیلوجی نے اس خوب صورت افسانے کو مزید آگے بڑھایا۔

نیلوفر عباسی ✧ ......''اس زمانے میں پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان سے ہندو اور ہندوستان سے مسلمان اپنے گھر اور کاروبار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ میرے ماموں اسلم فرخی، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت میں رہنے کا عزم و جوش لے کر اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئے۔ کراچی میں ہندوؤں کے بڑے، بڑے مکانات اور بنگلے مع قیمتی ساز و سامان سے آراستہ خالی پڑے تھے۔ انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والے بہت سے لوگ ان پر قبضہ کر کے عیش و آرام اٹھا رہے تھے۔ میرے ماموں بھی یہ سب کر سکتے تھے لیکن ان کی فطرت اور تربیت ایسی نہ تھی کہ بغیر جدوجہد کے فائدہ اٹھانے کا سوچتے۔ انہوں نے پاکستان چوک کے علاقے میں واقع ایک ایسی بلڈنگ کا انتخاب کیا جس کا ہندو منیجر دھنی رام پگڑی وصول کر کے فلیٹ ماہانہ کرائے پر دیتا تھا۔'' نیلو کی کہانی کسی خوب صورت افسانے سے کم نہیں لگ رہی تھی اور ہم اس تسلسل کو توڑنا نہیں چاہ رہے تھے اس لیے خاموشی سے ان کے ساتھ ان کے ماضی کے سفر میں خراماں، خراماں چل رہے تھے۔

''میرے نانا محمد احسن بہت کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت جائداد چھوڑ کر آئے تھے۔ لہٰذا اس کا کلیم بھرا تو انہیں کھارادر کے علاقے میں ایک بڑی زمین الاٹ ہوگئی جس میں کچھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک مشین نصب کروا کر اپنے کارخانے کو شروع کیا جبکہ

میرے ماموں اسلم فرخی نے ریڈیو پاکستان میں جاب کرلی۔ یہ وہی فلیٹ تھا جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا۔" نیلو کی بات پر ہم نے بہت تجسس سے پوچھا۔

✧ ......کیا آپ کے ممی اور ڈیڈی انڈیا میں ہی رہ گئے تھے؟

نیلوفر عباسی ❖ ......"ہاں وہ لوگ میرے ننھیال والوں کے ساتھ پاکستان نہیں آئے تھے۔ وہ لوگ وہیں انڈیا میں ہی رہ رہے تھے۔ پھر 9 اگست 1952ء کو جب میں پیدا ہوئی تو وہ دونوں خوشی سے نہال ہو گئے۔ ممی کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو اپنی بیٹی دکھائیں۔ میرے نانا، نانی اور ماموں، خالہ سب ہی مجھے دیکھنے کو..... بے تاب تھے لیکن پاکستان جانا اتنا آسان نہ تھا۔ ڈیڈی کی فوج کی نوکری، زمین جائداد، لمبا چوڑا کاروبار جس کے وارث ڈیڈی اور میرے چچا شہاب الدین خان تھے اور اگر ڈیڈی یعنی علیم الدین خان پاکستان ہجرت کر جاتے تو اس صورت میں ان کے والد کی آدھی جائداد و زمین بحقِ سرکار ضبط ہو جاتی۔ میرے چچا پاکستان جانے کے لیے اسی وجہ سے تیار نہیں تھے۔ آرام و آسائش کے عادی ہونے کی وجہ سے وہ وہاں پر ملنے والی مشکلات سے ڈر رہے تھے اور ڈیڈی کو بھی منع کر رہے تھے مگر پاکستان اور آزادی میرے ڈیڈی کا خواب تھا انہوں نے اس کے لیے بہت جدوجہد کی تھی اور یہی جذبہ انہیں ہر چیز سے بے نیاز کر کے آخر پاکستان لے آیا۔ اس وقت میں چند ماہ کی تھی۔ میرے ننھیال والوں نے بہت محبت سے ہمارا استقبال کیا۔ جگہ کی کمی یا تنگی کا رونا کسی کی زبان پر نہیں تھا۔ ہر سو بس مسکراہٹیں اور خوشیاں بکھری نظر آتی تھیں۔ پھر پانچ سال بعد میرا بھائی شہریار پیدا ہوا۔ وہ بہت حسین، گول مٹول بالکل گڈے جیسا بچہ تھا جسے میں ہر وقت گود میں لینے کی ضد کیا کرتی تھی۔ وہ سارے محلے کا بھی بہت لاڈلا بچہ تھا۔" نیلو جی ایک لمحے کو چپ ہو گئیں۔ اُن کی آنکھوں میں جیسے کوئی دکھ ہلکورے لینے لگا تھا۔ وہ کچھ ایسی بات بتانے لگی تھیں جو شاید ہم لوگ بالکل بھی سننا نہیں چاہ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ لمحے کی اس سوگوار سی خاموشی کو توڑتے ہوئے اپنی کہانی کو آگے بڑھایا۔

"بہت پہلے جب میری پرنانی کا انتقال ہوا تو یہ میں نے اپنی زندگی میں کسی کی پہلی موت دیکھی تھی۔ میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ سب سے بڑی تھیں۔ اس لیے سب سے پہلے چلی گئیں۔ میں سمجھتی تھی کہ سب لائن سے باری، باری اللہ میاں کے پاس جاتے ہیں۔ اپنے منے سے بھائی کے لیے میں بہت اداس اور فکرمند رہتی کہ سب مر جائیں گے اور یہ اکیلا رہ جائے گا۔ میں باقاعدہ یہ سوچ کر روتی تھی لیکن میرا وہ چاند سا بھائی سب سے پہلے چلا گیا۔"

✧ ......ارے وہ کیسے؟ ہم نے بہت شاکڈ ہو کر پوچھا۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"شہریار میرا بھائی جب ایک سال کا تھا تو اسے متواتر بخار رہنے لگا۔ ڈاکٹر سے دوا لیتے رہے لیکن اصل میں وہ گردن توڑ بخار تھا جس کو اس وقت ڈاکٹر سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔ یہ ہماری زندگی کا بہت ہی بڑا سانحہ تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ شہریار ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔ ممی بالکل ٹوٹ گئیں۔ انہیں کسی طور چین نہیں آتا تھا۔" ماحول اداس سا ہو گیا تھا لیکن زندگی تو نام ہی ہے اس گلدستے کا جس میں خوشیوں کے پھولوں کے ساتھ کچھ غم کے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اور انسان کو کبھی، کبھی ان کی چبھن بھی سہنی پڑتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے ہم نے نیلو جی کا موڈ بدلنے کی کوشش کی۔

✧ ......نیلو جی، آپ بچپن میں اسکول جانے سے گھبراتی تھیں یا شوق سے جایا کرتی تھیں؟ ہمارے سوال پر اُن کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"میں ہمیشہ سے پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور بہت شوق سے اسکول جایا کرتی تھی اور شاید یہ شوق مجھے ڈیڈی کی وجہ سے زیادہ ہوا تھا۔"

✧ ......بھلا وہ کیسے؟ ہم نے بے ساختہ پوچھا۔



نیلوفر عباسی، قمر علی عباسی اور ذیشان رسول

نیلوفر عباسی ❖......''اصل میں جب میں نے اسکول جانا شروع کیا تو ڈیڈی نے کہا تھا کہ ہمیشہ فرسٹ آنا اور بس اُن کی یہ بات میں نے اپنے ذہن میں بسالی اور اگر کسی مہینے میں سیکنڈ آجاتی تو میری پریشانی کی حد نہیں ہوتی تھی کہ ڈیڈی خفا ہو جائیں گے ایسے میں مجھے ممی کی مدد لینا پڑتی تھی۔ اسی لیے چھوٹی کلاس سے ہی میں نے پڑھنے میں بے حد محنت کی اور بہترین رزلٹ کی وجہ سے مجھے ہر بار ڈبل پروموشن ملتی گئی یعنی کلاس ون سے کلاس تھری اور پھر ففتھ کلاس میں آگئی۔''

✧......اوہ گاڈ، ویری امپریسو! ہم نے حیرت سے کہا۔

نیلوفر عباسی ❖......''اور اب ایک اور مزے کی بات سنو۔'' نیلو نے ہنستے ہوئے ہم لوگوں کو مزید حیران کُن بات بتائی۔ ''جب میں ڈبل پروموشن لے کے ففتھ کلاس میں آئی تو عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اب ہم اور زیادہ مشکل کتابیں پڑھیں گے۔ ایسے میں ہمارے ایک پڑوسی لڑکے نے بہت اتراتے ہوئے ہمیں اپنی نویں کلاس کا کورس دکھایا تو وہ مجھے جیسے چیلنج کرتا ہوا محسوس ہوا میں نے اسی شام ڈیڈی سے کہا کہ میں نائنتھ کا ایگزام دینا چاہتی ہوں۔ ڈیڈی کی حیرت اور خوشی دیدنی تھی انہوں نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ نویں کا امتحان دینے کے لیے چودہ برس کی عمر اور آٹھویں جماعت کا پاس ہونا ضروری ہے۔''

✧......یعنی کہ آپ نے ففتھ کلاس کی اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے آٹھویں کلاس کا امتحان دیا؟ ہم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

نیلوفر عباسی ❖......''بالکل جناب اور یوں میں نویں جماعت کی اسٹوڈنٹ ہو گئی لیکن بھئی اس میں مجھے کچھ نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ ایک تو نویں جماعت کے فارم میں میری عمر بڑھا کر لکھا دی گئی اور پھر یہ کہ ہم جو ہمیشہ فرسٹ آتے تھے میٹرک میں سیکنڈ کلاس لے کر پاس ہوئے اور سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ جو لڑکے اور لڑکیاں ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری بڑی کلاس میں جانے کے بعد ہم کو باجی کہنے لگے۔''

آخری جملہ انہوں نے اتنے مزے سے کہا کہ ہم سب کی بے ساختہ ہنسی سے کمرا بھی کھلکھلا اٹھا اور ہنسی کے اس جلترنگ میں نیلو نے اپنے افسانے کو آگے بڑھایا۔

''میرے بچپن کے معصوم دنوں کی بے شمار یادیں ہیں۔ رمضان میں ہمارے محلے کی گلی میں ایک رونق سی بکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ روزہ رکھنا ہوتا یا نہیں ہر عمر کا بچہ سحری کے لیے ضرور اٹھتا تھا۔ اکثر سحری کے بعد سب بچے مل کر لنگڑی پالا کھیلتے جو ایک مزے کا کھیل تھا۔ بچوں میں زیادہ روزے رکھنے کا مقابلہ بھی جاری رہتا تھا۔ افطاریاں گھروں میں بانٹنے کا بھی خوب رواج تھا۔ بہت خوب صورت سی رونق بکھر جاتی تھی۔ افطار

کے وقت 29 روزے کی شام سب اپنی، اپنی چھتوں پر چاند دیکھنے چڑھ جاتے۔ پھر اپنے نئے جوتے اور کپڑے اپنے بستر کے سرہانے رکھ کر ہم بچے سوتے تھے اس ایکسائٹمنٹ کا مزہ کوئی سوچ نہیں سکتا۔ چاند کا اعلان ہوتے ہی ڈیڈی برنس روڈ جاتے اور تازہ تازہ کھویا لے کر آتے۔ پھر ممی سوّیاں بناتیں جو اتنی لذیذ ہوتی تھیں کہ سارا سال لوگ ان سویّوں کا انتظار کرتے تھے۔ محلے میں ہم سب بچے رنگ برنگے خوب صورت کپڑوں میں تتلیوں کی طرح اڑتے پھرتے۔ اپنی، اپنی عیدی سے چیزیں خرید کر کھائی جاتیں۔ بقر عید میں جانوروں کی وجہ سے الگ ہی رونق اور ہنگامہ رہتا تھا۔ محرم کے آغاز پر گلی میں رنگ برنگی سبیلیں لگ جاتیں جن میں پانی اور دودھ کا شربت ملتا تھا۔ ماہ ربیع الاول میں گلی کے شروع اور آخر میں بڑے، بڑے گیٹ بنائے جاتے اور انہیں کاغذ کے پھول پتیوں سے خوب سجایا جاتا ان میں چھوٹی، چھوٹی لائٹس ساری رات جلتی بجھتی بہت اچھی لگتی تھیں بس تم سوچ نہیں سکتیں کہ ہمارے گھر اور محلے میں ہر موسم اور ہر تہوار کو میں نے کس جوش وخروش اور خوب صورتی سے مناتے ہوئے دیکھا ہے۔'' نیلو مکمل طور پر جیسے اسی دور میں واپس چلی گئی تھیں اور ہم ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں ان کی باتیں سن رہے تھے۔ کتنا خالص اور پیار و خلوص سے مہکتا ہوا تھا وہ دور جو اپنے اندر بے پناہ خوب صورتی سمیٹے ہوا تھا جس سے آج کل کی جنریشن ناآشنا ہے۔

✧ ...... واقعی میں نیلو جی آپ نے اتنا خوب صورت سماں کھینچا ہے کہ بس اسی میں جا کر رہنے کو من کر رہا ہے۔ کچھ اور ایسی ہی بچپن کی یادیں ہم سے شیئر کیجیے پھر ہم مزید آگے بڑھتے ہیں۔ ہماری بات پر وہ اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرادیں۔

نیلوفر عباسی ✤ ...... ''ایک نہیں بے شمار خوب صورت یادوں سے سجا ہے میرا بچپن۔ پاکستان چوک کے اس فلیٹ میں گزرا ہر پل میری یادداشت میں محفوظ ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ بڑے گھر کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ نانا نے الگ گھر لے لیا۔ نانا، نانی، خالہ ماموں سب کے جانے کے بعد فلیٹ میں ممی ڈیڈی اور میں رہ گئے۔ نانا کے گھر سے جب بھی کوئی آتا تو میرا ننھا سا دل چاہتا کہ وہ پہلے کی طرح بس یہیں رہ جائیں کبھی واپس نہ جائیں۔ شام کی چائے پر ممی گرم، گرم پھلکیاں تلتیں، کبھی سوجی کا حلوا بنتا کبھی وہ میٹھے ٹوسٹ بناتیں گرم، گرم مہکتی چائے کے ساتھ یہ سب خوب مزہ دیتے۔ چائے پر کوئی نہ کوئی مہمان ضرور ہوتا تھا۔ ماموں لوگ بھی آجاتے تھے۔ چھٹیاں، میں نانی کے گھر گزارتی تھی۔ خوب بڑا سا گھر تھا جس کے آنگن کی کیاریوں میں بیلا لگا ہوا تھا جس کی خوشبو سے آنگن مہکتا رہتا تھا۔ دس سال تک میں نے اکیلے ہی سب سے اپنے ناز نخرے اٹھوائے پھر میری زندگی میں میری بہن روشی نے آکر جیسے نئے رنگ بکھیر دیے۔''

✧ ...... اچھا یہ تو بتائیں کہ جب دس سالہ نیلو کی محبتوں کو شیئر کرنے اس کی ننھی منی سی بہن آگئی تو کبھی اس بچی کو بہن سے جیلسی فیل ہوئی؟ ہم نے ہنستے ہوئے انہیں چھیڑا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے .... بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

نیلوفر عباسی ✤ ...... ''ارے بالکل بھی نہیں۔ وہ میری زندگی کی بے حد حسین صبح تھی جب ڈیڈی نے اسپتال سے آکر بتایا کہ سیکنڈ نیلو آئی ہے۔ اس وقت اپنے باجی ہونے کا احساس کتنا خوش کن لگا تھا وہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور یقین کرو عمر کے اس فرق کے باوجود ہم دونوں پکی دوست رہی ہیں بس یوں سمجھ لو کہ اوپر تلے کی بہنیں لگتی ہیں ہم لوگ، ماشا اللہ۔ اس کی شادی سید تنویر علی جیسے خوش شکل، با اخلاق اور بہت قابل انجینئر سے ہوئی ہے۔ اس کے دو بچے اسامہ علی اور فاطمہ ہیں۔ میں صرف روشی کے ساتھ ہی اپنے بیتے ہوئے خوب صورت دنوں کو شیئر کرتی رہتی ہوں۔'' ان کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے بے پناہ پیار چھپا ہوا تھا۔

✧ ...... اللہ آپ دونوں بہنوں کی محبت کو ہمیشہ



پاکیزہ کی ایک تقریب میں (دائیں سے) نزہت اصغر، بشریٰ مسرور، ناہید چوہدری، نیلوفر عباسی، رخ چوہدری، قمر علی عباسی، عذرا رسول، یاسمین رشید اور انجم انصار

قائم رکھے۔ اچھا نیلو جی اب بات ہو جائے آپ کے شوبز میں آنے کی اور شہرت کی انتہائی بلندیوں کو چھونے کی...... یقیناً آپ کی زندگی کے اس اہم موڑ کو ہمارے قارئین بہت شوق سے سننا چاہیں گے۔ ہماری بات پر انہوں نے اپنی مخصوص دل نشین سی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھا۔

نیلوفر عباسی ❖......''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ اپنی زندگی کے اس اہم ترین موڑ کا ذکر بھلا میں کیوں نہیں کروں گی جس کی وجہ سے آج لوگ مجھے جانتے ہیں، میری عزت کرتے ہیں، مجھ سے پیار کرتے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ کہاں سے آغاز کیا جائے۔

''انٹر سائنس کرنے کے بعد ڈیڈی کے مشورے پر میں نے ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا۔ ویسے بھی اس کالج میں پڑھنا میرا بچپن کا خواب تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں مائیکرو بائیولوجی بھی پڑھائی جاتی تھی جس سے مجھے بے حد دلچسپی تھی۔ یہ 1968ء کی بات ہے میں کالج کے لان میں اپنی دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھی۔ شاید ہمیں کوئی فری پیریڈ مل گیا تھا تبھی اچانک ہی سر جلالی کا بلاوا میرے لیے آ گیا۔ ہاشم جلالی صاحب ہمارے اردو کے پروفیسر ہونے کے علاوہ اسٹوڈنٹ کے لیے extra curricular activities ...... کے انچارج بھی تھے۔ میں سمجھی شاید میں نے ٹیسٹ میں کچھ گڑبڑ کر دی ہے۔ ڈرتے، ڈرتے اسٹاف روم میں گئی تو غیر متوقع طور پر انہوں نے بہت خوشگوار موڈ میں میرا استقبال کیا اور بتایا کہ ریڈیو پاکستان میں جشنِ طلبا منایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کراچی کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ہر شعبے کے لیے ایک طالب علم کو حصہ لینے کی دعوت ہے۔ ہم آپ کو کالج کی طرف سے بھیجنا چاہتے ہیں۔ شعبہ ہوگا ''ڈراما'' ایک لمحے کو تو میں ناقابلِ یقین نظروں سے انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس وقت ریڈیو، ڈرامے کے آڈیشن کے لیے نامزد ہونا بہت کمال کی بات تھی۔ میرے دو خواب تھے ڈی جے سائنس کالج میں پڑھنا اور ریڈیو پر بولنا اور حیرت انگیز طور پر آج میرے دوسرے خواب کو بھی تعبیر ملنے والی تھی۔ میں نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔''

✧......آپ کی آواز ہی اتنی دلکش ہے کہ پورے کالج میں انہیں آپ ہی کا خیال آیا ہوگا۔ ہم سے کہے بنا رہا نہیں گیا تو وہ ہنس دیں۔

نیلوفر عباسی ❖......''نہیں، میرے خیال میں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔'' انہوں نے ٹھیک ٹھاک کسرِ نفسی سے کام لیا تھا۔

''خیر سر جلالی نے مجھے ریڈیو پاکستان سے آیا ہوا لیٹر تھما دیا جس پر آڈیشن کی تاریخ اور وقت درج تھا، اس کے علاوہ انہوں نے مجھے وہاں بالکل وقت پر پہنچنے کی تاکید بھی کی اور مقررہ تاریخ کو میں اپنی دوست فہمیدہ میمن کے ساتھ وقت سے کچھ پہلے ہی ریڈیو پاکستان کراچی پہنچ گئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کے زیادہ سے زیادہ سو پچاس لڑکے لڑکیاں ہوں گے مگر وہاں تو طلبا و طالبات کا اتنا ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ ریڈیو کی انتظامیہ کو اس جم غفیر کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں تو یہ سب دیکھ کر بالکل ہی ناامید ہوگئی اور فہمیدہ سے واپس چلنے کو کہا لیکن اس نے سر جلالی کا ڈراوا دے کر مجھے واپس جانے سے روک دیا۔ پھر آڈیشن کے مرحلے سے لے کر سلیکٹ ہونے تک ایک لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھے تقریباً ایک ہزار طلبا و طالبات میں سے ڈرامے کی ہیروئن سلیکٹ کر لیا گیا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ڈرامے کا نام تھا ''فالتو آدمی'' اپنی اس کامیابی کی خوشی آج بھی میرے دل میں بالکل ویسے ہی موجود ہے۔''

✧......ظاہری بات ہے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی......اور جب آپ کا یہ ڈراما نشر ہوا تو آپ کی آواز کو کتنا پسند کیا گیا۔ ہم نے تعریف کے ساتھ، ساتھ سوال بھی کر ڈالا۔

نیلوفر عباسی ❖......''رضوانہ جتنا میں نے سوچا تھا مجھے اس سے زیادہ پزیرائی ملی۔ پریس نے دل کھول کر تعریف کی۔ اخبار جنگ اور ڈان نے best voice of the year ''سنہری آواز'' جیسے کمنٹس دیے جہاں جاتی تھی لوگ تعریفوں کے پُل باندھنے لگتے تھے۔ اس زمانے میں ریڈیو پر نشر ہونے والے ڈرامے لوگوں کے لیے تفریح کا بہت بڑا ذریعہ بنے......''فالتو آدمی'' کے فوراً ہی بعد رضی اختر شوق نے مجھے ڈراما ''پاداش'' میں ہیروئن کا رول دیا۔ اور اس کے ہیرو ایس ایم سلیم تھے جن کے نام کا ڈنکا بجا کرتا تھا اور ان کے لاکھوں پرستار تھے۔ میں تو جیسے اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی......پھر تو جیسے ریڈیو ڈرامے کرنے کا سلسلہ ایسا شروع ہوا جو تھم ہی نہیں رہا تھا۔ بہت بڑے، بڑے رائٹرز کے لکھے ہوئے ڈراموں میں ان نامور آرٹسٹوں کے ساتھ کام کیا جنہیں اس سے پہلے میں صرف ریڈیو پر سنا کرتی تھی اور ان سے ملنے کا شوق، ان کو دیکھنے کی تمنا بھی دل میں رہتی تھی۔ میری ممی اپوا کی پبلسٹی سیکریٹری تھیں، ہر ہفتے اس آرگنائزیشن کی مصروفیات ریڈیو پر اپوا میگزین کے نام سے پیش کی جاتیں جسے ممی ترتیب دیتی تھیں۔ وہ میرے ریڈیو پر بولنے کے شوق کو جانتی تھیں لیکن ان کا کہنا تھا کہ مجھے سفارش کے ذریعے نہیں بلکہ آڈیشن پاس کر کے اپنے شوق کی تکمیل کرنا چاہیے اور اب ایک ہزار آوازوں میں میرے سلیکشن اور پھر ریڈیو کی دنیا میں اتنی کامیابی نے ممی اور ڈیڈی دونوں کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔'' نیلو کے چہرے پر اس وقت بھی اس کامیابی کی خوشی بکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔

✧......یعنی آپ کے والدین کی حوصلہ افزائی بھی اس فیلڈ میں آپ کے ساتھ رہی؟

نیلوفر عباسی ❖......''ہاں بالکل اور اسی وجہ سے میری زندگی میں کبھی کوئی الجھن یا پریشانی نہیں آئی۔ انہوں نے میرے شوق کا احترام کرتے ہوئے مجھے اس فیلڈ میں آنے سے بالکل نہیں روکا۔ انہوں نے مجھے اچھے اور برے کا شعور دیا تھا۔ انہیں مجھ پر بے حد ٹرسٹ تھا۔ وہ لوگ بہت براڈ مائنڈڈ تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر آنے کو قطعی برا نہیں سمجھتے تھے اور میں نے بھی کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیا جس سے انہیں کوئی شرمندگی



ہو۔میں نے ٹی وی پر کبھی سلیولیس نہیں پہنا حالانکہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن مجھے خود یہ پسند نہیں تھا۔" نیلو کتنے فخر سے اپنے ماں، باپ کے اپنے اوپر اعتبار کو اپنا مقدر بناتی چلی گئیں۔

✧ ...... افسانہ بہت دلچسپی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب جاننا یہ تھا کہ انہوں نے ریڈیو سے ٹی وی تک کا سفر کیسے شروع کیا......؟ ہمارے پوچھنے پر نیلو کی آنکھوں میں ایک پیاری سی چمک جگمگا اٹھی۔



نیلوفر عباسی ✧ ......"بھئی، آج تو تم مجھے یادوں کی اُن خوب صورت وادیوں میں گھومنے پر مجبور کر رہی ہو جہاں سے واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"بھئی یہ ایک اتفاق تھا کہ جس سال میں نے ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں قدم رکھا اسی سال کراچی میں پاکستان ٹیلی ویژن کا بھی آغاز ہو گیا......امیر امام ٹی وی کے ڈراما پروڈیوسر تھے اور ہر ہفتے کسی مشہور افسانہ نگار کے افسانے کی ڈرامائی تشکیل کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں آکر ٹی وی ڈراما کروں لیکن فائنل ایگزام نزدیک تھے اس لیے میں نہیں گئی۔ پھر ایگزام کے بعد ہم کچھ دوستیں ٹی وی اسٹیشن کی سیر کو گئے تو مجھے امیر امام کے بلاوے کا بھی خیال آ گیا سو اُن سے ملنے ہم لوگ ان کے کمرے میں جا پہنچے......وہ اس وقت لنچ کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت خلوص کے ساتھ اصرار کر کے کھانے میں شریک کیا اور پھر اچانک ہی میرے ہاتھ میں ایک اسکرپٹ تھما کر بولے کہ کل شام چار بجے اسی کمرے میں ڈرامے کی ریہرسل ہے، میں تو حیران ہی رہ گئی کہ پہلے کبھی نہ ہم ملے اور نہ ہی انہوں نے مجھے دیکھا تھا پھر کیسے یہ اہم رول آفر کر دیا۔ میری حیرانی دور کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ریڈیو پر وہ مجھے بہت بار سن چکے تھے اور ذہن میں میری شخصیت کا جو خاکہ انہوں نے بنایا تھا میں بالکل ویسی ہی نکلی تھی۔ واقعی میں قسمت انسان کو پل بھر میں کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ میں تو محض ٹی وی اسٹیشن گھومنے گئی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں ایک اور شہرت میری منتظر ہے۔

جب میں دوسرے دن وہاں پہنچی تو مشہور آرٹسٹ جمشید انصاری اور غزالہ رفیق بھی وہاں موجود تھے جن کے ساتھ مجھے کام کرنا تھا۔ اس میں مجھے غزالہ رفیق کی چھوٹی بہن کا رول پلے کرنا تھا۔ ڈراما آن ائر

گیا تو لوگوں نے خیر بہت سراہا ہی لیکن تبصرہ نگاروں کی تعریف نے تو حد ہی کر دی۔ امیر امام اتنے خوش ہوئے کہ ہیڈ کوارٹر سے خصوصی اجازت لے کر اگلے ہفتے کی کہانی میں پھر بک کر لیا۔ کیونکہ اس وقت ٹی وی پر یہ اصول تھا کہ پندرہ دن سے پہلے کوئی آرٹسٹ دوبارہ ریپیٹ نہیں ہوسکتا تھا۔“

✧......واہ نیلو جی، پہلے ہی ڈرامے سے اتنی پسندیدگی و شہرت حاصل کر لینا کوئی معمولی بات تو نہیں......آپ کو یہ سب کیسا لگ رہا تھا؟

نیلوفر عباسی ❖......نیلو کی دل کش ہنسی بے ساختہ تھی۔”ایک خواب کی سی کیفیت سے گزر رہی تھی میں۔ ہواؤں میں اڑنا کیسا ہوتا ہے یہ کوئی اس وقت مجھ سے پوچھتا......پھر ”جہاں برف گرتی ہے“ جو اے حمید کی مشہور کہانی تھی اس میں ایک پہاڑی لڑکی کے روپ میں بھی سب نے مجھے پسندیدگی کی سند دی۔ اس ڈرامے میں میرے ہیرو اس وقت کے سچ مچ کے ہیرو آغا فراز تھے۔ اور پھر آنے والا رمضان جیسے میرے لیے اور بھی بڑی خوشی چھپا کر لے آیا۔“

✧...... کیسی خوشی؟ ہم نے بہت تجسس سے انہیں دیکھا۔

نیلوفر عباسی ❖......”رمضان کی شاید دس تاریخ تھی کہ ٹی وی سے پروڈیوسر کنور آفتاب کا فون آیا کہ آپ عید کے ڈرامے میں ہیں، کل گیارہ بجے پہنچ جایئے گا۔ ریہرسل شروع کرنی ہے۔ مجھے تو پہلے یقین ہی نہیں آیا ابھی تو میں نے صرف دو ہی ڈرامے کیے تھے۔ اس زمانے میں عید کے ڈرامے کی خاص اہمیت ہوتی تھی اور اس میں ہیروئن کا رول ملنا تو جیسے ہر لڑکی کا خواب تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ ڈرامے کا نام تھا ”عید کا جوڑا......“ جو شمع پرویز کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں محض چار کیریکٹر تھے ایک نو بیاہتا جوڑا، کنیرن اور کریم اور دو پڑوسن......کپل کے روپ میں طلعت حسین اور میں تھے جبکہ پڑوسن خالہ عرش منیر اور عشرت ہاشمی تھیں۔ یہ بہت سمپل اور مزے داری کہانی تھی جس میں نہ اسٹائلش کپڑے تھے نہ شاندار بنگلے اور گلیمر نظر آرہا تھا لیکن ڈراما بے پناہ دلچسپ تھا جب عید کی رات ٹیلی کاسٹ ہوا تو ہر طرف ایک دھوم مچ گئی۔ ہر ایک کی زبان پر بس اس ڈرامے کا ہی چرچا تھا۔“

ہم نے دیکھا کہ اس ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے نیلو کی آنکھیں فخر و انبساط سے جگمگا رہی تھیں۔

✧......آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ”عید کا جوڑا“ واقعی میں کلاسک ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ڈرامے نے تو آپ پر کامیابی کے مزید در کھول دیے ہوں گے؟

نیلوفر عباسی ❖......”رضوانہ تم کو یقین نہیں آئے گا کہ ”عید کا جوڑا“ نے اتنی مقبولیت حاصل کی تھی کہ اس کے ڈیزائن اور نام کے سوٹ بازار میں آگئے تھے بلکہ اسی ڈرامے نے کالج کی ایک اسٹوڈنٹ کو نیلوفر علیم بنا دیا جسے عوام نے بے پناہ پیار اور پزیرائی بخشی......اس کے بعد بقر عید کے ڈرامے میں پھر مجھے مین رول میں کاسٹ کر لیا گیا جس کا نام تھا ”عید کی دعوت“ اور اس کے بعد تو جیسے میں اور عید کے ڈرامے لازم و ملزوم ہو گئے۔

”اگلے برس عید پر حسینہ معین کا لکھا ہوا ڈراما ”پپی عید مبارک“ بھی عوام میں بہت مقبول ہوا تھا اور ہاں جانتی ہو جب میرا ڈراما ”پپی عید مبارک“ ٹی وی پر آیا تو اس وقت کی خاتونِ اول محترمہ نصرت بھٹو نے بھی بہت پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور مجھے خاص طور پر گورنر ہاؤس میں ہونے والی عید ملن پارٹی میں مدعو کر کے سب مہمانوں سے تعارف کراتے ہوئے ڈرامے کی بہت تعریف کی تھی۔“

✧......اوہو زبردست......گویا سند مل گئی تھی نصرت بھٹو صاحبہ کی طرف سے بھی کہ یہ ڈراما کتنا اچھا تھا۔ ہماری بات پر جیسے انہیں کچھ یاد آگیا۔

نیلوفر عباسی ❖......”ارے ہاں یہ تو میں بتانا ہی بھول گئی کہ ٹیلی ویژن کی ہسٹری میں پہلی بار این ای سی ٹی وی ایوارڈ ہوئے تو میرے پہلے ڈرامے ”عید کا جوڑا“ کو سب سے زیادہ ایوارڈ ملے تھے۔ رضوانہ یہ سب میری ان کامیابیوں اور ان سے ملنے والی خوشیوں





کی یادیں ہیں جو آج میں اپنے پاکیزہ کے قارئین سے شیئر کر رہی ہوں۔" نیلوفر نے مسکراتے ہوئے جیسے وضاحت کی تو ہم ہنس دیے۔

✧ ......نیلو جی ہمارے قارئین تو آپ کی کامیابیوں کے سفر کی پل، پل کی کہانی جاننے کے باوجود بھی مشتاق رہتے ہیں......ایک انسپریشن ہے یہ خواتین کے لیے......اچھا یہ بتائیں "پہلی عید مبارک" کی اتنی پزیرائی کے بعد تو پھر آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ہوگا؟

نیلوفر عباسی ❖ ......"ہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔" نیلو کی آنکھوں کی جگمگاہٹ بہت خوب صورت تھی۔ "عید کے ڈرامے کے ساتھ، ساتھ ایک اور سلسلہ......میری پسندیدہ کہانی کے عنوان سے بھی چل رہا تھا جس میں مختلف مشہور ادیبوں کی کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل ہوتی تھی۔ پروڈیوسر رشید عمر تھانوی، سعادت حسن منٹو کی کہانی بردہ فروش ڈراما بنا رہے تھے۔ اسی کہانی پر ساٹھ کی دہائی میں مشہور فلم بدنام بن چکی تھی۔ اس فلم کی ہیروئن اس زمانے کی مشہور فنکارہ نیلو تھیں اور انہی کا کردار مجھے اس ڈرامے میں پلے کرنا تھا۔ تمہیں ایک بات بتاؤں کہ فلمسٹار نیلو میری بے حد پسندیدہ آرٹسٹ رہی ہیں اور......"

✧ ......ہم نے بے اختیار ہی ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کی طرف دیکھا...... نیلو جی کبھی آپ نے غور کیا کہ آپ کی صورت فلمسٹار نیلو سے کتنی مشابہ ہے اور نام بھی آپ کا نیلو ہے۔ کتنا خوب صورت اتفاق ہے یہ؟ ہماری بات پر ان کے چہرے پر بکھری خوشی نے ہمیں یہ اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ انہیں یہ اتفاق کتنا پیارا لگا ہے پھر مسکراتے ہوئے انہوں نے اپنے افسانے کو آگے بڑھایا۔

نیلوفر عباسی ❖ ......"فلم اسٹار نیلو نے اس فلم میں کئی ایوارڈ جیتے تھے اور یہ میرے لیے چیلنج تھا کہ میں اپنی فیورٹ اداکارہ والے رول میں کامیابی حاصل کرسکوں اور اللہ کا شکر ہے کہ سب نے میری اداکاری کو بہت پسند کیا......پھر اسی سلسلے کے ایک اور کھیل بردہ فروش میں بھی پروڈیوسر امیر امام نے میرا انتخاب کیا۔ یہ ایک بہت مشکل رول تھا۔ جس میں بردہ فروش عورت ایک لڑکی کو لیے شہر، شہر گھومتی ہے کہ جہاں اچھے دام مل جائیں وہ اسے بیچ دے۔ لڑکی کا رول میں پلے کر رہی تھی جس میں اس لڑکی کو بیڑی پیتے ہوئے بھی دکھایا گیا تھا۔ میں نے تو تبھی صاف انکار کر دیا کہ میں بیڑی ہرگز نہیں پیوں گی امیر امام صاحب نے لاکھ

سمجھایا کہ یہ محض ڈراما ہے اور سچویشن کی ڈیمانڈ ہے لیکن میرا دل بالکل بھی نہیں مان رہا تھا پھر آخر میں یہ طے کیا گیا کہ میں بیڑی دبا کر ہونٹوں تک لے جاؤں گی اور پھر اس پر کٹ کر کے ریل گاڑی بھاگتی ہوئی دکھائی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ میرے گھر والوں نے کبھی روک ٹوک نہیں کی کہ تم یہ نہیں کرو گی، ہاں یہ شعور ضرور دیا کہ میری حد کیا ہے اور میں ہمیشہ ان حدوں کی پابند رہی ۔ تبھی سارے پروڈیوسرز ،ڈائریکٹرز اور ایکٹرز کے ساتھ ہمیشہ میرا رشتہ عزت واحترام کا رہا۔“ ایک باوقار عورت کا غرور اُن کے لہجے میں بول رہا تھا۔

✧......آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں نیلو جی آپ نے جس عزت اور وقار کے ساتھ شو بز کی اس دنیا میں اپنا نام پیدا کیا ہے وہ ایک مثال ہے۔ حسب معمول اسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہماری بات سنتے ہوئے انہوں نے اپنے افسانے کو آگے بڑھایا۔

نیلوفر عباسی ✧......”کنور آفتاب جو کہ بہت ہی بڑے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر تھے ان کے ڈرامے منزل، منزل میں مجھے انہوں نے ایک ٹھیٹھ پنجابی لڑکی کا رول دیا تو میں گھبرا گئی اور یہ رول کرنے سے منع کر دیا لیکن کنور آفتاب صاحب نے بہت کانفیڈنشلی کہا کہ تم ہی یہ رول کرو گی اور میں جانتا ہوں کہ بہت اچھا کرلو گی۔“ ان کے اس اعتماد کا بھرم تو رکھنا ہی تھا مجھے سو میں اسکرپٹ لے کر اپنے پڑوس میں گئی جو پنجابی تھے اور ان کے ساتھ جی جان سے ڈائیلاگ سمجھے اور اتنی پریکٹس کی کہ اپنے آپ کو ڈرامے میں بالکل پنجابی لڑکی کے روپ میں ڈھال دیا۔ یکے بعد دیگرے میں ڈراموں میں مصروف تھی کہ ایک دن کنور آفتاب صاحب نے مجھے پروڈیوسر کی جاب کی آفر دی۔ دراصل اس وقت پی ٹی وی کے پاس کوئی بھی ایسا پروڈیوسر نہیں تھا جو سائنس میں ڈگری رکھتا ہو اور سائنس فکشن پر مبنی پروگرامز کے لیے ایسے پروڈیوسر کی شدید ضرورت تھی اور میں نے تازہ، تازہ ایم ایس سی کیا تھا، یہ فل ٹائم جاب تھی اور بے شمار بینیفٹس کے ساتھ جن میں گھر کا کرایہ، میڈیکل، کنوینس الاؤنس وغیرہ، وغیرہ شامل تھے لیکن میں نے معذرت کر لی۔“

✧......ارے، وہ کیوں بھلا؟ ہم نے حیرت سے پوچھا۔

نیلوفر عباسی ✧......”وہ اس لیے کہ ڈراما میرا بنیادی شوق تھا جو اس جاب کی وجہ سے شاید میں نہیں کر پاتی اور پھر میری طبیعت میں بہت لاابالی پن تھا۔ اپنی مرضی اپنا موڈ...... میں ملازمت کی پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال یہ کنور آفتاب صاحب کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے اس ملازمت کے قابل سمجھا۔“

✧......اچھا نیلو جی اب ذرا ذکر ہو جائے اس سیریل کا جس نے آپ کا نام ٹی وی کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا یا یوں کہیے کہ ’شہزوری‘ سیریل آپ ہی کے نام سے منسوب ہو گیا۔

نیلو کے چہرے پر اس وقت بھی ہم نے شہزوری کی کامیابی اور اس کی شہرت کی روشنی بکھرتی ہوئی محسوس کی۔

نیلوفر عباسی ✧......”ہاں، ہاں کیوں نہیں، شہزوری کے بغیر تو میرا افسانہ بالکل ادھورا ہوگا...... یہ وہ سیریل ہے جس نے مجھے دائمی شہرت بخشی...... اس زمانے میں ٹی وی سے سیریلز زیادہ نہیں پیش کیے جاتے تھے۔ بس ڈراموں کا زور زیادہ تھا۔ اور یقین کرو اس سیریل کی وجہ سے جیسے مزید سیریلز کی راہیں کھل گئی تھیں۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی پیش کی گئی تھی جو تن تنہا سماج اور معاشرے کی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور یہ کہانی مشہور ادیب عظیم بیگ چغتائی کے ناول سے لی گئی تھی اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس سیریل میں ایز اے شہزوری منتخب کیا گیا۔“

✧......اور آپ نے اس کردار کا حق ادا کر دیا اور اس ٹائٹل کو ہمیشہ کے لیے اپنے سر پر سجا لیا؟ ہم نے بے ساختہ کہا تو فخر وانبساط سے ان کا چہرہ ایک بار پھر جگمگا اٹھا۔

نیلوفر عباسی ✧......”اس کو میں بس اپنے اللہ کی مہربانی ہی کہوں گی۔ میں نے تو خود کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ سیریل اتنی مقبولیت حاصل کر لے گا۔ ڈائریکٹر محسن علی نے اپنی زندگی کا پہلا سیریل کچھ ایسے بنا دیا کہ اس



ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن پر ٹیلو ڈراماتہِ دام میں صداکاری کرتے ہوئے، جبکہ ماضی کی مشہور اداکارہ منی باجی سب سے آگے نمایاں ہیں

کا پہلا ایپی سوڈ آن ائر ہوتے ہی جیسے تہلکہ مچ گیا۔ خواتین اور نوجوان لڑکیوں کا تو یہ فیورٹ ترین سیریل بن گیا تھا۔ میں جہاں جاتی وہ لوگ مجھے گھیر لیتیں کوئی کہتی کہ آپ کی وجہ سے مجھے جینے کا حوصلہ ملا ہے، اب کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے تو سہی۔ اس میں میرا ایک جملہ بہت مشہور ہوا تھا کہ ''بہت بری آدمی ہوں میں۔'' خواتین مجھ سے کہتیں کہ آپ بری نہیں بے حد اچھی آدمی ہیں، ہم بھی آپ کی طرح مضبوط بن کر اس دنیا میں جئیں گے اور ہاں جب عصمت چغتائی ہندوستان سے کراچی کسی ادبی جلسے کے سلسلے میں آئیں تو میں بھی وہاں تھی۔ جلسے کے منتظمین نے مجھے ان سے ملوایا۔ وہ ''شہزوری'' کا کیسٹ دیکھ چکی تھیں۔ جانتی ہو انہوں نے مجھ سے کیا کہا؟''

✧......کیا کہا؟ ہم نے بے حد دلچسپی سے پوچھا۔

نیلوفر عباسی ✥......''انہوں نے کہا کہ میرے بھائی نے تو کاغذ پر لفظوں سے کردار ڈھالا تھا، تم نے تو جیتی جاگتی شہزوری سامنے لا کھڑی کی۔''

✧......اوہ گاڈ اردو ادب میں کتنا بڑا نام ہے عصمت چغتائی کا......اتنی بڑی ہستی کے کہے ہوئے ان جملوں کو سن کر آپ کا کیا ری ایکشن تھا؟

نیلوفر عباسی ✥......''میں تو خوشی اور حیرت سے ایک لمحے کے لیے ساکت سی ہو گئی تھی۔ ان جملوں کے سحر سے اپنے آپ کو نکال ہی نہیں پا رہی تھی۔ یہ 1981ء کی بات ہے لیکن ان کے الفاظ تر و تازہ پھولوں کے مانند اب بھی میرے دل میں خوشبو بکھیرتے رہتے ہیں۔''

✧......ویسے یہ لکھا کس نے تھا؟ ہم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

نیلوفر عباسی ✥......''یہ کمال حسینہ معین کا تھا۔ شہزوری ان کی لکھی ہوئی پہلی ٹی وی سیریل تھی۔ اس کے بعد ہی انہوں نے کرن کہانی، زیر زبر پیش، انکل عرفی، تنہائیاں اور بے شمار ڈرامے اور سیریل لکھے یعنی

پھر مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔“

✧......اچھا نیلو جی یہ بتائیں کہ شوبز کی اس جگمگاتی دنیا میں جہاں آپ نے مختلف ہیروز کے ساتھ اتنے سیریز اور ڈرامے کیے، کیا کبھی کسی نے آپ کے دل پر بھی دستک دی؟ ہمارے سوال میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے وہ ہنس دیں۔

نیلوفر عباسی ✧......”ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے سب ہیروز سے بس اچھی سلام علیک اور دوستی تھی۔ شکیل کے ساتھ میں نے سب سے زیادہ کام کیا۔ حسینہ معین کے پہلے ٹیلی پلے ”نیا راستہ“ میں وہ ہیرو تھے۔ ”نیا راستہ“ کے بعد عید کا ڈراما ”پہلی عید مبارک......“ اور پھر ہٹ سیریل ”شہزوری......“ دیکھنے والوں نے ہمیں فلمی جوڑے کی طرح لینا شروع کر دیا تھا۔“

✧......اتنا ساتھ کام کرنے اور مقبول جوڑی کے طور پر بھی مشہور ہونے کے باوجود بھی یہ بڑی بات ہے کہ کسی قسم کا کوئی اسکینڈل افواہ کے طور پر بھی سننے میں نہیں آیا؟ ہماری بات پر نیلو مسکرا دیں۔

نیلوفر عباسی ✧......”میرے پورے کیرئیر میں کبھی میرا کوئی اسکینڈل نہیں تھا۔ میں اور شکیل محض بہت اچھے دوست تھے وہ اپنا ہر راز مجھ سے شیئر کرتے، کون سی لڑکی ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے یا کس سے پیچھا چھڑائیں یا جسے وہ پسند کرتے ہیں ان کی اماں تک کیسے بات پہنچائی جائے یقین کرو وہ یہ سب مشورے مجھ سے لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ڈرامے میں کس کپڑے کے ساتھ کون سی جیولری اچھی لگے گی یہ شکیل ہی مجھے سمجھاتے تھے۔ ایک بار وہ ایک جیکٹ پہن کر آئے جو مجھے اچھی لگی میں نے ان سے مانگ کر پہنی اور مجھے اتنی پسند آئی کہ ”شہزوری“ میں اسے خوب پہنا اور شکیل بیچارے مروت میں کچھ بھی نہیں بولے۔“

انہوں نے آخری جملہ کچھ اتنے مزے سے کہا کہ ان کے ساتھ ہم اور عذرا بھی بے ساختہ ہنس دیے۔ ویسے ہم عذرا کے بھی بہت شکر گزار ہیں جنہوں نے اس انٹرویو کو بہت توجہ اور دلچسپی سے سنا۔ وہ ایک خاموش سامع کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہیں لیکن بریک کے دوران ان کی دلچسپ کمپنی کو ہم اور نیلو بہت انجوائے کرتے رہے تھے۔

✧......نیلو جی ابھی تو آپ کے ”اصل ہیرو“ کی اس افسانے میں انٹری ہونی ہے جس کا یقیناً قارئین بہت دلچسپی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ لیکن اس سے پہلے اپنے ڈراموں کے ہیروز کے ایک آدھ مزے دار قصے تو سنائیں جو دورانِ شوٹنگ پیش آئے ہوں؟ ہماری فرمائش پر نیلو کے ہونٹ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

نیلوفر عباسی ✧......”ہاں یوں تو کافی ایسے قصے ہیں جنہیں یاد کر کے اب بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ لیکن وقت اور صفحات کی گنجائش نہ تمہیں اجازت دیں گے اور نہ مجھے......“ پھر آنکھوں میں شرارت کی چمک لیے انہوں نے ہم لوگوں کی جانب دیکھا اور بولیں۔

”میرے پہلے عید کے ڈرامے ”عید کا جوڑا......“ کی کہانی بہت دلچسپ اور سمپل سی تھی۔ میں یعنی کنیزن کا میکا ویل آف نہیں ہے، پڑوسن عرش منیر مجھے سکھاتی ہیں کہ کریم (طلعت حسین) سے چھپ کر تم نے جو پیسے جمع کیے ہیں اس کا میں تمہیں زبردست سوٹ دلواؤں گی اور تم کریم کو یہ بتانا کہ یہ سوٹ تمہارے میکے سے آیا ہے یہ ساری اسکیم کریم سن لیتا ہے اور جس دن وہ لوگ شاپنگ کے لیے جاتی ہیں، وہ بھی ان کا پیچھا کرتا ہے۔ اب بازار میں شوٹنگ کے دوران بہت ہی دلچسپ واقعہ ہوا۔ عید کے زمانے میں تم تو جانتی ہو کہ کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ ریکارڈنگ سائلینٹ تھی کیمرا مین کے پاس چھوٹا سا سائلینٹ کیمرا تھا جو وہ ڈائریکٹر کنور آفتاب کی ہدایت پر موو کر رہا تھا۔ میں اور عرش منیر برقع میں تھے اور مختلف دکانوں پر جا رہے تھے سین کے مطابق طلعت حسین چپکے چپکے ہمارے پیچھے چل رہے تھے۔ اچانک کنور آفتاب کا اسسٹنٹ دوڑتا ہوا آیا اور اشارہ کیا کہ وہاں چلیں۔ میں اور عرش منیر وہاں پہنچے تو ایک کیم شحیم پٹھان نہایت غصے کے عالم میں طلعت حسین کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ کنور آفتاب بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ غصے سے بولا۔



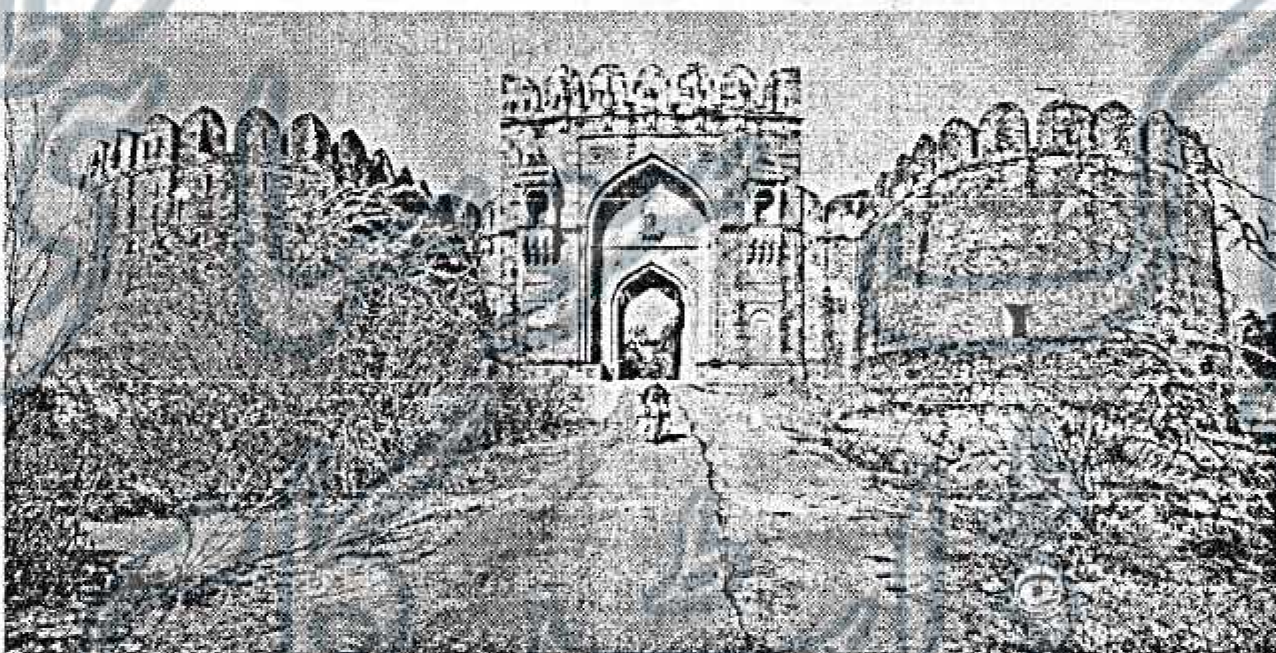
"بی بی یہ لفنگا بہت دیر سے آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔ ہم نے اس کو پکڑ لیا ہے اب جو بولو ہم اس کو سزا دے گا۔" برقع کے نقاب کے پیچھے سے طلعت حسین کی حالت دیکھ کر میں بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ طلعت حسین اور کنور آفتاب اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ محض ڈرامے کی شوٹنگ ہے لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ کہے جا رہا تھا کہ "خوچہ ام تمہیں پولیس کے حوالے کرے گا تمہاری ماں بہن جیسی ہیں یہ لوگ......" پھر جب خالہ عرش منیر نے انہیں سمجھایا کہ خان صاحب یہ تو میرے بیٹے جیسا ہے، یہ دیکھیں کیمرا، یہ ڈرامے کی شوٹنگ ہے، آپ بھی عید کے روز دیکھیے گا تب جا کر طلعت حسین کی جان چھوٹی۔ ٹی وی دین میں بیٹھے سب لوگ بھی اس سین سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے، ہنس رہے تھے لیکن طلعت حسین کافی سیریس ہو گئے تھے۔ ویسے بھی وہ بہت برد بار اور سنجیدہ طبیعت کے تھے۔ تو یہ سچویشن انہیں بہت ناگوار گزری تھی۔

مجھ سے انہوں نے بہت خفگی سے کہا۔ "آپ کو بڑی ہنسی آ رہی تھی۔ برقعے میں دُہری ہوئی جا رہی تھیں۔" اور جواباً میں ایک بار پھر بے تحاشا ہنس پڑی تھی۔" اس وقت بھی نیلو بے اختیار ہنس رہی تھیں۔ اور ہم لوگ بھرپور انداز میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اسی ہنسی کی جلترنگ میں انہیں ایک اور قصہ یاد آ گیا۔ "عید کا جوڑا......" عید الفطر پر پیش کیا گیا پھر بقر عید میں "پہلی عید مبارک" میں مجھے ایک ایسی لڑکی کا کردار ملا تھا جو انگلینڈ میں پروان چڑھی تھی اور اپنے انکل، آنٹی کے گھر پاکستان پہلی بار عید منانے آئی ہے اس میں شکیل ہیرو تھے اور جمشید انصاری ولن......ایک سین میں ہیرو کو ہیروئن سے ہلکا پھلکا سا رومانس کرنا تھا اس سچویشن کے لیے آفتاب صاحب نے ٹی وی اسٹیشن میں بنے تالابوں کا انتخاب کیا۔ جس کے درمیان ایک فوارہ تیزی سے پانی اچھالتا تھا۔ شکیل تالاب کے کنارے بڑے اسٹائل سے دھیمے، دھیمے ڈائیلاگ بول رہے تھے مجھے پتا نہیں کیوں شرارت سوجھی اور میں نے بے اختیار انہیں تالاب میں دھکا دے دیا وہ ہائیں، ہائیں کرتے رہ گئے۔ کیمرا مین اور دیگر لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مجھے ڈر لگا کہ آفتاب صاحب سے ڈانٹ پڑے گی مگر وہ OB VAN سے ہنستے ہوئے باہر آئے اور پانی میں شرابور شکیل سے بولے۔ "یار آپ جس طرح رومینٹک ڈائیلاگ بول رہے تھے تو ہیروئن کو تو آپ کو پانی میں دھکا دینا جائز بنتا ہے۔" اتنے مزے دار قہقہوں کو انجوائے کرتے ہوئے اب ہم ان کی زندگی کے سب سے اہم اور خوب صورت موڑ کی طرف آ رہے تھے۔ وہ موڑ جس کا آپ سب بھی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن دوستو انٹرویو کے اس سب سے خوب صورت حصے کو پڑھنے کے لیے آپ کو اگلے شمارے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جس میں نیلو کی اپنے ہیرو سے پہلی ملاقات سے لے کر ان کی دائمی جدائی کی وہ باتیں ہوں گی جو آپ کے دل کو چھو جائیں گی۔

قمر علی عباسی اور نیلوفر کی لازوال محبت کی خوب صورت کہانی کو اگلے ماہ پڑھنا نہ بھولیے گا کہ انتظار کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔

قلعہ روہتاس

ع۔ ہ......لاہور



قلعہ روہتاس دیکھنا میری دیرینہ خواہش تھی۔ یہ جہلم شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ میں لاہور سے جب بھی منگلا ڈیم یا جہلم گئی تو میری کوشش یہی رہی کہ قلعہ روہتاس دیکھوں...... الحمدللہ پچیس سال بعد میری یہ خواہش اب پوری ہوئی تو میں نے سوچا آپ کو بھی قلعہ روہتاس کی سیر کرواؤں۔

قلعہ روہتاس شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا...... ساتھ ہی پورے ملک میں سڑکوں کا جال بھی بچھا دیا تھا تاکہ ترقی تیز رفتاری سے ہو۔ ان سڑکوں میں آج کی جی ٹی روڈ قابلِ ذکر ہے۔ قلعہ روہتاس ۱۵۴۵ء (پندرہ سو پینتالیس) کے لگ بھگ بنایا گیا۔ یہ قلعہ تقریباً پچیس کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اب اس کی دیواریں ہی رہ گئی ہیں جو چھوٹی لال اینٹوں سے بنائی گئی ہیں۔ یہ اتنی موٹی اور چوڑی دیواریں ہیں کہ آدمی اس پر چڑھ کر بہ آسانی دوسری طرف اور اردگرد کا نظارہ کرسکتا ہے۔ انسان اس پر چڑھ کر بالکل بونا سا دکھائی دیتا ہے۔ دیوار پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بھی بنائی گئی ہیں جو غالباً لڑائی میں دشمن سے باخبر رہنے کے لیے بنائی گئی ہوں گی۔ نیچے دیواروں میں خوب صورت دروازے بنائے گئے ہیں۔ جن میں سے سڑکیں نکالی گئی ہیں۔ ان دروازوں کے نام بھی رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک سہالہ دروازہ ہے۔

اس قلعہ میں کچھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شیر شاہ سوری اور اس کے دو جنگجو ساتھیوں کے مجسمے رکھے ہیں۔ ساتھ ہی اسی اسٹیج پر دائیں طرف اس کی بیگم اور کنیز کے مجسمے بھی ہیں جو دونوں بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کو چمکیلے دوپٹے اوڑھائے ہوئے ہیں۔ یہاں پر انگریزوں اور شیر شاہ سوری کی تلواریں بھی شوکیس میں سجائی گئی ہیں، ہر شوکیس میں دو، دو تلواریں رکھی ہیں۔ شوکیس اور مجسموں کو لائٹ لگا کر خوب صورت بنایا گیا ہے اور اس پر طویل ہسٹری لکھی گئی ہے۔

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا وہ آٹھ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس کے والد نے ایک کنیز سے شادی کرلی تھی۔ فرید خان نے گھر کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر فوج جوائن کرلی۔ وہ فوج میں بھرتی ہوا اور محنت کرتے، کرتے سپہ سالار کے عہدے تک جا پہنچا۔ وہ ایک بہادر جنگجو تھا۔ اس نے بہت سی فتوحات کیں۔ اسے نہ صرف اپنے ملک کے گوشے، گوشے کی خبر ہوتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے بلکہ اس کی نظر دوسرے ملک کے حالات پر بھی رہتی تھی۔ اس کی بہادری کی وجہ سے اسے شیر شاہ کا لقب دیا گیا۔ اور وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔

انگریزوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں میوزیم کے بالکل ساتھ ہی ایک لمبی سی بالکونی بنائی اور اسی طرح کے گنبد جو اندر سے مٹی کے بنے ہوئے ہیں لیکن دونوں میں فرق صاف ظاہر ہوتا ہے...... یہاں پر قلعے کا نقشہ بھی بنا کر میز پر رکھا گیا ہے لیکن قلعے کی طرح نقشے کا بھی کافی حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ اسی بالکونی میں شیر شاہ سوری کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی ہے جو ہندوستان سے منگوائی گئی تھی۔ یہ بات ہمیں وہاں موجود آفیسر نے بتائی۔ اور بھی تصاویر آویزاں ہیں۔ اس جگہ پر دفتر بھی بنا ہوا ہے اور جو میوزیم کے ساتھ ہی منسلک ہے، ارد گرد کھڑکیاں ہیں اس میں سلاخیں لگی ہیں۔ یہ بھی خستہ حالت میں ہیں۔

شیر شاہ سوری نے قلعے کے اندر جو کام کروایا وہ پتھر اور مٹی کی چنائی سے کیا گیا ہے اس لیے گرمی میں گنبد اور اندر کے حصے بہت ٹھنڈے تھے۔

آگے جا کر کچھ فاصلے پر ایک کنواں ہے جو ایک عجوبہ ہے۔ اس کی گہرائی میں ایک سو پچپن سیڑھیاں نیچے جاتی ہیں۔ بہت لمبی چوڑی اور بڑی، بڑی پتھر اور مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں...... ان کی چھت کے اوپر چھوٹی اینٹ کی محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ اور اطراف میں موٹی سیمنٹ کی مضبوط اور اونچی دیواریں ہیں...... شاید یہ کسی بھی حادثے سے بچنے کے لیے بنائی گئی ہیں...... اوپر سے دیکھیں تو کنواں ایک وال کلاک کی طرح کا نقشہ ہے۔

یہاں ہمیں ایک کپل ملا جو کنویں کے اندر سے ہو کر آرہا تھا۔ انہوں نے کہا ہماری تو ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر اب آپ اس کے اندر جا کر اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر دکھاؤ۔ جب ہمیں وہ صاحب دوبارہ ملے تو انہیں بتایا ہم سب اندر سے ہو کر آگئے ہیں تو وہ بولے ہمیں پتا ہوتا تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم سب ماشاءاللہ..... اٹھارہ لوگوں کا قافلہ اور اکثریت جوان لڑکیوں کی تھی۔ وہ مذاق کرتی، باتیں کرتی ہمیں بھی لے گئیں۔ میں نیچے نہیں اتر رہی تھی لڑکیوں نے کہا آنٹی آجائیں یہاں بہت ٹھنڈک ہے۔ واقعی محسوس ہوا کہ جنت میں ایک دم آگئے ہیں۔ اے سی سے زیادہ ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

یہ سیڑھیاں شاید اس دور میں کنویں کا پانی حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں کیونکہ سیڑھیوں اور کنویں کے درمیان میں ایک بہت موٹی دیوار ہے۔ اور نیچے چند سیڑھیوں کے سامنے سے ایک دروازہ سا کھولا گیا ہے۔ اطراف کی لمبی دیوہیکل دیواریں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ یہ کیسے بنائی گئی ہیں۔ کنویں کا پانی تو خشک ہو چکا ہے۔ البتہ یہ سیاحوں کے لیے ایک پکنک پوائنٹ بن چکا ہے۔

حکومت نے قلعے کے اندر دو تین پارک بنا دیے ہیں اور مرمت کا کام بھی جاری ہے۔ قلعے کا کافی حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ البتہ کہیں کہیں تھوڑی، تھوڑی عمارت دکھائی دیتی ہے۔ جو ٹیلوں پر چڑھ کر واقع ہے۔ ایک جگہ ایک کمرے کے اوپر ایک دوسرا کمرا ہے......اب وہاں سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔

اگر حکومت توجہ دے تو یہاں بھی سیاحوں اور بچوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کیا جا سکتا ہے اور آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اردگرد کے قدرتی مناظر جنت نظیر ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پُل کے نیچے سے گزرتا دریائے جہلم دور سے نظر آتے خوب صورت سرمئی پہاڑ اور بادلوں کا ساتھ، ساتھ چلنا، یہ دلفریب مناظر ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ہمارے ملک کو اللہ جل شانہ نے بے حساب حسن و نعمتوں سے نوازا ہے۔

دن میں دس سے بیس گاڑیاں یہاں سیاحوں کی آتی ہیں۔ جن میں زیادہ اردگرد شہروں کے لوگ ہوتے ہیں۔ ”ہمارا جہلم دیکھ“ کے بینرز جگہ، جگہ آویزاں ہیں۔ لیکن اہل جہلم سے پوچھو تو کہیں گے کہ ہم نے روہتاس کا قلعہ نہیں دیکھا......اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ کہتے ہوں کہ یہ کہاں بھاگا جا رہا ہے۔ ہمارے شہر ہی میں ہے دیکھ لیں گے۔ میں نے ٹرین میں بھی کچھ خواتین سے باتیں کیں انہوں نے بھی روہتاس کا قلعہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ جہلم سے لاہور آ رہی تھیں جبکہ جہلم کی رہائشی تھیں۔

جہلم میں اتنی آبادی نہیں جتنی ہمارے لاہور اور دوسرے بڑے شہروں میں ہے اسی لیے اتنی ٹریفک بھی نہیں ہے۔ دور، دور بڑے، بڑے محلات اور پلازوں کی شکل کی عمارات نے شہر کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اب پندرہ بیس سال پہلے والا جہلم نئے جہلم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مجھے چونکہ سترہ سال بعد جہلم جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ جب میں نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ اتنی تبدیلی کیسے آ گئی تو انہوں نے اس کی بڑی وجہ یہ بتائی کہ یہاں سے اکثریت بیرونِ ممالک چلی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے حالات اچھے ہو گئے ہیں۔ کاش ہمارے ملک میں بھی حکومت فی گھنٹا کے حساب سے اچھی آمدنی مقرر کر دے تاکہ مزدوروں اور محنت کشوں کا استحصال نہ ہو۔

ہم بات کر رہے تھے جناب قلعہ روہتاس کی جس کی دیواریں اتنی مضبوط ہیں کہ ابھی تک بہت اچھی حالت میں ہیں۔ نیچے سے زمین میں گڑھے پڑ گئے ہیں لیکن دیواروں کی اینٹوں تک کا رنگ مدھم نہیں پڑا۔ البتہ اندر کی عمارت ختم ہو چکی ہے۔ کئی جگہوں پر دیواروں سے زمین سرک گئی ہے لیکن دیواریں پھر بھی کھڑی ہیں۔

واقعی قلعہ روہتاس ایک شاہکار ہے۔ اس کا فنِ تعمیر بہت متاثر کُن ہے۔ گو یہ قلعہ لوگوں کی حفاظت کے لیے اور دفاعی جنگ لڑنے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اب یہ آثارِ قدیمہ ہے۔ اسی قلعہ میں شیر شاہ سوری کو لڑتے ہوئے ایک گولہ لگا اور وہ شدید زخمی ہو گیا۔ اور مرنے سے پہلے اسے فتح کی خوشخبری بھی مل گئی۔

یہ قلعہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے۔ مغلوں کے فنِ تعمیر سے بالکل مختلف ہے کیونکہ یہ اندر سے بہت سادہ ہے جبکہ مغلوں کی تعمیر میں مینا کاری، باریک ڈیزائن اور حسین رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے...جیسے شاہی قلعہ لاہور......ان کی دیواریں ایک ہی طرز کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ قلعہ مغلوں کے دورِ حکومت سے پہلے کا ہے۔

اب اس اجاڑ جگہ پر کہیں، کہیں مسجدیں اور مزار، اسکول، گھر، دکانیں اور کینٹین اور قبریں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔

اس قلعے میں تاریخ کے طلبا کے لیے بہت کشش ہے کیونکہ اس میں پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے جس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ قلعے کا عجائب گھر دوپہر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔

بہرحال قلعے کی سیر کا مزہ تو بہت آیا۔

☆☆☆

سکھیاں دھانی آنچل پینگیں اور موسم ساون کا

شائستہ زریں

معزز قارئین!

السلام علیکم!

وضاحت نسیم نے کہا تھا

برکھا برسی آنگن اتری ایک البیلی شام
ایسی شام کے آتے ہی یاد آئے ایک نام
کتنے پیارے پون جھکورے کتنے پیارے گیت
ان گیتوں کو سنتے ہی یاد آجاتے ہیں میت
ساون کی پُر کیف فضائیں جب، جب رنگ لٹائیں
ایسے میں کچھ بیتی باتیں یاد آ کر رہ جائیں

بلاشبہ ساون یادوں سے منسوب ہے ساون رُت کی پون چلتے ہی یادیں دل کے پٹ کھولنے لگتی ہیں اور ادھر جھڑ بدلی لگی اُدھر یادوں کی جھڑی برسنے لگتی ہے اور دل ساون بن جاتا ہے۔

ساون رُت کی ان کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے ساون نمبر کے لیے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور شرکا سے معلوم کیا کہ

سوال نمبر۱: ناصر کاظمی نے کہا تھا

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے

آپ کے لیے یہ تم کون، کون ہوسکتا ہے؟ اور اس سے وابستہ دل کو چھو لینے والی کوئی یاد؟

سوال نمبر۲: آج کی مصروفیات اور مسائل کے ساتھ کیسے ساون کا بھرپور لطف اٹھایا جاسکتا ہے؟

سوال نمبر۳: ساون اگر بھیگے بنا سوکھا، سوکھا گزر جائے تب آپ خیالی ساون کیسے منائیں گی؟

شگفتہ شفیق (شاعرہ)

۱: ارے بھئی کس نے یاد آنا ہے۔ بس جی پکوڑے، املی کی چٹنی کے ساتھ یاد آتے ہیں اور اس سے متعلق کوئی ایک نہیں بے تحاشا یادیں، امی جی کے پیار کی خوب صورت باتیں، امی کے پکائے زبردست پکوان اب بھی سوچوں تو بے اختیار منہ اور آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔ منہ میں پکوڑوں اور آنکھوں میں امی کے لیے پانی۔ اپنا بہت تیز آواز میں ڈیک بجانا، بے حد رومینٹک گانے فل والیوم میں بجانا اور پھر گھر والوں سے ڈانٹ سننی کہ ارے بھئی کیا سارے محلے کو سنارہی ہو، آواز تو ہلکی کردو لیکن جناب وہ شگفتہ ہی کیا جس کے کان پر جوں رینگ جائے۔ ایک نہیں بے شمار دل کو چھو لینے والی یادیں۔ ہمارا گھر کالج سے نزدیک ہی تھا ہم سات، آٹھ لڑکیاں کالج سے واپس گھر آرہی تھیں زبردست بارش ہورہی تھی راستے میں ایک گھر پڑتا تھا جس میں بہت سے رنگوں کے بڑے، بڑے گلاب لگے



شگفتہ شفیق

ہوئے تھے ہم نے وہاں کسی کو نہ پا کر بہت سے گلاب توڑ لیے اچانک ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ ان کی گرجدار آواز سن کر ہم سب نے پھول وہیں پھینکے اور سرپٹ دوڑ لگائی وہ پھولوں سمیت ہمارے پیچھے آئے مگر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا، ہاں خوشی ضرور ہوئی کیا بھگایا واہ، واہ، واہ......

۲: ساون تو ساون ہے اس کا لطف کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہم تو ٹھہرے رم جھم کے عاشق سو سارے کام پیچھے پھینک کر اپنی ساری مصروفیات کو غچہ دے کر سب سے پہلے تو بارش میں خوب بھیگیں گے اور کاغذ کی ناؤ بنا کر اپنے بچپن کو آواز دیں گے اور پکوڑوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور بارش میں لانگ ڈرائیونگ کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ حالانکہ اکثر اوقات اس شغل کے لیے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن شوق کا کوئی مول نہیں۔

۳: دو عدد بڑے پائپ لے کر گھر والوں کے ساتھ لان میں جا کر ایک دوسرے کو اچھی طرح بھگو کر ساون کو یاد کریں۔ یہ ساون تو اکثر ہم منا لیتے ہیں اور اس میں اپنے بچوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔

سیما رضا
(ریڈیو پروڈیوسر، افسانہ نگار)

۱: میں یادوں کا قصہ کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں۔

اور جب ساون رت کی پون چلتی ہے تب میں گزرے پل سوچوں تو وہ بھیگا لمحہ یاد آتا ہے جب ساون کی پہلی رُت میں، میں نے ساون کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ شدید بارش سے گھر میں پانی بھر گیا تھا اور میری امی مجھے اور میری چھوٹی بہن نمو کو بارش سے بچانے کے لیے محفوظ جگہ کی تلاش میں کبھی اِدھر بٹھا رہی تھیں اور کبھی اُدھر چوکی پر وہ خود پوری طرح بھیگ چکی تھیں مگر انہیں مطلق اپنی پروا نہیں تھی۔ یہ ساعتیں آج بھی میری آنکھوں میں بھیگے کاجل کی طرح چمک رہی ہیں۔ ساون کی یادوں میں ایک اور بھیگا لمحہ آج بھی اپنی توانائی کے ساتھ دستک دیتا ہے۔ دواؤں کے زیر اثر امی کی یادداشت آہستہ، آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ابو کو تربوز لے کر آنا تھا۔ تیز بارش ہو رہی تھی ہم بہنیں اور کزنز ابو کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں فکر تھی کہ ابو خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔ ہم دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک امی نے معصومیت سے کہا.... ”تمہارے ابو تو آ ہی جائیں گے یہ سوچو کہ تربوز کیسے کٹے گا؟“ ہم سب نے حیرت سے امی کو دیکھا ہم سب بے ساختہ ہنس دیے... لیکن ساتھ ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں کہ امی جو ابو کی چھوٹی، چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھیں اس ایک نکتہ پر آ کر ان کی سوچ ٹھہر گئی تھی کہ ”تمہارے ابو تو آ ہی جائیں گے یہ سوچو کہ تربوز کیسے کٹے گا؟“

۲: جو ساون کو پسند کرتے ہیں وہ کسی بھی طریقے سے کسی بھی شکل میں ساون کے رومانس سے بھرپور لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اگر میں ریڈیو کے لائیو شو میں دلی جذبوں کی عکاسی کرتے ساون کے مسحور کن گیت نشر



سیما رضا

کروں میرے ساتھ، ساتھ سامعین بھی ساون کے گیتوں کی فرمائشوں سمیت شریک ہو رہے ہیں۔ یوں میں دفتری مصروفیات کے ساتھ مسائل کو پس

پُشت ڈال کر ساون کا بھرپور لطف اٹھاؤں گی اور یہ
بھیگی بھیگی مصروفیت میرا دل موہ لے گی۔

۳: زندگی میں سوکھا پن تو کبھی بھی ہمیں پسند نہیں آیا خاص طور پر ساون اگر سوکھا، سوکھا گزر جائے تو ہم جیسے ساون کے دلدادہ کے لیے یہ لمحہ کسی عظیم دکھ سے کم نہیں ۔تب ہم تصور میں ساون منانے کے لیے ایسی فلم کو اپنے سامنے لا کر مجسم کھڑا کر دیں گے ۔جس میں ساون کے کئی مناظر اور نغمات ہوں گے ، ساون کا گیت مالا ہمارے سامنے مجسم و متحرک ہے۔اور ہم اس گیت مالا میں دیکھیں تو کوئی کسی کے جذبوں کی زبان میں کہہ رہا ہے ، تیری دو ٹکیا دی نوکری' میرا لاکھوں کا ساون جائے اچانک بھابی کی آواز آتی ہے ارے سیما جلدی سے میرے ساتھ مل کر پکوڑے بناؤ، کیسا سچا اور بھرپور ساون جو محض میرے خیالوں میں ہے جس میں نہ سڑکیں خراب ہیں ، نہ بجلی غائب اور ہم خوش ہیں کہ خیالی ساون نے ہمیں مالا مال کر دیا۔

تہمینہ مختیار (پروفیسر)

ا: ساون رُت میں یوں تو دل کو چھو لینے والی یادیں بہت سی ہیں لیکن لفظ ''تم'' سے مجھے اپنے بابا بہت یاد آتے ہیں ، جب وہ ہمارے بچپن میں بارش کے دنوں میں ہم دونوں بہنوں کا ہاتھ پکڑ کر کھلی سڑک



تہمینہ مختیار

پر نکل جاتے تھے اور کہتے تھے بھئی بچو! یہ سڑک تمہارا باغ ہے اس بارش میں تم خوب بھاگو اور وہ خود بھی ہمارے ساتھ بچے بن جاتے تھے ۔اب نہ بابا ہیں نہ وہ بارشیں لیکن ایک یاد ضرور ہے جو ایسے موسم میں دل میں اداسیاں بکھیر دیتی ہے۔

۲: مصروفیات کبھی بھی ختم نہیں ہوتیں مسائل ہر دور میں رہتے ہیں بس اب مشینی مسائل زیادہ ہو گئے ہیں ۔ برقی رو نے جہاں زندگی میں جدت پیدا کی ہے وہیں جذبوں کی حدت میں بھی کچھ کمی کر دی ہے لیکن ساون آج بھی آسمان ہی سے برستا ہے جس میں چھتیں اب بھی مشرقی اندازِ تعمیر لیے ہوئے ہیں ، کہیں ، کہیں رنگ برنگے بھیگے ہوئے آنچل اب بھی لہراتے ہیں بارش میں آج بھی کہیں ، کہیں سے کوئی اچھی سی خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی ہے پھر اس بات کو کیوں نہ یقین بنالیں کہ بدلیاں جیسے ہی آسمان پر نظر آتی ہیں لوگ اپنا سب کچھ بھول کر بے قراری سے چھاجوں مینہ برسنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں پھر کہاں کے مسائل اور پھر کہاں کس کے وسائل سب اپنی استطاعت سے اس موسم سے لطف اٹھاتے ہیں۔

۳: جب خیالی پلاؤ پک سکتا ہے تو خیالی ساون کیوں نہیں ہمارے تصور میں آسکتا ہے۔ ویسے بھی کراچی کی بارشیں تو اب غزلوں یا گیتوں ہی میں رہ گئی ہیں۔

اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا

تو بس اب خیالی ساون کسی بھی ہلکے، ہلکے بھیگے بھیگے موسم میں منالیں آنکھیں بند کریں اور تصور کریں کہ بارش برس رہی ہے ، آس پاس کوئی نہیں ہے میں ہوں ، میری چھت ہے ، میرا لان ہے ۔ساون کے پکوان بھی پک رہے ہیں ان کی خوشبو آرہی ہے۔ یقین کریں خیالی ساون بھی اصلی ساون سے زیادہ لطف دے گا۔

سیما سراج (کالج پرنسپل)

ا: تم سے مراد وہ ہے کہ جس کے احساس کی خوشبو سے دل و جاں مہک اٹھیں ، جس کی محبت خون



سیما سراج

میں گردش کرتی ہو، جس کے وجود سے ساون کے موسم میں شعلے رقص کرنے لگیں۔ جس کے بغیر ساون رُت کے تمام رنگ پھیکے پڑ جائیں اور ساون رُت کا حسن ماند پڑ جائے اور ایک کسک سی دل میں اٹھے کہ

ساون رُت کی پون چلی اور تم نہیں آئے

جب ساون رُت میں ہم دونوں بھیگ گئے۔ وہ نظر کا چرانا اور ایک دوسرے کو نظر بچا کر دیکھنا شرم، حیا اور ساون کا نشہ جب یکجا ہو جائیں تو لمحے بھلائے نہیں جاتے۔

۲: ہر دور کا اپنا لطف اور مزہ ہوتا ہے۔ مسائل اور مصروفیات ان کے رنگ بدل، بدل دیتی ہیں۔ رنگ سب ہی خوب صورت ہوتے ہیں بشرطیکہ آپ ان سے لطف اندوز ہونے کا فن جانتی ہوں۔

۳: خیالی ساون حقیقی ساون سے زیادہ مزہ دیتا ہے۔ موسم، مقام اور وقت کی قید سے آزاد آنکھیں بند کرلیں اور پھر دیکھیں لیکن جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ آپ کو کیسے بتائیں، آپ بھی آنکھیں بند کرلیں اور بھیگے بدن کی خوشبو کو محسوس کریں۔

عظمیٰ بلوچ (آر جے)

1: ہمم...... ارے اس سوال نے تو یادوں کی وہ والی کتاب کھول دی جس پر وقت کی اچھی خاصی دھول جم گئی تھی، اب ایسا بھی نہیں کہ ہم قبل از مسیح کے زمانے کی بات کر رہے ہوں، خیر ساون، جل تھل بارش، بھنی ہوئی مکئی کے دانے اور بہادر آباد کراچی کی کتاب چورنگی میں، میرا بھائی اور ایک دوست۔۔۔ اُف اتنی تیز بارش کہ روڈ پر گاڑیاں تیرتی نظر آئیں اور پھر ہماری طرح کچھ اور بھی پاگل (بارش کے پاگل) روڈ پر اور..... بے فکری کی ہنسی، مستی، شوخی اور...... اور گرما گرم پکوڑے اور پٹھان کی چائے، ہائے۔۔۔ اب کہاں وہ بے فکری ...ریڈیو پر پروگرام تھا، دورانِ پروگرام تیز بارش



عظمیٰ بلوچ

شروع ہوگئی، خوب ساون کے گانے بجائے، لائیو کالز لیں، جب پروگرام ختم ہوا تو پتا چلا کہ اگلے پروگرام کے میز بان تیز بارش کی وجہ سے پہنچ نہیں پائے، ڈیوٹی آفیسر نے کہا کہ پروگرام پروڈیوسر نے کہا ہے کہ عظمیٰ سے کہو وہ ہی پروگرام جاری رکھیں، ہم بھی خوش کہ بھئی واہ، ڈبل مزہ...... دوبارہ ساون کے گیتوں کے سُر بکھیرنے لگی، لائیو کالز کو شامل کیا تو پہلی کال (آہم ......ان کی منگیتر کی کال آگئی جو خیر سے اب شوہرِ نامدار بن گئے ہیں) میں اپنے ساون کے شو میں مگن، کال اٹھائی آن ائر سلام دعا کی، نام پوچھا تو حضرت نے کہا رہنے دیں اتنے حسین موسم میں آپ بس میری ایک فرمائش پوری کردیں (آپ یقین کریں میں بالکل

آواز کو نہیں پہچان پائی) میں نے کہا جی فرمائیں کیا سنیے گا، کہنے لگے کہ وہ سنوا دیں "اب کے سال پونم میں، جب تم آؤ گی ملنے"۔ میں نے کہا ارے واہ، یہ کلام تو خورشید صاحب کو بھی بے حد پسند ہے...... اور وہ ایک دم بات کاٹ کر کہنے لگے جی میں وہی ہوں یعنی محمد خورشید، اوہ...... پھر تو بولتی ایسی بند ہوئی کہ بنا اللہ حافظ کہے گانا آن ائیر کیا۔ پھر ڈیوٹی روم میں ان کی کال آئی تو بے ساختہ ہنستے ہوئے کہنے لگے بھئی کیا ہو گیا......؟ ہم بھی آپ کے لسنر ہی ہیں، اب بھی اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو وہ خوب صورت شام یاد آ جاتی ہے۔

2 : اب تو ساون کراچی والوں کے لیے خواب ہی بن کے رہ گیا ہے مگر...... اگر ساون کی برساتوں میں گاؤں وغیرہ جانے کا پروگرام بن جائے تو ساون کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے، گاؤں کی ہریالی، پیپل کے درخت پر ڈلا ہوا جھولا (پینگ)، کزنز کے ساتھ کچے کچن میں مہکتی مٹی کے ساتھ گرم کچوریاں واہ واہ، واہ...... رہ گیا آپ کا سوال کہ کیسے لطف اٹھایا جائے تو میں تو صرف اتنا کہوں گی کہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے کچھ پل اپنے لیے، اپنی فیملی کے لیے ضرور نکالیں، سب کچھ مینیج ہو سکتا ہے اگر آپ مینیج کرنا چاہیں، موبائل فون، لیپ ٹاپ وغیرہ سوئچ آف کریں اور اپنی فیملی لائف کا بٹن آن کریں، ساون کا مزہ لوٹیں، مسائل کو بھول جائیں، آزمائش شرط ہے۔

3: خیال وخواب ہوا برگ و بار کا موسم...... جیسا کہ پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ کراچی والوں کے لیے ساون اب صرف ایک خواب بن کر یا پھر یاد بن کر رہ گیا ہے تو ہم تو بھئی خیالی ساون بھی زور شور سے مناتے ہیں۔ ذرا سے بادل چھائے نہیں اور ہمارا فرمائشی پروگرام اسٹارٹ، فوراً امی کو کال ملاتی ہوں ہاں امی جی آج بہت تیز بارش ہونے والی ہے آ رہی ہوں عائشہ کے ساتھ...... جی جی، پکوڑے بنوالیں، طاہری میں خود بنا لوں گی آ کر، کیری کا اچار بھی منگوالیں پلیز......

بادل برسیں

بادل برسیں!
بادل اتنے زور سے برسیں
میرے شہر کی بنجر دھرتی
گم صم خاک اُڑاتے رستے
سوکھے چہرے
پیلی آنکھیں
بوسیدہ مٹیالے پیکر ایسے بھیگیں
اپنے کو پہچان نہ پائیں
بجلی چمکے......!
بجلی اتنی زور سے چمکے
میرے شہر کی سونی گلیاں
مدت کے تاریک جھروکے
پُراسرار کھنڈر، ویرانے
ماضی کی مدھم تصویریں ایسے چمکیں
سینے کا ہر بھید اگل دیں
دل بھی دھڑکے
دل بھی اتنے زور سے دھڑکے
سوچوں کی مضبوط طنابیں
خواہش کی ان دیکھی گرہیں
ایک چھنا کے سے کھل جائیں
سارے رشتے، سارے بندھن
چاہوں بھی تو یاد نہ آئیں
آنکھیں اپنی دید کو ترسیں
بادل اتنے زور سے برسیں

شاعر: محسن نقوی
مرسلہ: شبنم میر، سیالکوٹ

یہ بات الگ کہ بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں مگر ہاں میری وجہ سے ہم سب بہن، بھائی ایک ساتھ ان دیکھا ساون ضرور انجوائے کرتے ہیں۔ میری سسرال والے بھی اب سوکھا، سوکھا ساون انجوائے کرنے لگے ہیں۔

ڈاکٹر مبینہ گل

۱: میڈیکل کالج کا زمانہ ساون میں بہت یاد آتا ہے جب ہم تمام اسٹوڈنٹ بارش میں زبردستی ٹیچر سے لیکچر منسوخ کرنے کی درخواست کرتے تھے اور ٹیچر بھی موسم کو انجوائے کرتے تھے۔ ہم کالج کینٹین میں گرما



ڈاکٹر مبینہ گل

گرم سموسے، چائے اور کچوریوں کا لطف اٹھاتے تھے اور کالج پوائنٹ میں برسات کے گانے گاتے بھرپور تفریح کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم کالج کی سالانہ پکنک پر گئے تھے، سخت گرمی کے دن چل رہے تھے لیکن جب ہم ساحلِ سمندر پر پہنچے تو موسم بہت اچھا ہوگیا تھا، آسمان پر بادل چھا گئے اور یکایک تیز بارش ہوگئی اور ہماری پکنک کا لطف دوبالا ہوگیا۔ ساون کی یادوں میں ایک یاد نازش باجی کی مہندی کی ہے۔ گھر کی پہلی شادی ہم سب بہت پُرجوش تھے۔ ایک مہینے سے مہندی کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن اس روز شدید بارش کی وجہ سے ہمارے تمام انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے لیکن ہم بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں، ہم نے تقریب ملتوی نہیں کی رات گیارہ بجے بارش رکی فراز بھائی کے گھر سے بارہ بجے مہندی آئی۔ مہندی اور گیلی مٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو کا لطف اٹھایا اور خوب ہلا گلا کیا۔ اور یہ دونوں موقع میرے لیے ساون رُت میں ''تم'' بن کر دل کو چھو لینے والی یاد بن گئے۔

۲: آج کل زندگی بہت تیز دوڑ رہی ہے اور مسائل و مصروفیات کی وجہ سے وقت کی شدید کمی ہے اگر ان سب کے باوجود گرما گرم پکوڑے، سموسے اندرسے کی گولیاں اور کچوریاں کھاتے اور ساون گیت گاتے ساون منانے کا کچھ اور ہی لطف ہے۔ اور اس پر گرم گرم چائے موسم کا لطف دوبالا کر دیتی ہے بارش میں گلی میں بچوں کا کھیلنا، پرندوں کی چہچہاہٹ، پتوں کی لہلہاہٹ دل کو موہ لیتے ہیں ایسے میں کچھ وقت کے لیے اپنی تمام پریشانیوں اور مصروفیات کو بھلا کر صرف اور صرف موسم کا لطف اٹھانا چاہیے۔

۳: تصور میں گھر والوں یا دوستوں کے ساتھ ساحلِ سمندر یا واٹر پارک کا رخ کر کے حقیقت میں ساون کا بھرپور لطف اٹھاتے ہیں وہ تمام مزے ہم خیالی ساون میں بھی لوٹیں گے۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ گھر بیٹھے، بیٹھے شمالی علاقہ جات کے برستے ساون کی سیر کر کے خیالی ساون سے لطف اندوز ہوں۔

ذوباریہ مرسلین (طالبہ)

مجھے اپنی سب سے اچھی دوست یاد آتی ہے کیونکہ ہم نے بارشوں میں اکٹھے بہت کھیلا ہے۔ ہم دونوں آسمان پر چمکنے والی بجلی سے بہت ڈرتے تھے۔ اس کے ساتھ، ساتھ اسکول کالج میں گزارے دن بھی بہت یاد آتے ہیں جب بارش میں دوستوں کے ساتھ مل کر ہم بہت ہلا گلا کرتے تھے۔

۲: چونکہ اب بارش پہلے کی طرح نہیں بلکہ کبھی، کبھی ہوتی ہے تو بارش میں تمام مصروفیات چھوڑ کر

صرف اور صرف بارش کا بھرپور لطف اٹھائیں اور تازہ دم ہوکر زیادہ دل لگا کر اپنا کام کریں اور تمام مسائل کو وقتی طور پر بھلا کر بارش کو پوری طرح محسوس کریں اور ارد گرد اگر قریبی دوست ہیں تو ان کو بھی اس میں شامل کرلیں ورنہ بارش ایسی چیز ہے جسے محسوس کرکے اکیلے بھی اس سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔



ذوباریہ مرسلین

۳: خیالی ساون کا کیا فائدہ؟ اس لیے خیالی ساون نہیں منانا چاہیے کیونکہ اس سے دل مزید خراب ہوتا ہے کہ تصور میں تو ساون کو دیکھ رہے ہیں لیکن برستے ساون میں بھیگ کر اسے محسوس نہیں کرپارہے۔

ماہم خان (آر جے)

۱: میری نظر میں ''تم'' میری زندگی کے وہ خاص لوگ ہیں جن کی میری زندگی میں بہت اہمیت ہے، جن کو میں دل سے مانتی ہوں اور چاہتی ہوں ان سے جڑی بہت سی یادیں ہیں اور وہ ''خاص پل'' میں یاد آتے ہیں۔ ساون رت میں تنہائی ہو تب میں گزرے بیتے دنوں سے اب تک کا سفر طے کرتی ہوں اور اس میں ان لوگوں کو یاد کرتی ہوں۔

۲: آج کی مصروفیات، مسائل اور پھر بارش مشکل میں ڈال دیا ہاہاہا۔ مسائل کو بھول کر اور مصروفیات والی جگہوں سے چھٹی لے کر لطف اٹھایا جا



ماہم خان

سکتا ہے۔

۳: ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ساون بھیگے بنا گزر جائے اور اگر گزر ہی جائے تو بھیگی بھیگی سڑکیں، گلیاں اور برستی بارش کو اپنے خیالوں میں سوچ کر لطف اٹھاؤں گی۔

☆☆☆

عزیز قارئین!

حمیرا راحت نے کہا تھا کہ

پیار بھرا اک رشتہ ہے برسات کے موسم سے
ساون لگتا ہے ماں جایا........ ہجولی بارش

اور ساون کی یہ یادیں اور سوغاتیں ہی تو ہیں جو اپنائیت کا بھرپور احساس دلاتی ہیں خوشگوار لمحات سے وابستہ ہوں تو دل میں خوشبو بن کر اور اگر تکلیف دہ ساعتیں ہوں تو درد بن کر دل میں مہکنے لگتے ہیں۔ ساون، بادل نہ بھی برسیں تو خیالی ساون بھی اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے جیسے یہ رپورٹ تیار کرنے کے دوران بادل بن برسے گزر رہے تھے اور اب جبکہ اس کے اختتامی فقرے لکھ رہی ہوں تو موسم کی پہلی بارش کی نوید ملی مینہ برسا اور خوب برسا...... ساون زندہ باد اور ساون نمبر؟ یہ تو آپ ہی بتائیں گی ناں، ضرور بتائیے گا۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یا الٰہی دونوں جہاں میں ازل سے ابد تک سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... الٰہی آمین۔

☆☆☆

☆ پیاری بہنو! اگست کے شمارے کے ساتھ حاضر ہوں اور آپ سب کو یوم آزادی کی مبارک باد دیتے ہوئے یہ ضرور کہوں گی کہ اپنے ملک کے مسائل، پریشانیاں، تکالیف کا رونا ہوتے ہوئے ہمیں خود سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے ملک کے لیے کیا ایسا کیا ہے جس سے کسی کو آسانی ہوئی ہو...... ہم سب اپنی گاڑیاں سائے میں کھڑی کرنے کے خواہش مند تو ضرور ہوتے ہیں مگر کیا ہم نے کوئی درخت اس لیے لگایا ہے کہ اس کا سایہ کسی کو آسانی فراہم کرے گا۔ الحمدللہ اس رمضان میں صاحب استطاعت لوگوں نے غربا اور مساکین کا بے حد خیال رکھا...... کراچی میں تو سڑکوں پر افطار ہوتے دیکھا گیا...... مگر کیا رمضان کے بعد یہ نیک کام نہیں ہونے چاہئیں...... دیوارِ مہربانی کا آئیڈیا بہت اچھا تھا کہ وہاں لوگ اپنی چیزیں ضرورت مندوں کے لیے رکھ آئیں مگر سامان لے جانے والوں کی مووی بنا کر انہیں چینلز پر چلانا کوئی مناسب بات نہیں لگی اور اب عید کے بعد شادیوں کا موسم شروع ہو گیا ہے اور خواتین کا ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جو سوٹ ایک بار پہن لیا اسے دوبارہ نہ پہنا جائے اور یوں کپڑوں کا انبار الماریوں میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے اس ضمن میں، میں طبقۂ امرا کی خواتین سے کہوں گی پہلا قدم آپ اٹھائیں کہ آپ اگر ایک سوٹ کو چار مرتبہ پہنیں گی تو وہ جو آپ کی نقل کیا کرتے ہیں وہ اس کو کم از کم دو مرتبہ تو ضرور پہن لیں گی۔ یاد رکھیے پیسے درخت پر نہیں لگتے...... یہ بہت محنت سے حاصل ہوتے ہیں اور انہیں نام و نمود کی جھوٹی نمائشوں میں ہرگز ضائع نہ کریں۔

☆ آیئے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری زہرا عباس، سعودی عرب کے ہاں دوسرا بیٹا تولد ہوا ہے (مبارک باد)

☆ گزشتہ دنوں پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور سندھی اخبارات کی کالم نگار نور افشاں، شکار پور کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی ہے۔ (دعائیں اور مبارک باد)

☆شاعرہ ایثل شادیان بھی پیا دیس سدھار گئیں۔ (مبارکاں)

☆اس ماہ کرنل کلیم اختر اور نسرین کلیم کی پیاری بیٹی بشریٰ کلیم کی شادی علی محی الدین احمد سے اسلام آباد میں ہوگی اور ولیمہ کراچی میں ہوگا۔ جس میں ہماری شرکت بھی ہوگی۔ (مبارک باد)

☆ہماری مایہ ناز شاعرہ شگفتہ شفیق نے ریڈیو ایف ایم پر اپنے پہلے روزے کا احوال بتایا۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری انیسہ حامد کی بھانجی زویا کی اور بھتیجی فائزہ کی شادی ہو رہی ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ردا کی کزن رمشا کی شادی صادق کے ساتھ کراچی میں ہو رہی ہے (مبارک باد)

☆نزہت اصغر، اسلام آباد میں اپنے بہن، بھائیوں سے مل کر واپس کراچی آ گئیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نفیسہ آرا، یو اے ای کی بیٹی رابعہ نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ (مبارک باد)

☆عظمیٰ آفاق بفضلِ اللہ تعالیٰ عمرے کی ادائیگی کے بعد کراچی آ گئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ جولائی اور اگست میں ہماری ان مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کی سالگرہ ہے آپ سب کو بے حد مبارک ہو......
نیلوفر عباسی، رعنا فاروقی، غزالہ طارق، شیریں حیدر، نزہت اصغر، آمنہ حماد، اقبال بانو، شہلا عامر، سنبل، ارم مشیر، شائستہ زریں و سعدیہ ہما شیخ۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بیمار ہیں۔
☆ غزل خاں، نیو یارک بسترِ علالت پر ہیں۔
☆ شہلا ظفر، کراچی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز نسرین فیصل، کراچی کی والدہ شدید علیل ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز شیخ، کراچی کی شوگر بہت ہائی ہوگئی ہے۔
☆ ہم سب کی لاڈلی امینہ عندلیب، سلانوالی بسترِ علالت پر ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی کو ابھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

انتقال پُرملال

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار سعدیہ سلیم، سڈنی کے پھوپا کراچی میں انتقال کر گئے۔
☆ اس ماہ مسز شیخ کے تایا کی برسی ہے۔

نوٹ۔ تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☜ نگہت سیما، چکوال سے۔ ''کیا آپ یقین کریں گی کہ میں کئی ماہ سے آپ کو فون کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ تب سے جب عظمیٰ آفاق کا وہ اپنے گھر کے متعلق مضمون چھپا تھا۔ اسکول سے آ کر نماز اور کھانے سے فارغ ہونے تک چار بج جاتے تھے۔ اس وقت آرام کا وقت ہوگا...... چلو کل جلد ہی کرلوں گی...... یونہی کرتے، کرتے ٹلتا گیا...... سو جا اب چھٹیاں ہو رہی ہیں، چھٹیوں میں کرلوں گی تو چھٹیاں ہوتے ہی رمضان کی آمد اور بھی الجھن کہ رمضان میں تو سب کی روٹین بدل جاتی ہے۔ کیا پتا کون کب آرام کرتا ہے، سو آج قلم اٹھا ہی لیا۔ عظمیٰ کے قلم میں وہی کاٹ ہے جو آپ کے قلم میں ہنسی ہنسی میں چوٹ کر جاتی ہیں۔ وہ اگر اس طرح لکھتی رہیں تو اچھی مزاح نگار بن سکتی ہیں۔ ان کو عمرے کی اور بیٹے کے حفظِ قرآن کی بہت مبارک ہو۔ (جزاک اللہ) ذکیہ بلگرامی کے روحانی سفر کی رُوداد کو دوسری بار بھی اسی شوق ذوق سے پڑھا جس سے پہلی بار پڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔ ان سے درخواست ہے کہ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اس ماہ کا پاکیزہ پورا پڑھ ڈالا۔ ہمیشہ کی طرح لاجواب ہے۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی پھر ناول کی اقساط آپ کے ناول کی تمام اقساط پڑھی ہیں، بہت خوب...... بہت دلچسپ ہے۔ یقیناً بہت بہترین ناول ہوگا۔ مدیحہ شاہد، دُرِ ثمن اور نایاب بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ دلچسپی برقرار ہے۔ پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوریت نہیں ہوئی اور اب اپنے ناول کے متعلق جو بالآخر اختتام کو پہنچا۔ اپنے تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے پڑھا پسند کیا اور رائے دی۔ بہت پیاری دوست افسر سلطانہ اور سدرہ مرتضیٰ کا بہت شکریہ جنہوں نے اکثر اقساط پڑھ کر رائے دی اور پسند کیا۔ آمنہ حماد کا اور انجم آپ کا بھی بہت شکریہ کہ اسے لکھنے کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ اگر آمنہ حماد اصرار کر کے نہ لکھواتیں تو شاید یہ ناول کبھی نہ لکھا جاتا۔'' (نگہت سیما...... آپ کا شمار ہماری ان مصنفات میں ہے جن پر ہم فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے وہ شمارے خاص الخاص ہیں جن میں نگہت سیما کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ میری اور میرے ادارے کی جانب سے دلی مبارک باد کہ آپ کے ناول نے پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ ماشاء اللہ)

☜ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کا اس ماہ بے حد خوب صورت انداز میں اختتام ہوا...... آخر میں انجم انصار کے انٹرویو نے اس میں مزید دلکشی پیدا کر دی کہ ہمیں ذکیہ صاحبہ کے بارے میں مزید جاننے

کو ملا۔ تمام ناول بہت اچھے جا رہے ہیں مگر گم شدہ محبت ہمارے ساتھ، ساتھ اس وجہ سے بھی چل رہا ہے کہ اپریل میں پاکیزہ کی سالگرہ تھی تو اس کی ہیروئن کی سالگرہ تھی۔ پھر رمضان کی افطار پارٹی اور عید کا احوال یہ سب پڑھتے ہوئے بھی ایک الگ لطف آیا ہے۔ رمضان اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دھیرے، دھیرے پڑھ رہی ہوں۔ اس ماہ کے جلترنگ ہماری بار ہا کی فرمائشوں پر آخر لگا ہی دیے گئے۔ جن کو پڑھ کر لطف آیا۔ پرانی تصاویر کیوں دیتی ہیں، اس ماہ خالدہ نسیم کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔ شائستہ زریں، مدیحہ شاہد اور غزالہ فرخ کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✿ اینہ عندلیب، سلانوالی سے۔''ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روحانی سفر کی روداد پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملا...... ان کا انٹرویو بھی ان کی یادوں کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔ ذکیہ آپا کی اور ان کی فیملی کی تصاویر کی تشنگی رہی...... ہم جن کی تحریروں سے محبت کرتے ہیں ان کے حوالے سے ان کے گھر کے لوگوں کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ (آئندہ ان کی کسی تحریر کے ہمراہ ذکیہ بلگرامی اور ان کے اہلِ خانہ کی تصاویر لگا دی جائیں گی) گم شدہ محبت کی قسط نمبر چھ بڑی بھرپور رہی اور آگے کیا ہوگا کا سسپنس علیحدہ رہا۔ نگہت سیما میری فیورٹ رائٹر ہیں اور انہوں نے اپنے ناول کا اختتام انتہائی عمدگی کے ساتھ کیا۔ دیگر تحریروں میں مدیحہ شاہد، شائستہ زریں، سیما بنت عاصم اور نزہت جبیں ضیا کی بہت اچھی لگیں۔ ڈبل بیڈ کا خاکہ ہم جب بھی پڑھیں گے ہنسی آئے گی۔ آپ نے بہنوں کی فرمائش پوری کی اور ہمیں بھی اچھی لگی۔'' (اور پیاری گڑیا ہمیں بھی آپ کی پسندیدگی سے خوشی ہوئی)

✿ تاجور بانو، لاہور سے۔''پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں، ہاں رائے دینے کا ٹائم نہیں ملتا...... مگر میں اس کا ایک، ایک لفظ پڑھتی ہوں۔ جو بہنیں بیمار ہیں ان کے لیے بھی دعا کرتی ہوں، آپ کا ہر ماہ کا اداریہ مجھے سچی میں بہت پسند ہے۔ ہر مرتبہ کام کی کوئی بات ہاتھ میں آجاتی ہے۔ آپ لڑکیوں کو بھی اچھی باتوں کی تلقین کرتی ہیں، میں اپنی بیٹیوں کو بھی پاکیزہ پڑھواتی ہوں تاکہ وہ بھی اچھی باتیں سیکھیں...... ایک بات آپ سے پوچھنی تھی کہ کیا اینہ عندلیب آپ کی کوئی خاص جاننے والی ہیں ان کی تحریریں ہر ماہ ہی نظر آیا کرتی ہیں۔'' (سب سے پہلے اس محفل میں خوش آمدید...... پاکیزہ کی باتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں تو وہ آپ صرف اپنی بیٹیوں کو ہی نہیں بلکہ آگے یعنی اپنے حلقۂ احباب میں بھی بتایا کریں...... ہاں آپ نے بالکل غلط سنا ہے کہ اینہ عندلیب میری کوئی جاننے والی ہیں، آپ کو پتا نہیں شاید...... اینہ عندلیب تو میری بیٹی ہے جو سلانوالی میں رہتی ہے)

✿ ثریا احمد، کراچی سے۔''باجی میں نے ٹی وی پر زاہد حسین چھیپا کا انٹرویو دیکھا جو سوفٹ ویئر انجینئر ہیں اور جنہوں نے قرآن پاک کو موبائل پر ڈاؤن لوڈ کرنے کا طریقہ بتایا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا اگر کسی بہن کو یہ طریقہ معلوم ہے تو اس کو پاکیزہ کی اس محفل میں بتا دیں تاکہ ہم اپنے، اپنے موبائل میں قرآن پاک کو شامل کر لیں۔'' (میں نے ایسا کوئی انٹرویو نہیں دیکھا کہ ان دنوں ٹی وی بہت کم دیکھ رہی ہوں...... اگر کسی بہن کو معلوم ہے تو ضرور بتائیں بلکہ میرے موبائل میں تو کوئی آ کر کر دے۔ نوازش ہوگی)

✿ صبا نور، لیہ سے۔''انجم باجی میں آپ کا ناول گم شدہ محبت بے حد شوق سے پڑھ رہی ہوں، اس کی دو خاص وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ناول بہت خوب صورت انداز میں شروع ہوا ہے اور بڑی دلکشی سے آگے بڑھ رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی ہیروئن کا نام میرے نام پر رکھا گیا ہے اور ہیرو کا نام بھی میری پسند پر رکھا گیا ہے۔ بس اب دل میں یہ خوف ہے کہ صبا کے ساتھ کچھ برا نہ ہو......'' (پیاری صبا ناول کے سسپنس کو خوف کا نام نہ دیں...... اور محبت کرنے والے تو بڑے بہادر ہوتے ہیں۔ بہر حال آگے کیا ہونے والا ہے یہ سب میں آپ کو پہلے سے ہرگز نہیں بتانے والی چاہے آپ خوف زدہ ہوں یا کوئی قسط پڑھ کر مزید ڈر جائیں)

✉ فرخندہ جعفری، گجرات مدینہ سیداں، آپ کا تفصیلی خط پڑھا آپ نے تو تبصرہ، مراسلات، نظمیں سب ایک ساتھ ہی لکھ دیں، آپ ہر سلسلے کے لیے علیحدہ کاغذ استعمال کیا کریں۔ ہاں تبصرے میں آپ نے ہر ناول، ہر افسانہ پسند کیا ہے...... اس لیے نوازش ہی کہوں گی۔

✉ ارم کمال، فیصل آباد۔ پیاری بیٹی آپ کے مراسلات بہت اچھے ہوتے ہیں مگر آپ ہمیشہ صفحے کی دوسری جانب

بھی لکھ دیتی ہیں۔ اس وجہ سے آپ کی بہت سی اچھی چیزیں شامل ہونے سے رہ جاتی ہیں اس لیے پلیز ہر سلسلے کے لیے الگ صفحہ استعمال کیجیے...... بے شک ایک ہی لفافے میں بھیج دیں اور یہی بات مجھے سیدہ علیشا بہاول پور سے بھی کہنی ہے۔

✉ فائزہ فاروق سحر، لاہور۔ آپ طویل نظمیں لکھنے کے بجائے مختصر نظمیں لکھیں...... وہ بھی کیا دن تھے ...... میں اختتامی بات تو کچھ تھی ہی نہیں...... ہاں پاکیزہ کارنر کے لیے اپنا انٹرویو کب بھجوا رہی ہو...... ہاں ریڈ قلم سے کوئی تحریر نہ لکھا کریں۔

✉ ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ۔ آپ کے مراسلات اچھے ہوتے ہیں مزید محنت کیجیے...... ہاں پاکیزہ کارنر کے لیے اپنا انٹرویو تصویر کے ساتھ یا پھر بغیر تصویر کے بھی بھیج سکتی ہیں...... جیسے جولائی کے شمارے میں ہم نے مکلی کی مرک جانوری کا انٹرویو شائع کیا ہے...... اسے ہمارے قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔

✉ راحیلہ بنت مہر علی شاہ، گاؤں آماخیل۔ خوش آمدید گڑیا آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی۔ آپ پاکیزہ کے تمام مستقل حصوں میں حصہ لیجیے اور ہر ماہ اپنا تبصرہ بھی ضرور لکھیے...... آپ کے بزم پاکیزہ کا سوال واقعی ہمیں سمجھ میں نہیں آیا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جیت گئیں اور میں ہار گئی۔ پلیز کوئی دلچسپ سوال بھیجو ناں۔

✉ لاریب، ماہ زیب، چونیاں۔ بے حد خوب صورت لکھائی میں آپ کی تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ احادیث بھیجتے ہوئے حوالہ ضرور دیں اور کسی کتاب سے اگر کوئی اقتباس بھیجیں تو بہت طویل نہ ہوتا کہ ہم اسے بہ آسانی کارنر پر لگا سکیں...... ویسے آپ کے مراسلات میں بہت پسند کرتی ہوں۔

ﻬ نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ سے۔ ”آپ کے لیے ہر وقت دعا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عذرا آنٹی اور معراج انکل کے لیے بھی دعا کرتے ہیں کہ ہمیشہ صحت برقرار رہے اور عظمیٰ جی سے کہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھیں پاکیزہ کے لیے۔ بڑا اچھا لگتا ہے ان کی غزل شائع ہوئی اچھا لگا۔ گم شدہ محبت اچھی جا رہی ہے۔ کہانی بہت آہستگی کے ساتھ کھل رہی ہے...... مگر پُرلطف سا تجسس برقرار ہے اور درِ ثمین تم کہاں ہو کہ ہاتھ چوم لوں۔ بس ملنے کی دیر ہے۔ ہماری محبت ابل پڑے گی۔ میری بیٹی اپنی نانو انجم انصار کو سلام پیش کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام قارئین اور مصنفات خالاؤں کو سلام اور دعا کہتی ہے۔“

(وعلیکم السلام اور تبصرے کا شکریہ)

ﻬ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ”پاکیزہ ڈائری میں آج کل عالیہ ضیا چھائی ہوئی ہیں انہیں بھی مبارک ہو...... اللہ انہیں اپنے گھر جلد بلالے، آمین۔ ذکیہ بلگرامی کو لاکھوں دعائیں پہنچیں...... سنبل ملک کے لیے بھی میٹھی دعائیں۔ تمام بیماروں کو شفا کی دعا...... اور مرنے والوں کو جنت کی دعا پہنچے...... تمام سلسلے پسند ہیں مگر شاعری ذرا زیادہ کردیں۔ باتیں بہاروں وخزاں کی اس بار بہت اچھا لگا...... وہ کیڑوں کے مسئلے پر اس بہن کو بہت مشورے ملے۔ امید ہے عمل کریں گی۔ ایک مشہور دعا جو عام ہے وہ بھی وردِ زبان رکھیں۔ اعوذ بکلمات اللہ الطامتہ من شر ما خلق اور میں نے حروفِ ابجد کے ذریعے اسم نکالا ہے، وہ میں بھی پڑھوں گی اور تمام گھر کے افراد بھی پڑھیں۔ ملیک منعم والی۔ ضرور افاقہ ہوگا انشاء اللہ۔“ (جزاک اللہ)

ﻬ تسنیم سکینہ صدف، ڈسکہ سے۔ ”پہلے تو مدیرہ کا مجھے کچھ کہنا دل پر اثر کر گیا۔ سلسلے وار ناول میں انجم انصار کے ناول نے دل موہ لیا۔ مکمل ناول میں اُمِ ایمان نے کمال کردیا۔ کہانیوں میں غزالہ جلیل راؤ، اعتراف ایک کامیاب تحریر تھی۔ فصیحہ آصف خان کی کرچیاں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں کہ دیکھ بھال جانچ پڑتال کے بعد رشتہ پکا کرنا چاہیے۔ بے شک آپ کتنے ہی غریب ہوں بڑے گھر کے لالچ میں ثمرین اتنی کم عمری میں بیوہ اور ذہنی ٹینشن کا شکار تو نہ ہوتی۔ شیریں حیدر کا افسانہ کنگن اچھا افسانہ تھا۔ ثمینہ فیاض کی تحریر بھی ایک خوب صورت تحریر تھی۔ مستقل سلسلوں میں ہمیشہ کی طرح جلترنگ ٹاپ کلاس رہا...... انجم آپی کی کتاب دل کے آس پاس...... مجھے میری دوست نے میری برتھ ڈے 16 جون کو گفٹ کی تھی اور مجھے سب تحفوں سے زیادہ یہ تحفہ دل کو لگا۔ عظمیٰ آفاق کی پاکیزہ ڈائری میں کچھ نظموں، غزلوں نے بھی چاشنی گھول دی۔ آئیے سب اس عید کے موقع پر صدقِ دل کے ساتھ اس عہد کو وفا کرتے ہیں کہ آپس میں نفاق، شقاق کو مٹا کر ایک مرتبہ پھر حسبِ سابق متحد ہو جائیں۔ اگر ہم سب نے دل سے بغض، کینہ نکال لیا تو یقیناً نہ صرف ہماری عبادات و ریاضت کا مقصد پورا ہو جائے گا بلکہ عید کی خوشیاں دائمی مسرتوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔“ (بے شک)

٭ رخسانہ ناصر، کراچی سے۔ ’’پاکیزہ کب سے پڑھ رہی ہوں۔ میری شادی سے بھی پہلے کی بات ہے پھر بعد میں کافی ٹائم بریک آگیا۔ اب پھر دوبارہ چار سال سے پاکیزہ ہر ماہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے نئی تبدیلیوں کے ساتھ۔ بہنوں کی محفل میں بس میرا بہت دل لگتا ہے۔ ہر ماہ سوچتی تھی کہ میں بھی خط لکھ کر سب بہنوں کے بیچ شامل ہو جاؤں لیکن اِک جھجک کہ میں رائٹر بھی نہیں۔ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں، ایک عام گھریلو سی عورت ہوں کہ جس کی دنیا صرف شوہر، گھر اور بچوں تک محدود ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ کیسا سوچیں خیر اب ہمت کر کے لکھ رہی ہوں جو مزاجِ یار میں آئے۔ ہاں آپ کو بتاؤں کہ پچھلے دنوں آپ جو آسٹریلیا گئی تھیں تو جانے سے پہلے آپ نے جو ویزے کے فارم وغیرہ کا جو کام کروایا تھا وہ میرے بیٹوں کا آفس تھا۔ بچوں نے بتایا کہ آج ہمارے آفس میں پاکیزہ کی انجم آنٹی آئی تھیں، میں تو سن کر اچھل پڑی کہ مجھے پتا ہوتا میں ضرور جا کر مل لیتی۔ انجم مجھے اپنے بچپن سے ہی جانے کیوں کسی بھی رائٹر سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ آپ کا ناول گم شدہ محبت زبردست لگ رہا ہے۔ انجم اگر میں کسی کراچی میں رہنے والی بہن سے دوستی کرنا چاہوں تو کیا آپ میری مدد کریں گی؟ اگر آپ نے میرا خط پڑھ کر محفل میں شامل کر لیا تو میرا مان بڑھ جائے گا۔‘‘ (آپ اس محفل میں باقاعدگی سے شرکت کریں۔ آپ کی دوستی سب سے ہو جائے گی۔ ہاں میں آپ کے بیٹے کے آفس میں انشاء اللہ بہت جلد دوبارہ آنے والی ہوں...... تو پھر ملاقات تو ہو رہی ہے ناں آپ سے)

٭ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ’’جون کا پاکیزہ جلدی مل گیا سب سے پہلے آپ کا اداریہ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا۔ واقعی رمضان المبارک کا مہینہ صبر کا ہوتا ہے۔ بہت اچھا لگا پھر ذکیہ جی کی یادوں کی مالا پڑھ کر دلی سکون ملا۔ سلوشن، ہاجرہ ریحان کا افسانہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیریں حیدر حسب سابق اچھا افسانہ لے کر آئیں۔ نسیم سکینہ صدف تین ناموں والی رائٹر واہ کیا کہنے، درامید اچھا افسانہ لگا۔ آسان راستے، نصیب کی بات، مٹی کی عورت، پیاس، پانچواں دیا...... مکمل ناول، میں بھی مسلمان ہوں، بے حد پسند آیا۔ کرچیاں، فصیحہ آصف نے بہترین لکھا مگر مختصر تھا۔ آپ کا سلسلے وار ناول گم شدہ محبت پڑھ کر مزہ آگیا۔ پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔ اپنی غزل دیکھ کر اچھا لگا۔ سدرہ کلثوم اپنا فون نمبر مجھے بھیجو جو بہنیں بیمار ہیں وہ انجم باجی کی کتاب روحانی مشورے سے صحت یاب ہو جائیں گی، ہمیں تو بے حد فائدہ ہوا ہے، میں تو دن رات انجم جی کو دعائیں دیتی ہوں، رفیعہ ابدالی کے نسخے و خط بہترین تھا اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دے، آمین۔ سب کو دعا و سلام خاص کراچی پیاری سی دوست یعنی پروین افضل کو بے حد سلام اور دعا۔‘‘ (آپ کے سلام کلام اور دعائیں پہنچائی جا رہی ہیں)

٭ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد سے۔ ’’اعتبار وفا اپنے پورے جوبن پر ہے اس ناول نے کبھی بور ہونے نہیں دیا ہر بار پڑھنے کے بعد تشنگی سی رہ جاتی تھی مگر اب نہیں رہی۔ نگہت سیما آپی کو میرا سلام اور اس بار گم شدہ محبت میں صبا اور ندیم خان والے معاملے کی بلی آخر کار تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ اب اگلے ماہ دیکھیں گے ندیم خان اور اس کے گھر والوں کے تاثرات...... دِلِ دشمن بلال بھی بہت خوب جا رہی ہیں، لگتا ہے عمر اور ایشال کو ملا کر ہی چھوڑیں گی۔ باقی سب افسانے، ناول اور کہانیاں زبردست تھیں۔ ہاں البتہ طیبہ عنصر کا پانچواں دیا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، کیا ہمارے ملک میں ایسے لوگ آج بھی ہیں جو خاندان کے نام پر بیٹیوں کی شادی باہر نہیں کرتے، اسلام میں تو مرد اور عورت کو برابر کا حق دیا ہے۔‘‘ (جی بالکل، تبصرے کا شکریہ...... آپ کی تحریریں مل گئی ہیں، شائع ہو جائیں گی)

٭ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ ’’بہنوں کی محفل اس بار پھیکی، پھیکی سی لگی جانے کیوں...... پاکیزہ ڈائری بھی کوئی خاص نہیں لگی۔ جہاں آرا حئی بچپن سے میری فیورٹ اداکارہ رہی ہیں۔ چہرے کی لُک سے ایک حلیم الطبع خاتون کا تاثر دیتی ہیں۔ اچھا لگا ان کا انٹرویو پڑھ کر لیکن شائستہ آنٹی پاکیزہ مہمانوں سے ذاتی سوالات کیوں نہیں پوچھتیں۔ ہمیں پتا نہیں... چل سکا کہ جہاں آرا صاحبہ کا تعلق بنیادی طور پر کہاں سے ہے؟ ان کی تعلیم؟ بات اگر انٹرویو کی ہو رہی ہے تو شیریں حیدر کے انٹرویو کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہو گی چونکہ میں مئی کے شمارے میں خط نہیں لکھ پائی سو اب اپنی رائے سے آگاہ کر رہی ہوں۔ شمع ہدایت پڑھا...... صدقے کے بارے میں بہت اچھی معلومات ملیں اور ایسی چیزیں پڑھنے کے بعد میں اپنی ذاتی زندگی میں ضرور ہی اپلائی کرتی ہوں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور ان کی یادوں کی مالا کی تو کیا ہی بات ہے بس وہ اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھا کریں۔ اعتبار وفا کچھوے کی چال چلتا ہوا ہر حال میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ ہی گیا۔ مجموعی طور پر اچھا

رہا۔ گنگن میں شیریں حیدر نے درست ٹائم پر درست میسج دیا۔ جنہوں نے زکوٰۃ نہیں دی وہ اب دے دیں۔ آپ کا ناول بہت زبردست جا رہا ہے۔ بالکل بور نہیں کر رہا، دُرِ شمن بلال کا ناول بھی ٹھیک ہے۔ سارہ کو تھوڑا بولڈ ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ جو کارنامہ وہ سرانجام دے چکی ہے تو......؟ نایاب جیلانی کا یہ ناول بھی پسند آرہا ہے۔ اسما بے حد بو ہے۔ جبکہ اسمارا کی گردن مروڑنے کا دل کرتا ہے۔ سلوشن، در امید اور پتھر کا دیس ٹھیک ہی رہے۔" (آپ کا پورا خط پڑھا...... اللہ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے...... تبصرے کا شکریہ)

٭ طاہرہ، خوشاب سے۔ "پاکیزہ بہت اچھا جا رہا ہے اور اپنی جگہ معاشرے کی اصلاح کے لیے بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ آگے انسان کی مرضی ہے کہ کس بات سے کیا اور کتنا سبق لیتا ہے۔ ہماری ایک بہن نے اپنے گھر میں کاکروچ کے مسئلے کا ذکر کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک عمل میرے علم میں آیا سوچا اس کا ذکر کر دوں۔ جمعرات والے دن باوضو ہو کر سورۃ نمل اول آخر درود شریف کے ساتھ پڑھیں اور ایک کاغذ پر لکھ کر مٹی کے کچے برتن (گھڑا وغیرہ) میں پانی میں بھگو دیں۔ پھر گھر کے تمام کونوں میں چھینٹیں ماریں۔ اور تمام گھر والے تھوڑا تھوڑا سا گھونٹ پانی بھی پی لیں۔ پھر دوسری اور تیسری جمعرات تک یہ عمل کریں۔ نہایت مجرب عمل ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ عملیات کا مکمل فائدہ تب ہوتا ہے جب بندہ فرائض وواجبات پورے کرے اور حرام کاموں (غیبت، ماں، باپ کی نافرمانی بدنظری، سود) سے بچے۔" (جن بہن کے ہاں یہ مسئلہ ہے میرا خیال ہے کہ انہیں یہ عمل ضرور کرنا چاہیے کہ یہی بات بشریٰ سہیل نے لکھی ہے)

٭ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "نگہت سیما کا ناول اعتبار وفا اختتام پزیر ہے۔ امید کرتے ہیں اختتام اچھا ہوگا۔ شاکنگ نیوز ہوگی عظام اور رواحہ یقیناً بھائی ہوں گے جو شاید بہن نکل آئے سسپنس پھیلا ہے۔ اُمِ ایمان کی اسٹوری، میں بھی مسلمان ہوں امپریسو تھی۔ پیدائشی مسلمان اب مذہب پر اتنے پکے نہیں رہے جتنا کہ بعد میں دل سے اسلام قبول کرنے والے مسلمان ہیں کیونکہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آئے ہیں۔ غزالہ جلیل راؤ نے بھی اچھا لکھا، ثمینہ فیاض کی...... نصیب کی بات پُراثر تحریر تھی۔ بہت اچھا میسج دیا کہ جو انسان کے مقدر میں ہے وہ اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ ٹی وی اداکارہ جہاں آرا حئی سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔ کافی ڈراموں میں انہوں نے بہت اچھی اداکاری کی۔ کافی اچھے ڈرامے ہیں ان کے خاص کر بربر گرفیملی میں ان کا رول جاندار تھا۔ مدیحہ شاہد کا پتھر کا دیس اچھا جا رہا ہے۔ صائمہ قریشی نے بھی اچھا لکھا، ساحل، جھرنا اور آئینہ کے لیے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ رفعیہ ابدالی کا تبصرہ اچھا لگا۔" (نوازش)

٭ نجمہ ناز اصغر، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے ٹھک کر کے دل میں اتر جاتا ہے، ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی یادوں کی مالا ایک خوب صورت روحانی سفر ہے۔ گم شدہ محبت اپنے بیک گراؤنڈ بنایا لگا میں بھی وہاں موجود ہوں۔ روحانی سوال جواب کا سلسلہ وقت کی ضرورت تھا، عظمیٰ کو کتاب کی رونمائی مبارک ہو۔ شیریں حیدر کا انٹرویو اچھا لگا، جلترنگ اداس لبوں پر ہنسی باقی ابھی پڑھا نہیں، دل کی آنکھ سے پڑھنے والی تحریریں دھیرے، دھیرے ہی پڑھی جاتی ہیں اور سمجھ کر پڑھتی ہوں، پڑھ کر سمجھتی ہوں تو وقت تو لگتا ہے۔ انجم باجی آپ کی مصروفیات کے باعث آپ کو فون نہیں کر پاتی، ورنہ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ آپ سے بات کرنے کے لیے...... یہ بات میں سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ میں نہ تکبر ہے اور نہ ہی کوئی اور بات۔ بات کر کے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔" (نجمہ تمہارے مراسلات ختم ہو گئے ہیں، مزید بھجوادو...... اس مرتبہ عید کے بعد بہت سی بہنوں سے میں رابطے میں نہیں رہ سکی...... کہ رمضان کے آخری عشرے میں اچانک ہی میرا بیٹا ضیا امریکا سے آگیا...... اور میری عید کی خوشیاں مزید بڑھ گئیں...... اس کا چند دن رہنا ہی میرے لیے بہت کچھ تھا۔ اسی طرح ذکیہ بلگرامی کا بیٹا بھی عید منانے کراچی آگیا تھا۔ تہواروں پر اولاد کا پاس ہونا بہت اچھا لگا کرتا ہے۔ اللہ سب بچوں کو دیس اور پردیس میں سلامت رکھے۔ آمین۔)

٭ ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ "سب سے پہلے تو پاکیزہ کی سالگرہ محترمہ عذرا آپا، معراج انکل اور انجم باجی آپ کو سب کو بے حد مبارک ہو۔ خوشی اس بات کی ہے کہ پاکیزہ نے کامیابی کا یہ سفر معیار کے ساتھ طے کیا اور اللہ پاک کے کرم سے اور آپ سب کی انتھک محنتوں سے دلی دعا ہے کہ یہ اسی طرح کامیابیوں اور کامرانیوں کو سمیٹتا ہوا اپنا سفر جاری رکھے، آمین۔ دین کی باتیں اور اداریہ پڑھے بغیر تو ہم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ پھر یادوں کی مالا اس کے

بارے میں کیا کہوں لفظ ہی نہیں ملتے کچھ کہنے کو سوائے اس کے کہ ذکیہ آنٹی ہم سب کا فخر ہیں اثاثہ ہیں۔ ان کا ہر قول و فعل قابل رشک اور قابلِ احترام ہے۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اللہ پاک ان کو صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ ہمارا عقیدت بھرا اسلام ان کو پہنچا دیجیے گا۔ (جی ضرور) اعتبار وفا کی ہر قسط پُرتجسس ہوتی ہے، اس بار تو بالآخر دو کردار مل ہی گئے اینڈ پر...... آپ کا ناول گم شدہ محبت میں آپ نے ایک منفرد اور اہم ٹاپک پر قلم اٹھایا ہے۔ اس فیلڈ کے متعلق بہت سی باتوں کی معلومات مل رہی ہیں، امید ہے گزشتہ کی طرح آپ کا یہ ناول بھی یادگار ثابت ہوگا۔ افسانوں میں نگہت اعظمی کی انعام نے ثابت کیا کہ خلوص کا رشتہ بہت پُراثر اور بے ریا ہوتا ہے۔ نیلم احمد بشیر نے بھی اپنی مختصر کہانی میں ایک تلخ حقیقت بیان کی۔ رضوانہ پرنس کی گھٹن یوں تو اچھی تحریر ہے مگر مجھے اس نکتے پر اختلاف ہے کہ زیادہ توجہ اور محبت سے انسان کی شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ اس ماہ کی بہترین تحریر...... پکھیرو تھی میمونہ صدف نے کمال کا لکھا، انہوں نے بہت ڈوب کر کہانی کے تانے بانے بنے، لفظوں کا چناؤ بھی اچھا تھا۔ پوری کہانی ہم نے آبدیدہ ہو کر پڑھی۔ محترمہ شیریں حیدر کا انٹرویو اچھا لگا۔ نزہت اصغر بہت اچھے سوالات ترتیب دیتی ہیں، ذرا سا گھوم لوں میں، ہاں جی عظمٰی ڈیئر بہت خوب صورت اور دلچسپ احوال لکھا آپ نے صاحب کتاب ہوگئی ہو بہت، بہت مبارک ہو انشاء اللہ جلد ہی آپ کی کتاب سے فیض یاب ہوں گے۔ تصاویر بھی اچھی ہیں۔ شمع ہدایت سبحان اللہ...... جلترنگ میں پاگل کون نہیں بہترین ہے۔'' (تبصرے اور پسندیدگی کا شکریہ)

✍ حلیمہ شیزہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''پیاری آنٹی جان سب سے پہلے تو میں آپ کی بہت زیادہ مشکور ہوں۔ آپ نے مجھ جیسی ادنیٰ سی بندی کو پاکیزہ کی خوب صورت محفل میں جگہ دی، میرا خط شائع کر کے میرا مان رکھا۔ میرا حوصلہ بڑھایا۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف...... اعتبار وفا زبردست موڑ پر جارہی ہے۔ اب گرہیں کھل رہی ہیں۔ مزہ آرہا ہے پڑھنے کا۔ گم شدہ محبت کی تیسری قسط میں ہی شہلا کو حارث کا رویہ سمجھ لینا چاہیے تھا کاش آنٹی جان لڑکیاں اتنی خوش فہم نہ ہوں۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب بہت افسوس ہوتا ہے جب لڑکے اپنی بھابیوں سے ہی دل لگا بیٹھتے ہیں۔ کیا بنے گا اقصم کا۔ کھوئے کھوئے لمحے بہت اچھی جارہی ہے۔ شروع میں بہت سسپنس تھا اس میں۔ لوہے کی روٹی بہت مختصر مگر بہت عمدہ ازدواجی زندگی کی عکاسی...... ویل ڈن...... شیریں حیدر سے مل کر بہت اچھا لگا۔ بہت کھری اور صاف گو انسان ہیں۔ دیار صبح کے اجالوں میں، بہت مختلف موضوع پر کہانی لکھی گئی ہے بیچاری نئی نویلی دلہن اسما پر اپنے آپ کو منوانا اک کڑا امتحان ہے۔ شمع ہدایت اک روشنی ایک راستہ ہے جو دل کو مطمئن اور پُرسکون کر دیتا ہے۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے، نوازش مراسلات کے لیے عرض ہے کہ آپ اسی ایڈریس پر ایک ہی لفافے میں الگ، الگ صفحات پر اپنی چیزیں لکھ کر بھیج سکتی ہیں)

✍ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چکوال سے۔ ''اس ماہ کا پاکیزہ بہت جلد مل گیا...... ڈاکٹر ذکیہ کی اثر انگیز دل میں اتر جانے والی باتیں پڑھ کر بہت خوشی سی ہوتی ہے اور انتہائی سبق آموز بھی، مجھے تو ان سے عقیدت سی ہوگئی ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اتنی اچھی روداد شائع کر رہی ہیں۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں۔ تھینکس آپی کہ آپ نے ہماری فرمائش تو پوری کی۔ اداریہ پڑھا آپ نے بہت اچھے ٹاپک پر لکھا ہے کہ واقعی آج کی دنیا میں گھر والوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ ہر کسی کی الگ سوچ، الگ رہن سہن، جب ایسا ہوگا تو آپس میں احترام محبت کے رشتے کیسے پروان چڑھیں گے۔ شمیم فضل خالق، نایاب جیلانی نے بھی اچھا لکھا۔ شیریں حیدر نے کمال اللہ دتہ، کمال کی کہانی لکھی ہے۔ ہاجرہ ریحان کی تحریر سبق آموز تھی۔ اس ماہ مجھے عقیلہ حق کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ویلڈن عقیلہ...... افسر سلطانہ کا انٹرویو ان کے کھٹے میٹھے جوابات بہت پسند آئے...... باتیں بہار و خزاں کی رابعہ کے جوابات پڑھ کر میں ان سے متفق ہوں۔ رابعہ نے سو فیصد سچ لکھا ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ عظمت صبا، شاہدرہ سے۔ ''پاکیزہ کی محفل میں کافی عرصے بعد شامل ہو رہی ہوں۔ پاکیزہ رسالے کی پرانی قاری ہوں اور لکھنے کا بھی شوق ہے۔ کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد دوبارہ کوشش کی ہے۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گی۔'' (آپ کی کہانیاں ابھی نظر سے نہیں گزریں۔ میں حتی الامکان بہنوں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتی ہوں)

✍ نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ ''پاکیزہ روز بروز نکھرتا جارہا ہے۔ میں تو بڑی باقاعدگی سے اس میں ہونے والی

کئی، کئی تبدیلیاں اور سلسلے نوٹ کرتی ہوں، فنکاروں کے انٹرویوز کا سلسلہ اچھا ہے۔ فلمی معلومات تو اخبار سے بھی مل جاتی ہے، ہمیں وہ سلسلہ پسند نہیں آتا اپنے پاکیزہ کو پاکیزہ ہی رکھیں۔ چھوٹی بڑی کہانیاں شامل ہوتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے، بہت کچھ پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ میں اسی طرح کھانے کی تراکیب اور دوسری چھوٹی چیزیں بھیجتی رہوں گی۔ اب تو ایک کا ناول ختم ہوگیا اور دوسرے کا اختتام ہے..... ثمرہ احمد یا عمیرہ احمد سے ناول لکھوائیں۔ یہاں دبئی میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اندرونی تصاویر بھی رنگین دے دیا کریں۔'' (آپ کی فرمائش کا خیال رکھا جائے گا۔ پسندیدگی کا شکریہ)

✿ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین سے۔ ''کافی دنوں بعد آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو عظمیٰ آفاق کو مع فیملی عمرے کی ادائیگی کی مبارک باد، اداریے میں آپ کی کہی باتوں پر سر تسلیم خم کیا اور یادوں کی مالا میں پہنچ گئے۔ آخری قسط کا پڑھ کر جہاں دل کو رنج ہوا وہیں ایک سرشاری کی کیفیت بھی رہی۔ بلاشبہ ذکیہ بلگرامی نے ہم لوگوں کے دلوں میں قرآن پاک سے محبت و عقیدت میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ اللہ سے تعلق مزید مضبوط ہوگیا۔ اللہ ان کو اجر عظیم عطا کرے۔ (آمین) انجم باجی آپ کا جلترنگ کا وہ خاکہ ہم بھی پڑھنا چاہیں گے، جس پر ذکیہ جی خوب محظوظ ہوئی تھیں جولڑکا سی اے (بیٹے) تھا میں تو سی اے سے ہی خوب محظوظ ہوئی ہوں (جی ضرور) نگہت سیما کا ناول اپنے اختتام کو پہنچا۔ سیما جی تمام کرداروں سے انصاف کرتی دکھائی دیں۔ ناہید فاطمہ حسنین سے ملاقات خوب رہی۔ عائشہ خان کا مختصر افسانہ حد بہت سی خواتین کو بہت کچھ سمجھا گیا۔ سروے بھی دلچسپ رہا۔ (شکریہ) مستقل سلسلے جتنے ماہتاب تھے۔ اپنی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔'' (حمیرا تمہارا فون نمبر نوٹ کرلیا ہے، شائستہ زریں آپ کو جلد کسی سروے میں شامل کرلیں گی)

✿ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''خوب صورت سجا سجایا پاکیزہ پاکر خوشی ہوئی۔ آخری کالموں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بہنوں کی محفل اور جلترنگ تک جا پہنچی۔ عید کے پکوان بھی مزے کے لگے۔ عید کے روز سجے سجائے مزید ارد... دسترخوان مہمانوں کی آمد، روزہ، نماز کی قبولیت کی مبارک بادیں دعائیں بچوں کا نئے کپڑوں میں خوش، خوش پھرنا...... الحمدللہ کہ ہم مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لطف و عنایات کے حقدار جو اللہ نے اپنے وعدے میں فرمایا ہے۔ پروردگار عالم ہم سب کے گناہ معاف فرمائے اور آئندہ بھی رمضان مبارک کے مقدس لمحات نصیب ہوں، آمین۔ اعتکاف میں بیٹھنے والی بہنوں کو مبارک باد گھڑ بیبیوں سے تعارف ہوا۔ عید رمضان کی تیاری کس طرح کرتی ہیں۔ (ہاں بھئی ایک سے ایک سلیقہ مند بھی ہیں اور پھوہڑ بھی) صدف خرم، قوامی سویاں کی ترکیب ضرور پاکیزہ میں ارسال کریں۔ شوگر والوں کے لیے ناممکنات میں سے ہے مگر آزمانے میں کیا حرج ہے۔'' (ترکیب تو ضرور لگادی جائے گی مگر شوگر والوں کو میٹھا کھانے میں احتیاط کرنی چاہیے)

✿ سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ''آپ کا ناول گم شدہ محبت میں چھپا پیغام بہت اچھا ہے کہ زندگی میں اتنی غلطیاں نہ کرو اور زندگی سے پہلے توبہ کرلو مگر کوئی سمجھے تو بات ہے ناں...... لوگ اپنی زندگی کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور دوسروں کی زندگی کو مذاق بنادیتے ہیں۔ اچھا حساس موضوع ہے۔ عید نمبر میں محترمہ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا پُرعقیدت روحانی سفر بے حد متاثر کن رہا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✿ بشریٰ سہیل، یو اے ای سے۔ ''پاکیزہ پڑھا ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بہت اچھی لگی اور یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ وہ سب کے لیے دعا کرتی ہیں۔ انجم باجی میرے بیٹے کے ویزے کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو رہا...... آپ سب بہنیں اور ذکیہ آپا بھی اس کے لیے ضرور دعا کریں۔'' (انشاء اللہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ سب بہنیں دعا کریں گی۔ اب آئندہ خط میں تم مجھے یہ بتارہی ہوگی کہ تمہاری یہ پریشانی حل ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ)

✿ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''پاکیزہ جیسے ہی آتا ہے...... میں اسے جب تک پڑھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ نگہت سیما کو مبارک ہو کہ ان کا ناول کامیابی سے اختتام کو پہنچا...... گم شدہ محبت پڑھ کر مزہ آرہا ہے، نایاب جیلانی اور دُرِ ثمن بلال بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مدیحہ شاہد آپ کی تو کیا بات ہے، بہنوں کی محفل مختصر لگی...... اس ماہ پاکیزہ کی کتابت بہت باریک تھی...... پڑھنے میں دشواری ہوئی۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی قسط انٹرویو کے ساتھ بہت اچھی لگی۔ دیگر تحریریں بھی سب

مزے کی تھیں۔'' (شکریہ)

٭ انجم گلزار، کراچی سے۔ ''ان دنوں میں عدت میں ہوں، سب بہنیں میرے لیے ضرور دعا کریں۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھ کر میں نے بھی قرآن پاک کی کتابت کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آخری قسط میں اس وجہ سے مزید مزہ آیا کہ انجم باجی نے ذکیہ آپا کی پوشیدہ شخصیت کے بارے میں کچھ بتایا...... اس ماہ بہنوں کی محفل میں اتنے کم خطوط کیوں لگے۔''
(جو خطوط بچ گئے تھے وہ اس ماہ شامل کیے جارہے ہیں)

٭ سنبل ملک اعوان، شاہدرہ سے۔ ''جولائی 2016ء کا خوب صورت دیدہ زیب ٹائٹل والا پاکیزہ سجا، سنورا سا...... اسے دیکھتے ہی لگا جیسے عید آج ہے، خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ، ساتھ کہانیاں بھی دیدہ زیب اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں کیوں نہ ہوں...... اس کی کمانڈ جو آنٹی انجم اور آنٹی عذرا رسول کے ہاتھ ہے۔ اس ڈائجسٹ میں تبصرہ نگاروں سے لے کر رائٹرز تک بہت محنت کرتی ہیں اس لیے تو ہر ماہ پوری شان وشوکت کے ساتھ چمک رہا ہوتا ہے۔ پورا اسٹاف لگن، پیار اور محنت سے کام کرتا ہے جس کے بعد ہمیں یہ خوب صورت ڈائجسٹ پڑھنے کو ملتا ہے۔ (یہ تو ہے) عید مبارک والا ڈائجسٹ مجھے بہت، بہت پسند آیا۔ ماہ وسال کے لباس اس میں خوشیوں کے سارے رنگ موجود تھے۔ مجھے کچھ کہنا ہے...... آنٹی آپ تو کمال کرتی ہیں، ہر موقع پر آپ بہت عمدہ بات کہتی ہیں، آپ کے پاس تو لفظوں کا خزانہ ہے وہاں سے آپ جتنے مرضی پھول نکالتی ہیں اور ہم ان پھولوں کی خوشبو میں نہال ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے یتیموں، بیواؤں کا خیال رکھنا، غریب، غربا کو کھانا کھلانا یہ سب ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے مگر ہم لوگ اپنی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ یادوں کی مالا، آخری قسط اللہ پاک ایسے، ایسے انعامات سے نوازتے ہیں کہ بندہ دنگ رہ جاتا ہے۔ مبارک باد کی مستحق ہیں وہ سب خواتین جنہوں نے قرآن مجید کو لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ میں نے سورۂ طٰہٰ کو لکھنا شروع کیا ایک ماہ ہوگیا ابھی تک مکمل نہیں ہوئی۔ (ہوجائے گی مگر باقاعدگی سے لکھو) آنٹی میرے گھر میں حرام کی آمدنی بالکل بھی نہیں ہے مگر پتا نہیں گھر کا شیرازہ کیوں بکھر گیا ہے؟ حروف مقطعات میرے گھر میں موجود ہیں، سب سے پہلے صبح ان کو دیکھتی ہوں پھر اپنے صبح کے کام انجام دیتی ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ (اللہ کرم کرے گا، نماز کی باقاعدگی رکھو اور چلتے پھرتے کام کرتے ہوئے وضو بے وضو یاحی یاقیوم پڑھتی رہا کرو) اعتبار وفا آنٹی نگہت سیما، زمین کے آنسو کے بعد آپ کی لاجواب تحریر پڑھنے کو ملی۔ کیا یہ کتابی شکل میں آئے گا ناول؟ کب تک؟ (انشاء اللہ بہت جلد) عید ملن، سیما بنت عاصم کی عید اور روزوں کے حوالے سے افسانہ اچھا تھا۔ پتھر کا دیس، مدیحہ شاہد کا ناول، سسپنس سے بھرپور تیسرا حصہ، علیزے نے محبت کے جال میں پھنسا کر لوٹ لیا۔ عید مبارک، غزالہ فرخ کا افسانہ عورت کی قربانی اور تربیت پر مشتمل اچھا تھا۔ گم شدہ محبت، آنٹی انجم جی کا ناول، دعا ہے کہ صبا کو سچی محبت مل جائے۔ شہلا کی قسمت بار، بار حارث سے ٹکرا جاتی ہے، حارث کو شہلا پسند نہیں مگر مجبوری پھر بھی ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ اب دیکھو...... کس کی محبت کس کو ملتی ہے، گم شدہ محبت جو ہوئی۔ میرے چارہ گر...... عالیہ حرا کا ناولٹ بہت ہی اچھا ناول، رومینٹک بھی تھا اور زندگی کا حوصلہ دینے والا بھی...... حد، عائشہ خان کا افسانہ چھوٹا سا مگر سبق دینے والا تھا۔ نایاب جیلانی دیارِ صبح کے اجالوں میں، منی ناول بہت اچھا ہے۔ مجھے عید منانی ہے، نزہت جبیں ضیا افسانہ بھئی آنٹی نزہت چھا گئیں۔ حور کے پہلو، واہ رضوانہ پرنس جی ہوں اور ان کا قلم پھول کلیاں نہ بکھیرے...... جیسی وہ شگفتہ ہیں ویسی ان کی تحریریں ہیں۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب...... اقصم کا مناب کو چاہنا پھر سارہ اور اسجد کا دھوکا دینا...... مگر زویا کی قربانی نے تو مجھے خوفزدہ کردیا۔ میں یہ قسط پڑھتے، پڑھتے پسینے میں شرابور ہوگئی تھی۔ (چلو پسینے پونچھ لو...... کہانی تو آپ کو اچھی لگی ناں) یہ زندگی، خالدہ نسیم کی شفقت سے بھرپور تھی مگر آخرت سکون والی۔ سلام پیش کرتی ہوں اس مردِ مجاہد کو جس نے یہ قدم اٹھایا اور ہمت کے ساتھ سارے فرض ادا کیے۔ اک میرے پاپا ہیں جو بات، بات پر کہتے ہیں بجلی کے بل میں نہیں دوں گا۔ سنبل کا خرچہ میں نہیں اٹھاؤں گا، سنبل کو اس مرتبہ پاپا جانی نے عیدی بھی نہیں دی۔ آنٹی جو بیٹی کماتی ہو کیا والدین اسے پیار کرنا اس کا فرض ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔'' (بھرپور تبصرے کا شکریہ...... سنبل بیٹا، ہماری بہت ساری پریشانیوں کی وجہ غربت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ والدین نے تمہیں اس قابل بنادیا ہے کہ تم جاب کرتی ہو۔ تم اپنا دل چھوٹا کرنے کے بجائے تم اپنے والد کا خیال رکھا کرو...... اور ملول ہرگز مت ہو)

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

٭ تسنیم ما پارا، شکاگو سے۔ ''الحمدللہ چار سال کے بعد میں شکاگو پہنچ گئی ہوں۔ پاکیزہ کا عید نمبر پڑھ لیا۔ نگہت سیما میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے ناول کا اینڈ فلمی کر دیا۔ (رائٹر لکھنے سے پہلے ہی ناول کا خاکہ بنالیتا ہے کہ اسے اپنی کہانی کس نہج پر لے جانی ہوگی......نگہت نے اپنے ناول کا اختتام قارئین کی فرمائش پر نہیں کیا......) دیگر تحریریں بہت اچھی ہیں، ذکیہ بلگرامی کی اختتامی قسط میں آپ کے لیے ہوئے انٹرویو نے چار چاند لگا دیے۔'' (بے حد شکریہ اور اس شمارے میں اختر شجاعت کا مضمون بھی مزید چاند لگانے کے لیے موجود ہے)

٭ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''الحمدللہ میری طبیعت ٹھیک ہے، میں آپ کو بار بار فون کرتی رہی، یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ آپ اعتکاف میں بیٹھی تھیں۔ اس ماہ مجھے ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بے حد پسند آئی۔ آپ نے ان کے بارے میں ہمیں مزید معلومات دیں جو مجھے بہت اچھی لگی اور یقیناً دیگر بہنوں کو بھی پسند آیا ہوگا۔'' (ہاں ہماری تمام بہنوں کو ہی یہ قسط بھی بہت پسند آئی تھی مگر ذکیہ بلگرامی مجھے عید کی مبارک باد دیتے ہوئے ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ انجم تم نے تعریف نامہ لکھ دیا۔ جبکہ میں نے ان کی شخصیت کے لیے صرف اکا دکا بات ہی لکھی تھی۔ ابھی تو میں نے ذکیہ کے بارے میں بہت کچھ بتانا ہے۔ انشاء اللہ......)

٭ رفعت خادم حسین، ملتان سے۔ ''پیارے پاکیزہ تو نے میرے دل کے بند دروازے کھول دیے ہیں سب سے پہلے اداریہ پڑھا بہت اچھا لگا۔ نازیہ نزی کی نمکین غزل جب پڑھی، تو دل خوش ہوگیا۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب' پاکیزہ کی اس بار تمام بہترین اسٹوری تھیں۔ بہنوں کی محفل میں اپنا خط پڑھ کر حوصلہ ملا کہ واقعی آپ کا دل بڑا ہے۔ پاکیزہ کی تحریروں میں روز بروز نکھار آ رہا ہے مصنفات بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

☆☆☆

عزیز بہنو! آپ اپنے خطوط جلدی پوسٹ کیا کریں تاکہ وہ اس محفل میں شامل ہوسکیں۔ دیر سے آنے والے خطوط آئندہ ماہ شامل کرلیے جائیں گے......اور اب آئیں پہلے درود پاک پڑھتے ہوئے دعا مانگتے ہیں یا اللہ، یارحمٰن یارحیم......اے کریم اللہ ہمارے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امت کے سارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے اور نیک کام کی توفیق، ہمت، طاقت اور مہلت ہم کو ضرور عطا کرنا......یا اللہ جس طرح تو نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے، اسی طرح شیطان کو ہم پر مسلط ہونے سے بچا۔ اے پاک پروردگار موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دینا......بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ میرے معبود، اے میرے مالک......اے وحدہ لاشریک......تو آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک آنے والے سارے ایمان والے مردوں، عورتوں، انسانوں، جنوں سب کو ہی بخش دے......ہمارے تمام مسائل حل کردے۔ اے سلامتی دینے والے ہمیں ہر بیماری خاص کر لا علاج و مہلک بیماریوں سے بچا......ہمیں تمام شرور سے بچا، ہمیں ہمیشہ عافیت والی زندگی دے تاکہ ہم تیرے دین کو ساری انسانیت تک پہنچا سکیں، آمین ثم آمین۔

یا مجیب، یا مجیب، یا مجیب

نوٹ (آخر میں ایک بار پھر درود پاک پڑھ لیں)

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری
عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

سارے جہاں کا داتا کون و مکاں کا مالک
ہے اس کی ذات افضل دونوں جہاں کا مالک
دنیا کی ساری رونق محتاج ہے اسی کی
جتنی بھی رونقیں ہیں روحِ رواں کا مالک
دردِ جنوں ہو کوئی یا دردِ آدمیت
سب کا بنے وہ درماں ہے انس و جاں کا مالک
آدم کی مشکلوں کو ہے جانتا ازل سے
ہے وہ نہاں کا مالک ہے وہ عیاں کا مالک
دلکش رسیلی جتنی آوازیں ہیں جہاں میں
بہتر سمجھتا ہے وہ سب کی زباں کا مالک
دیکھے ہیں جتنے موسم سب اس کی دسترس میں
سرما، بہار، گرما وہ ہے خزاں کا مالک
اندر ہے جو زمیں کے اوپر وہ جانتا ہے
وہ ہی زمیں کا مالک وہ آسماں کا مالک

کاوش: یاسمین کنول، پسرور

نعت

دل میں ہے عشقِ نبی اور زباں ہے خاموش
اشک آنکھوں سے رواں اور زباں ہے خاموش
کون آیا ہے یہ محفل میں اجالے پھیلے
دست بستہ ہیں فرشتے بھی زباں ہے خاموش
اُن کی محفل میں جو پہنچے تو عجب حال ہوا
سر جھکا آنکھ بھی نم اور زباں ہے خاموش
محفلِ نعت سجی اور یہ دیکھا سب نے
پھول نعتوں کے سجے اور زباں ہے خاموش
دل میں اِک نور بسا ہے تو مقدر جاگا
ایک ہلچل ہے جو جذبوں میں زباں ہے خاموش
کون سا راز ہے جو دل کو سکوں دیتا ہے
کچھ بتانا نہیں مقصود زباں ہے خاموش

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

نا امید ہو کر دعا کرنا نہ چھوڑیں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا جب تک آدمی کسی گناہ یا قطع رحمی اور دعا کی قبولیت میں جلدی نہ کرے اس وقت تک بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ کہے کہ میں نے دعا مانگی تھی، میں نے دعا مانگی تھی لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میری دعا قبول ہوئی ہو اور پھر وہ اس سے نا امید ہو کر دعا مانگنا چھوڑ دے۔ اس حدیث مبارک میں ایک اہم بات کی تاکید فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ انسان چونکہ فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جو دعا مانگے وہ فوراً ہی قبول ہو جائے اور اس کے اثر نظر آنا شروع ہو جائیں......
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ جلدی نہ کی جائے تو دعا قبول ہوتی ہے اور آپ نے جلدی کی تشریح بھی فرما دی کہ چند روز میں مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ مسلسل مانگتا رہے۔

از: انجم گلزار، کراچی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ عقل جیسی کوئی دولت نہیں اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔ ادب و آداب جیسی کوئی میراث نہیں اور مشورے جیسا کوئی مددگار نہیں۔

از: مصباح علی، فیصل آباد

امام غزالی فرماتے ہیں

اے انسانو! اگر کوئی بادشاہ تمہارے گھر آنے کا

ارادہ کرلے تو تم ہفتہ بھر پہلے گھر کو رنگ و روغن کرو گے اسے صاف ستھرا رکھو گے تا کہ بادشاہ تمہارے گھر سے خوش ہو کر جائے تو پھر اے انسانو! وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے جس کا رہنے کا گھر تمہارا دل ہے تو اپنے دل کو صاف ستھرا کیوں نہیں رکھتے۔

اے انسانو! اپنے دل سے حسد، بغض، نفرت اور اللہ کی نافرمانی جیسی بری خصلتیں نکال کر باہر پھینک دو۔ تا کہ تمہارے دل میں اس عظیم ہستی کی محبت پیدا ہو۔

از: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

عید مبارک

ہلالِ عید کی سب رونقیں مبارک ہوں
شعورِ ذات کی سب کاوشیں مبارک ہوں
خدا کرے کہ ضیائے خلوص پھر چمکے......
وفا و حُسن کی سب راحتیں مبارک ہوں
خدا کرے کہ محبت فروغ پا جائے
وصالِ یار کی سب الفتیں مبارک ہوں
تمہاری بزم تمنا سجی رہے ہر دم
فروغِ عشق کی سب ساعتیں مبارک ہوں
دعائے مخفیِ دلگیر ہو قبول خدا
وفورِ شوق کی سب چاہتیں مبارک ہوں

شاعرہ: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

معلومات

1۔ جس گناہ سے عمر کم ہوتی ہے وہ ماں سے بد سلوکی ہے۔

2۔ جس گناہ سے انسان پر لعنت ہوتی ہے وہ جھوٹ ہے۔

3۔ جس گناہ سے رزق تنگ ہو جاتا ہے وہ زنا ہے۔

4۔ جس گناہ سے دنیا میں ہی پکڑ ہوتی ہے وہ ظلم ہے۔

5۔ جس گناہ سے پوری انسانیت تباہ ہوتی ہے وہ قتل ہے۔

6۔ جس گناہ پر پردہ فاش ہو جاتا ہے وہ نشہ ہے۔

از: مہرین ضیا بخش، کراچی

میری عید تمہاری دید

عید کے حوالے سے بات ایک کہنی ہے
ذرا نزدیک آجاؤ کہ تم اونچا سنتے ہو
بہت ضروری بات ہے اور تم بھول جاؤ گے
عید پر جو گفٹ دو گے ڈائمنڈ کا سیٹ نہ ہو
نہ ہی گولڈن سی چین ہو بس
پھولوں کا گجرا اور پھولوں کے کنگن ہوں
ہاتھوں سے اپنے پہنا دو عید میری ہو جائے
عید میری ہو جائے جو دید تیری ہو جائے

شاعرہ: فریدہ فری، لاہور

پڑوسی

''یار تیرے گھر سے روز ہنسی کی آواز آتی ہے۔ اس خوشحال زندگی کا راز کیا ہے؟''

آدمی: ''میری بیوی مجھے جوتوں سے مارتی ہے، لگ جائے تو وہ ہنستی ہے نہ لگے تو میں ہنستا ہوں۔ خدا کا شکر ہے ہنسی خوشی زندگی گزر رہی ہے۔''

''او...... تیری کیا زندگی ہے۔''

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

محترم، پیاری بہنوں کے نام

شگفتہ شاداب، بے حد آداب
پھولوں کی مہک، آبشاروں کا ترنم
شباب کی امنگ، کلیوں کا تبسم
فضاؤں میں رچی خوشبو جیسی
سحر انگیز شگوفوں، دل آویز نغموں جیسی
خوش کن اداؤں جیسی
خوش ادا، مچلتی، گنگناتی، ریشمی لہروں جیسی
حسین یادوں کے جل تھل جیسی
پُرکشش عید آئی ہے
اس دھنک رنگ کے موقع پر میری جانب سے
عید مبارک

مرسلہ: ایمنہ عندلیب، سلانوالی

اقوالِ زرّیں

☆ اگر کوئی تمہارے ساتھ خوش ہے تو یقیناً وہ زندگی کے بہت سارے معاملات میں تم سے سمجھوتا کر رہا ہے۔
اور اگر تم کسی کے ساتھ خوش ہو تو یقیناً دوسرے کی بہت سی غلطیوں کو نظر انداز کر رہے ہو۔
☆ لوگوں کا اپنی ضرورت کے لیے تم سے وابستہ ہونا تمہارے لیے تم پر اللہ کی نعمت ہے ان نعمتوں سے مت گھبراؤ ورنہ نعمت مصیبت میں بدل جائے گی۔
☆ انسان اپنی غلطیوں کا بہترین وکیل اور دوسرے کی غلطیوں کا بہترین جج ہوتا ہے۔
مرسلہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

پکار

بہت مانوس لگتے ہیں
بہت سنسان سے رستے
کوئی آواز دیتا ہے
میرے جیون میں آجاؤ
شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

راہِ عشق

منصبِ جنوں کو پانے کے لیے
بے قدروں کے شہر سے گزرے
بارش کی طرح برسنے کو
گھٹا ٹوپ ابر سے گزرے
سیپ کا گوہر بننے کے لیے
خاموشیوں کے نگر سے گزرے
اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے
کوثر چشمِ تر سے گزرے
شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

مشورہ

آہٹوں سے ڈرنا ورنا چھوڑ دیجیے
بے بسی سے آہیں بھرنا چھوڑ دیجیے
گر نبھا سکتے نہیں، چاہتوں کی قید کو
مشورہ ہے پیار کرنا چھوڑ دیجیے
شاعرہ: رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان

رنگوں میں ڈھلی لڑکی

رنگوں میں ڈھلی لڑکی بھی جب بات کرتی ہے
اس کے لفظ خوشبو کی طرح محسوس ہوتے ہیں
وہ ہنستی ہے تو جیسے سارا عالم اس ہنسی میں ڈوب جاتا ہے
وہ لب اس کے وہ آنکھیں اور وہ چہرے کی شادابی
کہ جیسے اپسرا کوئی وہ رنگوں میں ڈھلی لڑکی
اس کا شرمگیں لہجہ یقیں مجھ کو دلاتا ہے کہ دنیا خوب صورت ہے
اداسی کے گھنے سایوں کو جب بھی اوڑھ لیتی ہے
میرا دل خون روتا ہے وہ رنگوں میں ڈھلی لڑکی
میں اس کی شربتی آنکھوں کے نم سے بھیگ جاتا ہوں
وہ رنگوں میں ڈھلی لڑکی جسے مجھ سے محبت ہے
میرا اظہار سنتی ہے تو پھر سب بھول جاتی ہے
جھکا کے اپنی پلکوں کو وہ ایسے مسکراتی ہے
وہ رنگوں میں ڈھلی لڑکی مرے لفظوں میں رہتی ہے
مجھے اکثر یہ کہتی ہے، مجھے تم سے محبت ہے
انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کاش میں بولتی

ہوائیں لفظ سن لیتیں
میرا پیغام اس کو پہنچاتیں
گو کہ وہ باوفا نہیں پھر بھی
تب بھی سن کر انہیں تڑپ جاتا
بھلے وہ ہم سے وفا نہ کرتا
پر میرا حوصلہ بڑھا جاتا
جو شب و روز ہم پہ گزری ہے
شاید وہ عید میں ہی آجاتا
اب میں کس کو سناؤں حال اپنا
کہ جو بن نہ سکا میرا اپنا
وہ کسی اور گھر کا باسی ہے

دل میں اسی لیے اداسی ہے
میں کہ مجبور کر نہیں سکتی
زخم دل کے دِکھا نہیں سکتی
جو رس رہے ہیں چور، چور ہوں میں
دل کو تھامے ہوئے مجبور ہوں میں
کیسے تم کو جھنجوڑ دوں آکر
رخ ہواؤں کا موڑ دوں جا کر
کہہ دوں جو اگر تم اجازت دو
تم ہی اب میرے دل کی چاہت ہو

شاعرہ: نازیہ نازی، نوشہرہ کینٹ

غزل

تجھے کس نے کہا ہے اوروں کو پکارنے کے لیے
جان اب بھی حاضر باقی ہے تجھ پہ وارنے کے لیے
ایک دل ہی تھا جو جیت لیا تیری دلکش اداؤں نے
اب بچا ہی کیا ہے میرے پاس ہارنے کے لیے
اور بھی لاکھوں تھے اس شہر میں تیرے چاہنے والے
اے محبت تجھے میرا ہی گھر ملا تھا اجاڑنے کے لیے
یہ کہہ کر ہٹالی گردن سے تلوار دشمنوں نے
اس کی اپنی محبت ہی کافی ہے اسے مارنے کے لیے

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

محبت روٹھ گئی ہے

کون کہے گا کہ تم روح میں سما گئی ہو
تم نے یہ کیا جادو کیا ہے
کون بلائے گا اپنے پاس ان پیار بھری ملاقاتوں کے لیے
اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کے، ساری میٹنگز چھوڑ کے
کون مجھے یوں اہمیت دے گا......؟
کس کے لیے میرا دل چاہے گا بننے سنورنے کو
کس کے لیے میرے ہونٹ مسکرائیں گے
محبت اب روٹھ گئی مجھ سے

از: رعنا جبیں، امریکا

انعام

اخبار نے اعلان کیا کہ لاہور کے سب سے شائستہ آدمی کو ایک خطاب دیا جائے گا۔ اپنا تعارف بھیجیں جس آدمی کو انعام دیا گیا اس کا خط کچھ یوں تھا۔

”میں سگریٹ، شراب سے دور ہوں، اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت پر نگاہ نہیں ڈالتا، میری نیک چلنی کی گواہی وہ لوگ ہی دے رہے ہیں جن پر میری کچھ ذمے داریاں ہیں۔“

تھوڑی سی مزید تفصیل کے بعد تحریر تھا۔ ”یہ زندگی میں پچھلے تین برس سے جیل میں گزار رہا ہوں، اب میری رہائی میں چھ ماہ رہ گئے ہیں۔ اگر مجھے انعام نہ ملا تو سب کو دیکھ لوں گا...... ہاں......“

مرسلہ: سائرہ ارم ڈوگر، کمالیہ

غزل

بہت سے خواب دیکھے ہیں، کبھی شعروں میں ڈھالیں گے
کوئی چہرہ تراشیں گے، کوئی صورت نکالیں گے
ابھی تو پاؤں کے نیچے زمیں محسوس ہوتی ہے
جہاں یہ ختم ہووے گی وہیں ہم گھر بنالیں گے
یہی ہے ناں، تمہیں ہم سے بچھڑ جانے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے مسئلے کا حل نکالیں گے
ابھی چپکے سے ہجر آثار لمحہ آئے گا اور پھر
تم اپنی راہ چل دوگے ہم اپنا راستہ لیں گے
جو اپنے خون سے اپنی گواہی خاک پر لکھ دے
ہم ایسے آدمی کو آسمانوں پر اٹھالیں گے
میں دیوارِ ابد کی سمت مڑ کر دیکھتا ہوں جب
صدائے غیب آتی ہے تمہیں واپس بلالیں گے
ہمارے ہاتھ جس کے قتل کی سازش میں شامل تھے
سلیم اس شخص کا قاتل سے ہم کیا خوں بہالیں گے

شاعر: سلیم کوثر

انتخاب: صبا سجاد، دبئی

☆☆☆



جلترنگ

انجم انصار

آہ......ری......ہمسائی

پڑوسن۔ ''رشیدہ! بڑا ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں، کل بڑے مزے کی کھیر بھیجی تم نے۔ اے ہے! یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گئی۔ کیا تمہارے گھر کراچی سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

رشیدہ۔ ''نہیں تو...... اس بھری گرمی میں خیر پور کون آئے گا۔''

پڑوسن۔ ''اے لو۔ تم نے ہی تو بتایا تھا کہ تمہاری ایک پیسے والی نند کراچی میں رہتی ہیں۔ کیا نام تھا بھلا سا ہاں ذکیہ!''

رشیدہ۔ ''ہاں! ذکیہ آپا! کراچی میں تو رہتی ہیں مگر اس جان جلاتی گرمی میں خیر پور آئیں گی کیا۔ یہاں تو بارہ مہینوں کی گرمی ہے۔''

پڑوسن۔ ''تو کیا کراچی میں گوند لگا کے بیٹھی رہتی ہیں۔''

رشیدہ۔ ''مری، کوئٹہ، سوات وغیرہ تو جایا کرتی ہیں۔ یہاں تو وہ جب آتی ہیں، جب انہیں گھبراہٹ کے دورے پڑتے ہیں۔''

پڑوسن۔ ''تو کل پیلے کپڑوں میں بال کھولے کون لڑکی تھی۔ جو شام کو چھت پر بھی کھڑی تھی۔ دور سے ہی دیکھا میں نے مگر بے حد حسین لڑکی تھی!''

رشیدہ۔ ''ارے حد ہوگئی ہے آپ اپنی ناجو کو نہیں پہچانیں، کل نہا کر پیلا سوٹ اسی نے تو پہنا تھا۔ سچ کہتی ہوں ہر رنگ اس پر کھل سا جاتا ہے۔''

پڑوسن۔ ''ناجو کے اتنے لمبے بال ہیں، پیروں تک آرہے تھے۔''

رشیدہ۔ ''آپ نے ہمیشہ اس کی بندھی ہوئی چوٹی دیکھی ہے، اس لیے اندازہ نہیں ہے، اس کے بال تو بے حد لمبے ہیں، پورے خاندان میں کسی لڑکی کے ایسے لمبے بال نہیں ہیں۔''

پڑوسن۔ ''سچ کہوں رشیدہ تیری چاروں بیٹیوں کے سامنے، یہ ناجو بالکل پری لگتی ہے، چہرے پر بڑا پن بھی ہے، اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ یہاں اس گھر میں رہتی ہوگی۔''

رشیدہ۔ ''ہاں خالہ، اس کی شکل دیکھتی ہوں تو یہی دعا مانگتی ہوں جیسی شکل شہزادیوں جیسی ہے، اس کے نصیب بھی ایسے ہی بنانا۔''

پڑوسن۔ ''میری جیٹھانی اپنے عارف کے لیے کہیں اور جارہی تھیں۔ میں نے کہا ناجو سے کرلو۔ دیکھی بھالی بچی ہے، میں نے انہیں سمجھایا تو اب وہ کسی دن تمہارے گھر آئیں گی۔ اب ماشاءاللہ ان کا عارف اچھا خاصا کمارہا ہے۔''

رشیدہ۔ ''منع کردیں آپ انہیں۔ میں تو کبھی نہ دوں انہیں اپنی ناجو...... ہے کیا کوڈو سا، ناک میں تو بات کرتا ہے، چلتا ہے تو بندروں کی طرح اچھلتا ہوا سا۔''

پڑوسن۔ ''ارے دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تمہارا...... اتنا اچھا بچہ ہے۔ راج کمار (اداکار) کی جوانی کی شکل ہے، پورا!''

رشیدہ۔ ''مجھے راج کمار، دیو آنند بھی ہولٹ سے اداکار لگے۔ گھبراہٹ ہوتی تھی اُن کی فلمیں دیکھ کر۔''

پڑوسن۔ ''رشیدہ مجھے لگتا ہے تم پاگل ہو، اچھے برے کی تمیز ہی نہیں ہے، میری جیٹھانی اتنی محبت کرنے والی عورت ہے، تمہاری بیٹی کو اپنی لاڈو بنا کر

رکھے گی۔“

رشیدہ۔”آپ کی جیٹھانی کی دونوں بہویں سلائی کا کام کرتی ہیں، وہ تو میری ناجو کو بھی مشین پر بٹھا دیں گی۔“

پڑوسن۔”تو کیا ہوا؟ مشغلے کا مشغلہ اور آمدنی کا الگ وسیلہ......!“

رشیدہ۔”ناجو کی شکل دیکھی ہے ناں......اب وہ ایسے کام تو نہیں کرسکتی؟“

پڑوسن۔”شکل اچھی ہو یا بری......سسرال جا کر کام تو سب کو کرنا پڑتا ہے، حکم چلوانے کے لیے بہویں تھوڑی لاتے ہیں۔“

رشیدہ۔”مگر میری ناجو کو تو گھر کے سلے ہوئے کپڑے پہننے پسند نہیں ہیں تو کیا وہ شوق سے سلائی کرنا چاہے گی۔ ہرگز نہیں، اسے تو سوئی میں دھاگا ڈالنا نہیں آتا، ہاں؟“

پڑوسن۔”مگر تمہاری اتنی اوقات تو نہیں ہے کہ ناجو کو بوتیک کے جوڑے پہناؤ، حیرت ہے کہ تم خود سلائی کا کام کرتی ہو اور اس طرح کی باتیں کرتی ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنے آپے میں رہو۔“

رشیدہ۔”خالہ، اب اللہ نے مجھے حسین ترین بیٹی دی ہے تو کیا میں اس کے لیے اچھے، اچھے خواب بھی نہ دیکھوں۔“

پڑوسن۔”اے لو! خواب دیکھنے پر بھی بھلا پابندی ہے، خواب دیکھو مگر جاگتی آنکھوں سے دیکھو! تمہارے میاں کی بھلا اوقات ہی کیا ہے جو وہ اپنی بیٹی کو اچھی قسم کا جہیز دے سکیں۔ تمہارے گھر کی حقیقت ہی کیا ہے جو آنے والا داماد تمہارے گھر میں فخر سے داخل ہوگا۔ صرف بیٹی کی گوری چمڑی ہے مگر ہزاروں کیا لاکھوں لڑکیاں ایسی دیکھی ہیں جو روپ کی روتی ہیں اور کرم کی کھاتی ہیں۔“

رشیدہ۔”اب میں نے عارف کے لیے منع کیا ہے، تو آپ میری بچی کو کوس رہی ہیں۔“

پڑوسن۔”کوس نہیں رہی، تمہیں تمہاری اوقات یاد دلا رہی تھی۔“

رشیدہ۔”اب میں آپ کے کہنے سے عارف بن مانس کا رشتہ بھی قبول کرنے سے رہی۔“

پڑوسن۔”تو ہم کون سا ناجو چڑیل کے لیے مرے جا رہے ہیں، جسے نہ چلنے کی تمیز نہ ہنسنے کی...... ہنستی ہے تو حلق کا کوا تک کائیں، کائیں کرنے لگتا ہے۔“

رشیدہ۔”خالہ! اب ہمارے گھر میں قدم مت رکھنا، ہاں بہت دماغ خراب کردیا میں نے لوگوں کا، اپنے دشمنوں کے ہاں کھیر پکا کر بھیجتی رہی۔“

پڑوسن۔”اے لو......وہ کھیر بھیجتی تھیں یا کاغذ چپکانے کی لئی، قسم لے لو جو کھائی ہو، بلی کو ڈالی تو وہ بھی سونگھ کر آگے بڑھ گئی۔ اس تک نے نہیں کھائی۔“

رشیدہ۔”ہاں! سب لوگ کھا، چاٹ کر ایسے ہی بیانات دیتے ہیں۔“

پڑوسن۔”ارے تم جیسی پھوہڑ سے تو کوئی ملنا تک نہیں ہے، نہ بات کرنے کی تمیز، نہ کھانے کی تمیز، ایک دن میں نے اپنی چھت سے دیکھا تھا دونوں ہاتھوں سے چاول کھا رہی تھیں۔ لاحول ولا قوۃ تمہارے گھر تو اب میں جھانکوں گی بھی نہیں۔“

رشیدہ۔”اب قائم رہے گا اس بات پر۔“

پڑوسن۔”تم خوشامد بھی کروگی تو بھی نہیں آؤں گی، ہاں!“

رشیدہ۔”میں تو مر کے بھی نہیں بلاؤں گی ہاں۔“

پڑوسن۔”میں تو تمہارے گھر کو بھی نہیں دیکھوں گی اور آج ہی اپنے بیٹے سے کہتی ہوں کہ جو کیبل کی لیڈ تمہیں فری میں دے رکھی ہے وہ آج ہی کاٹو پھر دیکھوں گی تم اسٹار پلس، سونی کے ڈرامے کیسے دیکھو گی؟“

رشیدہ۔”اللہ خالہ! کیا واقعی کٹوا دیں گی آپ تار...... جب کہ جانتی بھی ہیں کہ بھوکی رہ سکتی ہوں، ٹی وی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سوری خالہ......کبھی تو آپ

مذاق کو سمجھ لیا کریں، میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔‘‘

پڑوسن۔ ’’نہیں ہے، برداشت مجھے اوچھی باتوں کی۔‘‘

رشیدہ۔ ’’ارے چھوڑو خالہ...... تمہیں بھی خواہ مخواہ کا غصہ آگیا۔ ذرا سی بات پر آگ بگولا ہوگئیں۔ لو یہ پان کھاؤ۔ ہاں ناجو، خالہ کو ذرا دہی بڑے بنا کر تو کھلا۔‘‘

پڑوسن۔ ’’نہیں بس اب میں جاؤں گی، بہت سن لیں باتیں۔‘‘

رشیدہ۔ ’’خالہ! ایسا نہیں کریں یہ بتائیں آپ میری خالہ ہو یا نہیں۔‘‘

پڑوسن۔ ’’وہ تو میں ہوں۔‘‘

رشیدہ۔ ’’پھر معاف کردیں مجھے۔ یہ زبان ہی ایسی ہے کہ بری بات نکل ہی جاتی ہے۔‘‘

پڑوسن۔ ’’اچھا چل پہلے چائے لا پھر دہی بڑے پھر پان کھلا، تیرے ہاتھ کے پان میں بڑا ذائقہ ہے۔‘‘

خوشیاں

بعض خوشیاں بڑی عجیب ہوتی ہیں کہ ان کا نام رکھنا چاہیں تو باوجود کوشش کے کوئی بھی نام نہیں رکھ سکتے ہیں ایسی خوشیوں کو دل صرف خبیث خوشیوں کے نام سے ہی پکارتا ہے۔ راحیلہ سے میری دوستی بھی صرف انہی خبیث خوشیوں کی تسکین کے لیے تھی۔ (کہ رشتے داری کوئی اتنی خاص نہیں تھی)

راحیلہ بے حد کائیاں قسم کی خاتون تھیں، ہمہ وقت اپنے مطلب کی بات کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا اور عادتوں کا پٹارہ بھی ایسا تھا کہ ہر کام وہ اپنے مطلب اور فائدے کے لیے کرنے کی عادی تھیں۔

وہ جب بھی میرے گھر آتیں، تین چار گھنٹے بیٹھتیں، کھا پی کر جاتیں اور میرا سارا پروگرام چوپٹ ہوجاتا۔

میں اُن کے گھر جاتی تو وہ بدستور اپنے کام میں لگی رہتیں یا پاس بیٹھ کر کپڑوں پر استری کرتی رہتیں، ادھیڑنے کے لیے ایک آدھ قمیص ہمیں بھی پکڑا دیتیں۔

’’شمع ذرا اسے ادھیڑ دو... میں اسے دوبارہ سیوں گی۔‘‘ کھانے میں جو پکا ہوتا، سامنے رکھ دیتیں یا گھر کے سامنے سے تیسرے درجے کے ہوٹل سے نہاری منگوا کر کھلا دیتیں، اس بساند بھری نہاری کی اس قدر تعریفیں کرتیں کہ اس کے آگے وہ مرغ و ماہی کو ہیچ سمجھتیں اور میں ان کی چلتر بازیوں کو سمجھ کر کھول کر رہ جاتی۔

ہمارے گھر کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تقریب میں وہ اپنے درجن بھر بدتمیز بچوں کے ساتھ مدعو ہوتیں (کہ ان کے میاں ہمارے میاں جی کے قریبی دوست تھے) اول تو اُن کے گھر کوئی تقریب ہی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تو اس میں ہمارا گزارہ نہیں ہوتا، ٹیلی فون پر اگر انہیں ذرا بھی شک ہوجاتا کہ میں ان کے گھر آنے کے لیے اطلاعی فون کر رہی ہوں تو وہ ایک دم آواز کے والیوم میں تبدیلی لاکر از خود بیمار ہوجاتیں، ایسا کئی دفعہ ہوا تھا کہ جب میں نے ان کے ہاں فون کرکے پوچھا کہ ’’راحیلہ آج شام فارغ ہیں ناں؟‘‘ تب وہ انتہائی بیمار زدہ لہجے میں بولیں۔

’’نہیں، شمع بہن آج تو صبح سے بستر پر لیٹی ہوں، بلڈ پریشر بے حد لو ہے، ذرا بھی اٹھا نہیں جارہا۔ باتھ روم بھی دیوار پکڑ، پکڑ کر جارہی ہوں چکر بھی بے حد آرہے ہیں۔‘‘ فون پر ان کی آواز اس قدر بیمار ہوتی جیسے نزاعی دور چل رہا ہو۔

’’ارے، آپ تو بے حد بیمار ہیں، میں نے تو اس وجہ سے فون کیا تھا کہ آج شام کو میرے ہاں کھانے پر کچھ مہمان آرہے ہیں، میں نے سوچا تھا کہ آپ کو بلالوں مگر خیر آپ تو بیمار ہیں چلیں پھر کبھی زحمت دیں گے آپ کو۔‘‘ (میں دل ہی دل میں سرشار ہو کر کہتی، یہ فون بھی میاں کی وجہ سے کرنے

ہوتے تھے)

"نہیں شمو، تم پیار...... سے بلاؤ میں نہ آؤں، ایسا تو کبھی نہیں ہوسکتا۔ اب طبیعت بہت بہتر ہے، میں ضرور آؤں گی۔" بیماری بھرا لہجہ از خود تندرست ہوجاتا (اور میں ان کی خباثت تاڑ لیتی)

مگر ایک شب وہ پھنس گئیں۔ ان کی شادی کی سالگرہ تھی، جس میں انہوں نے اپنے قریبی دوستوں اور میکے وسسرال کی خاص، خاص شخصیات کو مدعو کیا تھا مگر ہم لاعلم تھے ایسے ہی ان کے ہاں فون کرڈالا۔

"ارے چھوڑیں، آج مت آئیں ہمارے علاقے میں خاصا ہنگامہ ہے۔" انہوں نے جھٹ منع کر ڈالا (ان کا یہ انداز ہمیں خبردار کردیتا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے)

"ہنگاموں سے ہم نہیں ڈرتے، یہ ہنگامے تو اب روزمرہ زندگی کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ اس طرف آنا ہے اس لیے تمہاری طرف چکر بھی لگالوں گی۔"

"ارے، آپ ایسے حالات میں بھی گھر سے نکلتی ہیں۔" انہیں ہمارے آنے پر حیرت سے زیادہ غصہ آرہا تھا۔ "کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہیں دیکھ نہیں رہیں کہ شہر کے حالات کیسے خراب ہورہے ہیں؟"

"دیکھو، ہم لوگ رات آٹھ بجے تک تمہارے ہاں پہنچیں گے۔ جب سے اسکول بند ہوئے ہیں نکلے ہی نہیں، بچے بھی ضد کررہے ہیں۔" میں نے ان کی باتیں نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"کاش آپ کل آجاتیں۔" اُن کی آواز ایک دم مرنے سی لگی جیسے سکتہ سا ہوگیا ہو۔

"کوئی بات نہیں، تمہاری ساس سے گپ شپ کروں گی۔" (کہ میری یہ ادا انہیں زہر لگتی تھی)

"دراصل آج ہمارے ہاں مہمان آرہے ہیں، گھر بھی چھوٹا سا ہے پھر آپ بچوں کے بغیر گھر سے نکلتی نہیں ہیں۔" وہ ہنسیں (ایسی ہنسی جس میں دل کے دو والو ہنس رہے ہوں اور دو والو چیخ، چیخ کر رو رہے ہوں)

"اے ہے، مہمان کیوں آرہے ہیں...... کوئی تو وجہ ہوگی؟" میں نے کریدا۔

"وہ دراصل...... ہماری شادی کی سالگرہ ہے ناں......" وہ نادم سی ہوکر بولیں۔ "اور پھر ابھی..... مجھے بے حد کام کرنے ہیں۔ بریانی پکانی ہے، مرغ روسٹ کرنا ہے، زیادہ تر لوگ سسرال کے ہی ہیں۔ دوستوں کو تو ہم نے بلایا ہی نہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر جتایا۔ (خدا کے لیے نہ آؤ)

"ارے میں کوئی تمہاری سہیلی تھوڑی ہوں، بہن جیسی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آپ اور بھائی جان آجائیں۔" وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں بھئی، میں پہلے ہی صاف، صاف کہہ رہی ہوں میں اپنے سب بچوں کے ساتھ آؤں گی، چھٹیوں کی وجہ سے تینوں نندوں اور چار جیٹھانیوں کے بچے بھی رہنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ساتھ لے کر آؤں گی۔"

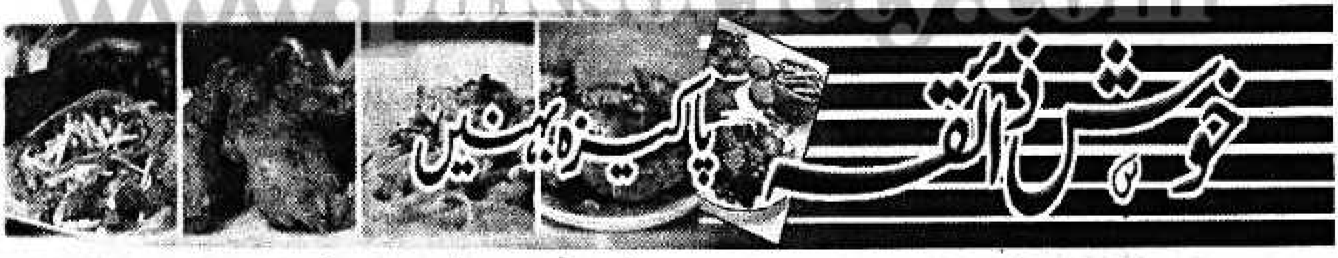
"اچھا بھئی لے آئیں...... میں چاول بڑھائے لیتی ہوں۔" وہ تنک کر بولیں۔

"چاول مت بڑھاؤ مرغے بڑھادو......" میں ان کا جملہ نظرانداز کرکے ہنسی۔ اور پھر اگلے دن وہ فون پر غصے میں سیخ پا ہوکر کہہ رہی تھیں۔

"شمع تم آئیں کیوں نہیں، فون کیا تو تمہارا فون خراب تھا اتنا انتظار کیا اس قدر کھانا بچ گیا۔ اگر نہیں آنا تھا تو پہلے سے بتادیں، میرا نقصان تو نہ ہوتا۔"

"اللہ، کیسے آتے تمہاری طرف علاقے میں اتنا ہنگامہ تھا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور فون بند کردیا مگر خبیث سی خوشی دل میں سر اٹھا کر ناچ رہی تھی۔ تھا، تھا، تھئی، تھئی۔

☆☆☆



خوبانی کا میٹھا

اشیا: سوکھی خوبانی، ایک کلو۔ چینی، ایک کلو۔ دودھ، ایک کلو۔ کسٹرڈ پاؤڈر، تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب: سب سے پہلے خوبانی ایک رات پہلے اچھی طرح سے صاف کر کے دھو کر پانی میں بھگو دیں، پانی خوبانیوں سے تین چار انچ اوپر رہے۔ دوسرے دن صبح خوبانیاں دیکھیں گی تو وہ پھول جائیں گی اب ہاتھ سے خوبانیوں کے بیج نکال لیں اور خوبانی کو اچھی طرح ہاتھ سے مسل کر اسی بھیگے ہوئے پانی میں ہی چولھے پر درمیانی آگ پر رکھ دیں اور مسلسل چمچ چلاتی رہیں ورنہ خوبانی میں اگر داغ لگ جائے تو مزہ خراب ہوجاتا ہے، خوبانی اچھی طرح پک جائے تو اور ٹکڑے بہت کم رہیں اور وہ ایک پیسٹ کی شکل میں آجائے تو تین پاؤ چینی اس میں شامل کر کے کچھ دیر پکائیں، اتار کر ٹھنڈا ہونے رکھ دیں۔ پھر دودھ میں کسٹرڈ گاڑھا، گاڑھا سا پکائیں اور بچی ہوئی چینی اس میں شامل کردیں جب کسٹرڈ گاڑھا ہوجائے تو چولھا بند کردیں۔

یاد رہے کہ یہ میٹھا ٹھنڈا ہونے پر ہی مزہ دیتا ہے یہ روم ٹمپریچر پر ٹھنڈا کریں، ٹھنڈا ہونے پر ڈش میں پہلے خوبانی کا میٹھا ڈالیں پھر اس کے اوپر کسٹرڈ کی تہ لگادیں اور وہ بیج جو خوبانی سے نکالے گئے تھے اچھی طرح دھو کر توڑ کر اس کے بادام نکال کر کسٹرڈ کے اوپر پھیلادیں۔ مزے دار خوبانی کا میٹھا تیار ہے، زیادہ مزے دار بنانے کے لیے اوپر تھوڑی سی کریم بھی ڈال دیں۔

شکم پُر

اشیا: گائے کا گوشت، (صاف ستھرا چکنائی کے بغیر) ایک کلو۔ چنے کی دال، ایک پاؤ۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ دار چینی، لونگ، الائچی بڑی اور ثابت، لال مرچ، حسب پسند۔ دہی، آدھا کلو۔ پیاز، (آملیٹ کی طرح) آدھا کپ۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ایک، ایک گڈی۔ ہری مرچ، (باریک کٹی) چھ عدد۔ لیموں، دو عدد۔ ادرک، ایک ٹکڑا۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: سب سے پہلے پانچ، چھ گھنٹے کے لیے دہی باریک کپڑے میں باندھ کر کہیں لٹکا دیں تاکہ پانی نکل کر سولڈ دہی کا گولہ سا بن جائے۔ شامی کباب کا مسالا جس طرح سب بناتے ہیں ویسا ہی بنا کر چوپر میں پیس لیں۔ پیاز، ہرا دھنیا، پودینہ اور ادرک بالکل باریک، باریک کاٹ لیں اور دہی میں ملادیں اس میں لیموں کا رس بھی شامل کرلیں جب یہ آمیزہ تیار ہوجائے تو جس طرح کباب بناتے ہیں بنالیں پھر درمیان میں دہی والا مسالا رکھیں اور چاروں طرف سے اسے کور کرلیں۔ اور پھر درمیانی آنچ پر تیل میں کباب کی طرح تل لیں اگر کباب تلنے میں ٹوٹ رہے ہوں تو اس پر تھوڑا سا کارن فلور چھڑک کر تل لیں کسی پلیٹ پر ٹشو رکھ کر شکم پُر اس میں رکھتی جائیں زبردست اور ڈیفرنٹ کباب تیار ہیں، اس کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی (بگھار والی) یا پھر حیدر آبادی مرچوں کا سالن بہت مزہ دیتا ہے۔

مرسلہ: نزہت جبیں ضیا، کراچی

بلوچی گوشت

اشیا: بکرے کا گوشت، ایک کلو۔ پیاز، دو عدد۔ گھی، دو سو گرام۔ لہسن، پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ ادرک پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

دہی، دو کپ۔ آلو بخارہ، پچاس گرام۔ ہری مرچ، آٹھ سے دس عدد۔ کالی مرچ، موٹی کوٹ لیں۔ دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: پیاز کاٹ کر تھوڑے پانی میں ڈال کر ابال لیں پھر کڑاہی میں گھی ڈال کر اس میں لہسن، ادرک کا پیسٹ ڈال کر ہلکا سا بھونیں۔ ساتھ ہی ابلی ہوئی پیاز ڈال دیں۔ پھر گوشت ڈال دیں اور حسبِ ذائقہ نمک شامل کرلیں یہ خود بخود پانی چھوڑ دے گا دس منٹ پکنے دیں۔ بعدازاں دو کپ دہی، آلو بخارا، کٹی ہوئی سبز مرچ اور کالی مرچ شامل کر کے اچھی طرح مکس کرلیں اور تیس سے پینتیس منٹ دم پر رکھ دیں۔ گوشت گل جائے تو اچھی طرح بھون لیں پھر برتن میں نکال کر تھوڑا سا پسا ہوا گرم مسالا، ادرک اور ہرا دھنیا چھڑک دیں۔ لذیذ بلوچی گوشت تیار ہے۔

مرسلہ: سدرہ یاسین، سرگودھا

کھوپرے کا حلوا

یہ حلوا نظر کے لیے بہت اچھا ہے اس کے علاوہ دل و دماغ کے لیے بھی ٹانک ہے۔ ناشتے سے پہلے بہت کم مقدار میں کھائیں۔

اشیا: کھوپرا کش شدہ ایک پاؤ۔ گھی، ایک پاؤ۔ انڈے، تین عدد۔ چینی، ایک پاؤ۔ سبز الائچی، چند دانے۔ لونگ، تین عدد۔ گری بادام، پندرہ عدد۔ گری اخروٹ، چھ عدد۔ بالائی، آدھا کپ۔

ترکیب: گھی گرم کر کے لونگ ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر کھوپرا ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں جب رنگت سنہری ہوجائے تو بالائی اور چینی ڈال کر مکس کرلیں۔ جب چینی گھل جائے اور گھی چھوڑنے لگے تو تینوں انڈے پھینٹ کر آہستہ آہستہ حلوے میں ملائیں اور چمچ چلاتے جائیں۔ جب سیٹ ہونے لگے تو باداموں کی گریوں پر سے چھلکے اتار کر اور اخروٹ باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ الائچیوں کے دانے باریک پیس کر ملا دیں۔ ڈش میں ڈال کر چاندی کے ورق لگا دیں یا پھر ٹرے میں جما کر برفیاں کاٹ کر فریج میں رکھ دیں۔

مرسلہ: منیزہ نعیم، راولپنڈی

چکن بروسٹ مسالا

اشیا: چکن، ڈیڑھ کلو۔ نمک، کالی مرچ حسبِ ذائقہ۔ سویا ساس، چار کھانے کے چمچ۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ ٹماٹو کیچپ، چار کھانے کے چمچ۔ چلی ساس، چار کھانے کے چمچ۔ میدہ، ڈیڑھ پیالی۔ کارن فلار، آدھی پیالی۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ املی کا پیسٹ، آدھی پیالی۔ چاٹ مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ کٹی ہوئی لال مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ پسا ہوا گرم مسالا، آدھا چائے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: چکن کے آٹھ ٹکڑے کر کے صاف دھو کر چھلنی میں رکھ کر خشک کرلیں اور ان پر ایک طرف ایسے کٹ لگائیں کہ ان میں مسالا بھرا جا سکے۔ بڑے سائز کے پین میں پانی ابالنے رکھیں اور ابال آنے پر اس میں چکن کے ٹکڑے ڈال کر پانچ سے سات منٹ ابال کر پانی سے نکال لیں۔ پھیلا کر خشک ہونے رکھ دیں۔ دھنیا اور زیرے کو بھون کر موٹا کوٹ لیں اور اس میں چاٹ مسالا، کٹی ہوئی لال مرچ، پسا ہوا گرم مسالا، املی کا پیسٹ ڈال کر ملائیں۔ چکن کے کٹے ہوئے حصے میں یہ آمیزہ تھوڑا تھوڑا بھر دیں۔ میدہ کارن فلار، نمک اور بیکنگ پاؤڈر کو گہرے پیالے میں رکھیں اور خوب مکس کرلیں۔ علیحدہ پیالے میں سویا ساس، سرکہ، چلی ساس اور ٹماٹو کیچپ ڈال کر ملائیں اور اس میں چار کھانے کے چمچ میدے کا یہ خشک مکسچر ملا لیں۔ چکن کے ٹکڑوں کو پہلے کیچپ والے مکسچر میں لتھیڑیں پھر خشک میدے کے مکسچر میں رول کر کے ٹرے میں پھیلا کر رکھ دیں۔ کڑاہی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ گرم کریں اور چکن کے ٹکڑے اس میں ڈال کر درمیانی آنچ پر ڈھک دیں۔ درمیان میں ایک مرتبہ ڈھکن ہٹا کر پلٹ دیں اور سنہری ہونے پر کڑاہی سے نکال لیں۔ فرائز کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: زرمینہ خان، بارہ کہو

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ یاسمین کنول...... پسرور

جانے کب تک تیری تصویر نگاہوں میں رہی
ہوگئی رات تیرے عکس کو تکتے، تکتے

☆ رفعت مبین رفی...... مشی گن، یو ایس اے

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

☆ کائنات عبدالحلیم...... میر پور خاص

ایک سے ایک خداوند ملا سجدہ طلب
آدمی سخت مراحل سے خدا تک پہنچا

☆ زرینہ خان...... بہارہ کہو

ہلالِ عید جو دیکھو ہمیں بھی یاد کرو
کہ ہم بھی تم کو دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں

☆ کوثر خالد...... جڑانوالہ

اداس رکھو یا خوش، کچھ گلہ نہیں کرتے
خزاں کے پھول کبھی یوں کھلا نہیں کرتے
ملا دو خاک میں ہم کو مگر دھیان رہے
ہم جیسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

☆ شمع...... پیرادالہ

آتی ہے تو کانٹے بھی دعا دیتے ہیں اس کو
جاتی ہے تو گلشن کو رُلا جاتی ہے خوشبو

☆ خدیجہ جمیل...... لاہور

اس دل کے بہلنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان بہت ہے
اب کے بھی اجڑ جائیں گے بستی کے کئی گھر
اس سال بھی برسات کا امکان بہت ہے

☆ عرشیہ جنید...... کراچی

سکوں کہیں بھی میسر نہیں ہے انسان کو
جنازے والے بھی کاندھا بدلتے رہتے ہیں

☆ عین الحیا ترمذی...... کاغان

دکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

☆ ثریا انجم...... واہ کینٹ

قدم، قدم پہ کوئی ذرا جاں کو ہارے تو
ہماری طرح کوئی زندگی گزارے تو
بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے آج انہیں
مری نگاہ کا صدقہ کوئی اتارے تو

☆ صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ

ڈر ہے پتھر کے نہ ہوجائیں کہیں
جانے والے تو پلٹ کے نہیں دیکھا کرتے

☆ انجم گلزار...... کراچی

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

☆ دُرِ شہوار...... لاہور

تھی اس قدر عجیب مسافت کہ کچھ نہ پوچھ
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں اور خواب تھک گئے

☆ نازنین آفریدی...... پشاور

تو جو بدلا بدل گئے ہم بھی
پیار کرتے تھے بندگی تو نہیں
وقت کٹ جائے گا بہر صورت
تو کوئی شرطِ زندگی تو نہیں

☆ نازیہ نزی...... نوشہرہ

کبھی روشنی مجھے کی عطا کبھی سائے ساتھ لگا دیے
کبھی سب چراغ بجھا دیے وہ تمہی تھے یا کوئی اور تھا

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

تعبیر جو مل جاتی تو اِک خواب بہت تھا
جو شخص گنوا بیٹھے ہیں نایاب بہت تھا

میں کیسے بچا لیتا بھلا کشتیِ دل کو
دریائے محبت میں تو سیلاب بہت تھا

☆ ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

چلتا تھا کبھی ہاتھ میرا تھام کر جس پر
کرتا ہے بہت یاد وہ رستہ اسے کہنا
امید وہ رکھے نہ کسی اور سے فراز
ہر شخص محبت نہیں کرتا اسے کہنا

☆ سمیرا علی......کالج کالونی کوئٹہ

تجھے تیری زلف کے سائے میں کوئی سونے والا نہیں ملا
مجھے میرے خواب کی موت پر کوئی رونے والا نہیں ملا
میرے بچپنے کے سکون کو بڑا اضطراب جو دے گیا
مجھے اب بھی اس کی تلاش ہے وہ کھلونے والا نہیں ملا

☆ نیر فہیم عطاری......کراچی

لبوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
دلوں کے دیپ جلتے ہیں چراغ شام سے پہلے
یہ سارے رنگ مردہ تھے تمہارے بننے سے
یہ سارے حرف مہمل تھے تمہارے نام سے پہلے

☆ شمائلہ انجم......سرگودھا

در پر لگی رہیں آنکھیں وہ نہ آئے نہ آن کو آنا تھا
عید کا دن گزر گیا آخر، آج کا دن گزر ہی جانا تھا

☆ ثمر احمد......کراچی

شمع بجھ جائے تو جل سکتی ہے
کشتی طوفاں سے نکل سکتی ہے
مایوس نہ ہو ارادے نہ بدل
تقدیر کسی وقت بھی بدل سکتی ہے

☆ آمنہ نثار......فیصل آباد

اپنی زلفیں میرے شانے پہ بکھر جانے دو
دو گھڑی گردشِ دوراں کو ٹھہر جانے دو

☆ نگہت آصف......اسلام آباد

شیشہ گروں کے شہر میں گزری تمام عمر
پھر بھی یہ پوچھتے ہو کیونکر پگھل گئے
میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ میرے گھر کے در و بام سجانے آئے

☆ شازیہ پیر......ہری پور ہزارہ

نہ دشت چھانے، نہ بن کھنگالے نہ کوہ پیما بنے ہیں
اسی ندامت پہ جی رہے ہیں کسی کی خاطر کیا ہی کیا ہے

☆ ممتاز خانم......کراچی

تمہاری راہ میں شاخوں پہ پھول سوکھ گئے
کبھی ہوا کی طرح اس طرف بھی ہو لیتے

☆ عنبر وسیم......گوجرانوالہ

زندگی کے اس سفر میں وہ میرا دمساز ہے
جس کی خاطر ہم نے جھیلی ہیں بڑی کٹھنائیاں
گونجتی ہیں میرے کانوں میں حسیں شہنائیاں
بس رہی ہیں میری آنکھوں میں وہی رعنائیاں

☆ زرینہ نعیم......قلعہ سیف اللہ

روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو
ہم نے یہ سوچ کے ہی تم کو خفا رکھا ہے
تم جسے روتا ہوا چھوڑ گئے تھے اک دن
ہم نے اس شام کو سینے سے لگا رکھا ہے

☆ لائبہ کائنات......نیو کیمپس، لاہور

ساون کی ہیں پھواریں جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے کیا ساتھ تم چلو گے

☆ عظمت صبا......شاہدرہ

آج بہت دن بعد سنی ہے بارش کی آواز
آج بہت دن بعد کسی نظر نے راستہ روکا ہے

☆ ایمن زرتاب ڈوگر......کمالیہ

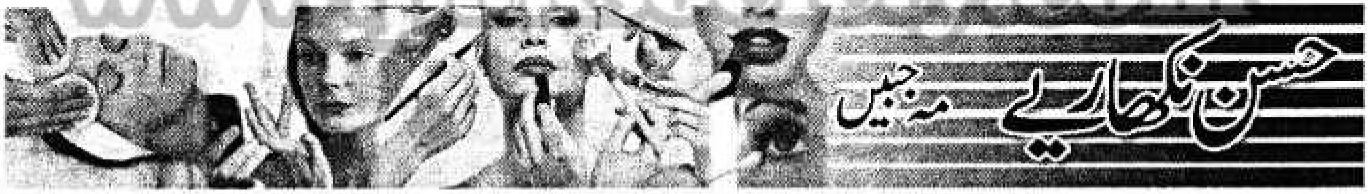
تیز بارش کا مزہ لوٹنے والوں پہ نہ جا
وہ تیری خستہ مکانی کو کب سمجھتے ہیں

☆ گلناز گل......ملتان

تھے حادثوں کے وار تو کاری مگر مجھے
مرنے نہیں دیا خلشِ انتقام نے

☆ نفیسہ آرا......راس الخیمہ

لے کے ساتھ کیسے چلے گا ماضی کو
جو مشکل سے حال اٹھائے پھرتا ہے
سوچ رہا ہوں اس کی قسمت کیا ہوگی
طوطا جس کی فال اٹھائے پھرتا ہے



حسن نکھار یے
مہ جبیں

خشکی، سکری کا خاتمہ

سیاہ لمبے گھنے صحت مند اور چمکدار بال کسے پسند نہیں، بالوں میں سفید بُرادہ (خشکی، سکری) نظر آنے لگے تو پھر پریشانی اور شرمندگی سے بچنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اس کے لیے کیا، کیا جائے......؟ خشکی، سکری سر پر ایک مرتبہ برش پھیرنے سے ہی واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا متاثرہ فرد ایک طرف تو نفسیاتی دباؤ اور عجیب سی خجالت کا شکار رہتا ہے اور دوسری طرف سر میں کھجلی اور خارش بھی ہوتی رہتی ہے اور مسلسل کھجانے کے باعث زخم بھی ہو جاتے ہیں اور ناخن بھی آلودہ رہتے ہیں جو دوسری طرح سے ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے اسباب کچھ یوں نظر آتے ہیں۔ معالجین کہتے ہیں کہ سر میں سکری کا بڑا سبب کسی شخص کی عام صحت گر جانا اور اس کے جسمانی نظام میں زہریلے مادوں کا پیدا ہو جانا ہے جو غلط غذا، قبض وغیرہ کا نتیجہ ہو سکتا ہے سکری کے دیگر اسباب میں جذباتی تناؤ، غیر معیاری شیمپوز کا استعمال، سر کو سردی و گرمی سے نہ بچانا اور جسمانی تھکاوٹ بھی شامل ہیں۔

بالوں میں برش یا کنگھا

علاج کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ آپ اپنے بالوں اور سر کی جلد کو صاف ستھرا رکھیں تا کہ اس پر مُردہ خلیوں کی تعداد ممکنہ حد تک کم ہو جائے۔ بالوں میں روزانہ برش، کنگھا پھیریں تا کہ خون کی گردش بڑھے اور سر کی سطح پر مُردہ خلیات باقی نہ رہیں۔ برش کو گردن کے پیچھے سے سر کے آگے کی طرف لے جائیں اور یہ عمل اس وقت تک دُہراتی رہیں جب تک اس انداز سے پورے سر پر یہ عمل اچھی طرح مکمل نہ ہو جائے۔

سر کی مالش اور مساج

سر کی ہر روز اچھی طرح مالش کریں۔ یہ مالش انگلیوں کی پوروں سے بالوں کی جڑوں کو مساج کرتے ہوئے اوپر کی جانب کی جاتی ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ مالش بالوں میں برش چلانے سے پہلے یا بعد میں کی جائے برش کی طرح مالش بھی سر کی جلد میں دورانِ خون کو تیز کرتی ہے۔ یہ سکری کی جمی ہوئی تہ کو اکھاڑتی ہے، بالوں کو بڑھنے میں مدد دیتی ہے اور سر کی جلد سے مُردہ خلیوں کو ختم کر کے نئے خلیے پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

سکری ختم کرنے کے گھریلو نسخے

سکری کے خاتمے کے لیے کئی گھریلو نسخے موجود ہیں جن میں سے بعض بہت پُر تاثیر ہیں۔ میتھی دانہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ چائے کے دو چمچ بھر کے میتھی دانہ لے کر اسے رات بھر کے لیے صاف پانی میں بھگو دیں صبح تک یہ نرم ہو جائے گا۔ صبح اسے برتن سے نکال کر صاف سل یا کھرل میں پیس کر پیسٹ بنا لیجیے اور سر پر لیپ کر کے نصف گھنٹے تک اسے لگا رہنے دیں پھر ریٹھے کے پانی یا سیکا کائی سے سر دھو لیں۔ سر دھونے کے بعد ایک چائے کا چمچ لیموں کا رس لے کر اسے بالوں میں لگا لیں۔ اس سے نہ صرف بال چمکیلے ہو جاتے ہیں بلکہ سکری بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ ہفتے میں دو بار دہی میں بیسن ملا کر سر دھونا بھی بہت مفید ہوتا ہے۔ ایک اور گھریلو نسخہ یہ ہے کہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ دہی لے کر کسی برتن میں ڈال کر تین دن کے لیے کھلی جگہ پر چھوڑ دیں پھر اس سے سر اور بالوں کی نصف گھنٹا تک خوب اچھی طرح مالش کر کے سر دھو لیں۔

خشکی اور غذا

غذا سکری کے علاج میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے سکری کے شکار افراد کو نشاستے دار، پروٹین اور چربی والے کھانوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ گوشت، چینی، تیز پتی والی چائے، کافی، چٹنی، اچار اور ڈبا بند غذاؤں سے بھی دور رہیں۔ بوتل والے بازاری مشروبات، مربہ جات، غیر معیاری آئس کریم، میدے سے تیار شدہ میٹھی اشیا سے بھی اجتناب کریں۔ سر کو دھوپ سے بچائے رکھیں اپنی عام صحت کا بھی خاص دھیان رکھیے کیونکہ اس سے بھی سکری دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ اپنی غذا میں دودھ، کیلا اور بادام بھی وقتاً فوقتاً شامل رکھیں۔ بادام کی ایک تعداد پانچ یا سات مقرر کریں۔

اس کے علاوہ مچھلی بہت مفید ہے۔ سبز پتوں والی سبزیاں آئرن مہیا کرتی ہیں جو بالوں کی بھی غذا ہے۔

اپنی صحت کا خود خیال رکھیے اور اس کے حصول کے لیے مسلسل کوشش کرتی رہیے۔

☆☆☆



بزم پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆فائزہ شہزاد......پشاور

سوال: یہ آخر فیس بک پر پھپیوں کی شامت کیوں آئی رہتی ہے؟ کیا ان کے گھر میں پھپّی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا؟

جواب: بہت سے فسادات میں پھپوؤں نے سپہ سالاری کی ہے، اس لیے یہ ایک علامت بن گئی ہیں اور اچھی پھپیوں کو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆فرحت احمد......بن قاسم، کراچی

سوال: لرزتا بدن، تھرتھراتے ہونٹ، کپکپاتے ہاتھ اس کیفیت کا نام بتایئے؟

جواب: یہ تو موقع پر پکڑے جانے والے چور کا نقشہ ہے یا پھر ٹی وی ڈراموں میں چالیس سال پہلے ہیروئن اپنی چوری، چوری والی محبت کا بھانڈا پھوٹ جانے پر ایسی ہی اداکاری کیا کرتی تھی۔

☆انعم حیدر خان......پاکپتن

سوال: شادی کے وقت لڑکی کے چہرے پر تو نور آتا ہے اور لڑکے کے چہرے پر......؟

جواب: شیخی......

☆گلناز گل......ملتان

سوال: کیا آپ مکھن میں سے بال نکالنا جانتی ہیں؟

جواب: نہیں......کیونکہ نہ میں مکھن کھاتی ہوں اور نہ لگاتی ہوں تو بال کیسے نکالوں گی۔

☆فردوس شازیہ......لاہور

سوال: فیشن کو پروان چڑھانے میں کس کا زیادہ کردار اہم ہیں۔ درزی یا بیوٹی پارلر کا......؟

جواب: سوشل میڈیا کا......اور حرص خوری خواتین کا۔

☆یاسمین کنول......پسرور

سوال: ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے، کیسے لوگ......؟

جواب: جو آتے ہیں کام دوسروں کے......مگر آج کل تو اپنے کسی مطلب کی وجہ سے کسی دوسرے کا کام کرتے ہیں ورنہ نہیں......اس لیے پھر بھی وہی لوگ اچھے ہیں جو کام تو آجاتے ہیں۔

☆مسز خدیجہ جمیل......لاہور

سوال: سیاست داں اور ڈاکو میں کیا فرق ہے؟

جواب: بعض ڈاکو غریبوں کی مدد بھی کرتے رہے ہیں جیسے سلطانہ ڈاکو اور سیاست داں تو بظاہر اپنی آن بان شان کے لیے جیتے نظر آتے ہیں۔

☆نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ

سوال: آج کل کی لڑکیاں کس کام میں مہارت چاہتی ہیں؟

جواب: یہی کہ سب انہیں ہر فن مولا سمجھیں......وہ کچھ بھی کریں......سب بہترین کا نعرہ لگائیں اور انہیں کبھی غلط نہ کہیں۔

☆مریم کاشف......حیدرآباد

سوال: رشوت سے بچاؤ کے ٹیکے کہاں لگتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں ایسے ٹیکے نہ بنائے جاتے ہیں اور نہ ہی باہر سے درآمد کیے جاتے ہیں، اس لیے بغیر ٹیکوں کے رہنا ہوگا۔

☆مصباح رضا سعید......فیصل آباد

سوال: تین بچوں کے ساتھ ہنی مون مناتے وقت میں سوچ رہی تھی؟

جواب: میرے میاں جی تو بڑے ایکٹو ہیں، مجھے بہت جلدی گھمانے پھرانے لے گئے ورنہ میری نندیں تو اپنے چھ، چھ بچوں کے ساتھ ہنی مون کے لیے گئی تھیں......بیچاریاں۔

☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ

سوال: ہر روز بھیگی بلی بننے والا شوہر کیا کبھی شیر بھی بن سکتا ہے؟

جواب: وہ پہلے ہی بھگا ہوا شیر ہی ہوتا ہے، جو کبھی بھی اصلی شیر سے زیادہ چنگھاڑتا ہوا بن جاتا ہے۔

☆شہلا نواز......لاہور

سوال: ہاتھوں کے طوطے کون اڑاتا ہے؟

جواب: طوطے تو کوئی نہیں اڑا رہا بلکہ اس کی جگہ موبائل اور پرس اڑائے جا رہے ہیں اور یہ کام ہر جگہ چور اچکے کر رہے ہیں۔

☆نرگس نسیم......چکوال

سوال: شادی سے پہلے عورت کو نازک پری کا خطاب دینے والے شادی کے بعد جھوٹ کیوں بولنے لگتے ہیں؟

جواب: وہ جھوٹ نہیں بولتے، نازک پری دو چار بچوں کے بعد خود ہی جناتن بن جاتی ہے۔

☆نسرین یاسین......حیدر آباد

سوال: کتابی چہرہ کس چہرے کو کہتے ہیں؟

جواب: جس پر بہت ساری کہانیاں لکھی نظر آ رہی ہوں۔

☆ناظمہ شاہین اعوان......واہ کینٹ

سوال: میں اکثر آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں؟

جواب: میں کس قدر خوب صورت ہوں۔

☆رفیعہ ابدالی......کراچی

سوال: آستین کے سانپوں سے کیسے بچا جائے؟

جواب: آنکھیں بند کر کے یقین کرنے والی عادت سے اب آپ پیچھا چھڑا لیں، آستین کے سانپ تو کیا آس پاس کے سانپ بھی نظر آنے لگیں گے۔

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

سوال: وہ کہتے ہیں کہ ہمارے منہ پر بارہ بجے رہتے ہیں، میں اُن کو کیا کہوں؟

جواب: تم اُن سے کہو......آپ کی مونچھیں ہر وقت سوا نو بجاتی رہتی ہیں۔

☆اُمِ ایمان قاضی......کوٹ چھٹہ

سوال: عقل کا دشمن غصہ ہے تو دل کا دشمن کون ہے؟

جواب: سامنے آنے والا ولن......چاہے وہ ساس ہو یا کوئی اور......؟

☆انیسہ حامد......کراچی

سوال: دورِ حاضر کی کوئی نئی ادا؟

جواب: لوگ بولتے ہوئے سننا بھی چھوڑ دیتے ہیں اور دیکھنا بھی......بس بول، بول کر بکواس کیے جاتے ہیں۔

☆فصیحہ آصف خان......ملتان

سوال: باجی کیا آج کے دور میں انسان اور گرگٹ میں کوئی فرق ہے؟

جواب: ہاں بہت فرق، انسان، گرگٹ سے زیادہ رنگ بدلتا ہے۔

☆روا اقبال......اوکاڑہ

سوال: خوشی کی عمر چھوٹی اور غم کی عمر لمبی کیوں ہوتی ہے؟

جواب: خوشی میں وقت گزرتے ہوئے پتا جو نہیں چلتا۔

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال: آج کل کی حوریں، لنگوروں کو کیوں پسند کرنے لگی ہیں؟

جواب: اب قابل ہو جاتے ہیں لنگور تو کچھ خیال تو کرنا پڑتا ہے ناں!

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

فضائل سورۂ فتح

یہ سورہ ہر کام (جو جائز ہو) میں فتح کے لیے بہت اکسیر ہے۔ وہ لوگ جو روزانہ ایک بار سورۂ فتح پڑھتے ہیں، ان کی اولاد کامیابیوں اور کامرانیوں کو ضرور چھوتی ہے۔ ہر قسم کے دشمن پر غلبہ پانے کے لیے یہ سورہ بہت مفید ہے۔ اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں چند روایات حسبِ ذیل ہیں۔

1۔ ابن سعد نے مجمع بن جاریہؓ سے روایت کی ہے کہ جب جبرائیلؑ اس سورہ کو لے کر آئے تو عرض کی کہ یہ سورہ آپ کو مبارک ہو۔ جبرائیل علیہ السلام کی مبارک باد کے بعد صحابہ رضوان علیہم اجمعین نے بھی آپ کو مبارک باد دی۔ (بخاری شریف)

2۔ حضرت عمرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلایا اور فرمایا: مجھے اس سورہ کے بدلے میں وہ تمام چیزیں پسند نہیں جن پر سورج نے طلوع کیا۔ (ترمذی)

3 حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورہ کے نزول کے بعد فرمایا۔ مجھے یہ سورہ زمین کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

4۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ یہ سورہ مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ پسند ہے جن پر سورج طلوع ہوا۔ (بخاری شریف)

5۔ صلح حدیبیہ سے واپسی میں مکہ اور مدینہ کے راستے میں اس سورہ کا نزول ہوا جب یہ سورہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایک ایسی سورہ نازل ہوئی جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔ (بخاری شریف)

6 جس کام میں فتح مقصود ہو تو اس سورہ کو 41 مرتبہ پڑھ کر اس کام کو جائے انشاء اللہ اس میں کامیابی اور نصرت ہوگی۔ (ناجائز اور حرام کاموں کے لیے ہرگز نہیں)

7۔ اگر کوئی شخص حج کا خواہش مند ہو اور وہ جا نہ پا رہا ہو تو اسے چاہیے کہ چالیس روز تک اس سورۂ کو گیارہ مرتبہ روزانہ پڑھے انشاء اللہ تعالیٰ غیب سے اس کے لیے حج کا ذریعہ بن جائے گا۔

8۔ اس سورہ کو پڑھنا فتوحات کی کنجی ہے۔ دن میں ایک بار پڑھنے کی عادت ڈالیں اور کامرانی کے مزے لیجیے۔

9۔ سورۂ فتح کو روزانہ فجر کی نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھنے کا معمول بنانے سے رزق کی فراوانی رہتی ہے۔

10۔ رمضان المبارک کے چاند کو دیکھ کر تین مرتبہ کھڑے ہو کر اس سورہ کو پڑھنے سے پورا سال عافیت میں گزرے گا۔ (انشاء اللہ)

سات دن میں یرقان کا علاج

مولی کے سبز پتے لے کر کوٹیں یا گرائنڈ کر لیں اور ململ کے کپڑے سے اس کا پانی نچوڑ لیں اور گڑ کی شکر ملا کر ایک کپ صبح، ایک دوپہر میں کھانا کھانے کے بعد اور ایک رات کو کھانے کے بعد پئیں۔ پیتے ہی سکون ملے گا۔ بھوک بھی خوب لگے گی۔ کھانے میں تیل بالکل استعمال نہ کریں اور نہ ہی چاول اور فریج کا رکھا ہوا کھانا کھانا ہے۔ اس عرق کے پینے سے آپ کو

موشن ہو سکتے ہیں تو پانی کا استعمال زیادہ رکھیں۔ انشاء اللہ ... سات دن میں یرقان ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں جب بھی آپ پئیں اس پر درود شریف کے بعد کم از کم تین بار سورۂ فاتحہ ضرور پڑھ لیں۔

خراب دانت اور خراب مسوڑھے

معدہ خراب ہو تو اس کے اثرات مسوڑھوں اور دانتوں پر لازمی پڑتے ہیں۔ گرم، گرم کھانا کھا کر ٹھنڈا پانی پینا، گرم چائے سے پہلے یا بعد میں برف کا استعمال کرنا، یخ ٹھنڈی اشیا کا زیادہ استعمال، زیادہ گوشت خوری، تیز مرچ مسالا، باسی اشیا کھانے کے ساتھ، ساتھ پان کھانا، نسوار کھانا اور گٹکا کھانے سے عموماً پیٹ خراب رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسوڑے خراب ہوتے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے پرہیز ضروری ہے۔ دانتوں میں مسواک کریں، شہد کھانے کی عادت ڈالیں، شہد صبح اور رات کو لیں ایک چمچ اور اس پر تین مرتبہ سورۂ فاتحہ دم کر کے کھائیں۔ اس کے ساتھ، ساتھ لاہوری نمک باریک پیس کر اس میں خالص سرسوں کا تیل ملا کر اس پر تین سو تیرہ مرتبہ یارحیم پڑھ کر شہادت کی انگلی سے دانتوں اور مسوڑھوں پر ملیں اور رال بہائیں اور کلی نہ کریں۔ صبح نہار منہ اور سوتے وقت یہ عمل اس وقت تک کریں جب تک آپ کے دانت اور مسوڑھے اچھی طرح ٹھیک نہ ہو جائیں۔

لاعلاج امراض کا آسان علاج

بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جان ہی نہیں چھوڑتیں۔ جس سے نہ صرف صحت روز بروز خراب سے خراب تر ہو جاتی ہے بلکہ طبیعت میں چڑچڑا پن بھی آ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے روزانہ استغفار کی ایک تسبیح پڑھنا اپنا معمول بنالیں، سورۂ فاتحہ روزانہ اپنی پانی کی بوتل پر کم از کم گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کر کے پیا کریں۔ چاند کی پہلی تاریخ کی پہلی شب کو بعد نمازِ عشا دو رکعت نماز نفل اس طریقے سے پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص پانچ، پانچ مرتبہ پڑھیں۔ اس کے بعد جائے نماز پر ہی بیٹھے، بیٹھے سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھیں اول و آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر سجدہ ریز ہو کر دعا مانگیں اور اپنے اوپر دم کریں۔ تین یوم باقاعدگی سے پڑھیں اور ہر نئے چاند کو اسی طریقے سے پڑھے جب تک مذکورہ بیماری جڑ سے نہ اکھڑ جائے۔

چوری ہو جانے کی صورت میں

اگر آپ کے گھر میں خدانخواستہ کوئی چیز چوری ہوگئی ہو تو جس دروازے سے چوری کا مال گیا ہو اس دروازے پر کھڑے ہو کر سورۂ طارق روزانہ ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ انشاء اللہ مال واپس مل جائے گا یا خواب میں چور کا پتا چل جائے گا۔

رات کو نیند نہ آتی ہو

ایسی صورت میں وضو کر کے درود شریف پڑھنا شروع کر دیں۔ جتنی آپ کو آیات زبانی یاد ہیں آنکھیں بند کر کے پڑھیں اور سوچیں کہ آپ خانہ کعبہ کے سامنے سجدے کی حالت میں ہیں، ایسی حالت میں نیند آنے کے بعد اگر بیچ میں آنکھ کھلے تو پہلا کلمہ پڑھ کر خوب دعائیں مانگیں، انشاء اللہ آپ کی ساری دعائیں پوری ہوں گی۔

شوہر توجہ سے بات نہیں سنتا

آپ اپنا بھی خیال رکھیں...... ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر بیویاں شوہر سے بول چال بند ہونے کی صورت میں اپنا منہ تک دھونا چھوڑ دیتی ہیں، آپ اپنا پہلے سے زیادہ خیال رکھیں۔ میکے جانے کی بھی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور میاں جی بلکہ سارا گھر آپ سمیت سورۂ فاتحہ کا دم ہوا پانی پئیں...... تاکہ ان کا غصہ خود ہی ختم ہو جائے اور کوشش کریں کہ زیادہ اوقات باوضو رہیں۔ اس کے ثمرات کا اندازہ آپ کو از خود ہو گا۔

☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تا کہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تا کہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بچی کا قد رک گیا ہے

شمیم نور......اورنگ آباد

سوال: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی عمر 11 سال ہے لیکن قد اس کا بہت چھوٹا ہے۔ یعنی 4 فٹ اور 3 انچ ہے۔ کیا مینسز کے بعد لڑکی کا قد نہیں بڑھتا؟ اس سلسلے میں، میں بہت پریشان ہوں۔ میری اکلوتی بچی ہے۔ مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کریں۔ کوئی اچھی سی دوائی تجویز کریں تا کہ اس کا قد بڑھ جائے۔ رنگ ... صاف کرنے کے لیے بھی دوائی دیں۔ کیونکہ اس کا رنگ بھی سانولا ہوتا جارہا ہے۔ چھوٹی تھی تو گوری تھی مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی جارہی ہے اس کا رنگ سانولا ہوتا جارہا ہے اور قد ہے ہی چھوٹا۔ کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمادیں جس سے دونوں مسئلے حل ہو جائیں تا کہ اسے کسی قسم کا کوئی احساسِ کمتری نہ ہو۔ عمر بھر آپ کو دُعائیں دوں گی۔

جواب: گھبرانے اور پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ ہوگا وہی جو رب چاہے گا۔ متوازن غذا دیں (سبزی، دال، پھل، گوشت، دودھ، انڈے) گھر کی بنی ہوئی۔ ورزش کرائیں۔ قد ہمیشہ خاندان (ماں اور باپ) کے حساب سے بڑھتا ہے۔ تین ماہ

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2016ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

____

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرا کر بچی کی حالت بتائیں۔ Pulsatilla 30 Sarsaprilla 30 Iodium 30 ہر دوا کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کرائیں۔

مینسز کی بندش

نوشین......لطیف آباد

سوال: عورتوں کی بیماریوں سے متعلق یہ نیا سلسلہ بہت اچھا ہے اور قابلِ ستائش ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میری بیٹی 18 سال کی ہے۔ آغاز میں چند سال اسے مینسز بالکل درست اور وقت پر آرہے تھے۔ مگر اب یہ سلسلہ خود بخود رک سا گیا ہے اور اب دو، دو، تین، تین ماہ کے بعد آنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں نے دوڈھائی ماہ ہومیوپیتھک علاج بھی کروایا تھا مگر افاقہ نہ ہوا۔ اب دس ماہ بعد اس کی شادی ہے۔ شادی کے بعد کوئی الجھن تو پیش نہیں آئے گی۔ ویسے صحت کے لحاظ سے ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے اور کوئی دوسرا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر جلدی جواب اور علاج تجویز کریں۔

جواب: فکر اور پریشانی سے بھی بعض اوقات فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لیے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی میڈیسن ایک ماہ کے استعمال کے بعد حالت سے آگاہ کریں۔ Calc.Carb 30 , Pulsatilla 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ Magnesium Phos Pentarkan اور Ptk 60 کی ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ چوسیں۔

کمر درد اور لیکوریا

نورین......فیصل آباد

سوال: ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا کی بیماری ہے۔ اس کا بہت علاج کروایا۔ ایلو پیتھک کا بھی، ہومیوپیتھک کا بھی، حکمت کا بھی اور ٹونے ٹوٹکے بھی استعمال کیے جو کہ میری دادی جان نے کروائے تھے۔ مگر مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میں اب بے حد مایوس ہوگئی ہوں۔ پھر میں نے پاکیزہ میں ہومیوکلینک پڑھا اور بڑی امید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ بیماری کی وجہ سے میری کمر میں بہت زیادہ رہنے لگا ہے۔ میری پنڈلیوں میں بھی درد رہتا ہے اور میں بہت کمزور بھی ہوں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ پیلا ہے، یعنی رنگت میں سرخی نہیں ہے۔ آنکھیں بھی اندر سے پیلی پڑی ہوئی ہیں۔ اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی بے تحاشا ہیں۔ میرے خط کا جواب ضرور اور جلدی دیجئے گا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

جواب: نورین صاحبہ پریشان نہ ہوں۔ نماز پابندی سے پڑھتی رہیں۔ اچھی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کریں۔ کھانا متوازن کھائیں۔ تیز مرچ مصالحہ استعمال نہ کریں۔ کوئی گیم کھلیں بیڈمنٹن، ٹینس ٹیبل وغیرہ۔ صبح نہار منہ دودھ پیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ Kreosote 30 , Origanum 30 کے 5,5 قطرے اور Alfalfa Q کے 10 قطرے آدھا گلاس کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد استعمال کریں۔

لمبا قد گورا رنگ

علینہ گیلانی......بہاولپور

سوال:۔ مجھے آپ سے اپنے دو مسائل بیان کرنے ہیں۔ میری عمر 19 سال ہے۔ میرا قد 5 فٹ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا قد تین سے چار انچ بڑھ

جائے۔ میری عمومی صحت بہت اچھی ہے اور میری خوراک بھی مناسب ہے۔ برائے مہربانی کوئی اثر انگیز دوا تجویز کر دیجیے۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ وقت کے ساتھ ساتھ سانولا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے میرا رنگ صاف ہوتا تھا اور چہرے پر چمک بھی ہوتی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی اثر انگیز دوا تجویز کر دیں جس سے میرا رنگ گورا ہو جائے اور مجھے کسی کے سامنے شرمندگی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ برائے مہربانی یہ بھی واضح کر دیجیے کہ ان دواؤں کے استعمال سے کوئی گائنی کے مسائل تو پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسائل کا حل بتا دیجیے، میں آپ کی بہت ممنون و مشکور ہوں گی۔

جواب:۔ تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال بڑھائیں۔ ورزش کیا کریں، متوازن غذا کھائیں۔ 19 سال میں قد بڑھتا تو نہیں لیکن کوشش کی جا سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ Thyroidinum 30 کے 5 قطرے چوتھائی کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ Sarsaparilla 3x کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ Calc Phos 30 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر حالت بتائیں۔

نیند میں جھٹکے

عائلہ......ڈیرہ غازی خان

سوال: ڈاکٹر صاحب بعد سلام عرض ہے کہ میری بیٹی جس کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ اسے ایک مسئلہ درپیش ہے۔ شیر خوارگی کی عمر سے ہی میں نے محسوس کیا ہے کہ نیند میں اگر اسے ہلایا جلایا جاتا ہے جیسے عموماً بچے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نیند میں اُٹھا کر لٹا دیا جاتا ہے تو اس کا جسم کانپنے لگ جاتا ہے۔ جو کہ آج تک برقرار ہے۔ لیکن اس کی یہ کیفیت سیکنڈز یعنی چند لمحات کی ہوتی ہے۔ جسم کچھ دیر کانپتا ہے لیکن اس کی نیند ڈسٹرب نہیں ہوتی۔ میری بچی دودھ شوق سے پیتی ہے۔ باقی کھانے پینے کی چور ہے لیکن اس کے باوجود ماشاء اللہ ذہین اور ایکٹو بچی ہے۔ اپنی کلاس میں پوزیشن لی ہے۔ ون کلاس میں ہے۔ ویسے ... بالکل ٹھیک ہے لیکن اب بھی کبھی کبھار اس کا جسم نیند میں کانپتا ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں آپ سے اپنی تسلی کے لیے مشورہ کرنا چاہتی ہوں کہ کیا کروں۔ کوئی ہومیوپیتھک دوائی بتائیں۔ بچی کی رپورٹس کی کاپیاں آپ کو ارسال کر رہی ہوں۔ دوا تجویز کر کے مہربانی فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ یہ کس وجہ سے ہے۔ کیا آئندہ زندگی میں اس کے لیے کوئی مسئلہ بن سکتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں میری رہنمائی کریں۔

جواب: آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ آپ فکر مند ہوں۔ ہمیں لگتا ہے کہ بچی میں آئرن و کیلشیم کی کمی ہے۔ اس لیے کہ وہ اور چیزوں کی طرف رغبت نہیں رکھتی۔ تین ماہ تک اس کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Fer.Phos 30 صبح و شام اور Calc.Carb 30 دوپہر و رات کو پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کرائیں۔ انشاء اللہ بچی جلد بہتر ہو جائے گی۔

ناک کی ٹیڑھی ہڈی

فرمان علی......سبی

سوال: ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ناک کی نرم والی ہڈی، یعنی دونوں نتھنوں کے درمیان والی ہڈی ٹیڑھی ہے۔ اس طرح کہ الٹی طرف والی سیدھی طرف ہے یعنی الٹی طرف چنے کی دال جتنا گڑھا بنا ہوا ہے اور وہ سیدھی طرف کو نکلا ہوا ہے اور ناک تھوڑی بڑی ہے۔ جب چھوٹا تھا تو ناک چھوٹی تھی اور ہڈی بھی سیدھی تھی مگر میں نے ناک کو دبا دبا کر اور

نتھنوں میں انگلیاں مار، مار کر اس طرح کر دیا ہے۔ ناک کی تھوڑی بہت چونچ بھی نکلی ہوئی ہے۔ برائے کرم ایسا علاج بتائیں کہ ناک کی ہڈی سیدھی ہو جائے اور ناک کی چونچ بھی درست ہو جائے اور ساتھ ساتھ ناک چھوٹی بھی ہو جائے۔ بہت ہی پریشان رہتا ہوں مگر جب آپ کا نام اور قابلیت پڑھی تو مجھے میری منزل نظر آئی۔ آپ سے درخواست کرتا ہوں میری مدد فرمائیں۔ مجھے تسلی بخش جواب دیں۔ تاعمر دعائیں دوں گا۔

جواب: تم خود یہ کیسے تشخیص کر رہے ہو کہ تمہاری ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں اس ہڈی کے ٹیڑھے ہونے سے کیا تکلیف ہوتی ہے یہ تم نے نہیں لکھا۔ میری رائے میں کسی پلاسٹک سرجن کو دکھاؤ وہ تمہارا صحیح حل نکال سکتا ہے۔ ویسے تسلی کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Flour 30 کے پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

اعصابی کمزوری

عجائب خان..... پشاور

سوال: ڈاکٹر صاحب، بیماریوں کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا ہوں۔ جسم بالکل کمزور ہو چکا ہے۔ اعصابی کمزوری، کندھوں، ٹانگوں، کمر میں درد اور چڑچڑاپن پیدا ہو گیا ہے۔ ہر وقت غصہ آتا رہتا ہے۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ نظام انہضام خراب ہو چکا ہے۔ کوئی میٹھی چیز، طاقت والی چیز نہ پی سکتا ہوں اور نہ کھا سکتا ہوں۔ بادی بواسیر بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کافی علاج کروایا لیکن فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ معدے کا اور بواسیر کا علاج کرواتا ہوں تو جسم کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اور اگر کمزوری کا علاج کرواتا ہوں تو قبض اور بواسیر کی پرابلم پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف چیکو کھانے سے پاخانہ ٹھیک آتا ہے۔ براہ مہربانی دونوں کے لیے کوئی اچھی سی دوائی تجویز کریں کیونکہ زندگی گزارنی مشکل ہو گئی ہے۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔

جواب: عجائب خان' دینی کتب کا مطالعہ کریں۔ نماز کی پابندی کریں۔ سادہ غذا کا استعمال کریں۔ مرچ مصالحے اور مرغن غذائیں بالکل بھی استعمال نہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں..... ایک ماہ بعد اپنی حالت سے آگاہ کریں۔ Nux VomicaPentarkanPtk63 Origanum 30 کے 10,10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ہر کھانے کے بعد Alfalfa Q کے دس قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

ڈرائی اور پتلے بال

انعم اسلام آباد

سوال: میں 19 سال کی ہوں اور مجھے آپ سے اپنا یہ مسئلہ بیان کرنا ہے کہ میرے بال بہت ہلکے ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں، میں انہیں تیل بھی لگاتی ہوں، ہفتے میں دو دفعہ سے زیادہ شیمپو استعمال نہیں کرتی۔ لیکن بال بہت ہلکے اگتے ہیں۔ میں انہیں مہینے دو مہینے کے گیپ سے کٹواتی بھی رہتی ہوں (جو نوکیں نکل آتی ہیں) لیکن پھر بھی بہت پتلے اور روکھے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ بڑھتے نہیں ہیں لیکن صرف نوکیں ہی بڑھتی ہیں۔ مجھے بڑے اور لمبے بالوں کا بہت شوق ہے۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھ میں ایک دانہ ہوا تھا جیسے ہو جاتے ہیں آنکھ کی کھال پر۔ مجھے اس میں کوئی تکلیف یا چبھن نہیں ہے لیکن مین چاہتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ گرم کپڑے کی سکائی کرو، میں نے کی، ڈاکٹر کو دکھایا، کھانے کے لیے دوا دی اور کہا کہ بیس دن بعد آ کر نتیجہ بتائیں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی اثر نہیں ہوا۔ تھوڑی سی سوجن کم ہو گئی لیکن دانہ ابھی تک ہے اور اس کو ہوئے تقریباً تین مہینے

ہو چکے ہیں۔ مجھے کسی نے اس پر مٹی کے پیالے کا لیپ لگانے کا کہا لیکن ابھی تک یہ ٹوٹکا میں نے نہیں آزمایا۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے دونوں مسائل کا حل بتادیجئے۔ میں آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔

جواب :۔ بی بی آنکھ کا معاملہ ہے بغیر دیکھے دوا تجویز نہیں کی جاسکتی۔ ہاں البتہ بالوں کے لیے زیتون کا تیل استعمال کریں اور ایک شیمپو بھی، وہ آپ کو ہم سے منگوانا ہوگا۔ کھانے کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Phos 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور Alfalfa Q کے سات قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

ذہنی کیفیت

جاوید تحسین .... کراچی

سوال :۔ آپ اور آپ کے بورڈ آف ڈاکٹرز نے میرے مسئلے کا حل بہت جلد بھیج کر مجھ پر ایک عنایت کی جس کے لئے میں تہ دل سے شکر گزار اور دعا گو ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہونے کو ہے جو کیفیت اور فائدہ ظاہر ہوا وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

(۱) شروع کے دو تین دن مجھ کو نیند سکون سے آجاتی تھی اور مجھے کسی قسم کی انگریزی دوائی کا سہارا نہیں لینا پڑا۔

(۲) میں نے انگریزی دوا ایک ماہ ہوا مستقل چھوڑ دی ہے اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے مستقل نجات مل جائے۔

(۳) پچھلے ایک ہفتے سے میں نوٹ کر رہا ہوں کہ نیند مجھ کو بہت دیر سے آتی ہے یعنی ڈھائی سے تین بجے تک اور چونکہ مجھے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے اس وجہ سے میں جلد ہی اٹھ جاتا ہوں۔ میں یہ بات قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو ان دوائیوں سے فائدہ نہ ہوا ہو۔ خدا کے فضل سے مجھ کو ان دوائیوں سے بہت فائدہ ہوا۔ پہلے میں اگر کبھی رات بھر جاگ جاتا تھا تو صبح کو کام کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تھی۔ دن بھر خصوصاً ٹانگوں اور کمر میں بہت درد ہو جاتا تھا اور دماغ سائیں سائیں کرتا تھا۔ ان دواؤں کے استعمال سے کم از کم یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں آج کل تین سے چار گھنٹے سو رہا ہوں یہ میری کیفیت ہے۔ اب آپ جو مشورہ دیں اس کے مطابق عمل کر کے کلی طور پر شفایاب ہو جاؤں۔

جواب :۔ بہت خوشی ہوئی کہ پہلے سے خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں ۔ اللہ آپ کو مکمل شفایاب کرے۔ آپ نے اپنی ذہنی کیفیت کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ اب کیسی ہے؟ شک کی عادت کس حد تک ہے؟ دوستوں وغیرہ سے کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں کرتے؟ نیند کی کوئی دوا نہ کھائیں یہ ذہن پر اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ جو ہدایات ہم نے آپ کو پہلے دی تھیں کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟ عمل جاری رکھیں اور پچھلی دواؤں کو روک دیجئے اور ایک ہفتے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thuja 200 کی ایک خوراک صبح اور ایک شام لیجئے پھر تیسرے دن سے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کپ پانی میں مندرجہ ذیل ادویہ کے 5,5 قطرے ڈال کر استعمال کریں۔

Gelsemium 30 + Passiflora Q + Ignatia 30 + Stramonium 30 ایک ماہ کے استعمال کے بعد پھر کیفیت سے آگاہ کریں۔ یاد رکھیں دوائیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی استعمال کرنی ہیں۔